ادبِ لطیف

۱۹۳۴ء

نیا اردو ادب

مکتبہ اردو کی مطبوعات اردو ادب کے ذخیرے میں گرانبہا اضافہ اور ہندوستان کی ذہنی ترقی میں سنگ میل ہیں۔ مکتبہ اردو ہندوستان کے نامور لکھنے والوں کی طرف دست تعاون بڑھاتا ہے۔ اور اُن کی فنی تخلیقات کا بہترین نعم البدل پیش کرتا ہے۔

تاریخ

کتاب	مصنف	قیمت
کمپنی کی حکومت	باری	۳/-/-
انقلاب فرانس	"	-/۸/-
تاریخ کیا ہے؟	"	-/۸/-
تاریخ یونان	جے۔ بی بیوری	-/۸/-
توزک بابری	ظہیر الدین بابر	-/۸/-
سلطنت روما	جے۔ بی بیوری	-/۸/-
انقلاب کی تاریخ	گوپال متل	-/۸/-
تاریخ عالم	باری	(زیر طبع)

سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
گورکی کی ڈائری	حسن عباس	-/۸/-
کارل مارکس	باری	۱/۸/-
استالین	مارشل وارشلوف	-/۸/-
ماتا ہری	خلیل احمد	(زیر طبع)
عصمت انونو	ثریا اندریمان	-/۸/-
محمد عربی	باری	-/۸/-
رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا	-/۸/-
ٹراٹسکی	نریندر ناتھ سیٹھ	-/۸/-
ہمارا لینن	ماشل ملیح آبادی	-/۸/-
لینن (بحیثیت ایک انسان)	کلارا زٹکن	-/۸/-
سیرت امام ابن تیمیہ:	غلام جیلانی برق	۲/۴/-
ہندوستان کے لیڈر	یوسف مہر علی	-/۸/-
سبھاش بوس	گوپال متل	-/۸/-
گاندھی	"	-/۸/-
جواہر لعل نہرو	"	-/۸/-
ابوالکلام آزاد	عبد اللہ بٹ	-/۸/-
تانیا	پی۔ لیڈوف	-/۸/-
Aspects of Abul Kalam Azad		1-12
ٹالسٹائی	جیرلڈ ابراہم	-/۸/-
نپولین	ایچ۔ اے۔ ایل فشر	-/۸/-
میری زندگی	چیخوف	(زیر طبع)

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
نئے زاویے (اول)	(مرتبہ) کرشن چندر	(زیر طبع)
نئے زاویے (دوم)	(مرتبہ) کرشن چندر	۶/-/-
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	۴/-/-
رنگ و بو	سید فیاض محمود	(زیر طبع)
باسی پھول	علی عباس حسینی	۲/۸/-
طلسم خیال	کرشن چندر	۱/۱۲/-
ٹوٹے ہوئے تارے	"	۱/۱۲/-
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/-/-
کونپل	اُپندر ناتھ اشک	۱/۱۲/-
صحرانورد کے خطوط	میرزا ادیب	۳/-/-
عورتوں کے افسانے	کوثر چاند پوری	۲/۸/-
دنیا کی حور	"	۱/۱۲/-
لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	۱/۸/-
پرواز لقلق	"	۱/۸/-
سرکش روحیں	خلیل جبران	۱/۸/-
پھول اور کانٹے	گوپال متل	-/۸/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۲/۱۲/-
بگولے	احمد ندیم قاسمی	۳/-/-
طلوع و غروب	"	۱/۱۲/-
۳ پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	۱/۸/-
رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۳/-/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۲/۸/-
شبستان الم	زبیدہ سلطانہ	۲/۸/-
الاؤ	سہیل عظیم آبادی	۱/۸/-
ایک لڑکی	(خواجہ) احمد عباس	۱/۸/-
زندہ چین	(مترجمہ) تمنائی	۲/-
خونی	اختر انصاری	۱/۱۲/-
کرنیں	شفیق الرحمن	۲/-/-
ان کہی	ممتاز مفتی	۲/۸/-
کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی	۱/۱۲/-
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۲/-/-
چٹان	اُپندر ناتھ اشک	۱/۱۲/-
پردہ سیمیں	ڈاکٹر محمد نصیر الدین	۳/-/-
چاند کا گناہ	راجہ مہدی علی خان	۴/-/-
جگا	بلونت سنگھ	۲/۱۲/-
بھنور	شیر محمد اختر	۱/۴/-
چاندی کے تار	مہندر ناتھ	۲/۱۰/-
پتھر کا دل	مترجمہ سراج الدین	۲/۱۲/-
ایک بات	عصمت چغتائی	۲/۸/-
ان داتا	کرشن چندر	۲/۸/-
درپن	شکیلہ اختر	۲/-/-
بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری	۳/-
میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	۳/-
زندگی کا میلہ	اختر حسین رائے پوری	(زیر طبع)
ناگن کالی رات	وقار انبالوی	"
جھمیلے	ممتاز مفتی	"
پت جھڑ	احمد ندیم قاسمی	"
جدید جدید تر	دھرم پرکاش آنند	"
بد تمیز	سعادت حسن منٹو	"
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	"
نئے دیوتا	دیوندر ستیارتھی	"
گائے جا ہندوستان	"	"
چراغ تلے	کرشن چندر	"

سالنامہ

"1946"

ادبِ لطیف
لاہور

مکتبہ
اردو
لاہور

اردو افسانہ کے عروج میں عصمت چغتائی کی حقیقت نگاری اور بیباک نگاہی کا بہت بڑا حصہ ہے، اور اب عصمت اپنی تمام فنکارانہ قوتوں کو پوری شدت اور نفاست سے کام لاتے ہوئے اردو ناول کے پرانے اور گہرے خلا کو پُر کریگی۔

ٹیڑھی لکیر

اس ناول کا نام ہے، اور اسکی مصنفہ

عصمت چغتائی

ہے، لیکن اشاعت کے بعد یہ ناول سارے ہندوستان کا سرمایہ ہے، ہندوستان کی ادبی برتری کا ثبوت ہے، ہندوستانی زندگی کے ہر رُخ، ہر پہلو اور ہر رنگ کا نہایت پُرخلوص صاف اور روشن جائزہ ہے، عصمت اس ناول میں آپ کو فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آئے گی۔ اُردو ناول کے لق و دق صحرا میں "ٹیڑھی لکیر" ایک نخلستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول تعلیم نسواں، تہذیب فرنگ، قحط، جنگ، ادبی زندگی، غرض موجودہ دور کے ہر ضروری موضوع پر ایک بسوط تبصرہ ہے اور عصمت کی زبان اور بیان کا ایک معجزہ

زندگی کا میلہ

محبت اور نفرت کے مصنف کے غیر مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ

زندگی کا رنگا رنگ مرقع جس میں زہر کی تلخی کے ساتھ آبحیات کی خنکی ملی ہوئی ہے۔

نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوا کرتا ہے۔

اور ناظرین جانتے ہیں کہ مصنف کے نقش اول کو اردو افسانہ نگاری میں کتنا بلند مرتبہ حاصل ہے

(زیر طبع)

جدید، جدید تر

دھرم پرکاش آنند کے افسانے بہترین نفسیاتی تجزیے ہیں۔ ان تجزیوں میں وسعت ہے۔ ان کے تاثر کا دائرہ ان کے اظہار کا پھیلاؤ ایک پورے سماجی طبقہ کا احاطہ کرلیتا ہے۔ اونچے متوسط طبقے کے ریشمیں خول میں کلبلاتی ہوئی زندگی کی زہر آلود تصویریں۔ ان تجزیوں کی سچائی، دیانت اور شدت آنند کے افسانوں کے تار و پود بنتی ہیں۔ اُس نے اپنے موقلم سے اس افسردہ گلشن میں وہ وہ نازک گل بوٹے کھلائے ہیں۔ کہ ایک پورے طبقے کی زندگی اور موت اپنی تمام تر رعنائیوں اور افسردگیوں کیساتھ ہمارے سامنے آگئی ہے۔

(زیر طبع)

ایک بات

اُردو کی سرکش افسانہ نگار

عصمت چغتائی

کا ایک اور مجموعہ

جسمیں عصمت نے اپنے بیباکانہ اسلوب نگارش تیکھے تیکھے طنزیہ لہجے اور موضوعات کے تنوع سے ہندوستان کی ٹھہری ہوئی زندگی میں پھر ایک بار کئی پتھریلے اور نوکیلے کنکر اچھالے ہیں۔ عصمت نے اپنی اچھوتی فنکاری سے ادب میں جو ہنگامہ خیزی کی ہے۔ اُسکی مثال اردو ادب کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسکے ہنگاموں میں جاندار ادبیت کے سنگ بنیاد پنہاں ہیں۔ زندگی کے لطیف ترین حصوں کی فصد کھولنے میں عصمت کی نگاہ تیز نیز نشتر کا کام کرتی ہے ایک بات — میں لاکھوں تیکھی تیکھی باتیں کہی گئی ہیں۔ قیمت عہ

جلد ۲۳
شمارہ ۵، ۶، ۱

ترتیب

زرِ سالانہ
چھ روپے

غزلیات:

افسانے اور ڈرامے:

(کو اپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام چوہدری برکت علی ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادب لطیف لاہور سے شائع کیا۔)

ادارہ

اشارات

اکثر حضرات کے نزدیک سالنامہ شائع کرنا ایک ادبی فیشن میں داخل ہے، اور وہ محض اس ادبی فیشن کے احترام کی خاطر سالنامہ شائع کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے، لیکن ادارہ ادب لطیف کے نزدیک سالنامہ محض ایک نفع بخش فیشن نہیں ہوتا، ایک اجتہاد ہوتا ہے، ایک بلاوا ہوتا ہے، ایک سنگِ میل ہوتا ہے، سالنامہ ادب لطیف کا ہمیشہ سے یہ نعرہ رہا ہے۔ "آگے بڑھو" اس نعرے کی گونج سال بھر ادبی حلقوں میں گھومتی رہتی ہے، اور نئے سال کے ساتھ ہی اس نعرے کی تکرار ایک نئی زندگی۔ ایک نئے اُفق۔ ایک نئے عزم کی غمازی کرتی ہندوستان بھر کے علمی و ادبی اداروں میں نفوذ کر جاتی ہے، 'ادب لطیف' کی ایک الگ شخصیت ہے اس شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں سارے ہندوستان کے ادیبوں نے ہماری مسلسل امداد کی، اور ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں، کہ ہماری خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بڑے بڑے لکھنے والوں نے ہمارے ساتھ جو تعاون کیا، وہ اپنی گہرائی، گیرائی اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ایک مستقل اور بے مثل حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر اُس شخص کو ہوگا جس نے ادب لطیف کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔

"تم ننگی کہانیاں چھاپتے ہو" ایک طرف سے آواز آتی ہے، اور ہم چونک اُٹھتے ہیں، ادب اور عریانی کا گٹھ جوڑنا ممکن ہے، اگر ہمیں ادب پیش کرنا ہے، تو عریانی سے کنارہ کش رہنا پڑے گا، اگر ہمیں عریانی کی ترجمانی منظور رہے، تو ادب کی لطافتوں کا گلا گھونٹ دینا ہوگا۔ لیکن ادبِ لطیف میں ننگی کہانیاں کہاں سے آئیں! بحمداللہ ادارہ کی نگاہیں ادب اور عریانی کا امتیاز بآسانی کر سکتی ہیں، "تمہیں عدالت میں جواب دینا ہوگا" ہتھکڑیوں کی جھنکار میں لپٹی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے، ہم چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح مہینوں عدالتوں کا طواف کرتے ہیں، لیکن ہم قارئین کے سامنے سستی ہمدردی مول لینے کے لئے روتے پیٹتے نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں، کہ ذمہ داری صرف ہماری ہے، تعجب کا مقام ہے کہ بڑی بڑی عدالتیں ہماری "ننگی اور فحش" کہانیوں کو ادب پارے قرار دے کر ہمیں بری کر دیتی ہیں۔ مگر یہ رٹ برابر جاری رہتی ہے، "تم ننگی کہانیاں چھاپتے ہو"

ایک آواز آتی ہے۔ "تم ادب کے پردے میں اشتراکیت کا پروپیگنڈا کر رہے ہو" —— ادب اور پروپیگنڈے کا گٹھ جوڑنا ممکن ہے، ہم پھر چونک کر ادبِ لطیف کے مندرجات کا جائزہ لیتے ہیں، کہ ایک اور صدا سنائی دیتی ہے۔ "تم تصوف اور بھگتی کے موضوعات پر کتابیں کیوں نہیں چھاپتے" —— اور پھر اعتراضات کا تانتا بندھ جاتا ہے "تم ہمارے ہم خیال کیوں نہیں ہوتے؟" "تم زندگی کی اتنی خوفناک تصویریں کیوں نشر کرتے ہو؟" "تم نوح ناروی کی غزلیں اور کوثر چاندپوری کے افسانے اور ماہر القادری کے مقالے کیوں نہیں چھاپتے؟" —— "کیوں، کیوں، کیوں؟" —— اور اِن سب اعتراضات کا جواب ہوتا ہے 'ادب لطیف' ایک مسکت جواب۔ زندگی اور ادب کے بکھرے ہوئے رنگوں کا مرکب —— ایک پھریرا —— جو نہ حلقوں کا قائل ہے نہ جماعتوں کا، جسے نہ عریانی سے غرض ہے نہ پروپیگنڈا سے، جسے نہ شخصیتوں سے لگاؤ ہے نہ عقیدوں سے، اُس کا مقصد حیات ہے سچا ادب پیش کرنا —— اور فیصلہ آپ پر موقوف ہے کہ ہمارا یہ نیا سالنامہ ہمارے اس دعوے کا مکمل جواب ہے یا نہیں،

اور پھر ہمارے نئے ادیبو اور شاعرو، یہ تو سوچو کہ تم کب تک اقبال، جوشؔ، فیضؔ، مجازؔ، ندیمؔ، فراقؔ اور راشدؔ وغیرہ کے خیالات کو دہراتے چلے جاؤ گے
کرشن چندر، عصمت، منٹو اور بیدی کے افسانے کب تک تمہارا ساتھ دیں گے، تم کب تک عبدالغفار، نیاز فتحپوری، احتشام حسین اور عبدالحق کے خوانِ تنقید
کی ریزہ چینی کرو گے، تمہاری اٹھان سے مستقبل کی امیدیں وابستہ تھیں، اردو ادب کے فلک بوس محل کا کلس تمہارے دستِ صنعت کا محتاج تھا، مگر تم
اُن خولوں سے باہر آنے کی جرأت ہی نہیں کرتے، جو ترقی پسند جماعت کے مشہور ادیبوں اور شاعروں نے تمہارے ارد گرد چن دیا ہے، تمہارے تیور
بتا رہے ہیں کہ اردو ادب موجودہ دور میں اتنے زبردست عروج کے بعد تمہاری وجہ سے چانک تنزل پذیر ہونے لگے گا، اور ہمارے ذکی نوجوانو!
جوشؔ، اور کرشن چندر، اور عبدالغفار ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے، اور اردو ادب کی اتنی عظیم روایات کو سنبھالے رکھنے کا تم میں کس اور جس
نہیں، اگر ہے تو تم اُسے بروئے کار نہیں لائے!

اُن لوگوں نے اپنے دور کی زندگی کا مشاہدہ کیا، مگر زندگی ہمیشہ ایک ہی ڈھرے پر نہیں چلتی، وہ نہایت تیزی سے پہلو بدلتی ہے، تمہارے
سامنے بنگال اُجڑ گیا، جنگِ عظیم نے ساری دنیا کی سیاست، معاشرت اور معیشت کی چولیں ہلا دیں، چین میں دریائے زرد کی طغیانی سے
ایک کروڑ انسان خانماں برباد ہو گئے، امریکہ کے لاکھوں مزدوروں نے ہڑتالیں کیں، جن چھوٹے چھوٹے ملکوں کو اتحادی قوتوں نے آزادی
کے وعدوں کی تھپکیاں دیں، اُنہیں پھر سے تاج کے نگینے بنایا جانے لگا، ہندوستان کی فضا پر قحط کے دیو نے سایہ ڈالا، آسام میں خود ہندوستانیوں
کے ہاتھوں سیکڑوں ہندوستانی کنواریوں کی عصمتیں تاراج کر ڈالی گئیں، انگلستان میں میموں کے پیٹوں سے بیشمار ایسے بچے پیدا ہوئے جن کے
باپ امریکہ کی زنگدار نسل سے تعلق رکھتے تھے، فوجی تمغوں کی تقسیم کیلئے نہ جانے کتنے لاکھ گز لمبا ریشمی فیتہ تیار کرنے کا آرڈر دیا گیا، اور کلکتہ کے بازاروں
میں ننگی عورتیں مظاہرے کرتی رہیں، — یہ اور اس نوع کے ہزاروں واقعات تمہارے سامنے ہیں، ان کے اثرات تمہارے سامنے ہیں، اور تم ابھی تک اپنے پیشرووں
کی تقلید سے چھٹکارا نہیں پا چکیتے، تمہارا یہ رویہ صرف تمہاری ادبی موت نہیں، اردو ادب کی موت ہے، اور اسی لئے ہندوستانی قومیت کی موت ہے،

اور ہمارے کامیاب فنکارو، بلاشبہ انسانی زندگی میں آرام و آسائش کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، مگر بڑی بڑی تنخواہوں کی صورت میں
سرکار نے تمہاری ادبی قوتیں تو سلب نہیں کر لیں؟ کہیں ہزاروں کے مشاہروں کی شکل میں فلم کمپنیوں کے مالکوں نے تمہارے ضمیر تو نہیں خرید لئے ہیں؟ تین
برس میں ایک نظم کہنے والو، اور دو برس میں ایک کہانی لکھنے والو، زندگی بڑی تیز رفتار ہے" اور اس کی تیز رفتاری کا احساس ہم سے زیادہ تمہیں
تھا، ابھی ہندوستان کو تمہاری ضرورت تھی؟ ابھی اُسکے زخموں کے کھرنڈ اکھڑے نہیں تھے، بازار میں مزدور کا گوشت بدستور بک رہا تھا، اور کشمیر کی جنت
میں نئے نئے جہنم حسبِ معمول پیدا ہو رہے تھے،

ہمارا خیال تھا، کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ہمارے ادب میں ایک انقلاب آ جائے گا، اور یہ انقلاب اُس سیلابی یا عبوری یا ہیجانی کیفیت کا حامل
نہیں ہوگا، جو ترقی پسند ادب پر ایک بعید مدت تک کے لئے چھا دی گئی، اس انقلاب میں قطعیت ہوگی تعیین ہوگی، جنگ کے ہمہ گیر اثرات کا پرتو ہوگا
بیواؤں اور یتیموں کی عکاسیاں ہونگی، ایک نئے نظام کی تعمیر کا پروگرام ہوگا، اور وہ سب کچھ ہوگا جس کا ذکر ہم نے گذشتہ سالنامہ کے "اشارات" میں
کیا تھا، مگر جنگ ختم ہو چکی، اور جنگ کے متعلق لکھنے والے سرمائے نے نگل لئے، اور اردو ادب اُن راہوں کے موڑوں کو دیکھتا ہی رہ گیا، جن پر سے
وہ نئے قافلوں کا چھ سات برس سے انتظار کر رہا تھا،

یہ متوقع سرگرمیاں البتہ ایک نئے رنگ میں ضرور جاگزیں ہوئیں، اردو ادب کی حلقہ بندیاں شروع ہوئیں، ادیبوں کی تقسیم کا ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا، فن کے
سانچے بدلنے لگے، ہر اُس شخص نے تنقید کا بیڑا اٹھا لیا، جسے ہندوستانی جامعات نے کوئی سنہری سند تھما دی، فری اور بلینک ورس کو رگید اگیا، افسانوں نے
مطالعوں کی صورت اختیار کی، مطالعوں نے خاکوں کی، اور خاکوں نے "جواب مضمونوں" کی، شاگردوں نے اُستادوں کی تعریف میں مبالغہ کی آخری
حدیں چھو لیں، دوستوں نے دوستوں کی توصیف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا ڈالے، اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ ہمارا ادب لٹ جائے گا، ہمارا مستقبل لٹ جائیگا
ہم بے انتہا خوشی اور فخر سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ادارہ "ادب لطیف" نے ان تمام منفی قسم کی تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی رواداری
اور جذبۂ مصالحت سے ہمیشہ کوشاں رہا، کہ وہ مشعل جو ترقی پسند ادیبوں نے رجعت کی گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں بلند کی تھی، نہ بجھے، بلکہ اور بلند ہو، اور بھڑکے اور
انسانیت کی کوکھ اندھی ہونے سے بچ جائے، ہم ان کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس سوال کا جواب بھی ہمارا آئندہ سالنامہ ہی دے گا۔

مقالات

قاضی عبدالغفار

وقار عظیم

اثر لکھنوی

باری (علیگ)

عبادت بریلوی

پروفیسر کنہیالال کپور

حمیدہ سلطان

اویس احمد ادیب

عندلیب شادانی

اختر اورینوی

جدید اُردو ادب

سیف و سبو	جوش ملیح آبادی
نقش فریادی	فیض احمد فیض
شعلۂ ساز	فراق گورکھپوری
ماوراء	ن-م-راشد
نئے زاویے	کرشن چندر
بگولے	احمد ندیم قاسمی
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو
ان داتا	کرشن چندر
بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی
چرواہے - گرتی دیواریں	اپندر ناتھ اشک
کمپنی کی حکومت	باری علیگ
تنقید جدید	اختر اورینوی
ادب و انقلاب	اختر حسین رائپوری

قاضی محمد عبد الغفار

امن اور اہل قلم

امن کے متعلق اگر اہل قلم کے فرائض کا کوئی ذکر کرنا چاہے تو میں اپنی بحث کو اس مفروضہ سے شروع کروں گا کہ امن سے بھی اہل قلم کو وہی نسبت ہے جو جنگ سے ہے۔ ہر قوم کا ادب اس کے فکر اور احساس انسانی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔

دوسری عالمگیر اور عالم سوز جنگ کے بعد اب ہم ایک ایسے دور "تشکیک" سے گزر رہے ہیں جس میں زندگی کی نہ تو قدریں ابھی تک معین ہوئی ہیں۔ اور نہ انسانی افکار میں ٹھہراؤ۔ اور استقلال کی حالت پیدا ہو سکی ہے۔ انسانیت کے وجود پر جنگ کے زخم ابھی ہرے ہیں۔ یہ ایک عبوری دور ہے۔ جس میں آج چند نظریات قائم ہوتے ہیں۔ اور کل وہ مسمار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جمہوریت حقوق انسانیت۔ چار آزادیاں حق خود ارادیت اور آزادی کی بہت سی اصطلاحیں رقیق حالت میں ہیں اور پانی کی طرح ایک سانچے سے دوسرے میں انڈیلی جا رہی ہیں! جس رنگ کا شیشہ ہوتا ہے وہی رنگ اس پانی کا نظر آتا ہے۔

شک۔ خوف۔ فریب اور عقائد کے ضعف کی اس حالت میں اہل قلم کو بھی ابھی کوئی سیدھا راستہ نہیں ملا ہے۔ عام طور پر ان کی حالت یہ ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

انسانوں کی زندگی کا شیرازہ اس قدر بکھر گیا ہے کہ اب پھر اس شیرازہ بندی میں کچھ زمانہ صرف ہو گا۔

اگر میرے لئے اس موضوع کے انتخاب کا یہ مقصد ہے کہ اس کے تحت اس مسئلہ پہ بحث کی جائے کہ اہل قلم امن کے قائم کرنے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ تو میں سوائے اس کے کیا کہوں کہ اس کار خیر میں قلم کی توانائی وہی کام کر سکتی ہے جو جنگ کے جیتنے میں تلوار کی توانائی سے لیا جاتا ہے۔ قلم خود ایک تلوار ہے —— مگر وہ دو دھاری تلوار ہے —— وہ دونوں طرف کاٹتی ہے اور اب بیسویں صدی عیسوی کے افکار انسانی نے قلم میں اتنی طاقت پیدا کر دی ہے کہ اس کی نوک کبھی تو احساس انسانی کی رگوں میں گھس کر ہر قسم کا زہر داخل کرتی ہے۔ اور کبھی پکے ہوئے پھوڑوں میں سوراخ کر کے ان کا مادۂ فاسد خارج کر دیتی ہے۔

دوران جنگ میں ہم نے قلم کی قوت کے اتنے حقیقت نواز اور حقیقت سوز مظاہرے دیکھ لئے ہیں کہ اب اس بات کا تعین کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کبھی بھی اہل قلم امن و امان کی خاطر اتنا ہی زور قلم صرف کر سکیں گے جتنا انہوں نے جنگ کے متعلق صرف کیا۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا قوموں کا ادب اُن کی زندگی کا آئینہ اور اُن کے احساسات و افکار کا ترجمان ہوا کرتا ہے اس لئے انسانوں کی وحشیانہ فطرت کی اُن تصویروں کے بعد جو اس آئینہ میں ہم نے دیکھی ہیں اگر زندگی کا کوئی گوشہ ایسا بھی موجود ہے جہاں خالص اور بے عیب انسانیت کار فرما ہے یا ہو سکتی ہے تو یہ کام بلاشبہ اہل قلم ہی کا ہے کہ وہ اس انسانیت کے عکس کو اجاگر کریں۔ اس کے دھندلے نقوش میں رنگ بھریں اس کے نقوش اور دائروں میں انسانیت کی روح کو (جو ابھی تک برقرار ہے) بھر دیں اور زندگی کے نگار خانہ میں تمدن اور اخلاق کے مسخ چہروں کو از سر نو سنواریں۔

اس حقیقت سے روشناس ہونے کے لئے کہ آیا متمدن ممالک کے اہل قلم اس حق اور حقائق کشی کی اس مصروفیت کے بعد جس نے فسطائیت دشمنی کے رنگ میں خود اپنی فسطائیت کے تماشے بھی اہل نظر کو دکھائے اب اپنا نقشہ بدلیں گے اور تخریب کے اس ہنگامہ کے بعد تعمیر کی شرطیں پوری کر سکیں گے۔ ہمیں بہت دور جانے سے پہلے خود اپنے گرد و پیش کے ادب کے جدید رجحانات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی زبانوں کے ادب میں جو جدید ادبی رجحانات

نمایاں ہو رہے ہیں۔ اُن میں ابھی تک تنقیض "تخریب" نفرت و بغاوت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اور اگر آپ یہ چاہیں کہ میں آپ سے بے محابا یہ کہہ دوں کہ ادب میں نفرت و بغاوت اور تخریب کا یہ عنصر بہت بُرا ہے تو میں ایسا تو نہ کہوں گا! تخریب یا نفرت محض تخریب کی خاطر یقیناً بری چیز ہے لیکن تعمیر بغیر تخریب کے بھی اگر ممکن ہے تو "پرامن ارتقا" کی اس اصطلاحی افیون کا نشہ اور اس نشہ سے پیدا ہونے والی غنودگی کا تجربہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں حاصل ہوا ہے وُہ تو تعمیر کے اُن تھکے ہوئے نظریات کو مجھ پر ذرا بھی مؤثر نہیں بناتا۔

تعمیر کے لئے تخریب اتنی ہی ضروری ہے جس طرح ترقی کے لئے قدیم نظریات سے بغاوت! تغیر کے بغیر بغاوت مؤثر نہیں ہوتی۔ جس طرح بوڑھے جسم میں محض خضاب لگانے سے توانائی پیدا نہیں ہوسکتی۔ جدید ادب (میں صرف اپنے ہی ملک کا ذکر کر رہا ہوں) اگر زندگی کے قدیم بندھنوں کو توڑ کر میدان میں نہیں آتا وُہ ان نئے افکار کی ترجمانی بھی نہیں کر سکتا جو جنگ کے بعد پیدا ہوئے ہیں تو زندگی کے قدیم نقشوں میں ان افکار کا کوئی مقام نہیں۔ ہمارے قدیم ادب میں امن کا تخیل یا تو قدیم دیوان خانوں کی محفلوں اور مشاعروں میں حسن و عشق، زلف سیاہ، ابروئے خمدار۔ عارض تاباں اور وصل و فراق کی داستانوں تک محدود ہو چکا تھا یا زیادہ سے زیادہ شاہنامہ اور طلسم ہوشربا کی قصہ خوانی کے کمالات تک پہنچ کر جب سر سید۔ حالی و شبلی کسی قدر جاگے ادب کی سوئی ہوئی توانائی نے بھی ایک کروٹ لی ۱۸۵۷ء کے بعد سے شکست خوف اور کمتری کا ایک احساس اور (E.SCAPISM) کا عنصر ہمارے ادب پر حاوی تھا (ESCAPISM) کا صحیح ترجمہ کرنے کیلئے مجھے ابھی تک کوئی اچھا لفظ نہیں ملا ہے مگر میں اسے ایک ایسی کیفیت سمجھتا ہوں جب عمل اور احتجاج کی طاقت سلب ہو چلی ہوتی ہے۔ اور انسان اپنی بدحالی اور مجبوری کے احساس کو بھول جاتا ہے اور حقائق سے دور بھاگنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر آرٹ اور لٹریچر کی نفسیات میں پناہ لیتا ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد سے ادب میں اہل قلم کی اس کمزوری کا احساس ایک حرکت پیدا کرنے لگا اور ایک نامعلوم ذہنی انقلاب نے دھیرے دھیرے اپنے لئے باہر آنے کا کوئی راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ ابھی یہ جدید ادب اپنے ارتقا کی پہلی ہی منزل میں تھا۔ جب دوسری جنگ عظیم نے اس کو دبوچ لیا اور اس بری طرح سے دبوچ لیا کہ جو ممالک جنگ سے قریب تھے انہوں نے جنگ کے اغراض کیلئے اپنے تمام اہل قلم کی توانائیوں کو وقف کر دیا۔ ہندوستان ان لشکروں میں محض ایک پیش خدمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے اسے کسی قدر فاصلے سے دُنیا کے اس ابتلائے عظیم کا تماشا دیکھ کر کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور اس کی نظروں کے سامنے سے پردے اُٹھنے شروع ہوئے شکست و فتح کے میدان میں بالادست ممالک کی ذہنی بدامنی کی علامتیں سامنے آئیں۔ اور پھر اُس آئینہ میں اُسے خود اپنی صورت بھی زیادہ واضح نظر آنے لگی۔ اب اُس نے اس پس منظر میں خود اپنی زندگی کو ایسے ادب کے آئینہ میں پیش کرنا شروع کیا اور تعمیر کے ارادے سے تخریب شروع کی۔ جس نے قدیم افکار کی عمارتیں مسمار کرنی شروع کیں۔ قدیم ادب اور لٹریچر کے دیوان خانوں کے پردے اُٹھا دیئے اور اپنی دنیا کو یہ بتانا چاہا کہ زندگی ہے کیا اور ہونی کیا چاہیئے اس مقصد کے تحت اُسے ان چادروں کو کھینچ لینا پڑا جن کے نیچے اس کی سماجی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے بہت پرانے ناسور چھپا دیئے گئے تھے۔ جو لوگ شکست خوردہ ذہنیت اور احساس کمتری کی افیون کھا کر اونگھ رہے تھے اور گزرے ہوئے زمانہ کے خوابوں میں اب بھی آرٹ اور لٹریچر کے پری زادوں کو رقص کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہیں جدید ادب نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کوئی گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آیا کرتا۔ اپنے لئے اپنا زمانہ انسان خود بناتا ہے پرانی تصویریں جو کھٹوں میں سے نکال دی جاتی ہیں انہیں روغن لگا لگا کر چمکانا فضول ہے۔ نئی تصویریں اور ایسی صحیح تصویریں ان چوکھٹوں میں لگائی جاتی ہیں۔ جو ایکس رے کی طرح اندر کی حالت کو عیاں کر دیں تب ہی تو ان خرابیوں سے واقف ہو کر ان کا کچھ علاج ممکن ہے۔

نئے ادب نے اپنے اس ایقان کو پیش کیا۔ کہ امن صرف ایک ذہنی کیفیت ہے وُہ کوئی ایسی چیز نہیں جو بزور شمشیر پیدا کی جا سکے۔ اور ایٹم بم کی دھمکی سے قائم رکھی جا سکے! امن کے ان تصورات کو سب سے پہلے ان اقوام نے پیش کیا جو سب سے زیادہ زبردستی۔ نزاج اور

خانہ جنگی کے مصائب برداشت کر چکی تھیں۔ چین اور سویٹ روس کے ادب نے زندگی کے ان حقائق کو اپنی حقائق نگاری کا موضوع بنایا اور اس برقی رو کے دھکوں اور دھماکوں سے اپنے مفلوج اعضا میں حرکت پیدا کرنی چاہی۔ اس کوشش کے کیا نتائج حاصل ہو سکے اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ اب ان ممالک کا لٹریچر ہندوستان تک پہنچ رہا ہے دوسرے ممالک کے ادب نے بھی ایک نئی کروٹ لی، لیکن ان کے تصوّر کو (جس کے ساتھ ایک خوشحال سماج کا تصوّر وابستہ ہے) نئے ادب کے اس جدید تخیّل کو سب سے زیادہ امداد اُن ہی ممالک نے دی جو قدیم زندگی کی مصیبتوں سے نجات پاکر اپنے لئے ایک نئی دنیا بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی دنیا کے لئے نیا لٹریچر پیدا کیا اور اس نئے لٹریچر نے نئے سانچوں میں نئی زندگی کو ڈھالا۔ اگر دنیا میں امن کا کوئی دور آنے والا ہے تو ہر جگہ ذہنی ارتقاء کا یہ استقلال عمل بہت ضروری ہے۔ سنہ ۴۶ء میں ابھی ابھی ایک ابتلائے عظیم سے نجات پانے کے بعد ہم نہ تو میر اور سودا اور انشاء کے شاعرانہ افکار کی تقلید میں اپنا وقت ضائع کر سکتے ہیں اور نہ شرر اور رتن ناتھ سرشار کی اصطلاحوں میں زندگی کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں، یہ سچ ہے کہ آرٹ بجائے خود بھی ہماری جذباتی زندگی میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ لیکن ایسے تعیش کی ہمیں فرصت کہاں! بیشک میر و سودا اور شرر و سرشار بھی اپنے زمانہ کے کچھ مسائل رکھتے تھے جن کی اصلاح میں انہوں نے اپنے آرٹ کو استعمال کیا ہوگا۔ لیکن ہماری طرح اپنی نسل کے صرف (۲۵) سال میں عالمگیر جنگ کی دو ایسی انسانیت سوز اور دوزخی آتش زدگیوں سے کب گذرے تھے؟ کب انہوں نے اعلیٰ ترین انسانیت کو اس طرح ہلاک ہوتے دیکھا تھا؟ کب انہوں نے علم و فضل کے اتنے اونچے اونچے میناروں اور گنبدوں کو مسمار ہوتے دیکھا تھا! جو طوفانی ہوائیں آج چل رہی ہیں اس کے سامنے ان اساتذہ کی محفلوں کے چراغ کیا ایک لمحہ بھی روشن رہ سکتے! معاف کیجئے۔ شائد آپ میری باتوں سے خفا ہو جائیں لیکن ادب کی قدیم محفلوں میں آرٹ کا تصور ایک قسم کی مارفیا کا اثر تھا۔

مارفیا درد کو تو دبا سکتی ہے اس کے احساس کی دھار کو کند تو کر سکتی ہے۔ لیکن درد کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہی حال ہمارے قدیم آرٹ اور ادب کا تھا اسے ہم امن کا زمانہ کہتے ہیں۔ لیکن وُہ دراصل بیمار کی غنودگی کا زمانہ تھا۔

اب جبکہ دنیا ایک خوفناک زلزلہ کے بعد کچھ اور ہی ہو گئی ہے امن کا وُہ تصوّر بھی باقی نہیں جو پچاس سال پہلے تھا۔ اب اگر ہم امن چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ زندہ رہنے کے کچھ حقوق بھی مانگتے ہیں جن کے بغیر امن کی تمام اصطلاحیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس امن کی صحیح کیفیت پیدا کرنے کے لئے اہل قلم کو بھی حقائق نگاری سے آپ کے منہ کا مزا تلخ کرا دینا پڑے گا۔ بہت سے سماجی تالابوں کے ساکن پانی پر بڑے بڑے پتھر پھینک کر ان میں کچھ تلاطم پیدا کرنا پڑیگا۔ سماج کی جو مینڈکیں ان تالابوں میں امن اور سکون کی زندگی بسر کر رہی ہیں اُنہیں بار بار یاد دلانا پڑے گا کہ ان کے تالابوں کے باہر بھی ایک دُنیا ہے جہاں سورج چمکتا ہے! اس عمل کو اگر آپ بغاوت اور تخریب کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو کر لیجئے لیکن ہوگا تو یہی کہ ایک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا۔

سماج کے چور ضرور پکڑے جائیں گے اُن کی تمام چوریاں پکڑی جائیں گی۔ تب ہی ہمارا ادب اور ہمارا آرٹ حقیقی امن کا کوئی مؤثر پیام آپ کے دلوں تک پہنچا سکے گا ——— اسے آپ بغاوت کہئے یا تخریب!

اس شخص کی نسبت آپ کیا کہیں گے جسکی صورت نہائت بُری ہو لیکن وُہ اپنے کو یا تو حسین سمجھنے پر اصرار کرتا ہو یا اپنی بدصورتی کی یاد کو بھلا دینے کے لئے کبھی آئینہ دیکھتا ہی نہ ہو۔ اب اگر ایسے شخص کے سامنے آپ زبردستی آئینہ رکھ دیں گے تو وُہ یقیناً خفا ہوگا۔ حقیقی ادب ایک آئینہ ہے کسی کی مرضی کا پابند نہیں سب کے سامنے آتا ہے اور سب کو اُن کی اصلی صورت دکھاتا ہے۔ آپ خفا ہو کر اُس آئینہ کو توڑ دیں لیکن اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں بھی صورت وہی نظر آئے گی! لہذا جب آپ اس آئینہ سے خفا ہوئے بغیر اس میں اپنی زندگی کے حقائق کا صحیح عکس دیکھنا گوارا کرنے لگیں اس وقت آپ جدید ادب کی اس بغاوت میں اپنے لئے حقیقی خوشحالی اور امن کا ایک

راستہ پائیں گے ۔ ادب اور ادیب امن اور خوشحالی کے جن تصوّرات کو پیش کرتا ہے ۔ وہ جب تک بد حالی اور بد امنی کے پس منظر میں پیش نہ کئے جائیں ۔ موثر اور کارگر نہیں ہو سکتے ۔ جس دن آپ اس بات کو تسلیم کرلیں تو اسی دن آپ یہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ ادب اور ادیب زندگی کا ایک ماہر فن معمار ہے ۔ تلوار جس بستی کو ویران کرتی ہے قلم اس کو آباد کر سکتا ہے!! اہل قلم کی جدوجہد جسے ہم جدید ادب کے نام سے موسوم کرتے ہیں ایک ایسا معیار ہے کہ اس کی کامیابی کو ہم امن کی کوششوں کی کامیابی کا پیمانہ بنا سکتے ہیں ۔ جس قدر "جدید ادب" "ترقی کرے گا ۔ اسی قدر "نئی زندگی" پیدا کرے گا ۔ اور جس قدر نئی زندگی پیدا ہوگی اسی قدر امن کی بنیادیں استوار ہوتی جائیں گی ۔ نوجوان نسلوں کی طرح نوجوان ادب سے بھی ہماری تمام تر آرزوئیں وابستہ ہیں ۔ ستر برس کی بوڑھی عورت کو کتنی ہی اچھی طرح دلہن بنا کر بٹھا دیا جائے ۔ مگر "نوجوان ادب" کی محفل میں کوئی نظر اس "آب و رنگ و خال و خد" سے دھوکا نہیں کھا سکتی ۔ سا ادب کے ذریعہ سے حقیقی امن کے تخیل میں توانائی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئے ادب سے ملک کو زیادہ مانوس کیا جائے ۔ قدیم اصطلاحوں کے نگار خانوں سے ہم باہر آئیں اور بازار کی سجی سجائی دوکانوں کی آرائش سے دھوکا کھانے کے بجائے زندگی کی تنگ و تاریک گلیوں کے اندر گھسیں اور وہاں کی گندگی اور مصیبت سے اپنے زندہ رہنے کے ارادے کو تقویت پہنچائیں ۔ یاد رکھئے کہ امن کوئی بازار کا سودا نہیں جسے ہم دوکان سے خرید لائیں وہ خود اپنی اخلاقی اور سماجی زندگی کی ایک مستحکم تنظیم ہے جو کسی قانون کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اپنے ارادے اور اپنے قومی ادب کی تعمیر سے ہی حاصل ہو سکتی ہے جس طرح جسم کی عریانی کے لئے لباس کی ضرورت ہے اسی طرح سماجی زندگی کے تحفظ کے لئے ایک صحت بخش قومی ادب بھی ضروری ہے ۔ قومی زندگی میں قومی ادب کے بغیر جسد قومی کا دوران خون قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ملک کے نوجوان ادیبوں کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی سے اپنے ادب کو قریب لائیں ۔ تب ہی وہ اپنی قوم میں ایک خوشحال اور باعزت امن کے احساس کی مضبوط بنیاد قائم کر سکیں گے ۔

(نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

وقار عظیم

لاتا ہے جوئے شیر کا......

کائنات کے چپہ چپہ میں افسانہ نگار کے لئے بے گنتی، بے شمار موضوع بکھرے پڑے ہیں۔ مظاہر قدرت، سمندر، پہاڑ، جنگل اور ان سب میں پھیلی ہوئی زندگی۔ خدا کی پیدا کی ہوئی عجیب سے عجیب جاندار اور بے جان چیزیں، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گائیں، بکریاں، کُتا، بِلی، طوطا، مینا، چوہے خرگوش، سانپ، بچھو اور ہر طرف رینگنے والے کیڑے مکوڑے۔ پھر ان سب پر حکمرانی کرنے والا انسان۔ اُس کی بوقلموں زندگی، اس بوقلموں زندگی کے نِت نئے مسئلے۔ ایک انسان، دوسرا انسان، تیسرا انسان اس طرح دنیا کے بے شمار انسان اور اُن میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی عادت، اپنا اپنا کردار، اپنے جذبات، احساسات اور اندر چھپی ہوئی کتنی ہی نفسیاتی پیچیدگیاں —— یہ اور نہ جانے کتنے موضوع ہر وقت افسانہ نگار کی نظر اور فکر کو دعوت دیتے ہیں۔ پھر ہر افسانہ نگار کی اپنی الگ نظر ہے۔ اپنا علیحدہ سوچنے کا طریقہ ہے۔ اور اس طرح کائنات کے یہ بے گنتی، بے شمار موضوع نہ کبھی ختم ہوتے ہیں اور نہ اِن میں کبھی پرانا پن پیدا ہوتا ہے، پرانا پن یا فرسودگی موضوع میں نہیں، موضوع تلاش کرنے والی نظر میں پیدا ہو جاتی ہے، سوچنے والے دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے موضوع تلاش کرنے والے کے پاس ایک متجسّس، پریشان اور کبھی ایک جگہ نہ رُکنے والی نظر، اور کبھی ایک چیز سے مطمئن نہ ہونے والا مضطرب دِل ہو تو افسانہ کے لئے موضوع بہت ہیں۔ یہ موضوع تیز نظر اور جاگتے ہوئے ذہن کے سامنے خود بخود آتے ہیں۔ اچھا افسانہ نگار آرام سے آنکھیں بند کئے اپنی کرسی پر بیٹھا ہے یا دنیا کی ہر فکر سے آزاد ہو کر اپنے بستر پر دراز ہے۔ عین اس بے خبری میں جیسے کوئی آکر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کہ "معاف کیجئے گا جناب! میں ایک افسانے کا موضوع ہوں۔ آپ مجھے استعمال کیجئے"۔ ایسے ناخواندہ لیکن مبارک مہمانوں کی کمی سوتے ہوئے ذہن کو تو شاید محسوس ہوتی ہو۔ لیکن جس نے اپنی نظر کو کائنات کی عکاسیوں کے لئے وقف کر دیا ہے، جس کا دِل ہر وقت کسی نئے جذبہ سے معمور نظر آتا ہے اور جس کے ذہن میں ہر وقت دیکھی اور محسوس کی ہوئی باتوں کو جگہ دینے اور اُن پر غور و فکر کرنے کی گنجائش ہے۔ اُسے افسانے کے موضوع ہر وقت سوجھتے ہیں اور بغیر کسی کاوش کے سوجھتے ہیں۔ وہ بن بلائے مہمانوں کی طرح ہر وقت اُس کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کی نظر کے سامنے کوئی چیز آتی ہے۔ اور یہ چیز جیسے خود بخود ذہن میں ایک نیا موضوع لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ اُس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی سرمایہ میں گھُل مل کر یہ موضوع یا مرکزی خیال ایک افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے —— یا پھر کبھی دوستوں سے باتیں کرتے وقت محض ایک لفظ، سڑک پر گزرتے ہوئے کوئی چھوٹا سا حادثہ، کسی کتاب میں دیکھی ہوئی کوئی تصویر، کسی کتاب، رسالہ یا اخبار کا ایک جملہ توانا ذہن کے لئے تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ اور چھوٹی سے چھوٹی چیز، چھوٹی سے چھوٹی بات، ایک لفظ، ایک جُملہ، ایک غلط انداز نظر، کسی نہ کسی نئے موضوع یا افسانے کے مرکزی خیال کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اور افسانہ نگار اس خود بخود اُبھرنے والے مرکزی خیال پر کسی افسانہ کا ڈھانچہ بنا لیتا ہے۔ کبھی اُسی وقت افسانہ کی ہر تفصیل، اُس کا ایک ایک ٹکڑا، اُس کا سارا پلاٹ، اُس کی ابتدا، خاتمہ سب کچھ جیسے آئینہ کی طرح نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ اس موضوع یا مرکزی خیال کو مہینوں، برسوں پالنا پوسنا پڑتا ہے۔ جب کہیں وہ اس قابل ہوتا ہے کہ واقعی افسانہ بن سکے۔ افسانہ نگار کو اپنی طبیعت پر ضبط اور قابو رکھ کر، اپنے جذبات کو دبا کر اس نئے موضوع کی تشکیل کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ انتظار صبر آزما بھی ہے۔ اور دل شکن بھی لیکن فنی نقطۂ نظر سے بے حد اہم بھی۔ جو افسانہ نگار اِس طرح خود بخود پیدا ہونے والے خیال کو افسانہ بنانے کے لئے اتنا بے چین ہو جائے کہ اس کے پُختہ ہونے کا بھی انتظار

نہ کرسکے وُہ اچھے افسانے کبھی نہیں لکھ سکتا۔ اُس کے افسانوں میں پکّے پھلوں کی شیرینی اور رَس دونوں چیزیں ناپید ہوتی ہیں اور اچھا افسانہ نگار کبھی اپنے پھلوں کو کھٹّا اور کڑوا یا بے رس دوسرے کے سامنے لانا گوارا نہیں کرتا وُہ ہر نئے آنے والے موضوع کا خیر مقدم کرتا ہے اور اُسے اپنی ذہنی اور جذباتی زندگی میں رچا کر دوسروں سے اس کا تعارف کراتا ہے۔ یہی طریقہ صحیح ہے۔ خود افسانہ لکھنے والے کیلئے بھی اور پڑھنے والے کیلئے بھی۔

لیکن موضوع ہمیشہ خود بخود ہاتھ جوڑ کر نہیں آیا کرتے ضروری نہیں کہ وُہ ہمیشہ افسانہ نگار کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی رہیں۔ اُسے موضوع تلاش کرنے بھی پڑتے ہیں۔ اپنے ذہن میں دبے دبائے تجربوں کو اُلٹ پلٹ کرکے دیکھنا پڑتا ہے۔ اپنے جذباتی سرمایہ کی پوری کھوج کرنی پڑتی ہے۔ اپنے پڑھے ہوئے مواد کی طرف نظر دوڑانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو دیکھا ہے، سوچا ہے، محسوس کیا ہے اُسے ایک ایک کرکے سامنے لانا پڑتا ہے۔ پھر بھی کوئی موضوع نہیں سُوجھتا کسی مرکزی خیال کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اس حالت میں جو کچھ سوجھتا ہے، وُہ بھدّا، بے رنگ اور فضول نظر آتا ہے لیکن بیٹھے بیٹھے یکبارگی انہیں اُلٹی پلٹی اور تلاش کی ہوئی چیزوں میں سے کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور اِس کام کی بات سے افسانہ بن جاتا ہے۔

موضوع کی تلاش افسانہ نگار کے لئے بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ اگر اس کی نظر ہر وقت نگراں اور ذہن ہر وقت بیدار نہ رہے تو اچھے موضوع خود بخود پیدا نہیں ہوتے۔ اپنے سارے ذہنی، علمی اور جذباتی خزانے کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد بھی یقینی نہیں کہ اچھا موضوع مل جائے اس لئے عموماً افسانہ نگار اپنا کام پُرانے اور فرسودہ موضوعوں سے چلاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک نیا انداز بیان اس فرسودگی میں کوئی ایسا نیا پن پیدا کردیتا ہے کہ پُرانی چیز کے عیب اور اس کی اُکتاہٹ چھپ جاتی ہے۔ لیکن ایسا ہمیشہ ممکن نہیں۔ کبھی نہ کبھی یہ راز فاش ہوجاتا ہے۔ اور پھر افسانہ نگار کا افسوں ہمیشہ کے لئے ختم سا ہوجاتا ہے۔ افسانہ نگار خود بھی عموماً اِس انجام کے خطرہ سے واقف ہوتے ہیں اس لئے وُہ بعض دوسری پیچیدہ راہیں اختیار کرتے ہیں۔

کبھی کبھی وُہ ایسی چیزوں کو افسانہ کا موضوع بنا لیتے ہیں جن میں وقتی کشش ہوتی ہے اور یہ وقتی کشش پڑھنے والوں کو اپنی طرف مائل کرکے افسانہ نگار کے لئے ایک وقتی سرور کا سامان مہیّا کردیتی ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کشش اور سرور دونوں کو ثبات نہیں۔ اس لئے کہ افسانہ نگار نے جس خیال کو اپنے افسانہ کا موضوع بنایا ہے اُس میں کوئی مُستقل قدر نہیں۔ اور مُستقل قدر کی کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موضوع میں وقتی ہنگامہ کا سامان ضرور پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن اُس میں تاثیر کی پختگی نام کو نہیں ہوتی۔ ایسے موضوع کی مثال میں وُہ افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں جنس کی سطحی جذباتیت اور اُن کے مادّی نتائج کی تصویریں ہوتی ہیں یا جو افسانے کسی ایک فرقے یا گروہ کی خوشنودی کے لئے کسی دوسرے فرقے یا گروہ کی زندگی کو ملامت یا جذباتی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک دوسری چیز جسے بعض افسانہ نگار جدّت پسندی کے دھوکے میں برتنے لگتے ہیں۔ یہ ہے کہ وُہ اپنے افسانہ کی بنیاد ایسے خیال یا واقعہ پر رکھتے ہیں۔ جس میں اُن کے نزدیک کوئی جدّت ہے۔ جس موضوع سے وُہ خود اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اُن کا خیال ہے کہ دوسرے بھی اُس سے ناآشنا ہیں۔ اس موضوع کی اُونچ نیچ کو اچھی طرح جانے پہچانے بغیر وہ اس میں کود پڑتے ہیں اور اُس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو تیراکی سے اچھی طرح واقف نہ ہونے والے اس تیراک کے لئے جو اندھا دھند گہرے پانی میں کود پڑے۔ افسانہ نگار کا پہلا منصب یہ ہے کہ وُہ اپنے موضوع سے اچھی طرح واقف ہو اُسے اپنے مضمون اور موضوع سے سچی دلچسپی اور سچّا لگاؤ ہو۔ اُسے اِس نے اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھا اور سمجھا ہو۔ اِس کے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی بات جاننے کی کوشش کی ہو۔ جب تک یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ افسانہ نگار کو موضوع پر پوری قدرت نہیں ہوسکتی۔ جسے موضوع پر قدرت نہیں وُہ اس موضوع کو پھیلا کر اچھا افسانہ بنا ہی نہیں سکتا۔ جس نے گھر سے نکل کر مناظر قدرت دیکھے ہی نہیں وُہ منظر نگاری کیا جانے۔ جس نے گوشہ نشینی کو زندگی بنالیا ہو۔ وُہ زندگی کی مصوّری کیسے کرے؟

نئے افسانہ نگار عموماً اس خطرہ کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ لالچ میں پڑ کر انہیں اچھے اور بُرے موضوع میں امتیاز باقی نہیں رہتا ۔ جو موضوع پہلی نظر میں اچھا لگے، ضروری نہیں کہ وہ اچھا ہی ہو ۔ اس لئے افسانہ نگار کا فرض ہے کہ ظاہری حسن و خوبی سے متاثر ہوئے بغیر موضوع کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور اس بات کا یقین کرے کہ ظاہر میں خوبصورت دکھائی دینے والی چیز اندر سے بھی خوبصورت ہے ـــــ اس میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہے ۔ یہ چیز دشوار ضرور ہے، اور صرف تجربہ ہی اس سلسلہ میں سب سے بڑا معلّم ہے ۔ لیکن بیدار ذہن رکھنے والا نیا افسانہ نگار بھی اس مہلک مرض سے آسانی سے بچ سکتا ہے ۔

افسانہ نگار کو اپنی آنکھیں کھُلی رکھنی پڑتی ہیں ۔ اُسے اِن ظاہری آنکھوں کے ساتھ ساتھ دِل اور دماغ کی آنکھوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے ـــــ چیزوں کی بیرونی سطح سے زیادہ اُن کی گہرائیوں کا رازداں ہونا ضروری ہے ۔ اس کے بغیر اچھی افسانہ نگاری ممکن نہیں ۔ ایک شخص کے ذہن میں کوئی موضوع آتا ہے وہ اس موضوع کو کہانی کا لباس پہنا کر ہمارے سامنے لانا چاہتا ہے ۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے شائد ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ بات ہے اور اس بات کو کہنے کی خواہش بھی اُس کے دِل میں موجود ہے تو اُسے یہ بات کہنی چاہیئے ۔ کہنے والے کے پاس موضوع ہے کہانی کہنے یا لکھنے کی خواہش ہے، اُسے کہانی کہنی چاہیئے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کہانی کہنا اتنی آسان بات ہے ۔ کیا کہنے کی ضرورت کا احساس ہی کہانی کے کہنے کی کافی وجہ ہے ؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا جواب اثبات میں دیا جائے گا ۔ لیکن عملی نقطۂ نظر، جسے فنی نقطۂ نظر بھی کہہ سکتے ہیں، اس سوال کے جواب میں آسانی سے "ہاں" نہیں کہے گا ۔ اور عمل اور فن کے پاس "نہیں" کہنے کی معقول وجہ ہے ۔

اچھی کہانی کہنا فن ہے ۔ بُری کہانی کہنے سے اُس کا نہ کہنا کہیں بہتر ہے اور اچھی کہانی کہنے کے لئے، کہنے والے کو اُس کا فن سیکھنا چاہیئے ۔ فن سیکھنے اور اُس میں مہارت پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنے ذہن کی تربیت کرنی پڑتی ہے ۔ ذہن میں ضروری سامان اور مسالہ جمع کرنا پڑتا ہے ۔ جب تک ذہن میں مسالہ نہ ہو اور جب تک ذہن میں مسالہ جمع کرنے کی خواہش نہ ہو، فنی مہارت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ آنکھیں زندگی کے بے پایاں مواد میں سے اپنے کام کی باتیں جمع کرنے کی عادی ہو جائیں اور ذہن آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کو صحیح جگہ رکھ کر اُن سے وقتاً فوقتاً کام لے سکے کامیاب افسانہ نگار کی فنی مہارت کے یہ دو پہلے زینے ہیں اور ان دو زینوں کو طے کر لینے سے پہلے افسانہ نگار کو خاصا زادِ راہ جمع کرنا پڑتا ہے ۔ اس زادِ راہ کے جمع کرنے میں کئی چیزیں افسانہ نگار کو مدد دیتی ہیں ۔

افسانہ نگار کو سب سے قیمتی اور قابلِ قدر خزانہ مشاہدہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے ۔ آنکھ برابر کھُلی رہے تو زندگی میں تخیّل اور فکر کے لئے دولت کی کمی نہیں ۔ جس فن کار کی نظر ہمیشہ اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو غور سے دیکھتی اور اپنے تجربے کی دولت کو بڑھاتی رہتی ہے ۔ اُس کے تخیّل میں کبھی کہنگی اور فرسودگی پیدا نہیں ہوتی ۔ اور جس فنکار کے پاس ہر وقت دیکھنے والی نظر نہیں اُس کا تخیّل ایک نہ ایک دن ایسا تھکتا ہے کہ تازیانوں کی چوٹ سے بھی اُسے آگے چلانا ممکن نہیں ۔ اس لئے ادب میں مشاہدہ کی عادت کو ادیب کی زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے ۔ مشاہدہ جبر آزما ہوتا ہے ۔ اس سے تھکن پیدا ہوتی ہے لیکن جس افسانہ نگار نے اپنے ضبط و تحمل کو کام میں لا کر، تھکن سے ڈرے بغیر اس عادت کو اپنا رفیق بنا لیا اُسے زندگی بھر تھکن نہیں ستاتی ۔ ادب میں تھکن مواد کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ کے عادی ادیب اور افسانہ نگار کو مواد کی کمی کی شکائت نہیں پیدا ہوتی ۔

کسی نقاد نے لکھا ہے ادبی تخلیق اصل میں واقعات کے انتخاب کے بجائے اُنہیں رد کرنے کا دوسرا نام ہے ۔ جب تک ادیب کے پاس تجربات کا اتنا وافر سرمایہ نہ ہوگا کہ وہ اس سرمایہ میں سے اپنے کام کی چیزیں چُن سکے اُس کے لئے کوئی اچھی ادبی تخلیق ممکن نہیں ۔ مشاہدہ کے عادی افسانہ نگار کے سامنے تجربات کا یہ وافر سرمایہ ہر وقت موجود رہتا ہے ۔ اور اس وافر سرمایہ میں سے وہ اپنی پسند کے قیمتی جواہر چُن کر انہیں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ مشاہدات کا یہ وافر اور کبھی نہ ختم ہونے والا

خزانہ اکٹھا کرنے کے لئے افسانہ نگار کو شروع شروع میں بڑی کاوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ اُس پر یہ چیز بار گزرتی ہے اور اس عادت کو اپنے لئے بوجھ سمجھ کر اُسے اپنے کندھے سے پھینک دینا چاہتا ہے۔ لیکن اچھے افسانہ نگار کو آزمائش کے اس دور سے جبر اور ضبط کے ساتھ گذرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ واقعات، مناظر اور زندگی کی دیکھی ہوئی ان گنت چیزوں سے نقوش بنانے کی عادت اُس کی فطرت کا ایک جزو لاینفک بن جائے اور نظر میں کیمرہ کی تاثیر پیدا ہو جائے۔ کہ جو کچھ اُس کے سامنے آئے اُس کی تصویر ذہن میں اُتار لے۔ زندگی کی کوئی بات دوسری بات سے نہیں ملتی کوئی منظر کبھی دوسرے منظر جیسا نہیں ہوتا اور ایک انسان کبھی اپنی عادتوں میں اپنے طور طریقوں میں دوسرے سے مشابہ نہیں۔ اس لئے نظر کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جو اُس نے آج دیکھا ہے وہ اُس کے لئے کل دیکھنا ممکن نہیں۔ اور اسی لئے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہ ہونے دے۔ جو وقت ضائع ہو گیا وہ واپس نہیں آتا اور اس میں گذری ہوئی چیز کو نظر دوبارہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے کیوں نہ افسانہ نگار اپنے ہر لمحہ سے فائدہ اٹھائے کیوں نہ ہر نئے وقت میں ایک نیا منظر، ایک نیا واقعہ یا زندگی کا ایک نیا بھید دیکھ کر اپنی نگاہ بیدار کو اور بھی بیدار بنائے؟ مشاہدہ افسانہ نگار کا رفیق کار ہے تو نئے سے نئے موضوع ہمیشہ اُس کے حلقہ بگوش غلام رہتے ہیں۔

نظر کا کام مشاہدہ کرنا ہے اور مشاہدہ افسانہ نگار کی ذہنی اور جذباتی تعمیر کا ایک قیمتی جزو ہے لیکن اکثر سب کچھ دیکھ کر ہی نہیں جانا جاتا۔ صرف دیکھ کر باتیں سیکھی جا سکیں تو زندگی سے دور رہنے والے خانہ بدوش انسان شائد دنیا کے سب سے زیادہ تجربہ کار انسان ہوں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ زندگی کے تجربہ کی مثال بھی معمل کے تجربوں کی سی ہے جہاں سائنس داں چیزوں کے مرکب بنا کر دنوں، ہفتوں مہینوں اور برسوں کی کاوش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ زندگی کے تجربے بھی گھر بیٹھے نہیں حاصل ہوتے۔ انسان کو زندگی کے ساتھ ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا پڑتا ہے، زندگی کی ٹھوکریں کھانی پڑتی پڑتی ہیں۔ ٹکریں سہنی پڑتی ہیں۔ بُرے اور بھلے انجام دیکھنے پڑتے ہیں، بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ جب کہیں تجربہ اپنا بنتا ہے۔ تجربے جان بوجھ کر، کوشش کر کے اور ارادتاً حاصل کئے جاتے ہیں۔ تجربے وہ بھی ہوتے ہیں جن میں زندگی ہمیں کھینچ کر لے جاتی ہے۔ اس کی موجوں کے تھپیڑے کھلاتی ہے، اور ہم ایک نیا سبق سیکھ کر ایک مضبوط ارادے کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ زندگی میں تجربے نہ ہوں تو کچھ نہیں۔ یہ بات سب کے لئے صحیح ہے، لیکن اتنی صحیح کسی کے لئے بھی نہیں جتنی افسانہ نگار کے لئے۔ افسانہ نگار نے تجربے نہیں کئے تو گویا اُس نے اپنی افسانہ نگاری کی زینت کا بہت سا سامان خود اپنے آپ کھو دیا۔ جو کچھ وہ حاصل کر سکتا تھا، اُسے حاصل نہیں کیا۔ اور جو حاصل ہو سکے اُسے حاصل نہ کرنا زندگی کی بہت بڑی بھول ہے۔ اُن کے لئے اور بھی بڑی جن کا منصب دُنیا کو کچھ دینا ہے۔ جنہیں دُنیا کو کہانیاں سنانی ہیں۔ اور ان کہانیوں سے سننے والوں کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لینا ہے۔ افسانہ نگار کا پہلا اسلحہ مشاہدہ ہے اور دوسرا اس کا تجربہ۔ ان اسلحوں کے بغیر وہ نہتا سپاہی ہے۔

تجربہ کو افسانہ میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ مارک ٹوین کے ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ جرمنی کی ریل کے انتظام کا اندازہ لگانے کیلئے مارک ٹوین نے ۱۵ مرتبہ ٹکٹ خریدا۔ اور پھینک پھینک دیا۔ لیکن ہر مرتبہ اُسے نیا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ اس تجربہ کی بنا پر اُس نے جو افسانہ لکھا اُس سے پانچسو ڈالر کمائے۔

زندگی کا ہر تجربہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار کو پانچسو ڈالر دلوا دے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر نئے تجربے سے اس کی دولت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے۔ جس کے بغیر ذہنی اور جذباتی تعمیر ممکن نہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ کے علاوہ ایک اور چیز جسے مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں افسانہ نگار کے لئے بے حد ضروری بتایا گیا ہے۔ ذاتی مطالعہ اور محاسبہ ہے۔ افسانہ نگار کو چاہئے کہ وہ برابر اپنے آپ سے اپنی ذات کے متعلق سوالات کرتا رہے۔ ہر انسان ایک سربستہ راز ہے۔ اور رازوں کا کھولنا افسانہ نگاری کی دلچسپی کا ایک اہم جزو۔ پھر کیوں انسان سب سے پہلے اُسی بھید کا پتہ نہ چلائے جو اس سے سب سے زیادہ

قریب ہے۔ اپنے جذبات احساسات، اور شعور کی تہوں کو ٹٹولنا۔ اپنے ہر عمل اور ہر ارادے کے پیچھے کسی نفسیاتی تحریک کی جستجو، اپنی کہی ہوئی ہر بات میں اپنی اندرونی اخلاقی زندگی کا کوئی عکس دیکھنے کی کوشش، افسانہ نگار کے لئے بیسیوں ایک سے زیادہ ایک گہرے موضوع پیدا کر سکتی ہے۔ خود اپنی ہی زندگی میں بہت سی کہانیوں کا مواد چھپا ہوا ہے۔ افسانہ نگار کو اس مواد سے کام لینے کی عادت پیدا کرنی چاہیئے۔ یہ عادت جب پختہ ہو جائے گی تو افسانہ نگار اسے پھیلا کر آسانی سے دوسری ذاتوں کے مطالعہ اور محاسبہ تک لے جاتا ہے اور اپنی تجرباتی دنیا میں ہر وقت ایک نئے راز اور بھید کا اضافہ کر سکتا ہے۔ اس طریقہ میں یہ خطرہ ضرور ہے کہ افسانہ نگار پر خود اس کی اپنی ذات اس طرح چھا جاتی ہے کہ اُس کے لئے اپنے آپ کو اِس سے باہر نکالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر افسانہ نگار شروع ہی سے اس خطرہ سے آگاہ ہو اور اپنی ذات کے مطالعہ کو دوسروں کی ذات کے مطالعہ کی پہلی منزل سمجھ کر اس کام کو شروع کرے تو اس کے تجربات کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیگی۔ تجربوں کی خاصی بڑی دنیا کتابوں میں بند ہے اس لحاظ سے نہیں کہ افسانہ نگار جو کچھ کتاب میں پڑھے اُسے نقل کر کے یا بعض صورتوں میں مسخ کر کے اپنے افسانے کا موضوع بنائے مطالعہ افسانہ نگار کے لئے ایک بیحد ضروری عمل ہے لیکن یہ ضروری عمل اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے۔ کہ پڑھنے والا اس کے خطروں اور اس کی پیدا کی ہوئی للچاہٹوں سے بچ کر اس سے وہی اخذ کرے جو اُس کے کام کو زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے میں مدد دے۔ مطالعہ جیسا میں نے ابھی کہا تھا۔ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ دوسروں کے اُگلے ہوئے نوالوں کو اپنے دسترخوان پر سجا کر دعوت کا سامان جمع کر لیں، مطالعہ پڑھنے والے کے لئے ایک زبردست ذہنی تحریک کا کام دیتا ہے، اچھے مطالعہ سے پڑھنے والے کے ذہن میں جو تازگی، توانائی اور ایک نئی بات کہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی اور چیز سے پیدا نہیں ہوتی۔ اچھا مطالعہ، ذہن میں تخلیق کی قوتوں کو ابھارتا اور اکساتا ہے اور اُنہیں کہنگی اور فرسودگی سے بچاتا ہے۔ اس لئے ہر افسانہ نگار کو جہاں ایک طرف مشاہدہ اور ذاتی محاسبہ سے کام لینا ہے وہاں اُسے زندگی بھر پڑھنا بھی ہے۔ دنیا میں اُس سے اچھے لکھنے والے ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کو اس سے مختلف انداز میں دیکھا ہے۔ اور اس نئے انداز کی جھلک ان کی تصنیفوں میں موجود ہے۔ یہ تصنیفیں بھی افسانہ نگار کے تجربات میں گہرائی اور پھیلاؤ پیدا کرتی ہیں۔

افسانہ نگار بہت کچھ دیکھتا ہے، زندگی سے بہت سے نئے سے نئے تجربے حاصل کرتا ہے۔ ذاتی محاسبہ سے اس پر فطرتِ انسانی کے چھُپے ہوئے بھید آشکارا ہوتے ہیں اور وہ ان دیکھی اور سیکھی ہوئی چیزوں کو اپنے ذہن میں جمع کرتا رہتا ہے۔ تجربات برابر اُس کی ذہنی اخلاقی اور جذباتی زندگی کا جزو بنتے رہتے ہیں، اُسے برابر پہلے سے زیادہ رنگین بناتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سارے تجربے اُس کے ذہن میں جا کر اس طرح ایک دوسرے سے گھُل مِل جائیں کہ ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں پہچاننا اور ضرورت کے وقت سامنے لانا ممکن نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ افسانہ نگار کی ساری محنت رائگاں گئی۔ جو کچھ اُس نے اتنی کاوش اور جانفشانی کے بعد حاصل کیا تھا۔ وہ اگر ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند ہے اور اس اندھیری کوٹھڑی کی کنجی اُس کے پاس نہیں تو یہ سارا مال متاع اُس کے کسی کام کا نہیں۔ اس لئے افسانہ نگار مشاہدہ سے، زندگی کے ساتھ چل پھر کر تجربہ سے، ذاتی محاسبہ سے، مطالعہ سے جو کچھ سیکھے اُسے چاہیئے کہ کبھی کبھی اس کا جائزہ لیتا رہے۔ پچھلے واقعات اور تجربات کو دبی ہوئی نچلی تہوں سے باہر نکال کر انہیں کبھی کبھی دھوپ بھی دیتا رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ سارے قیمتی تجربے کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو جائیں اور افسانہ نگار خالی ہاتھ رہ جائے۔ گذرے ہوئے واقعات اور تجربات کی تصویریں بنا کر انہیں اپنی ذہنی زندگی میں زندہ اور تر و تازہ رکھنا افسانہ نگار کا ایک اہم فرض ہے اور یہ اہم کام اُسے اپنی قوتِ تخیل سے لینا ہے۔ ہر تخیل کو استعمال میں نہ لایا جائے اُسے استعمال کر کے کبھی کبھی اُس پر دھار نہ لگائی جائے تو وہ کند اور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے اور کند اور ناکارہ تخیل افسانہ نگار کی زندگی کا ایک سانحہ ہے جس کا ماتم اُسے جیتے جی کرنا پڑتا ہے ـــ افسانہ نگار کو اگر اس ماتم سے بچنا ہے تو اُسے چاہیئے کہ اس دولتِ ابدی کو برابر استعمال کر کے زندہ رکھے۔ تخیل کا استعمال ہی اُس کی حیاتِ ابدی کا سب سے بڑا ممد ہے۔ افسانہ نگار کا تخیل زندہ ہو تو اُس کے پاس موضوعوں کی کمی نہیں۔ مواد کی فراہمی کے

سلسلہ میں افسانہ نگار کو جو کچھ کرنا چاہیئے وہ اتنا زیادہ ہے کہ شاید غلط معلوم ہوتا ہو لیکن ایسا نہیں۔ اچھے افسانہ نگار کو خود اپنی ذات سے اور اُن سب سے جن کی رائے پر اُسے اعتماد ہے برابر کام لینا پڑتا ہے۔ خود وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ کڑوے اور میٹھے تجربے حاصل کرتا ہے، تخیل سے کام لیتا ہے، اُسے تازیانے لگاتا ہے، مطالعہ کرتا ہے اور اِس طرح اپنے افسانوں کے لئے مواد مہیّا کرتا ہے۔ اور اس مواد کی بنیاد پر اپنے افسانوں کی عمارت کھڑی کرتا ہے لیکن افسانہ میں جو کچھ ہے وہ خود اُسی کا سوچا ہوا ہے۔ اپنی سوچی ہوئی باتوں میں انسان کو خامی نظر نہیں آتی۔ اس لئے افسانہ نگار کو چاہیئے کہ وہ کوئی افسانہ چھپوانے سے پہلے اُسے اپنے دوستوں کو سنائے۔ اور اس کے ہر پہلو پر بحث مباحثے اور ردّ و قدح کے بعد اُس میں تبدیلیاں کرنے پر آمادہ ہو۔ اپنی غلطیوں کو مان لینا، اُن میں ترمیمیں اور تبدیلیاں کرنا، اور اپنی چیزوں کو اچھا بنانے کے لئے اُن میں کاٹ چھانٹ کرنا بھی ایک اچھے افسانہ نگار کی سیرت کی ایک خصوصیت ہونی چاہیئے اس کے بغیر بھی ممکن ہے اچھا افسانہ لکھا جا سکے لیکن بحث مباحثہ کے بعد اُس کے اور زیادہ بہتر ہو جانے کے امکانات ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک آخری چیز اور افسانہ نگار کو افسانہ لکھنے سے پہلے، اور افسانہ لکھنا شروع کر دینے کے بعد اپنی مشق کے ابتدائی دور میں اور خاصی مشق بہم پہنچا لینے پر، زندگی بھر ہوشیار، چوکنّا اور بیدار رہنا پڑتا ہے۔ اُسے اپنے پتّے کو مارنا پڑتا ہے جھوٹی لالچ سے بچنا پڑتا ہے اچھے اور بُرے کی تمیز کرنی پڑتی ہے۔ چیزوں کو غور سے دیکھنا، کتابیں پڑھنا، زندگی میں گھل مِل کر اُس سے نت نئے سبق حاصل کرنا، اپنی ذات کی تنقید، اس سے دوسروں کی زندگی سے نتیجے اخذ کرنے کی قوّت۔ فکر و تخیل، بحث مباحثہ، اپنی کاوش اور محنت کی پیدا کی ہوئی ادبی تخلیق پر نکتہ چینی کو برداشت کرنے کی عادت، غرض افسانہ نگار کو ساری زندگی مصروف رہنا پڑتا ہے۔ ہر نیا قدم اُسے ایک نئی بات سکھاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر نئی بات اُسے زبانی یاد رہے اس لئے افسانہ نگار کو زندگی بھر اپنے تجربات کے نوٹ لینے پڑتے ہیں۔ انہیں یادداشت میں محفوظ رکھنا پڑتا ہے اور اس طرح اُس کی ساری زندگی صبر، آزمائش، ضبط، تحمّل اور کاوشوں میں بسر ہوتی ہے اور یہ ساری کاوشیں آزمائشیں، صبر اور تحمّل اس لئے ضروری ہے کہ افسانہ نگار کو ایک اہم کام انجام دینا ہے اُسے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرنی ہے، دنیا وہی ہے جس میں ہم آپ رہتے ہیں۔ جسے ہم آپ دیکھتے ہیں، لیکن افسانہ نگار اپنے لچکدار، زرخیز تخیل سے اِسی چھوٹی سی معمولی بات کو رنگین بنا دیتا ہے اور ہماری دیکھی ہوئی دُنیا بالکل نئی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس پُرانی دُنیا کو نیا بنانے کے لئے اُس کی فرسودگی میں کوئی تازگی پیدا کرنے کے لئے وہ تجربات کے سمندر میں غوطے لگاتا ہے اس کی تہ میں سے دائیں، بائیں ہر طرف ہاتھ پھیلا کر چھوٹی اور بڑی بہت سی چیزیں چُنتا ہے۔ ان چنی ہوئی چیزوں میں سے اُس کی نظرِ انتخاب کچھ جواہر ریزے نکال لیتی ہے اور اُن جواہر ریزوں کو اُس کا توانا تخیل زندگی کی نئی آب و تاب دے کر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اور اِس طرح وہی زندگی جو ہماری دیکھی بھالی ہے، جسے ہم نے برابر برتا ہے، بالکل نئی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اِس نئی دُنیا میں افسانہ نگار کے تخیل، اُس کے جذبات اور اُس کے زندگی بھر کے تجربات نے کچھ ایسے رنگ ملا دیئے ہیں جو زندگی میں اس سے پہلے بکھرے ہوئے تھے۔ اور اب قوسِ قزح کی رنگینی لے کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔

لیکن قوسِ قزح کی یہ رنگینیاں یوں نہیں پیدا ہو جاتیں۔ ان کے لئے "جوئے شیر" لانی پڑتی ہے۔

اثر لکھنوی

ایک خط کا بازیافتہ مسودہ

رائے بریلی

۲۷ جولائی ۳۱ء

مخزمی جناب ایڈیٹر صاحب ——— تسلیم

میرا خیال ہے کہ ۲۳ جولائی ۳۱ء کے ضمیمہ اخبار ——— میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی غزل پر جو تنقید شائع ہوئی ہے۔ اُس میں انصاف اور اعتدال سے کام نہیں لیا گیا نہ اُن کے اشعار کا مطلب سمجھنے میں دماغ سوزی کی گئی۔ امیدوار ہوں کہ مندرجہ ذیل سطور کو اپنے مقتدر اخبار کی آئندہ اشاعت میں جگہ دیجیے۔

خاکسار اثر

ڈاکٹر اقبال کا مطلع ؎　نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی　　اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اعتراض: شعر میں نالے کی خامی کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ نالے کو سینے کی دیگچی میں پکانا لطف سے خالی اور معنویت سے دور ہے۔

جواب: بلبل کا متواتر نالہ کش ہونا ہی خامیٔ نالہ کا ثبوت ہے جس پر لفظ ابھی دلالت کرتا ہے۔ بقول میر علیہ الرحمۃ ؎

۱؎　دیتی ہے طول بلبل کیوں شورشِ فغاں کو　　اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو

جب نالے کا ظرف سینہ ہے اور نالہ خام ہے پھر اس کی پختگی سینے میں نہ ہوگی تو کہاں ہوگی؟ ضبطِ نالہ کا منشا یہ ہے کہ دل گداختہ اور جگر کباب ہو، اس کے بعد عالمِ اضطراب و اضطرار میں نالہ اگر تا لب آیا تو اثر میں ڈوبا ہوگا۔ یہی تاثیر نالے کی پختگی ہے ورنہ سینہ دیگچی اور نالہ شب دیگ نہیں ہے۔

۲؎　پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اس شعر پر کوئی اعتراض نہ ہو سکا تو یہی کہہ دیا کہ مابعد کے شعر سے ملایا جائے تو برے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ فی الحال صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مابعد کے چار شعر اُسی کلیہ کی شرح ہیں جو اس شعر میں قائم کیا گیا ہے یعنی مصلحت اندیش ہونا عقل کے لیے ممدوح اور عشق کے لیے معیوب ہے۔

۳؎　بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اعتراض: عشق تو نہ گویا اس کی عادت کودنے کی ہے، اگر وہ کودتا بھی ہے تو کانوں، سینہ یا داغ کی مجمر میں۔ ابراہیم خلیل اللہ بھی خود کودے نہ تھے بلکہ زبردستی دھکیلے گئے تھے .... لبِ بام کیا تماشا ہو رہا تھا جس کے دیکھنے میں عقل محو تھی اور یہ عقل .... تھی کہاں، عشق کے ساتھ ساتھ کودنے کو آئی تھی، ہمت نہ پڑی، رہ گئی، یا لبِ بام نٹ کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

جواب: یہ ارشاد ہی غلط ہے کہ عشق کی عادت کودنے کی نہیں ہے، پروانہ سراپا عشق ہے اور شمع کی آگ میں کود پڑتا ہے۔ جیسا خود معترض کی عبارت سے بھی مترشح ہوتا ہے، عشق سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔ شاعری کی دنیا معمولی تاریخی یا مذہبی دنیا سے الگ ہے ..

۱؎ اسنند عاید برائی سے محروم رہی۔ نہ تو مضمون شائع ہوا نہ واپس کیا گیا۔ پرانے کاغذات میں مسودہ مل گیا وہی صاف کر کے مجی حضرت احمد ندیم قاسمی کی طلب مضمون کی تعمیل میں حاضر کر دیا۔ کوئی تازہ مقالہ تعجیل میں قلمبند کرنا ممکن نہ ہوا۔　　اثر

ماناکہ حضرت ابراہیم خود آگ میں نہیں کودے بلکہ منجنیق سے پھینکے
گئے مگر راہ دوست میں قدم رکھنا اور راضی برضا ہوکر مصائب و آفات کا استقلال سے مقابلہ کرنا آگ میں پھاندنا نہیں ہے تو کیا ہے حضرت ابراہیم
فاعل مختار تھے اگر چاہتے تو امتحان سے کنارہ کش ہو جاتے مگر نہیں، اُنکے سینے میں جذبہ عشق الٰہی جوش زن تھا۔ وہ سرتاپا عشق و سپردگی عشق تھے
شوق نے گویا پر لگا دیئے اور اڑتے ہوئے دھکتی آگ تک پہنچے

شعر کا حاصل یہ ہے کہ عقل دماغ سے کام لیتی ہے اور عشق دل کا تابع ہے۔ عقل ہر فعل کے انجام پر نظر رکھتی ہے اور خطروں سے بچنا چاہتی ہے، عشق اپنے
ولولوں کا پیرو ہے، عقل بھٹکتی پھرتی اور منزل مقصود سے دور رہتی ہے، عشق ایک جرأت رندانہ یا لغزش مستانہ میں اپنے مشن کی تکمیل کرتا ہے۔ عقل ہر شے
کے ظاہر کو دیکھتی ہے (یہی تماشائے لب بام ہے) عشق کا مطمح نظر باطن ہوتا ہے۔ جہاں عقل آگ دیکھتی ہے عشق کو گلزار نظر آتا ہے

ان شعروں میں عقل اور عشق کا تقابل ہے۔ توافق زمان و مکاں لازم نہیں، خدا معلوم حضرت معترض عقل
کو "مقام ابراہیم" میں کیوں لے گئے خصوصاً جب عشق کے ساتھ زمانہ ماضی اور عقل کے ساتھ زمانہ حال استعمال ہوا ہے۔

؎ عشق فرمودۂ عاشق سے سبک گام خرام　　عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

اعتراض:۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا صاحب عاشق نے حکم دیا عشق چلنا پھرتا نظر آیا مگر عقل کو کس نے پیغام دیا تھا کیوں ایسا مغلق پیغام دیا تھا جس
کے معنی کی الجھی میں گتھیاں پڑیں اور پھر سلجھائے نہ سلجھیں۔ یا یہ عقل ہی ایسی بے وقوف تھی جس کی سمجھ میں معمولی پیغام کے معنی نہ آئے دوسرے یہ کہ
خرامیٔ عشق کو عقل کے پیغام نہ سمجھنے سے علاقہ ہی کیا ہے

جواب:۔ اس شعر میں بھی عقل اور عشق کا تقابل اور واقعہ ابراہیمؑ کی مزید وضاحت ہے۔ ایک ہی پیغام ہے جو عقل اور عشق دونوں تک پہنچتا ہے عقل
میں پیغام کا سطحی مطلب سمجھنے کی صلاحیت زیادہ ہے مگر یہی صلاحیت غور و فکر کی موید ہوکر قاطع عمل یا تعمیل میں تاخیر کا موجب ہوتی ہے۔ عشق
نے پیغام سنا نہیں کہ بقول آتش علیہ الرحمۃ

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی　　ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

عقل پیغام کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہ گئی، عشق ایک جنبش میں شاہد مقصود سے ہمکنار ہو گیا۔ عقل اب تک حیران ہے کہ آگ میں کودنا، جان کو ہلاکت
میں ڈالنا کیا معنی۔

خدا جانے حضرت معترض نے پیغام کو معمولی کس بنا پر سمجھ لیا حالانکہ پیغام ایسا اہم اور اس نہج کا ہے کہ عقل اس کے الفاظ تو سمجھتی ہے مگر
اس کی غرض و غایت تک رسائی نہیں ہوتی، پیغام یہ تھا کہ آگ میں کود پڑ، عقل یہی سمجھی اور قرین مصلحت نہ جانا، عشق "بسم اللہ مجریہا و مرسیہا"
کہکر کود پڑا اور آگ کو اس قدر خنک پایا کہ دانت بجنے لگے۔ ظاہری پیغام تو یہی تھا کہ آگ میں کود پڑ، مگر اس میں یہ معنی مضمر تھے کہ تمہاری
استواریٔ ایمان کا امتحان منظور ہے کیا طیار ہو؟ عشق نے لبیک کہی، عقل سوچتی رہ گئی۔

؎ شیوۂ عشق ہے آزادی و دیر آشوبی　　تو ہے ہندوئے صنم خانۂ ایام ابھی

اعتراض:۔ دیر آشوبی کس جانور کا نام ہے؟ "تو" تکرار کا مخاطب کون ہے؟ ایام کا صنم خانہ یعنی چہ؟

جواب:۔ اگر شاعر نے دراصل دیر آشوبی کہا ہے تو میں بھی مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں، میرا گمان ہے کہ یہ فقرہ دیر آشوبی نہیں بلکہ دہر (د۔ ہ۔ ر)
آشوبی ہے جس کے معنی ہوتے عالم میں ہنگامہ برپا کرنا۔ "تو" کا مخاطب وہی ہے جو "ہندوئے صنم خانۂ ایام" ہے
ایام (روزگار) کو صنم خانہ کہنے سے نیرنگیٔ زمانہ اور اس کے انقلابات و تغیرات کی طرف نہایت خوبی سے اشارہ ہوا، صنم خانہ کے اعتبار سے
[illegible] کے معتقد یا پرستار یا پیرو کو ہندوئے صنم خانۂ ایام کہنا کس قدر پر لطف ہے۔ ایسی دلپذیر اور معنی خیز ترکیبوں پر شاعر کا مضحکہ اڑانا میرے

نزدیک بدعت سے کم نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہوا کہ عشق کا شیوہ آزادی (ترکِ رسوم و قیود، توہمات کی بیخ کنی) اور وہ مرآشوبی یعنی انقلاب انگیزی ہے مگر عقل کے مرید زمانے کا رنگ اور ہوا کا رُخ دیکھتے اور اُس کے مطابق کاربند ہوتے ہیں۔ عشق نئی نئی راہیں نکالتا، دار و رسن کو جلوہ دیتا اور ایک ہنگامہ برپا کر دیتا ہے مگر عقل اپنے کہنہ و فرسودہ و پامال جادوں پر گامزن ہے ان میں سلامتی و سلامت روی تو ہے مگر عشق کے مست کرنے والے خطرے کہاں۔

سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات		تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

اعتراض: سعیٔ پیہم معلوم نہیں کس کی ترازو ئے کم و کیفِ حیات ہے، کیوں جناب، یہ ترازو سعیٔ پیہم کے ایک ہی پلّہ سے بنی ہے یا اس کا دوسرا پلّڑا بھی ہے اور اس سعیٔ پیہم کی ترازو میں کمیت و کیفیت کن باٹوں سے تولی جاتی ہے، تیری میزان یعنی آپ کے مخاطب مردود کی میزان کیا ہے۔ شمار سحر و شام، زمان حیات یعنی کمیت و حیات تو اسی سحر و شام کی ترازو سے معلوم ہوتی ہے لہٰذا سعیٔ پیہم کی ترازو اور "تری" کی میزان کا فعل ایک ہی ہوا۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ سعیٔ پیہم ڈنڈی ترازو ئے کم و کیف، حیات کی لئے ہوئے اکیلا ہیں، "وہ" اہیں "وہ" اکڑ رہی ہے اور "تیری صاحب" انگلیوں پر یا دل میں سحر و شام کا شمار کر رہی ہیں۔ مگر میزان تو آلۂ وزن ہے نہ کہ آلۂ شمار۔

جواب: حضرت معترض "نہ بازاری" اصطلاحات کے زبردست ماہر معلوم ہوتے ہیں اور مجھے شعر سے زیادہ اعتراض کی نوعیت ذہن نشین کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ شاعر نے "کم و کیفِ حیات" (حیات کی بوقلمونی و چگونگی) کو ایک جنس قرار دیا ہے۔ جس کے تولنے کی ترازو (قدر مقرر کرنے کا آلہ) سعیٔ پیہم ہے نہ کہ روز و شب، یا ماہ و سال۔ اتنا سمجھنے کے بعد تمام اعتراضات جو شعر نہ سمجھنے پر مبنی ہیں (مع جگت سمیت)، کالعدم ہو جاتے ہیں اور ان کی تردید میں خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں رہتی۔

شعر کا حاصل یہ ہوا کہ حیاتِ انسانی کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس کی سرگرمیٔ عمل سے لگانا چاہیئے نہ کہ امتدادِ زمانہ یا مرورِ ایام سے۔ ایک شخص ہزار برس جیا مگر کوئی کام مفید خلائق نہیں کیا تو مردے سے بدتر ہے۔ دوسرا شخص عین عنفوانِ شباب میں کوئی کارِ نمایاں کر کے مر گیا تو زندۂ جاوید ہے میں نے محض مفہوم واضح کرنے کو یہ مثال دی ورنہ یہ بھی ضرور نہیں کہ کامیابی سزاوارِ تحسین اور ناکامی درخورِ ملامت ہو، سعیٔ پیہم چاہیئے، کامیابی یا ناکامی سے کوئی غرض نہیں، زندگی کے طول یا اختصار، مفید یا رائیگاں ہونے کی ترازو یا میزان یہی سعیٔ پیہم ہے نہ کہ شمارِ مہ و سال ہے ؎

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے		عمر یونہی تمام ہوتی ہے"

ڈاکٹر اقبال اس کو زندگی نہیں سمجھتے بلکہ سرگرمیٔ عمل کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ یہی سرگرمیٔ عمل منشائے حیات ہے۔

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی		تیرے دل میں ہے ابھی کاوشِ انجام ابھی

اس شعر پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ یہ شکایت ہے کہ نظم کو قطعہ سمجھیں یا غزل سمجھیں؟
میری التماس ہے کہ اگر غزل کا دائرہ "سخن نرم با زناں گفتن" تک محدود نہیں ہے تو یہ نظم بلاشک و شبہ غزل ہے۔ غزل میں قطعہ بند اشعار رکھنا میر کے زمانے سے آج تک رائج ہے۔ میں میر کی ایک غزل نقل کرتا ہوں جس میں صرف ایک شعر اور مقطع الگ ہیں۔ باقی اشعار تین قطعات میں تقسیم ہیں۔

پہلا قطعہ

ہر جزو مد سے دستِ دبغل اٹھتے ہیں خروش		کس کا ہے راز، بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ابرے کہیں ہے موج، کوئی چشم ہے حباب		موتی ہے کسو کی بات ہے، سیپی ہے کسو کا گوش!

علیحدہ شعر

حیرت سے ہو دے پرتو مہ، نور آتش		تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش
(ہو کر)

دوسرا قطعہ

کل ہم نے سیرِ باغ میں دل ہاتھ سے دیا — اِک سادہ گلفروش کو پاکر سبد بدوش
جاتا رہا نگاہ سے جوں موسمِ بہار — آج اُس بغیر داغ جگر بر سیاہ پوش

تیسرا قطعہ

شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزور مَے — بیٹھے تھے شیرہ خانہ میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو — عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش
جمشید جس نے وضع کیا جام کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے نا و نوش
جز لالہ اُسکے جام سے پاتے نہیں نشاں — ہے کوکنار اُسکی جگہ اب سبو بدوش
جھومے ہے بید جائے جوانانِ میگسار — بالائے خم ہے خشت سرِ پیرِ میفروش

میرؔ اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیرؔ نے
پر اے زباں دراز بہت ہو چکی اَخموش

---

۸ ابرِ نیساں یہ تنک بخشیٔ شبنم کب تک — میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

اعتراض:۔ تنک بخشیٔ شبنم کیا چیز ہے؟ پھر ابرِ نیساں سے شبنم کا طلب کرنا بھی کیا خوب۔ اجی جناب جب ابر ہوتا ہے تو شبنم کہاں ہوتی ہے۔ ابر اور شبنم سے تو عداوت ہے۔ پھر ابرِ نیساں سے بجائے قطرہ ہائے آبِ نیساں اپنے کہسار کے لالوں کے خالی جام پُر کرنے کے لئے شبنم طلب کرنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ بات یہ ہے کہ تنک بخشیٔ شبنم کے معنی بوجہ بے علمی ہماری سمجھ میں نہ آئے ورنہ یہ معمہ حل ہو جاتا۔

جواب:۔ حضرت معترض پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں حیرت ہے کہ تنک بخشیٔ شبنم کے معنی نہیں سمجھتے۔ اس کے معنی ابرِ نیساں سے شبنم طلب کرنا نہیں ہیں بلکہ ابرِ نیساں سے گلہ ہے کہ شبنم کی طرح کم کم کیوں دیتا ہے۔ ٹوٹ کے برس۔

۹ جلوۂ گل کا ہے اک دام نمایاں بلبل — اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی

اعتراض:۔ رگِ گل کا دام تو اُلّو کی چڑیا ہو سکتا ہے مگر جلوۂ گل کا دام ہمیں نہیں معلوم کس کارخانے میں تیار ہوتا ہے اور بلبل کمبخت کیلئے تو گل ہی کا دام کافی ہے۔ ایک مرتبہ گرفتار ہونا تحصیل حاصل ہے سو دام ہوں تو کیا پروا۔

جواب:۔ خود حضرت معترض گل کو دام کا بدل تسلیم کرتے ہیں دبلبل کمبخت کے لئے تو گل ہی کا دام کافی ہے، مگر جلوۂ گل کی نسبت فرماتے ہیں کہ دام نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ لفظ جلوہ سے دام کا پھیلنا ظاہر ہوا، محض گل کی تشبیہ دام سے زیادہ قفس سے موزوں ہے۔ اُن کا فرمانا درست ہوتا کہ رگِ گل کو دام کہہ سکتے ہیں، گل کو نہیں کہہ سکتے اگر لفظ گل کے ساتھ لفظ جلوہ اور لفظ نمایاں کا اضافہ نہ ہوتا۔ دام رگِ گل نمایاں کب ہوتا ہے۔ بمصرعۂ ثانی سے واضح ہوا کہ جلوۂ گل کے دام نمایاں کے علاوہ گلستاں میں پنہاں دام بھی ہیں مثلاً ہم صفیروں کی سرد مہری، بغض و حسد و کینہ پروری، مکر و فریب، دغا زنگری اور سب سے زیادہ تلخ دوستی کے پردے میں دشمنی۔ مگر یہ توجیہہ اُس وقت پیدا ہو گی کہ بلبل سے روحِ انسانی جو دامِ عناصر میں اسیر ہے گلستاں سے یہ عالمِ نیرنگ، اور جلوۂ گل سے اِس دنیا کے دلفریب مناظر مراد لئے جائیں ورنہ حضرت معترض کی اُلّو کی پھبتی پھبا جائے گی جس کی داد چڑیمار دیں گے۔

۱۰ ہمنوا لذتِ آزادیٔ پرواز کجا — بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

اعتراض: نشیمن کی تشبیہ دام سے خوبصورت نہیں ہے۔ نشیمن بمنزلۂ قفس کہنا چاہیئے . . . . . . دام صرف قافیہ کی خاطر سے لایا گیا ہے

ایک ہی قافیہ کے تین چار شعر ایک جگہ لکھدینے سے لطف اور زیادہ ہو گیا ہے۔

جواب:۔ حضرت معترض نے غور نہیں کیا کہ اگر لفظ دام کی جگہ لفظ قفس ہوتا تو ردیف "ابھی" بیکار ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں یہ مطلب نکلا کہ ابھی تو نشیمن دام ہے (دام کا مرادف ہے) رفتہ رفتہ قفس ہو جائیگا۔ علاوہ بریں شاعر نے نشیمن کو دام سے تشبیہ نہیں دی ہے۔ بلکہ جیسا خود معترض نے در پردہ اعتراف کیا ہے بمنزلۂ دام کہا ہے (تھوڑی دیر کے لئے اُن کی عبارت "نشیمن بمنزلۂ قفس کہنا چاہیے" میں قفس کی جگہ دام پڑھئے۔ تو میرے معروضہ کی تصدیق ہو جائیگی) اگر کوئی کہے کہ مجھے خار بمنزلۂ گل ہے تو اس سے یہ مراد نہ ہوگی کہ خار و گل مشابہ ہیں بلکہ قائل کی حالت کا اندازہ ہو گا۔

ع خبر اقبالؔ کی لائی ہے گلستاں سے نسیم نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

اعتراض:۔ یعنی قفس یا پھٹکی کا استعمال ابھی صیاد نے نہیں کیا ہے نسیم جھوٹی ہے مردار۔ نہ کوئی نو گرفتار ہے، نہ پھڑکتا ہے، نہ دام کا وجود ہے نہ صیاد کا۔

جواب:۔ اس شعر کی تنقید پڑھکر بے حد صدمہ ہوا۔ اور میر کا یہ مصرعہ یاد آیا ع "تھا وہ بے درد مجھے جن نے وفا کو سونپا"۔ مانا کہ معترض کا دل پتھر ہے۔ جسے اس سر تیز نشتر کی خلش محسوس نہیں ہو سکتی مگر کیا فن کے لحاظ سے ردیف کی بلاغت پر بھی غور نا ممکن تھا۔ کیا ردیف سے بس یہی پایا جاتا ہے کہ صیاد نے ابھی قفس یا پھٹکی کا استعمال نہیں ہے۔ کیا لفظ ابھی سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نو گرفتار کا پھڑکنا ذرا دیر میں سسکنے اور دم توڑنے میں مبدل ہو جائے گا؟

مقطع میں لفظ خبر کے اثرات صرف اہل دل کے لئے ہیں۔ اس کی نشتریت کو نظر انداز کرنے پر معترض سے کوئی گلہ نہیں۔

ایک ہی قافیہ کو ایک ہی غزل کے متعدد اشعار میں باندھنا عیب نہیں بلکہ قادر الکلامی اور تنوع تخئیل کا ثبوت ہے بشرطیکہ ایک ہی مطلب کی تکرار بادنیٰ تغیر نہ ہو۔

حضرت اقبالؔ کے باکمال شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن بقول آتشؔ ؎

قابل گوش سیکڑوں گوہر گوش بھی قابل گہر ہے شرط

اور خود اقبالؔ نظیری کی زبان سے کہتے ہوں گے ؎

ضمیرے پُر گہر دارم قرینِ ابرِ نیسانی
سخن را مستمع خواہم کہ چوں دریا کند گوشے

مولانا باری

اٹھارہویں صدی کا پنجاب

اورنگ زیب کی موت سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تخت نشینی تک پنجابیوں کو ایک نہایت ہی پُر آشوب دور کا سامنا کرنا پڑا۔ دلی کی مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی، ہندوستان کے بہت سے صوبے اس سے کٹ رہے تھے۔ پنجاب کے لئے بھی ایسا کرنا آسان تھا۔ لیکن پنجاب کی مقامی حکومت کو اجنبی حملہ آوروں نے مضبوط اور مستحکم ہونے کا موقعہ نہ دیا۔ دلی کی کمزور مرکزی حکومت میں اتنی قوت اور صلاحیت نہیں تھی۔ کہ وہ پنجاب کو اجنبی حملہ آوروں سے بچا سکتی۔ ان حملہ آوروں نے ایک طرف جہاں مغل اعظم کی کمزوری اور بے بسی کو نمایاں کر دیا وہاں انہوں نے پنجاب کے نظم و نسق کو تہ وبالا کر دیا۔ افغانوں کا یہ دعویٰ ہوتا تھا کہ پنجاب پر ان کا تسلط ہے۔ دلی کی مرکزی حکومت پنجاب کے معاملات میں دخیل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ افغانوں کو پنجاب پر اپنا تسلّط جمانے کیلئے بار بار حملے کرنے پڑتے تھے۔ ان حملوں نے پنجاب کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا کم و بیش ایک سو سال تک پنجاب کی یہی کیفیت رہی۔ اس صدی میں جہاں ہندوستان کے دوسرے آزاد اور نیم آزاد صوبے علوم و فنون میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ وہاں پنجاب میں علوم و فنون کے سرچشمے تقریباً سوکھ گئے، اس مدت میں چند شاعر ضرور دکھائی دیتے ہیں، ان کی شاعری پنجابیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، اس افراتفری کے دور میں پنجاب تعمیرات میں خاک ترقی کر سکتا تھا۔ سینکڑوں، ہزاروں عمارتیں سطح زمین کے ساتھ ہموار ہو گئیں۔ یا ہموار کر دی گئیں۔ رہی سہی عمارتوں کی مرمت کے لئے بھی کوئی مشکل ہی سے ملتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کا پنجاب عبارت ہے بیرونی حملوں اور اندرونی شورشوں سے۔

اورنگ زیب کی موت (۱۷۰۷ء) کے بعد اس کا بڑا بیٹا بہادر شاہ تخت پر بیٹھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں بندہ بیراگی کی سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں۔ بیراگی اور اس کے ساتھیوں نے ستلج اور بیاس کے دوآبہ کے کئی شہروں کو لوٹنے کے بعد لاہور پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن سرہند پر شاہی فوج نے بندہ بیراگی کو شکست دی، بندہ بیراگی نے اپنے آپ کو لوہ گڑھ میں محصور کر لیا۔ تین مہینے تک شاہی فوجوں نے لوہ گڑھ کا محاصرہ کئے رکھا۔ اس موقع پر بندہ بیراگی قلعہ لوہ گڑھ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی اثنا میں بہادر شاہ بھی دلی سے لاہور پہنچ گیا۔ لیکن چند دنوں کے بعد اس نے لاہور ہی میں وفات پائی۔

بہادر شاہ کی موت (۱۷۱۲ء) کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت کے لئے لڑائی ہوئی، سب سے پہلے تین بھائیوں نے مل کر لاہور کی فصیل کے باہر چوتھے بھائی عظیم الشان کو شکست دی، شکست کھانے کے بعد عظیم الشان نے راوی عبور کرنے کی کوشش کی لیکن ساحل تک نہ پہنچ سکا، اب معزالدین نے اپنے دو بھائیوں سے علیحدہ علیحدہ لڑائی کر کے انہیں شکست دی، معزالدین نے تخت نشین ہوتے وقت جہاندار کا لقب اختیار کیا، جہاندار کو حکومت کرتے ہوئے ابھی سات مہینے ہی گذرے تھے کہ عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے اسے شکست دی۔

مغل شہزادوں کی باہمی لڑائیوں نے بندہ بیراگی اور اس کے ساتھیوں کو موقعہ دیدیا تھا کہ وہ دوبارہ منظم ہو جائیں، اب بندہ بیراگی نے کوہستانی پناہ گاہوں سے نکل کر سب سے پہلے سرہند پر حملہ کیا اور شہر کو آگ لگا دی، پھر بٹالہ اور کلانور پر یورش کی۔ اب فرخ سیر نے اس شورش کو دبانے کیلئے نواب عبدالصمد کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا، پنجاب کے پہاڑی راجاؤں کی مدد سے عبدالصمد نے بیراگی کو کئی ایک معرکوں میں شکست دی، بیراگی نے آخر کار اپنے آپ کو گورداسپور کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بندہ بیراگی اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر کے دلی بھیجدیا گیا۔

نواب عبدالصمد خاں کے بعد اس کا بیٹا نواب زکریا خاں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا، زکریا خاں کے عہد میں پنجاب اندرونی شورشوں سے بچا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ زکریا خاں کو اتنی مہلت مل گئی تھی کہ اس نے لاہور اور شالامار کے درمیان بیگم پورہ کو سرکاری عمارات سے سجا دیا۔ اس زمانہ کی بنی ہوئی عمارتوں میں سے صرف چند کھنڈر باقی ہیں۔ زکریا خاں نے پنجاب میں امن وامان قائم کر دیا۔ قیام امن کی اس جدوجہد میں زکریا خاں کے ساتھ آدینہ بیگ کا بھی بہت حصّہ ہے آدینہ نگر (موجودہ دینا نگر) اسی کا بسایا ہوا ہے۔

اِدھر زکریا خاں پنجاب میں مرکزی حکومت کے تسلط کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ اُدھر مرکزی حکومت سازشوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کئی ایک صوبے مرکز سے کٹ چکے تھے۔ نظم ونسق میں ابتری پھیل چکی تھی، مرکزی حکومت کی ایک سازش نے نادر شاہ کی طوفانی فوج کا رخ ہندوستان کی طرف پھیر دیا شاہی فوج کو پشاور کے قریب شکست دینے کے بعد نادر شاہ نے بلا روک ٹوک چناب کو عبور کر لیا۔ وزیر آباد میں زکریا خاں کی فوج نے نادر شاہ کا مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اب نادر شاہ نے لاہور کا رُخ کیا۔ لاہور کو بچانے کیلئے زکریا خاں کی زیر کمان ایک فوج نے راوی کو پار کیا تین دن تک لڑائی ہوتی رہی، چوتھے دن زکریا خاں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ زکریا خاں بھاگ کر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اب اس نے قلعہ اور فصیل کو مستحکم کرنا شروع کیا، اسی اثنا میں نادری لشکر راوی پار کر کے شالامار میں ڈیرے ڈال چکا تھا، نادر شاہ کے ایک امیر کفایت خاں کے ذریعہ زکریا خاں اور نادر شاہ میں صلح ہو گئی۔ زکریا خاں نے بیس لاکھ روپے اور چند ہاتھی تاوان جنگ کے طور پر نادر شاہ کو پیش کئے۔ نادر شاہ نے زکریا خاں کو پنجاب کی گورنری پر بحال رکھا۔ اب نادر شاہ نے دلّی کا رخ کیا۔ دلی میں قتل عام کرنے، لوٹ مار مچانے اور ان گنت دولت سمیٹنے کے بعد لاہور سے ہوتا ایران چلا گیا۔

نادر شاہ کے حملے نے مغل اعظم کی سیاسی کمزوری کو بے نقاب کر دیا تھا۔ چنانچہ ادھر نادر شاہ نے ایران کا رُخ کیا ادھر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خود مختاری کی تحریک شروع ہو گئی، نادر شاہ کے حملے نے پنجاب میں مرکزی حکومت کے اقتدار کو کافی حد تک کمزور کر دیا تھا، ان حالات سے سکھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ پنجاب کی مقامی حکومت کی بے بسی اور دلّی کی مرکزی حکومت کی کمزوری ان پر واضح ہو چکی تھی، لہٰذا انہوں نے سیاسی قوت حاصل کرنے کیلئے اپنی سرگرمیوں کو پہلے سے زیادہ تیز اور زیادہ منظم کر دیا۔

نواب زکریا خاں کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا یحییٰ خاں گورنر مقرر ہوا۔ یحییٰ خاں کا چھوٹا بھائی شاہ نواز ملتان کا ناظم تھا۔ اس نے اپنے باپ کی جائداد میں اپنا حصّہ طلب کیا۔ لیکن یحییٰ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کی درخواست پر زیادہ توجہ نہ کی، اس پر شاہ نواز اپنی فوج سمیت اچانک شالامار کے قریب نمودار ہوا۔ شاہ نواز نے دیوان صورت سنگھ کی معرفت یحییٰ خاں کو تصفیہ کرنے کا پیغام بھیجا۔ ابھی دونوں بھائیوں میں بات چیت جاری تھی کہ عیدگاہ و دونوں بھائیوں کے سپاہیوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں یحییٰ خاں کو شکست ہوئی۔ شاہ نواز نے یحییٰ خاں کو قلعہ میں قید کرنے کے بعد مرکزی حکومت کی منظوری حاصل کئے بغیر اپنے گورنر ہونے کا اعلان کر دیا۔

تھوڑی مدت کے بعد یحییٰ خاں قید سے بھاگ کر دلّی جا پہنچا۔ اب شاہ نواز کو یقین ہو گیا کہ یحییٰ خاں شاہی فوج لے کر لاہور پر حملہ کرے گا۔ چنانچہ اس نے [illegible] میں احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی، اسی اثنا میں وزیر قمرالدین کے دباؤ سے شاہ نواز نے احمد شاہ کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ شاہ نواز کے اس طرز عمل نے احمد شاہ ابدالی کے جوش وخروش کو اور بڑھا دیا۔ راوی کے کنارے پر پنجابیوں اور افغانوں کا مقابلہ ہوا۔ شاہ نواز بھاگ کر دلّی چلا گیا۔ احمد شاہ نے دیوان لکھپت رائے کو قید سے نکال کر لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ افغانوں نے لاہور کے سب سے زیادہ بارونق اور امیر حصّے یعنی مغلپورہ کو خوب لوٹا۔ اب احمد شاہ نے دلّی کا رُخ کیا۔ لیکن وزیر قمرالدین کے بیٹے نواب معین الملک (میر منّو) نے احمد شاہ ابدالی کو سرہند کی لڑائی میں شکست دی۔

شاہِ دلی نے میر منّو کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے نے سکھوں کو موقع دے دیا کہ وہ لاہور کے آس پاس چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیں۔ میر منّو نے ان قلعوں کو مسمار کرنے اور سکھوں کو دبانے کی جتنی زیادہ کوشش کی اتنا ہی اسے زیادہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ برسوں کی بدامنی سے تنگ آکر زمینداروں نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ زمینداروں کی اس بغاوت میں سکھوں نے پورا پورا ساتھ دیا۔ میر منّو ان ہنگاموں کے فرو کرنے میں

معروف تھا کہ ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر پھر لشکر کشی کر دی۔ میر منّو نے دربارِ دلّی سے امداد طلب کی لیکن وہاں کیا دھرا تھا۔ مقامی جنگجو عناصر پر وہ اتنا تشدد کر چکا تھا کہ ان سے کسی قسم کی امداد طلب نہیں کر سکتا تھا۔ چاروناچار میر منّو نے پنجاب کے چار اضلاع کا مالیہ ہر سال احمد شاہ ابدالی کو بھیجنے کی شرط پر حملہ آور سے نجات پائی۔

دلّی کے سازشی دربار کو میر منّو کا یہ اقدام پسند نہ آیا، چنانچہ شاہ دہلی نے شاہ نواز کو ملتان کا ناظم مقرر کر دیا، میر منّو نے اس شاہی فرمان کی ذرّہ برابر پروا نہ کرتے ہوئے ملتان کے دیوان کوڑا مل کو شاہ نواز کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ دیوان کوڑا مل نے شاہ نواز کو شکست دی۔ شاہ نواز اسی لڑائی میں مارا گیا۔ پنجاب میں افغانی فوج کی موجودگی کی بنا پر میر منّو نے چار اضلاع کا مالیہ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس پر احمد شاہ نے تیسری بار پنجاب پر حملہ کیا۔ لاہور کی دیواروں کے نیچے چار مہینوں تک پنجابیوں اور افغانوں میں لڑائی ہوتی رہی افغانوں نے چونکہ لاہور کا محاصرہ کر رکھا تھا اس لئے اپریل ۳ ۱۷۵۲ء میں محمود بوٹی کے قریب ایک کھلے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دیوان کوڑا مل کے مارے جانے کے بعد پنجابی فوج میں بددلی پیدا ہو گئی۔ پنجابی فوج کا ایک افسر عزیز بیگ اپنے پانچ بیٹوں سمیت اس لڑائی میں مارا گیا۔ چھٹے بیٹے نے اپنے باپ اور بھائیوں کی نعشوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔ محمود بوٹی میں اس قبر کے آثار بیسویں صدی کے آغاز تک موجود تھے، ممکن ہے اب بھی ہوں۔

میر منّو نے احمد شاہ ابدالی کو پچاس لاکھ روپے دے کر صلح کر لی، احمد شاہ ابدالی نے جالندھر، لاہور اور کوہستان کی سندِ حکومت اس کے نام لکھ دی تھی۔ لیکن میر منّو اس فرمان کے حصول کے بعد زیادہ مدت تک زندہ نہ رہ سکا۔ اس نے ۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔

میر منّو کی موت کے بعد اس کی بیوہ مراد بیگم نے عنانِ اقتدار کو سنبھالا۔ اس زمانے میں پنجاب پر دلی اور قندھار دونوں اپنے اپنے غلبے کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن نہ مغل بادشاہ کو اور نہ احمد شاہ ابدالی کو اتنی فرصت تھی کہ وہ پنجاب کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کیلئے کوئی قدم اٹھاتے، مراد بیگم نے حکومت کے کام کاج کی طرف کافی توجہ دی لیکن اس کے دربار میں دلی اور قندھار کے جاسوسوں کی موجودگی نظم و نسق کی راہ میں حائل ہوتی تھی دہلی کے بادشاہ کے طرفداروں کے طرزِ عمل سے تنگ آ کر مراد بیگم نے احمد شاہ سے امداد طلب کی، احمد شاہ ابدالی نے جہان خاں کو اپنا نائب بنا کر لاہور بھیجا، اس اثنا میں شاہ دلّی نے غازی الدین حیدر کو ایک فوج کے ہمراہ لاہور روانہ کیا۔ اب شاہ دلّی کا ایک نائب بھی لاہور میں رہنے لگا۔ ان حالات میں مراد بیگم نے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی، جب غازی الدین حیدر کو مراد بیگم کے اس اقدام کا علم ہوا تو اس نے مراد بیگم کو گرفتار کرا کے جالندھر کے ناظم آدینہ بیگ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۵ء کے جاڑوں میں چوتھی مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا۔ آدینہ بیگ کانگڑہ کی طرف چلا گیا۔ احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور کو لاہور کا حاکم مقرر کرنے کے بعد دلّی کا رُخ کیا، ابدالی فوج کے سپاہیوں نے دو ماہ تک دلّی کو خوب لوٹا، لوٹ مار کرنے کے بعد احمد شاہ نے قندھار کی راہ لی، تیمور نے پنجاب میں اپنے پاؤں جمانے کے لئے سکھوں اور پنجاب کے سابق گورنر آدینہ بیگ سے لڑائیاں شروع کر دیں، چونکہ تیمور کی فوجی قوت اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی، کہ وہ اپنے دونوں دشمنوں سے بیک وقت لڑائی شروع کر دے۔ اس لئے اس نے سکھوں اور آدینہ بیگ میں افتراق پیدا کرانے کی کوشش کی۔ تیمور نے آدینہ بیگ کو لاہور طلب کیا۔ لیکن آدینہ بیگ نے لاہور آنے سے انکار کر دیا۔ اس پر افغانی فوج کو آدینہ بیگ کی گرفتاری کیلئے بھیجا گیا۔ لیکن یہ فوج آدینہ بیگ کو گرفتار نہ کر سکی۔ اس وقت آدینہ بیگ اپنے نام پر بسائے ہوئے شہر آدینہ نگر (موجودہ دینانگر) میں تھا، آدینہ بیگ کی فوج میں سکھوں کی کمی نہیں تھی۔ سردار جسا سنگھ آدینہ بیگ کی فوج کا ایک افسر تھا۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کی ایک بڑی جمعیت کو لاہور پر حملہ کرنے کیلئے تیار کیا۔ اس فوج کا سردار جسا سنگھ کلال تھا۔ اس فوج کے مقابلے کی تاب نہ لا کر شہزادہ تیمور چناب پار چلا گیا۔ جسا سنگھ کلال نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اپنا سکہ چلایا، جسا سنگھ کلال کا لاہور پر زیادہ دیر تک قبضہ نہ رہ سکا۔

مئی ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا، درانی فوج کی تعداد چونکہ بہت تھوڑی تھی۔ اس لئے وہ پیچھے ہٹتی ہٹتی اٹک کو پار کر گئی۔

اس طرح اٹک تک کے علاقے پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔ پنجاب کی حکومت آدینہ بیگ کے سپرد کرنے کے بعد بہت سے مرہٹے فوجی افسر واپس چلے گئے، لیکن چند ماہ بعد ہی آدینہ بیگ نے وفات پائی۔

پنجاب کا شہزادہ تیمور کے ہاتھوں سے نکلنا تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کرنے اور مرہٹوں سے لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں جب احمد شاہ ابدالی کی ان تیاریوں کا مرہٹوں کو پتہ چلا تو انہوں نے اٹک ملتان اور لاہور کو خالی کر دیا۔ پنجاب میں مرہٹوں کی چند ماہ تک عمل داری رہی۔ لیکن اس مدت میں امن مفقود ہو چکا تھا۔ سکھوں نے مرہٹوں کو مالیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر اس وقت احمد شاہ ابدالی پنجاب پر حملہ نہ کرتا تو پنجاب میں سکھوں اور مرہٹوں کا تصادم یقینی تھا، احمد شاہ ابدالی بلا روک ٹوک لاہور پر قابض ہوگیا۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی ایک بہت بڑی فوج دتی کے آس پاس جمع ہو رہی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے دلی کا رُخ کیا، پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی، مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے بلند خاں کو پنجاب کا گورنر اور زین خان کو سرہند کا ناظم مقرر کیا۔ جونہی احمد شاہ نے چناب پار کیا سکھوں نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ اب سکھ سرداروں نے جابجا قلعے بنانے شروع کر دیے۔ احمد شاہ ابدالی نے کابل پہنچکر اپنے ایک جرنیل نور الدین کو سکھوں سے لڑنے کیلئے بھیجا لیکن سردار چڑت سنگھ نے نور الدین کو شکست دی، اب بلند خاں نے گوجرانوالہ پر حملہ کیا، لیکن شکست کھا کر لاہور آگیا۔

پنجاب میں سکھوں کا زور بہت بڑھ رہا تھا۔ بلند خاں اور زین خاں کیلئے ان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے چھٹی بار پنجاب پر حملہ کیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "احمد شاہ کی زندگی عقاب کی سی تھی۔ وہ پہاڑ کی بلندی سے زمین پر نگاہیں جمائے رکھتا۔ جہاں شکار اس کی نظر پڑتا وہ اپنے کوہستانی آشیانہ سے اڑ کر میدان میں اترتا، اور شکار کر کے چل دیتا۔ اور پھر ویسے ہی موقع کی تاک میں بیٹھا رہتا" ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ نے پھر پنجاب پر حملہ کیا۔ سکھوں اور ابدالی فوج میں گوجروال اور برنالہ کے درمیان لودھیانہ سے پچیس میل دور مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ گرفتار ہونے والے سکھ سرداروں میں سے ایک آلہ سنگھ بھی تھا، احمد شاہ ابدالی نے اس کی شجاعت سے متاثر ہو کر اسے راجہ کا خطاب دیا۔ کابلی مل کو لاہور کا حاکم مقرر کرنے کے بعد احمد شاہ قندھار چلا گیا، احمد شاہ کے جاتے ہی بھنگیوں کی مثل نے گوجر سنگھ۔ لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے ماتحت لاہور پر حملہ کر دیا۔ کابلی مل نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اب پنجاب میں سکھوں کا زور بڑھنے لگا۔ انہوں نے سرہند کے افغان حاکم زین خاں کو قتل کرنے کے بعد سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سرہند پر دوبارہ قبضہ کرنے کیلئے احمد شاہ ابدالی نے ساتویں بار پنجاب پر حملہ کیا، سکھوں نے لاہور خالی کر دیا۔ وہ سرہند کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ اُسے بعض حالات کی بنا پر واپس جانا پڑا۔ احمد شاہ نے اپنی طرف سے سردار آلہ سنگھ کو سرہند کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب احمد شاہ سکھوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر اُتر آیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے مشکل سے چناب پار کیا ہوگا کہ سکھوں نے درانی کے مقرر کیئے ہوئے حاکم لاہور کابلی مل کو لاہور سے نکال دیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر سکھوں نے جہلم اور ستلج کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کی بارہ مثلوں نے پنجاب کے اس علاقے کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ پنجاب میں افغانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک پنجاب میں مرکزی حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی۔ سارا پنجاب بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرداروں میں بٹا ہوا تھا، ان سرداروں کی آپس میں کئی بار مقامی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

دو سال تک تیاریوں میں مصروف رہنے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۷ء میں پنجاب پر آٹھویں بار حملہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی کا یہ آخری حملہ تھا۔ اس حملے میں ابدالی کو ناکامی ہوئی، ابدالی کی واپسی کے بعد اس کی زندگی ہی میں پنجاب اس کے قبضے سے نکل گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی موت پر ۱۷۷۳ء کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین تیمور شاہ نے دو مرتبہ ملتان پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ تیسری بار وہ ملتان پر قابض ہوگیا۔ تیمور شاہ کو سندھیوں، کشمیریوں، اور ازبکوں کی بغاوتوں نے اس قدر پریشان کر دیا تھا۔ کہ وہ پنجابیوں کے ساتھ کوئی فیصلہ کن لڑائی نہ کر سکا اس کے عہد حکومت ۱۷۷۳ء سے ۱۷۹۳ء میں پنجاب کے مختلف حصوں پر سے افغانوں کا اقتدار بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ پنجاب کے سردار اُن دنوں

کو اپنی حفاظت میں لے لیتے جو تیمور شاہ کے افسروں کو لگان دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ تیمور شاہ کی وفات کے بعد جب شاہ زمان افغانستان کے تخت پر بیٹھا تو اس وقت پنجاب پر سے افغانوں کا اقتدار اُٹھ چکا تھا۔

شاہ زمان کے عہد حکومت کے شروع ہی میں پنجاب خود مختار سرداروں اور جاگیرداروں میں بٹ چکا تھا۔ لیکن اس پر بھی شاہ زمان کو پنجاب میں حاکمیت کے معمولی اختیار حاصل تھے۔ ۱۷۹۵ء میں اس نے حسن ابدال اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثنا میں ہندوستان کے حالات یکسر بدل چکے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتوحات اور میسور کی صورت حالات نے ہندوستان پر شاہ زمان کے حملے کے امکانات پیدا کر دیئے تھے، سلطان ٹیپو اور شاہ زمان میں عہد و پیمان ہو چکے تھے؛ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پوزیشن جنوبی ہندوستان میں کافی مضبوط تھی۔ اس کی مملکت پر اودھ ہی سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ لارڈ ویلزلی نے شاہ زمان کے حملے کی روک تھام کے لئے اودھ میں انگریزی فوج بھیجدی۔

۱۷۹۷ء کے جاڑوں میں شاہ زمان لاہور پہنچا۔ جب شاہ زمان نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن لڑائی لڑنا چاہتا ہے۔ تو بہت سے سکھ سرداروں نے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ انیسویں صدی کے ایک مؤرخ کے الفاظ میں "لاہور کے بڑے بوڑھوں کو وہ وقت اب تک یاد ہے جب سیاہ ٹوپی اور سیاہ لباس پہنے ہوئے شاہ زمان قلعہ کی دیواروں تلے اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا"۔ پنجاب کے سرداروں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بعد شاہ زمان دلی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کے بھائی محمود کی شورش نے اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ اگلے جاڑوں میں شاہ زمان پھر لاہور پہنچا، اسی اثنا میں لارڈ ویلزلی نے ایران کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ کر لیا تھا۔ جب شاہ زمان لاہور پہنچ گیا۔ تو شاہ ایران کی امداد سے محمود نے جو اس وقت ایران میں پناہ گزیں تھا۔ ہرات پر حملہ کر دیا۔ محمود کا یہ اقدام لارڈ ویلزلی کے اشاروں سے ہوا تھا۔ تھوڑی مدت تک لاہور میں رہنے کے بعد ۱۷۹۹ء میں اسے واپس جانا پڑا، واپسی پر شاہ زمان کی چند ایک توپیں چناب میں گر پڑیں، ان توپوں کو اس علاقے کے ایک نوجوان سردار رنجیت سنگھ نے نکلوا کر شاہ زمان تک پہنچا دیا۔ اس پر شاہ زمان نے ایک فرمان کے ذریعہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا حاکم مقرر کر دیا۔ چونکہ اس وقت لاہور پر شاہ زمان کا قبضہ نہیں تھا۔ لہذا شاہ افغانستان کا یہ فرمان رنجیت سنگھ کیلئے ایک اخلاقی امداد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

لاہور تین حاکموں کے تصرف میں تھا۔ صاحب سنگھ، چیت سنگھ اور مہر سنگھ نے لاہور کے مختلف حصوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ لاہور کے یہ تینوں حاکم ان سرداروں کی اولاد تھے جو پنجاب کی تاریخ میں "سہ حاکمانِ لاہور" کہلاتے ہیں۔ صاحب سنگھ، چیت سنگھ، اور مہر سنگھ، ترتیب کے ساتھ گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے بیٹے تھے۔ ان تین حاکموں نے لاہور کو تباہ کر رکھا تھا۔

ادھر رنجیت سنگھ اس سوچ میں تھا کہ لاہور پر کیسے قبضہ کرے ادھر لاہور کے لیڈر اس فکر میں تھے کہ لاہور کو مزید تباہی اور ویرانی سے بچانے کیلئے تین حاکموں سے کس طرح رہائی دلائی جائے چنانچہ حاکم رائے، محمد عاشق، محمد باقر، محمد طاہر اور مفتی محمد اکرم نے رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ لاہور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ اپنی فوج سمت لاہور کی طرف بڑھا۔ اس نے باغ وزیر خاں (جسکی بارہ دری میں پنجاب لائبریری واقع ہے) میں ڈیرے ڈال دیئے۔ تینوں حاکموں نے اپنے آپ کو شہر کے اندر بند کر لیا۔ محکم دین جو اس وقت لوہاری دروازہ کی حفاظت پر مامور تھا لاہور کے ان لیڈروں کا ہم خیال تھا۔ جنہوں نے رنجیت سنگھ کو لاہور پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ جب رنجیت سنگھ کی فوج نے لوہاری دروازہ پر حملہ کیا۔ تو مہر محکم دین نے دروازہ کھول دیا جب تینوں حاکموں کو پتہ چلا کہ رنجیت سنگھ شہر میں داخل ہو چکا ہے تو ان میں سے دو بھاگ گئے۔ اور چیت سنگھ قلعہ میں چلا گیا۔ تیسرے دن وہ بھی قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

رنجیت سنگھ کی فوج کے چند سپاہیوں نے لاہور کو لوٹنا چاہا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے لوٹ مار کرنے کی سخت ممانعت کر دی۔ رنجیت سنگھ کے اس طرز عمل نے لاہوریوں کی ہمدردی حاصل کر لی۔ جس پر مہر محکم دین کو بعد میں وہ "باپو جی" کہہ کے پکارتا رہا۔ اس کی امداد سے وہ لاہور پر قابض تو ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی لاہور پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کیلئے اُسے پنجاب کے سرداروں کی ایک متحدہ فوج سے لڑنا تھا۔ چند مہینوں کے بعد سردار صاحب سنگھ،

سردار گلاب سنگھ اور سردار نظام الدین خاں حاکم قصور نے مل کر لاہور پر چڑھائی کر دی۔ لاہور سے تھوڑی دور بھسین کے مقام پر اتحادیوں اور رنجیت سنگھ کی فوجوں میں لڑائی ہوئی۔ اتحادی سردار شکست کھانے کے بعد منتشر ہو گئے۔ اس لڑائی میں رنجیت سنگھ کو اتحادیوں کی دولت اور ان کا سامان جنگ ہاتھ لگا۔ لاہور پہنچکر رنجیت سنگھ نے ایک دربار کیا جس میں رنجیت سنگھ نے اپنے "مہاراجہ بہادر" ہونے کا اعلان کرنے کے بعد اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اسی دربار میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فرمان جاری کیا کہ پرانے قاضیوں اور مفتیوں کو ان کے عہدوں پر بحال کیا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے پنجاب کی اس صورت حالات سے اس زمانے کے تمدنی اور معاشی حالات کا بہت آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد پنجاب کے مغل گورنروں کو اندرونی شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان شورشوں میں حکومت اور عوام دونوں کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ بہرحال پنجاب کے مغل گورنروں نے جب ان شورشوں پر قابو پانے کے بعد پنجاب کی معاشی اور تمدنی ترقی کی طرف قدم اُٹھانا چاہا تو نادر شاہ اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کی صوبائی حکومت کو بہت کمزور کر دیا۔ ۱۷۵۹ء میں پنجابیوں کو ایک ہولناک قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قحط میں لاکھوں انسان ہلاک ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کی معاشی اور سماجی زندگی کو جس حد تک برہم کر دیا تھا اس کا اندازہ پنجابیوں کی اس کہاوت سے لگایا جا سکتا ہے "کھادا پیتا لاہے دا تے باقی احمد شاہے دا" ان حملوں کے باوجود احمد شاہ ابدالی پنجاب پر نہ تو پورے طور سے مسلّط ہو سکا اور نہ اسے امن کے قیام میں کامیابی ہوئی۔ ان حملوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ پنجاب کی صوبائی حکومت کمزور ہو گئی۔ اور پنجاب کے مختلف حصّوں پر چھوٹے چھوٹے سرداروں کا قبضہ ہو گیا۔ ان سرداروں کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی "ریاست" میں امن قائم رہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے تھے۔ ان اندرونی جھگڑوں نے پنجاب کی تجارت اور صنعت کو مٹا دیا تھا۔ ۱۷۸۳ء کے قحط نے پنجاب کو تباہ اور ویران کر دیا تھا۔ مشرقی پنجاب کے ہزاروں گاؤں ویران ہو گئے۔ پنجاب کے وسطی اضلاع میں اس قحط نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ سینکڑوں ویران اور برباد شدہ گاؤں آج بھی اس قحط کے نشانات میں سے باقی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں پنجاب کے کئی ایک شاعروں نے اس زمانے کے سیاسی اور معاشی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ پنجابی زبان میں لکھنے والے صوفی شاعر پنجاب کی تباہ حالی کا اکثر تذکرہ کرتے ہیں۔ اس صدی کے اختتام پر شاہ مراد فارسی اور اردو میں پنجاب کی تباہی پر نوحہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاہ زمان کے حملے کے بعد پنجاب کی عمومی حالت کو وہ اس طرح پیش کرتا ہے!

نہ ہے شاہے کہ از کابل بلاہور	چوں وحشی آمد و دیوانہ ساں رفت
نمے زیبد مراد اورا شاہ گفتن	چہ شد گر نام سلطانے براں رفت
نہ ذوق سکہ نے پروائے خطبہ	نہ اندیشہ کہ سود آمد زیاں رفت
براہ غارت و تاراج پنجاب	چوں دزد آہستہ تر آمد دواں رفت
ز دست جور آں غول بیاباں	عجب حالت بجان شہریاں رفت
زمانے برزمینے کس نیاسود	ز عالم راحت و امن داماں رفت
کجا در بتکدہ ناقوس ماندے	کہ اکثر از مساجد ہا اذاں رفت

یہی شاعر "نگس نامہ" میں لاہور کی ویرانی اور اس کی گندگی کو پیش کرتا ہے۔

اس صدی میں جہاں وارث شاہ نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کی ترجمانی کو حد کمال تک پہنچا دیا تھا۔ وہاں "بلھے شاہ" علی حیدر اور فرد فقیر نے اپنی صوفیانہ شاعری سے پنجابیوں میں انسان دوستی کے جذبات کو بیدار کئے رکھا۔ اگر وارث شاہ پنجاب کے جمالیاتی پہلو کے عکاس ہیں تو یہ صوفی شاعر پنجابیوں کے روحانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عبادت بریلوی

شاعری اور عریانی

عریانی کا تصور بڑی حد تک اضافی ہے۔ایک بات جو کسی خاص سماج کے ایک خاص فرد کو عریاں معلوم ہوتی ہو، ممکن ہے دوسری سماج کے فرد کو عریاں نہ معلوم ہو۔ یہ چیز حالات و واقعات کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسے حالات و واقعات کے پس منظر ہی میں دیکھنا چاہئے۔مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ مغربی عورتیں، جس طرح کا لباس پہنتی ہیں اور جس انداز سے بازاروں میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں، ہم اس کو ان کی بے حیائی پر محمول کرتے ہیں اور ان کی اس عریانی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ حالانکہ ان کی سماج کے افراد کیلئے یہ کوئی ایسی معیوب باتیں نہیں۔ ہم لوگ جب ان عورتوں کو اپنے جسم کی نمائش، اپنی بانہوں کا چمپئی رنگ، اپنے غازہ آلود چہرے کی چمک دمک اور سینے کے اُبھار کو نمایاں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو ان کو ذرا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ اس سماج کے نوجوانوں پر وہ بیقراری کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے، جس کا شکار ہندوستانی نوجوان، ان عورتوں کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی سماج میں ایسے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے۔ اس لئے یہاں کے نوجوانوں میں جنسی تشنگی کا احساس، سارے جسم کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دیتا ہے —— یہ تو خیر مشرق و مغرب کا تقابل تھا۔ آپ ہندوستان ہی کے مختلف خطوں کو دیکھئے! شمالی ہندوستان میں جس بات، جس طریقے اور جس انداز کو عریانی سمجھا جاتا ہے، اس کو گجرات، وسط ہند اور جنوبی ہند کے اکثر قبیلوں میں معیوب نہیں سمجھتے۔ گجرات میں عورتیں جس طرح نیم عریانی لباس پہنتی ہیں اس کو شمالی ہند والے اچھا نہیں خیال کرتے —— گونڈ اور بھیل قوموں کے یہاں جو عورتوں کا لباس ہے، اسکو شمالی ہند کی کوئی عورت تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو ان کا جسم عریاں ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف ان کے سارے خد و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قبیلے ایسے بھی ہیں جن کے یہاں نوجوان لڑکیاں اپنے پستانوں کو کسی چیز سے پوشیدہ نہیں کرتیں۔ وہ اسی طرح نمایاں رہتے ہیں۔ اور ان کے یہاں اس کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا —— یہی حال بعض خاص حالات و کیفیات کے بیان کا ہے۔ کہ کسی خاص دور میں اگر بعض خاص حالات کی تصویریں کھینچنی معیوب سمجھی جاتی ہیں، تو دوسرے دور میں ان کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، جو اس زمانے کے لوگ نہیں ہوتے۔ بلکہ "اگلے وقتوں کے لوگ" ہوتے ہیں۔ اور جو زمانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں اور حالات و واقعات کے تیوروں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن وہ لوگ جو ذہنی حیثیت سے آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں، ان چیزوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ جیسے ان کے نزدیک ان کے بیان میں کوئی معیوب بات نہیں۔!

جنسیات اور اس سے متعلق مختلف حالات و کیفیات کے بیان ہی کیساتھ عریانی کا تصور وابستہ ہے۔ جہاں کہیں بھی جنسی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یا اُس کے متعلق کوئی بات کہی جاتی ہے۔ تو لوگ اس کو عریاں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں ہمیشہ یہ خیالات یکساں نہیں رہے۔ یعنی جنسیات کے متعلق تصورات قریب قریب ہر دور میں بدلا کئے ہیں۔ ایک زمانے میں اگر اُس کی مختلف کیفیات کے بیان کو معیوب مانا گیا ہے، تو دوسرے دور میں وہ کھُلم کھلا بغیر کسی جھجک کے پیش کئے گئے ہیں —— صدیاں گزریں، جب انسان اس دنیا میں بالکل نو وارد تھا۔ تو جنسی تعلقات کو وہ ایسا گناہ خیال نہیں کرتا تھا، جیسا کہ ہم آج خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے جنسی فعل اس کے نزدیک ایک بڑی مقدس اور اہم بات تھی —— اور سینکڑوں مثالیں تو ایسی ملتی ہیں، جب جنسی اعضاء، ان کی پرستش اور ان سے متعلق مختلف کیفیات کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا۔ بریفالٹ نے اپنے ایک مقالے "مذہب اور جنسیات" میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ دُنیا کے تمام مذاہب، کسی نہ کسی صورت میں جنسی مظاہرات سے وابستہ رہے ہیں۔ اگلے زمانے کے لوگ ایک لمحے کیلئے بھی اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہ تھے کہ مذہب اور جنسی معاملات میں کوئی تعلق نہیں۔ دنیا میں مختلف مقامات

پر یہ دونوں چیزیں ایک سنگم پر ملتی ہیں۔ جاپان، ہندوستان، نیوگنی، پولینیشیا، یونان اور روم وغیرہ میں اکثر جگہ یہ تصورات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ بریفالٹ لکھتا ہے کہ اس زمانے سے لیکر جب انسان وحشی اور جنگلی جانوروں کی طرح شکار کرتا پھرتا تھا۔ اس وقت تک جب اس نے کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالنا شروع کیا، اس کے یہاں ایسے رقص و سرود کا رواج عام تھا جو جنسی ہیجان پیدا کرتے تھے۔ اور جو جنسی فعل کی ایک تمثیل تھے —— اور پھر دور تک وہ اس حقیقت کو پھیلا کر بیان کرتا ہے کہ عہد قدیم میں جو ممالک سب سے زیادہ تہذیب یافتہ خیال کئے جاتے تھے۔ ان سب کے یہاں ہمیں جنسیات اور مذہب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصر، بابل، یونان، روم، ایشیائے کوچک، اور بحیرہ روم کے آس پاس کی قدیم تہذیبوں میں جنسیات کی پرستش کچھ دخل تھا —— بات یہ تھی کہ وہ جنسی فعل کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس تصور نے ان کے ذہنوں میں تقدس کا رنگ دے دیا تھا۔ اس لئے جنسیات، اور جنسی فعل سے متعلق گناہ کا تصور ان کے یہاں دور تک نظر نہیں آتا۔ عہد قدیم میں ہمیں ناگ کی پرستش کا ذکر اکثر جگہ ملتا ہے۔ اور جنسیات پر بہت سے لکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جنسی فعل اور جنسی عضو کی ایک تمثیل ہے۔ ہندوستان میں شیوجی اور پاربتی کے تعلقات کی کہانیاں، اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ عورت اور مرد اور ان کے جنسی فعل کو کسی طرح بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کے چھپانے سے کچھ حاصل ہے۔ عہد مسیح سے قبل اکثر ممالک میں ایسے دیوتاؤں کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق جنسیات سے ہے۔ اور عوام جن کی پرستش بھی کرتے تھے۔ روم میں جنس کا دیوتا Priapus کہلاتا تھا۔ روم میں پامپئی Pompei کے ویران شہر کی دیواروں پر ایسی تصویریں ملتی ہیں، جن میں اس دیوتا کو قربانی دینے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ وسطی امریکہ میں اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ وہاں کسی زمانے میں جنسی اعضاء مقدس و متبرک خیال کئے جاتے تھے۔ یہودیوں تک کے یہاں بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ وہ جنسی اعضاء کو تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے —— غرض یہ کہ جنس اور جنسی اعضا کی پرستش قدیم مذاہب میں عام تھی۔ شرم یا گناہ کے تصور کو اس میں دخل نہ تھا۔ اور اس سماج کے افراد اپنی ان حرکات کو اسی تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے آج کے مذہبی لوگ اپنی مختلف حرکات کو دیکھتے ہیں۔ قدیم مصر کے مندروں میں بھی جنسی قربانیوں کا رواج عام رہا —— چنانچہ ایفروڈائٹ کیلئے جو سب سے بڑی قربانی عورتوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اس کے نام پر اپنی عصمت و عفت کو وہاں کے پجاریوں کے حوالے کر دیتی تھیں اور وہاں کے پجاریوں نے اس چیز کو اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ ان تمام باتوں سے —————— یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جنس کے معاملات ایک زمانے تک مذہبیات سے وابستہ رہے۔ اور ان کو کسی طرح بھی معیوب نہیں سمجھا گیا۔ برخلاف اس کے ان کی اہمیت کے پیش نظر انسان نے ان کی پرستش کرنی شروع کر دی۔

لیکن جیسا کہ دنیا میں اور بہت سی باتوں کا رد عمل ہوتا ہے، ان خیالات کا بھی ہوا۔ یہ خیالات اور یہ رسومات بھی بہت دنوں تک ایک طرح پر نہ چل سکیں۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے اس سلسلے میں مکاری، دغابازی اور جعلسازی کا دخل نہ تھا۔ برخلاف اس کے ان کو برتنے میں ایک کی سادگی اور معصومیت کارفرما تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ مسخ ہوتی چلی گئیں —— اور بہت سے لوگوں نے ان کو اپنی وحشیانہ خواہشات کی تسکین اور عیش پرستی کا ذریعہ بنا لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عیاشی کا خیال اس میں گھر کرتا گیا۔ جس کی زیادتی ساری سماج کیلئے مضر ثابت ہونے لگی۔ پہلی صدی عیسوی تک آتے آتے یہ رسومات بہت کافی مسخ ہو چکی تھیں۔ اور اگرچہ ان کا رواج اب بھی عام تھا۔ لیکن اب بہت سے لوگوں نے ان کو بری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ شروع شروع میں عیسائی مذہب کے پادریوں نے ان کی روک تھام میں بڑا حصہ لیا۔ لیکن ان کا تدارک کرنے میں وہ بھی انتہا پسند ہو گئے۔ چنانچہ عیسائی مذہب کے قبل جتنے مذاہب بھی عام تھے۔ وہ سب ان کے نزدیک غیر مقدس ٹھہرے۔ جنسی افعال کو ان مذاہب میں برا نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی نظروں میں یہ چیز بھی غیر مقدس قرار پائی اور انہوں نے اس کو گناہ قرار دے دیا۔ رد عمل کے طور پر ان کے اطوار انتہا پسندانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے علاوہ ہر مذہب کو غیر مقدس اور اسی کے ساتھ ساتھ جنسی فعل اور جنسی تعلقات

کی اہمیت کو غلط اور اس کے ارتکاب کو شرم آگیں بتایا، جو ان مذاہب میں عام طور پر رائج تھے۔ چنانچہ تمام عیسائی لکھنے والوں کی تصانیف ان خیالات سے پُر نظر آنے لگیں۔ کہ جنسی فعل یا جنسیات کی مختلف کیفیات کا بیان گناہ ہے۔ عورت کا جسم مرد کیلئے لعنت ہے، اور عورت مرد کو گمراہ کرتی ہے۔ ان کی اس قسم کی تحریروں کو فرائڈ کے نظریئے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی روک تھام میں ان کی اس جنسی بھوک کو تھوڑا سا سکون مل جاتا تھا۔ جو ان لوگوں میں عام تھی۔ بہر حال اس تحریک نے جنسیات کے سلسلے میں مختلف جگہ Taboos قائم کئے۔ اور جو آج تک اسی طرح موجود ہیں۔ لیکن وہ فطری نہیں بلکہ خود ہماری سماج کے بنائے ہوئے ہیں۔

جنسیات کا موضوع چونکہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہر انسان اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض سماجی بندھنوں کے باعث، وہ اس کے متعلق زیادہ کہنے سننے پر آمادہ نہ ہو۔ لیکن ایسے سماج کے افراد بھی تنہائی میں اس قسم کی کتابیں پڑھنے میں لطف لیتے ہیں، جن میں جنسی باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی دل و دماغ دونوں پر یہ جذبہ سب سے زیادہ حکومت کرتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی ہر انسان کیلئے ضروری ہیں۔ وہ لوگ جو اس کے متعلق کچھ کہنے یا سننے کو معیوب سمجھتے ہیں، دوسروں کو ایک فریب دینا چاہتے ہیں، اور خود تنہائی میں اس سے لطف لیتے ہیں۔ H.R.L.Shepperd نے Som of My Relgion میں لکھا ہے کہ بعض سماجی مذمومات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق بات چیت کرنی زیادہ خوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن ان کے فراموش کر دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر سوچنا، غور کرنا اور اس سے دلچسپی لینا؛ انسانی فطرت میں داخل ہے، خواہ سماجی احتسابات اس کو کتنا ہی مذموم قرار دے دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں نے اس سے دلچسپی لی ——— کہیں چھپ کر اور کہیں کھلم کھلا ——— ! جنسی تعلقات کی اہمیت کے پیش نظر بعض جگہ جنسی تعلیم کی اہمیت کو بھی محسوس کیا گیا۔ چنانچہ بعض وحشی اقوام کے یہاں آج بھی جنسی تعلیم کا رواج ملتا ہے۔ اور ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ڈاکٹر میلینوسکی اور مس مارگرٹ میڈ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ بہت سی وحشی اقوام مذہبی رسومات کے پردے میں جنسی تعلیم دیتی تھیں اور آج بھی دیتی ہیں۔ پلوٹارک لائی کرگس کی سوانح حیات میں ظاہر کیا ہے۔ کہ نوجوانوں کو شادی کی طرف راغب کرنے اور جنسی حیثیت سے صحت مند بنانے کیلئے رقص کو کس قدر دخل ہے ——— وہ بعض ایسی رسومات کا تذکرہ کرتا ہے جس میں عورتیں اور مرد سربازار برہنہ نکلتے تھے۔ اور ان حرکات سے ان میں شادی اور محبت کے جذبات استوار ہو جاتے تھے۔

ان تمام باتوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سماج کے جنسی احتسابات قابل ستائش نہیں ——— اور نہ وہ ایسے فطری ہیں کہ بس ان میں ترمیم کی ہی نہیں جا سکتی ——— تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ہر دور میں بدلا کئے ہیں۔ ایک زمانہ میں جنسی افعال اور جنسی اعضا کی پرستش کی جاتی تھی۔ پھر ایک دور وہ آیا جب عیسائیوں کے شروع زمانے میں اس پر خوب لعن طعن ہوئی۔ اور اس فعل کو مذموم قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنسی فعل اور عورت کا جسم انسان کے لئے لعنت قرار پایا۔ جب سینٹ پال کے منہ سے یہ جملہ نکلتا ہے کہ عورت کے جسم کو چھونا ہی انسان کیلئے اچھا ہے۔ تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن یہ دور بھی ہمیشہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب عیسائی پادریوں نے عورتوں کے ساتھ افلاطونی انداز ——————— میں رہنا شروع کیا۔ جس میں جنسی تعلقات پیدا کرنے کی ممانعت تھی۔ لیکن اسی زمانے میں زیادہ پادری بدچلنی کے الزام میں دھرے گئے۔ اور پھر آخر میں خانقاہوں کا رواج ہوا۔ جس میں راہب عورتیں اور مرد ایک ساتھ رہتے تھے۔ عورت اور مرد کا ایک ساتھ رہنا اور ان میں جنسی تعلقات کا پیدا نہ ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ ان لوگوں کی حرکتوں نے کلیسا کو بدنام کیا ——— ہاں تو جنسی احتسابات ہی انسان کی بدچلنی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر انسان کھلم کھلا، بالکل فطری انداز میں زندگی بسر کرے تو یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ انہیں خیالات کے پیش نظر اکثر ان مروجہ احتسابات کے نظریوں کے خلاف بغاوتیں برتی رہیں ——— چنانچہ جنس کے معاملے میں کلیسا کے خلاف سب سے پہلا باغی انگریزی شاعر بلیک تھا جس نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں کلیسا کے احتسابات کی دل کھول کر مخالفت کی۔ اس نے بتایا کہ جنسی فعل جو دنیا میں سب سے

زیادہ حسین اور خوشگوار فعل ہے ——— اس کو خواہ مخواہ مذہب نے جرم قرار دے دیا ہے۔ اور پھر انیسویں اور بیسویں صدی تک آتے آتے۔ فلسفیوں، سائینسدانوں اور ادیبوں نے جنسی احتسابات کے خلاف ایک اچھا خاصا محاذ قائم کر دیا۔ سکشول رفارم کانگریس نے اس چیز کو ہوا دی، جس میں دنیا کے بڑے بڑے دماغ شامل تھے۔

جنسیات کے متعلق ان نظریات کا مدوجزر ہمیں ادب اور آرٹ میں بھی ملتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کا کوئی ادب اور آرٹ ایسا نہیں جس میں جنسیات اور اس سے متعلق حالات و کیفیات کا بیان موجود نہ ہو۔ چنانچہ بعضوں کا تو یہ خیال ہے کہ اگر جنسیات کے مختلف نظریوں' اس کی تاریخ' اور اس کے دھارے کے اُتار چڑھاؤ کو جس دور میں بھی دیکھنا ہو، تو اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس وقت کے ادب اور آرٹ کا مطالعہ و تجزیہ کیا جائے۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ اب مختلف ممالک کے مختلف زمانوں کے ادبیات کو دیکھئے! آپ کو اس میں جنسیات کے متعلق انہیں نظریوں کی تصویریں بے نقاب نظر آئیں گی، جو ان دنوں عام تھے۔ دنیا میں شاید سب سے پہلی ادبی تخلیق وہی ہوئی ہوگی جس میں جنسی تعلقات اور اس کی مختلف کیفیتوں کا تذکرہ ہوگا ——— وحشی اور غیر مہذب انسان پر جنسی فعل اور اس کے کیف نے اس قدر اثر کیا ہوگا۔ کہ وہ اس کے متعلق بیساختہ بہترین انداز میں کچھ نہ کچھ کہنے کیلئے مجبور ہو گیا ہوگا۔ ایسے گیت کہے گئے ہوں گے جن میں جنسی معاملات اور کیف کا تذکرہ ہوگا ——— یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جس کی بنیادیں صرف قیاس ہی پر قائم ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب ہمیں ادبی تاریخ کی کڑیاں ملنے لگتی ہیں، تب بھی ہمیں قدم قدم پر ہر صنف ادب میں اسی بنیادی انسانی جذبے کا اثر کار فرما نظر آتا ہے۔ ادب میں پرانی داستانوں کو دیکھئے' ان سب میں آپ کو عورت کا بیان ضرور ملے گا اس کے مختلف اعضا کا تذکرہ ضرور ہوگا۔ اس کی ہستی جس کیف کا باعث بنتی ہے' اس کی مختلف تصویریں ضرور نظر آئیں گی۔ ہر ملک کی دیومالا میں جو چیز سب سے زیادہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے' وہ اسی چیز کا بیان ہے۔ حالانکہ دیومالا میں تقدس کا عنصر سب سے زیادہ موجود رہتا ہے ——— پرانی تہذیبوں میں ہندوستان' چین' یونان' و روم' مصر و بابل وغیرہ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ان مقامات کے رہنے والوں کی نظروں میں جو ان کے شاہکار ہیں اور جو اب کلاسکس کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں' وہ جنسیات کی مختلف کیفیات کے بیان سے خالی نہیں۔ ان سب میں ہم عورت کو دیکھتے ہیں۔ اور اس کی ہستی میں قدرت نے جن سرور و سرخوشی کی دنیاؤں کو سمو دیا ہے ان کا بیان بھی پاتے ہیں۔ کالی داس' والمیکی' ہومر' لی پو' لاؤ ژو کے زمانوں سے لیکر گیٹے، شلر، شیکسپیر اور اس کے بھی صدیوں بعد تک دیکھ جائیے۔ آپ کو ان میں ہر ایک کے یہاں ایسی باتیں ملتی ہیں۔ جن کے باعث بڑی حد تک ان کی تخلیقوں میں جگہ جگہ عریانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اُردو شاعری بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بھی قریب قریب ہر دور میں اس چیز کی فراوانی رہی ہے۔ غزل جو ساری اردو شاعری کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے' اس کے معنی ہی عورتوں کے متعلق باتیں کرنے کے ہیں۔ چنانچہ ہر دور کی غزلیات میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو عریاں ہیں اور جن میں کھل کر شاعروں نے جنسی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عورت اور اس کے ایک ایک عضو کا تذکرہ وہ سب کے سب بغیر کسی جھجک کے کرتے ہیں۔ معاملہ بندی ان میں سے بہتوں کا خاص موضوع ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات میں جو کیفیات ایک دوسرے پر طاری ہوتی ہیں' وہ ان کو بھی مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جنسی فعل سے قبل جو حالت طاری ہوتی ہے وہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرماتے نہیں ——— غرض جنسیات سے متعلق کونسی کیفیت ہے جس کا بیان ان کے یہاں موجود نہیں ——— آج جس کو عریانی کہا جاتا ہے۔ اس پر کسی زمانے میں مشاعرہ گاہوں کی چھتیں اڑ جاتی تھیں۔ ——— یہ تو خیر فطری باتوں کا بیان ہے لیکن غزل گو شاعروں کے یہاں ایسی غیر فطری باتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جہاں جنسی حیثیت سے وہ ابنارمل نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہمارے قدیم شاعروں میں اکثر کے یہاں امرد پرستی کا ذکر موجود ہے۔ وہ لطف لے لے کر لڑکوں کے حسن کا بیان کرتے ہیں اور ان کے فراق میں ان کے اوپر جو بے قراری کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کی تصویر بھی کھینچتے ہیں۔ اور بعض تو ایسے بے دھڑک ہیں کہ وہ ان کا نام تک لینے سے باز نہیں رہتے۔ چنانچہ غزل کی شاعری پر ایک زمانے میں یہ زبردست اعتراض تھا۔ جو ایک حد تک آج بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں اکثر جگہ

ان معاملات کا بیان موجود ہے جو انسان کے لئے قابلِ ستائش نہیں —— لیکن بہر حال قدیم اُردو شاعری میں یہ چیز موجود ہے۔ جواب کسی طرح بھی مٹائی نہیں جا سکتی —— !

تصوف قدیم شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری میں بھی اس کا پلّہ اچھا خاصا بھاری ہے۔ تصوف کا خیال ہمیں خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ دنیاوی معاملات اور خصوصاً جنسی رنگ کا اس میں شائبہ تک نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن قدیم شاعری میں تصوف کے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا ہے —— ، جہاں کہیں بھی اس کے اسرار و رموز کھولے گئے ہیں، وہاں جنسی رنگ جھلکتا ہے —— ہمارے شاعروں نے تصوف کے تحت حقیقت اور معرفت پر جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ سب کا سب مجازی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا شخص جو ان کی اشاریت سے واقف نہ ہو۔ ان کو دنیاوی اشعار کے علاوہ ایسے اشعار نہیں سمجھ سکتا جن میں دنیاوی معاملات سے الگ ہو کر کوئی بات کہی گئی ہو۔ ان میں بھی معشوق کے حُسن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کہیں اس کے عارض کا بیان ہوتا ہے۔ کہیں اس کے چشم و ابرو کی تعریف ہوتی ہے۔ کہیں اس کے سرو ایسے قد کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ کہیں اس کے عشوہ و ناز و ادا کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے یہ لوگ مراد اور کچھ لیتے ہیں —— اور بڑے سے بڑا اللہ والا ان پر جھومتا ہے۔ مثال کے طور پر حافظؔ کی شاعری کو دیکھئے جس کو آج متصوفانہ شاعری میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے یہاں اکثر جگہ ان کیفیات کا ذکر ملتا ہے، جن کا تمام تر تعلق جنسیات سے ہے۔ بھلا بتایئے جب وہ اس قسم کا شعر کہے ؎

مے دو ساله و معشوقِ چار ده ساله همیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

تو کوئی کیا سمجھے۔ آخر اس خیال کو تصوف کا رنگ کیسے دیا جا سکتا ہے ؟ —— یہی نہیں بلکہ ایسے بیسیوں اشعار حافظؔ کے دیوان میں ملتے ہیں۔ ایک حافظؔ ہی پر کیا منحصر ہے۔ اُردو اور فارسی کے قریب قریب ہر صوفی شاعر کا یہی حال ہے۔ ان میں سے اکثر کے اشعار فحشیات کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان میں تذکرہ کیا جاتا ہے تصوف کے رازہائے سربستہ کا۔ متصوفین کے یہاں اس چیز کا زور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ گوشہ نشینی اور تجرد کی زندگی بسر کرنے کے باعث، ان میں سے اکثر جنسی بھوک کے شکار تھے۔ وہ خانقاہوں میں رہنے کے عادی تھے۔ اس لئے ان کی تجرد کی زندگی نے اس فطری جذبہ کو دبا یا۔ جس کے باعث وہ حقیقت کے متعلق بھی اپنے خیالات کو ان پیرایوں میں بیان کرنے کیلئے مجبور ہو گئے —— اور خوب کھل کھیلے۔ اُردو شاعروں میں ولیؔ، سراجؔ، میرؔ، میراثرؔ، میر دردؔ، مظہر جانجاناں، تصوف میں بہت اچھے کہنے والے خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے متصوفانہ اشعار میں (میر دردؔ کو چھوڑ کر) جنسی رنگ کی جھلک موجود ہے۔ لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ جنسی دباؤ انسان سے عجیب عجیب باتیں کراتا ہے۔ ایک ذرا اُردو شاعری اور تصوف کو چھوڑ کر فرانس کے اس زمانے کو دیکھئے! جب وہاں کی عورتیں حضرت عیسےٰ کے متعلق اس قسم کے گیت گاتی تھیں ؎

Praise to Jesus, praise his power,
Praise his sweet allurements!
Praise to Jesus, when His goodness
Reduces me to nakedness:
Praise to Jesus when he say to me.
'My sister, my dove my beautiful one'
Praise to Jesus in all my steps,
Praise to his amorous charms!
Praise to Jesus, when His mouth

Touches mine in a loving kiss!
Praise to Jesus when his gentle Caresses
Overwhelm me with chaste joys!
Praise to Jesus when at my Leisure
He allows me to kiss him.

اگرچہ یہ نظم حضرت عیسےٰ سے ایک عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن اس میں شروع سے آخر تک جنسی رنگ جھلکتا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس جنسی بھوک کا جو فرانس کے اندر ایک خاص دور میں رہبانیت نے پیدا کر دی تھی۔ زندگی کی یہ ایک عام حقیقت ہے کہ جو چیز زیادہ سے زیادہ دبائی جاتی ہے، وہ اسی قدر ابھرتی ہے۔ یہی حال جنسی جذبے کا ہے۔ کہ جس قدر بھی اس کو دبانے کی کوشش کی جائے گی وہ ابھرے گا۔ اور دوسرے راستوں سے اپنے آپ کو ظاہر کرے گا —— متصوفانہ شاعروں میں جو جنسی رنگ موجود ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شعراء اخلاقی بندھنوں اور ذہنی جکڑبندیوں کے باعث کھل کر اپنی جنسی کیفیات کا بیان نہ کر سکے —— اس لئے ان کی عارفانہ باتیں بھی جنسی رنگ میں رنگ گئیں، اور بعض تو فحشیات کی حد تک پہنچ گئیں۔ میں جب میر اثرؔ کی مثنوی "خواب و خیال" کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ کیسے وہ یہ سب کچھ لکھ گئے۔ حالانکہ بڑے اللہ والے، صوفی اور حضرت میر دردؔ کے مرید اور شاگرد تھے —— لیکن بہرحال وہ بھی انسان تھے۔ ان کی بھی فطری خواہشات تھیں جو دب کر ابھریں اور ان کا اثر "خواب و خیال" کی صورت میں نمایاں ہوا۔ اور جس سے ان کو ذہنی سکون بھی ملا۔

اس جذبے کا اظہار بھی سماجی ماحول کا پابند ہے۔ اور اس کی مختلف کیفیات کے بیان کو بھی ہمیں سماجی ماحول کے پس منظر ہی میں دیکھنا چاہئے جب زمانہ بدلتا ہے۔ تو یہ خیالات بھی کروٹ لیتے ہیں۔ اور وقت اور حالات کے تقاضوں سے شاعری میں بھی اس کی صورتیں بدلا کرتی ہیں۔ خود انسانی زندگی اپنے سماجی ماحول کی پابند ہوتی ہے، اور انسان اپنی حرکات و سکنات کو سماجی نظریوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعری چونکہ سماج اور ماحول کا عکس ہوتی ہے اس لئے اس میں ان مختلف نظریوں کا بے نقاب ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ہر ملک کے مختلف زمانوں میں جنسی کیفیات کے بیان کے متعلق مختلف نظریے ملتے ہیں۔ اگر ایک زمانے کے شعر و ادب میں ان کیفیات کے بیان کو سماج معیوب نہیں سمجھتا تو دوسرے دور میں اس پر سخت احتساب کرتا ہے۔ ایسے دور میں شاعر ایسی باتوں کے بیان میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، دل کھول کر کہتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی آواز وقت کی آواز ہوتی ہے اس لئے وہ کسی کے روکے رُک بھی نہیں سکتی۔ دنیا بھر کی شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ جب سماج رنگین ہوتی ہے۔ اور تعیش کی دیوی ہر خاص و عام پر حکومت کرتی ہے۔ تو اس زمانے کی شاعری میں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے۔ عیش پرستی، کا عنصر اس میں قدم قدم پر بے نقاب نظر آتا ہے۔ ایسے دور میں شعراء عورت اور شراب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حسن و عشق اور اس کی مختلف کیفیات کا ذکر تو ایسے ماحول میں نہیں ہوتا لیکن ہاں عورت کے جسم کی تعریف اور اس کی ہستی جس کیف کا باعث بنتی ہے، اس کا بیان ضرور ہوتا ہے۔ جس کے باعث اس میں اکثر جگہ عریانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سماج کے افراد اس کو عریاں نہیں سمجھتے۔ کیونکہ وہ شب و روز اسی دنیا میں بسر لیتے ہیں۔ وہ اسی ماحول میں سانس لینے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہر ملک کی شاعری میں ایسے دور گذر چکے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں۔ لیکن فرانس کی شاعری میں اس کی سب سے زیادہ فراوانی نظر آتی ہے۔ وہاں کے شاعر کھلم کھلا عورت کے ان اعضا کا ذکر کرتے ہیں۔ جن سے جنسی تحریک پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ ایسی ایسی باتیں کہتے چلے جاتے ہیں جس کو ہندوستان والے تو شائد ذرا بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہ ہوں۔ وہ کہیں اس کے پستانوں اور ان کے ابھار کا ذکر کرتے ہیں۔ تو کہیں اس کو عریاں ہو جانے کا درس دیتے ہیں Theophile-gautur کی ایک نظم ہے ——

The Rose Coloured Gown جس میں اس نے انہیں تمام باتوں کو پیش کیا ہے - وہ کہیں ایک عورت کے پستانوں کو Twin-ivory Globes سے تعبیر کرتا ہے اور کہیں یہ کہتا ہے کہ اگرچہ اس کی گاؤن اس کے جسم پر بہت اچھی معلوم ہوتی ہے - لیکن پھر بھی نازیبا ہے کیونکہ وہ حقیقتوں کو چھپائے ہوئے ہے ـــــ اور میری نظروں کو دیکھنے کیلئے بیقرار ہے - اس لئے تو اپنے اس لباس کو اُتار کر پھینک دے کیونکہ حقیقتوں کے اظہار میں بلا کی شیرینی اور مٹھاس ہوتی ہے ـــــ ایک گائیٹر ہی پر منحصر نہیں، فرانس کے اکثر شاعروں کا یہی حال ہے - اور اس کی وجہ صرف یہی ہے - کہ انہوں نے ایسے سماج کے آغوش میں پرورش پائی، جو حد درجہ رنگین تھا - اور جس میں ان کو ایسی باتیں کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی - ـــــ اور نہ صرف فرانس بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کے دور آئے اور اب بھی آتے رہتے ہیں -

اُردو شاعری میں بھی ایک ایسا دور آیا تھا - جب اس نے ایسی باتوں کو بڑے زور شور کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ دی تھی - یہ وہ زمانہ تھا - جب لکھنؤ میں اودھ کی سلطنت اپنے شباب پر تھی - اور یہاں کے نوابوں کی رنگین محفلوں اور تعیش پسندیوں کے شہرے دور دور پھیل گئے تھے ـــــ ان دنوں یہاں کی سماج کو سوائے جنسیات اور اس کے متعلقات کے اور کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی ـــــ سوجھتی کیسے ـــــ؟ زندگی ایک نئے موڑ پر آ چکی تھی - اب یہاں رنگینیاں راج کرتی تھیں - اگرچہ صنفِ نازک کو آزادی اب بھی نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا بدل اس طرح ہو گیا تھا کہ شاہدانِ بازاری سے محلے کے محلے آباد تھے - اور ان دنوں کے سماج میں ان کو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا - شریف سے شریف اور بڑے سے بڑے گھرانے ان سے ربط و ضوابط قائم کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے تھے - خود مائیں اپنے نوجوان لڑکوں کیلئے اس کے انتظامات کرتی تھیں - ان تمام باتوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا ـــــ یعنی ان دنوں کے ادب اور شاعری میں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا - چنانچہ اس زمانے کے قریب قریب ہر غزل گو شاعر کا معشوق بازاری معشوق ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس کے اوپری رنگ و روغن کی تعریف زیادہ کرتے ہیں - اور اس کے ظاہری حسن و جوبن کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں - لیکن عشق کی داخلی کیفیات، جن کا تمام تر تعلق دل سے ہے - ان کے یہاں نظر نہیں آتیں - اور بعض جگہ تو ان کی یہ جنسی ہیجان پسندی ان سے ایسی ایسی باتیں کہلاتی ہے کہ ہم سُن کر حیران رہ جاتے ہیں - اور سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہی اس زمانے کی تہذیب تھی؟ - کیا تہذیب کے علمبردار ایسے ہی ہوتے ہیں ـــــ؟ اس زمانے کا بڑے سے بڑا شاعر حتیٰ کہ آتش تک اس سے نہیں بچ سکا - اس کی شاعری میں بڑی سنبھلی ہوئی کیفیت ہونے کے باوجود ایک ایسا رنگ ملتا ہے، جس کو وہ اس سماجی ماحول میں سانس لینے کے باعث پیش کرنے کیلئے مجبور تھا - جب آتش تک اس سے دامن نہ بچا سکا تو پھر چھوٹے شاعروں کا تو خیر کہنا ہی کیا؟ - ان کے بیان میں عریانی لطافت کے ساتھ ہوتی تو قابلِ اعتراض نہ تھی ـــــ لیکن وہ تو اس قدر آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان میں سے اکثر کی شاعری ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے - جب وہ اس طرح کے اشعار کہتے ہیں ؎

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا ／ آج آتی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو — ناسخ

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو ／ منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا — آتش

دوست کو لیکر بغل میں رات بھر سوتا ہوں میں ／ رشک ہے دشمن کو میرے طالعِ بیدار پر — ”

وصل کی شب دل کے خوش کرنے کا ساماں کیجئے ／ خود بھی عریاں ہو جئے انکو بھی عریاں کیجئے — ”

اٹھ گئے ساقینِ جاناں سے جو شب کو پائنچے ／ اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا — امانت

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی ／ آج ہم طائر کو لائے دام میں — ناسخ

کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی ／ حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا — آتش

تو ان کو پڑھ کر ہماری طبیعت منغض ہو جاتی ہے - لیکن بہر حال وہ ایک خاص دور اور ایک خاص سماج کی پیداوار ہیں - اس لئے ان کو مطعون نہیں کیا

جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان شاعروں میں کوئی ایسی بڑی ادبی شخصیت کا مالک نہ تھا جو اس دلدل کو پار کر جاتا۔ لیکن اس میں صرف اس زمانے کی رنگین سماج ہی کو دخل نہ تھا بلکہ اقتصادی اور معاشی حالات بھی اس کے بہت کچھ ذمہ دار تھے۔ اس زمانے کے شاعر بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو رہے تھے۔ انہیں اگر شعوری طور پر احساس نہ تھا، لیکن غیر شعوری طور پر وہ یہ ضرور جانتے تھے۔ کہ ان کی سلطنت کی بنیادیں ریت پر قائم ہیں انہیں معلوم تھا کہ مرہٹے اور انگریز اپنی طاقتیں روز بروز بڑھاتے جا رہے ہیں۔ وہ تو نبرد آزمائی میں مشغول ہیں، لیکن ان کے یہاں قلعوں کی جگہ راج محلوں نے لے لی ہے۔ انہیں ان تمام بندھنوں کا احساس بھی تھا جن میں وہ بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ حالات پر قابو پا لیتے۔ کیونکہ اندرونی حالات اس قدر بد سے بدتر ہو چکے تھے۔ کہ ان کا علاج کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ ذاتی بغض و عناد، مکاریاں، جعلسازیاں، یہ ساری چیزیں سلطنت کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھیں۔ ان حالات نے ان کو زندگی سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان کی شاعری میں بھی ایک فراری کیفیت ہے۔ وہ زندگی سے دور بھاگے اور انہوں نے پناہ لی صنفِ نازک کے کیفِ ہم آغوشی میں ——! وہ کھو گئے شرابِ ناب کی لہروں کے سرور میں! —— انہوں نے بسیرا لیا رنگینیوں اور رعنائیوں کے جھرمٹ میں ——! جہاں پہنچکر ان کی انتہا پسندی نے، ان کی شاعری کی حدیں ابتذال سے ملا دیں۔ اسی لئے آج ان کی شاعری ہمیں بری بھدی اور خراب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان دنوں لوگ انہیں شعروں کو پسند کرتے تھے جن کو آج ہم تنہائی میں بھی دہراتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اس زمانے میں معاملہ بندی، اور جنسی تحریک پیدا کرنے والے اعضا کا تذکرہ اگر شاعری میں نہ ہوتا تو وہ روکھی پھیکی سمجھی جاتی۔ یہ بھی زمانے کی بلہاری تھی ——!

برخلاف اس کے میرؔ و سوداؔ کے زمانے کی شاعری کو دیکھئے! —— ان سب کے یہاں بھی جنسیات کا تذکرہ ہے لیکن ایسی عریانی نہیں جو آتشؔ و ناسخؔ اور دوسرے لکھنوی شعراء کے یہاں موجود ہے۔ میرؔ و سوداؔ اور دلی اسکول کے دوسرے شعراء کے یہاں حسن و عشق کا ایک بلند تصور ملتا ہے۔ وہ داخلی کیفیات کا بیان زیادہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ظاہری حسن اور خارجی کیفیات کا بیان نہیں، جس کی وجہ سے ایسی زیادہ عریانی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ سب بھی ایک خاص سماج کی پیداوار ہے۔ میرؔ و سوداؔ نے جس زمانے میں سانس لی، اس میں صنفِ نازک پر پابندیاں کچھ زیادہ عائد تھیں۔ وہ مکانوں کے زندانوں میں اس وقت بھی مقید تھیں۔ شاہدانِ بازاری کی بھی وہ فراوانی نہ تھی جو آگے چل کر لکھنؤ میں ہوئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان سب کے یہاں جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں ایک سلگنے والی کیفیت ہے۔ آزادی اور بغاوت کا تصور بھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ اپنے ماحول سے بغاوت کر کے کچھ ایسی باتیں کرتے جو اگرچہ عریاں ہوتیں۔ لیکن ذہنی حیثیت سے ان کو تھوڑا بہت سکون بخش دیتیں۔ البتہ ان حالات کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ امرد پرستی کا ذکر شاعری میں بھی ہونے لگا۔ اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ یہ چیز صرف ایران کی تقلید ہی پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ حالات و واقعات کا تقاضا تھی۔ اس سماج میں امرد پرستی کا رواج ضرور تھا —— ہر چند آج اس کو کوئی چھپانے کی کوشش کرے، لیکن جب بھی کوئی ذرا گہری نظر سے دیکھے گا کہ ایسا تھا اور ضرور تھا۔ چنانچہ اس دور کا شاید ہی کوئی شاعر (میر درد کو چھوڑ کر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے اور جن کی شاعری کو میں سوائے متصوفانہ شاعری کے اور کسی قسم کی شاعری نہیں سمجھتا۔) ایسا ہوا ہو جس نے امرد پرستی کا تذکرہ اپنی شاعری میں نہ کیا ہو —— اور چونکہ ان کے دیوانوں میں کھلم کھلا ایسے اشعار ملتے ہیں اس لئے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس پر احتساب بھی اتنا سخت نہ تھا۔ مشاعروں میں کھلم کھلا ان موضوعات پر اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اور سننے والوں کو ان پر وجد آ جاتا تھا —— ان کے یہاں فراری کیفیت بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ باوجود سپر ڈال دینے کے وہ ابھی میدانِ کارزار میں مصروفِ جنگ تھے۔ ان کے پیچھے شاندار روایات تھیں جو انہیں آگے کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ وہ اگرچہ شکست کھا چکے تھے۔ اور ان کی حکومت صحیح معنی میں لال قلعے ہی تک محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی اور شاندار حکومت کا تختہ آسانی سے نہیں اُلٹ سکتا۔ اس لئے ان کی شاعری میں ایک حد تک سینہ سپری کا سا انداز بھی نظر آتا ہے۔ جن کی نے میں ایسی کراہوں کی آوازیں موجود ہیں جو زخموں سے چور ہو جانے کے بعد دکھے ہوئے دلوں سے نکلتی ہیں۔ یہ سب بھی وقت اور ماحول کے ادنےٰ

کرشمے تھے۔

یہ تو خیر اس زمانے کے ان شاعروں کا ذکر تھا جو ذرا اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اسی زمانے میں آگرے کی سرزمین پر ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے جو ان سب سے الگ ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں بالکل ایک نیا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ عوام کا ترجمان ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی ہے اس میں حقیقتوں کا بیان ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو ہر خاص و عام سے ملتا تھا۔ اس لئے اس کی شاعری میں بھی انہیں حالات و کیفیات کے مرقعے موجود ہیں۔ اور اس نے ان کی زندگی کے صرف کسی ایک پہلو پر قلم نہیں اُٹھایا ہے۔ بلکہ سارے مسائل کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں عورتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان کے جسم کے ایک ایک عضو اور عشوۂ و ناز و ادا کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ وہ جنسی جذبے اور اس کے مختلف حالات و کیفیات کا تذکرہ بھی کرتا ہے ــــ اور ان سب باتوں کو پیش کرتے وقت وہ کہیں بھی حقیقت نگاری کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس نے عشق کیا ہے۔ لیکن ایسا عشق نہیں جس میں صرف شبِ ہجر کی تلخیاں ہی سہنی پڑتی ہیں۔ اور مجنوں بن کر صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھاننی جس کی پہلی منزل ہے۔ اس کے عشق میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں نظر آتی ہے، وہ اس کا جنسی پہلو ہے۔ اس کا معشوق بازاری معشوق ہے، جس کے یہاں جا کر وہ جب بھی چاہے، اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ وہ اندھیری رات میں فرقت کے جانسوز لمحے نہیں کاٹتا۔ بلکہ راستے میں جاتے ہوئے اس کا معشوق مل جاتا ہے اور اس کی دلی مراد بر آتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے بیان میں بھی عریانی کو دخل ہے لیکن چونکہ حقیقتوں کا بیان ہے، اس لئے آج ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے زمانے میں اس کی وہ قدر نہ ہو سکی۔ جو اس کے دوسرے ہمعصروں کی ہوئی۔ شیفتہ تک نے اس کو شاعر نہیں مانا ــــ بات یہ تھی کہ اس نے اپنی دُنیا اونچے طبقے سے علیحدہ بنائی تھی۔ اور وہ ایک عامی انسان کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اسی وجہ سے عامی انسانوں کی ذہنی کیفیات۔ اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں، اس کی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ وہ جنسی جذبات کا تذکرہ جس انداز سے کرتا ہے، وہ بھی ایک حد تک عامی ہے، لیکن اس میں حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہے۔ اس کی تصویریں جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ پیداوار ہیں اس سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کی جس میں اس نے سانس لی۔ یہ شاعر تھا نظیر اکبر آبادی ــــ!

پھر غدر کے زمانے کو دیکھئے! جب آزاد و حالی ایک انقلاب کا پیغام دے رہے تھے۔ جب سارا ہندوستان اپنا چولا بدل دینے کا متمنی تھا۔ ان کی تحریکوں میں ریفارم کی کوشش سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ ہندوستان کے گیسوؤں کو سنوارنے کے خواہشمند تھے جو حقیقتاً ان دنوں منت پذیرِ شانہ تھے۔ ادب ہی پر کیا منحصر ہے، ان دنوں تو زندگی کے ہر شعبے میں ریفارم کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی ہندوستان اب ریفارم چاہتا تھا۔ کیونکہ میدان کارزار میں تو اس نے سپر ڈال دی تھی۔ اور اب اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ کہ وہ بیرونی حاکموں کے زیرِ سایہ اپنی حالت کو زیادہ سے زیادہ سدھارنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کی سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں ــــ ادب میں بھی یہی ہوا کہ اس کے اندر جو خرابیاں ایک انتشاری ماحول نے پیدا کر دی تھی، ان کو زیادہ سے زیادہ دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی حالت میں کوئی ایسی بات جنسیات سے متعلق پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ جس میں عریانی کو دخل ہو اور جو عوام میں کوئی فراری کیفیت پیدا کرے۔ اسی وجہ سے حالی کے یہاں جو اس زمانے کا نمائندہ شاعر ہے، حسن و عشق کا بیان تو ملتا ہے۔ لیکن لطیف انداز میں ــــ! ــــ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کے ساتھ، جس میں سادگی کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ چنانچہ حالی نے ان چیزوں کو سراہا نہیں، جو اکثر شعراء نے اب تک روا رکھی تھیں۔ یعنی اس نے عریاں شاعری کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے یہاں مولوی اور شاعر کی شخصیتیں ایک جگہ ملتی ہیں۔ اور وہ ہمارے ادب میں ایک بڑی قابلِ قدر ہستی ہیں۔ لیکن اس گروپ کو چھوڑ کر ذرا دیکھئے کہ قریب قریب اسی زمانے میں داغ اور امیر مینائی بھی اپنی اپنی محفلیں جمائے ہوئے ہیں۔ اور وہ اپنی شاعری میں جن خیالات کو سمو رہے ہیں۔ وہ حالی سے بالکل مختلف ہیں۔ داغ کے یہاں جنسی کیفیات کا تذکرہ بہت زیادہ ہے اور اس کی تقلید میں امیر مینائی بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ داغ تو خیر اسی دنیا کا انسان تھا۔ اور اس نے ان تمام حقیقتوں کا بیان کیا جو ہر انسان

کے دم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن امیر مینائی نے باوجود ایک اللہ والے، صوفی ہونے کے ایسی باتیں کہیں جو بعض جگہ داغ کو بھی مات کر دیتی ہیں ۔۔۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی دور میں ہمیں یہ دو رنگی نظر آتی ہے ؟ ــــــ بات یہ ہے کہ ان دونوں حلقوں کے شاعروں نے اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق "اپنے سماجی ماحول سے اثر قبول کیا۔ ایک کا شعور چونکہ زیادہ بیدار تھا۔ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ اسلئے اس نے زندگی سے فرار اختیار نہیں کیا۔ دوسرے نے دماغ کے بجائے دل سے زیادہ کام لیا۔ چنانچہ زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر وہ رومان کی دنیا میں بسیرا لینے لگے۔ زمانہ جس انتشار سے ہم آغوش تھا۔ انہوں نے اس کو فراموش کر دینا چاہا ــــ رنگینیوں اور رعنائیوں کے بیان میں کھو کر! ــــ یہ ساری کیفیت بھی سماجی اور معاشی ماحول کا تقاضا تھی۔

اس کے بعد جنگ عظیم اور اس کے آس پاس کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں مغربی تعلیم کا رواج اچھی طرح ہو گیا۔ اور یہاں کے لوگوں نے زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کا اثر قبول کرنا شروع کیا۔ ادب بھی اس سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد کی اُردو شاعری مغربی شاعری سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس رومان کا رنگ غالب ہے جو شیلے، کیٹس اور بائرن کا حصہ ہے۔ اقبالؔ کو چھوڑ کر جس کی شاعری سوائے تفکر کے اور کچھ نہیں، اس زمانے کے سارے شاعر رومان کی رنگین شاہراہوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اور جوشؔ ان سب میں آگے ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ کہیں پجارن کے متعلق نظم لکھتا ہے، کہیں "جنگل کی شہزادی" کی تصویر کھینچتا ہے۔ اور کہیں "مہترانی" یا "جامن والیوں" کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور اگرچہ ان سب میں بھی رومانی عنصر غالب ہے۔ لیکن حقیقت کا بھی فقدان نہیں۔ وہ جامن والیوں کے حسن کی تعریف ہی نہیں کرتا۔ بلکہ آخر میں ایک حقیقت کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے باعث ان فصلوں میں اکثر اس کی رسوائی ہو چکی ہے ؎

جوشؔ یہ کافر مناظر ہوش میں رہنے نہیں ۔۔۔ آہ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی ۔۔۔ (جامن والیاں)

یہ بھی زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔ اور جنس کا ایک پہلو جس کے بیان کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس قسم کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس پر تعجب کیا جائے۔ نوجوانوں کی دنیا میں ایسی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اگر لطیف انداز میں ان کا بیان کر دیا جائے تو ایسی کونسی بری بات ہے ــــ لیکن اس قسم کی آوازیں اس دور میں دبی دبی اور گھٹی گھٹی سی آوازیں معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی ان کے بیان میں وہ تندی اور تلخی نہیں آئی تھی۔ جو آگے چل کر پیدا ہو گئی ــــ جوشؔ کے علاوہ جو شاعر اس راہ پر چلے، ان سب میں اگرچہ ایک انفرادیت ہے، لیکن وہ بے باکی کا پہلو نہیں۔ جو جوشؔ کے یہاں ہمیں جگہ جگہ ملتا ہے ــــ وہ سب عورت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن روائتی انداز میں ــــ! اگر ان کے انداز بیان اور طرز ادا کو چھوڑ کر دیکھا جائے۔ تو جہاں تک حسن و عشق کی کیفیات کے بیان کا تعلق ہے، وہ غزل میں سموئے ہوئے خیالات سے آگے نظر نہیں آتے۔ ان میں سے زیادہ تر عورت کے حسن کا بیان کرتے ہیں، جس میں کہیں کہیں جنسی پہلو ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی خاص حقیقت کو وہ پیش نہیں کرتے۔ جوشؔ نے یقیناً اس سلسلے میں بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور آئندہ چلنے والوں کو ایسا راستہ دکھا دیا جس پر چل کر وہ دور ــــ بہت دور نکل گئے۔ حتیٰ کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن بعض لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتے رہے۔

اب اُردو شاعری کا بالکل ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس میں وہ حقیقت نگاری سے زیادہ قریب آ گئی۔ عورت کے متعلق صرف رومانی باتوں کا دور اب ختم ہو گیا۔ اب وہ ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ جہاں جنسیات، اس کی مختلف کیفیات کا بیان، عورت کے جسم سے پیدا شدہ لذت کا تذکرہ، اب نوجوان شاعروں نے کھلم کھلا شروع کر دیا۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ موضوع انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے اثرات جسم اور ذہن، دونوں پر بے شمار ہیں۔ تو پھر اس کو پیش کرنے میں جھجک کیا معنی ــــ؟ ــــ اس منزل میں جو شاعری ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کو عریاں کہا جاتا ہے۔ لیکن صرف عورت کے جسم سے متعلق کچھ باتوں کا تذکرہ ہی کیا کسی فن پارے کو عریاں بنا سکتا ہے ــــ؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک زمانہ میں وہ ضرور تھا جب ذہنی پا بہ زنجیری انسان کے گلے کا ہار تھی۔ وہ پتھروں، درختوں، چاند، تاروں، سورج اور کوہساروں کے سامنے جھکتا

تھا۔ اور ان سب کو دیوتا مانتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سارے خیالات بدلتے گئے۔ اس کے اس طرح کے قائم کئے ہوئے خیالات اوہام اور صرف
اوہام نکلے۔ پھر زمانہ اس کو رفتہ رفتہ زیادہ سائنٹیفک بناتا گیا۔ عورت کے جسم اور جنسیات کے تذکرے کا بھی یہی حال ہے۔ کہ بعض زمانوں میں لوگوں
نے اس کے بیان کو اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن دنیا ہمیشہ تو ایک نہج پر نہیں چل سکتی۔ زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلا کرتی ہیں۔ اس لئے جنسیات کا تذکرہ اور
اس کی فطری کیفیات کا بیان، اب وقت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ دنیا بدل چکی ہے۔ اب ہر بات کو سائنٹیفک طریقے پر سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔
اور جو ایسا نہیں کرتا۔ اس کو اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہیں۔

جنسیات کے متعلق غور کرنے کے لئے بیسویں صدی کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں سارے یورپ میں اس مسئلے نے بڑی
اہمیت اختیار کر لی۔ یورپ کے مختلف سائنسدانوں، فلسفیوں، طبیبوں اور ادیبوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔ عورتیں تک اس کام میں کسی
سے پیچھے نہیں رہیں۔ کلیسا تک نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور ان سب کے ہاتھوں جنسیات کے اسرار و رموز کھلم کھلا بے نقاب ہونے لگے۔
ان سب میں ہیولاک ایلس ایک بہت بڑے مرتبے کا مالک ہے جس کی کتاب "مطالعہ نفسیات جنسی" نے شائع ہو کر سارے یورپ میں تھلکہ ڈال دیا۔
اور جس کی پہلی جلد کو ہندوستان میں ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن امریکہ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ اس کا خیر مقدم کیا —— ہیولاک ایلس
نے جنسیات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ جنسی مظاہرات، جو مختلف مذاہب و اقوام میں موجود تھے۔ ان کو بے نقاب کیا۔ اور نوجوانوں کو اس
مسئلے کی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف راغب کیا —— وہ لکھتا ہے کہ جنسی جذبہ ایک ایسی آگ کا شعلہ ہے جس کو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ اور پھر اس کا بھی
تذکرہ کرتا ہے کہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے جب عشق و محبت کو . . . . ایک فن کی حیثیت سے بیان کرتے ہوئے ہر شخص کے چہرے پر شرم و حیا کے رنگ
دوڑنے لگتے تھے۔ لیکن اب ہمیں اس کو ایک مقدس فریضہ سمجھنا چاہئے۔ اب یہ چیز شاعروں ہی تک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ ہر شخص کیلئے ضروری
ہے۔ کہ اس پر غور کرے۔ کیونکہ اس میں زندگی کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہونے کا راز مضمر ہے۔ ایلس کے علاوہ جیمس ہنٹس، گیڈیز اور ٹامسن وغیرہ نے بھی
ان خیالات کی اشاعت میں حصہ لیا۔ جرمنی اور فرانس میں آئون بلاخ، کرلیفٹ ایبنگ اور فوریل وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے جنسی مسائل پر کھل کر
بحث کی۔ ان سب میں بڑا اور نامور ماہر جنسیات میگنس ہرشفیلڈ تھا۔ جس نے جرمنی میں سب سے پہلے جنسیات کے مطالعے کا ایک شعبہ قائم کیا۔ ہٹلر نے
اس محکمے کو بند کر دیا اور ہرشفیلڈ بیچارے کو جرمنی چھوڑنا پڑا۔ اس نے لندن کی سیکشول رفارم کانگریس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ اس میں اس چیز کو
بخوبی واضح کیا تھا۔ کہ جنسیات کے معاملے میں شرم اور خاموشی اچھی باتیں نہیں۔ وہ کہتا ہے " اگلے زمانے میں جہالت کو معصومیت سمجھا جاتا تھا۔ اور جنسی
معاملات میں خاموشی ہی بہتر خیال کی جاتی تھی۔ لیکن اس وقت سے اب تک بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ چنانچہ آج ہمیں اس کا پورا احساس ہے۔ کہ
جنسیات کے معاملے میں خاموشی معصومیت نہیں بلکہ جرم ہے۔ اور یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم اس خاموشی کو جلد سے جلد ختم کریں۔ انہیں کے ساتھ ساتھ
فرائڈ اور ایڈلر نے بھی اپنے نظریات کی نشر و اشاعت شروع کر دی۔ اور جن کے ساتھ جنسیات کے معاملے میں انقلاب کا ایک ایسا سیلاب آیا جس نے
ساری دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ فلسفیوں نے بھی اس پر غور کیا اور اس سلسلے میں وینگر اور کیرکنگ اور آوسینلی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں ——
ادیب بھی ان خیالات سے بچ نہ سکے۔ ان میں لارنس اور جیمس جوائس خاص طور پر مشہور ہیں۔ لارنس ان سب میں سب سے زیادہ آگے ہے۔ اور اس
کے سارے خیالات اس کے خطوط میں بے نقاب ہیں لیکن اس کے علاوہ the Rainbow unconsious the of Phant Asia اور
Lady Chatterly Slover بھی اس لحاظ سے قابل غور ہیں —— اور اس کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے " میں چاہتا ہوں
کہ جنسیات کے متعلق ہر مرد اور عورت پوری طرح ایمانداری اور صفائی کے ساتھ غور کرے۔ اگر ہم جنسی حیثیت سے وہ بات نہیں کر سکتے جو ہماری تسکین
کا باعث ہے تو کم از کم جنسی طور پر سوچ تو سکتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں، اور دوشیزگی کی یہ ساری باتیں اس کاغذ کی طرح ہیں، جس پر کچھ لکھا ہوا نہ ہو۔ جو سب
کی سب حماقت آمیز ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا ایک گتھی ہے۔ جنسی جذبات اور خیالات کی —— ! —— برسوں کے بعد صحیح خیال آرائی

اور جنس کے معاملے میں نبرد آزمائی، ہمیں وہاں لے جائے گی جہاں ہم جانا چاہتے ہیں ——— یعنی عصمت و عفت کے صحیح نظریوں تک، جہاں ہمارے جنسی خیالات اور جنسی افعال ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ اور ایک دوسرے میں حارج نہ ہوگا ——" لارنس کے علاوہ، ہکسلے، ایچ۔ جی ویلز۔ برٹرینڈ رسل، اور جے سی پونیر، وغیرہ نے اسی طرح کے خیالات کا پرچار کیا۔ فرانس میں جولی رومین کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے، مختصر یہ کہ ساری دنیا کے ادبیات میں ان خیالات کا سیلاب آیا جو پرانے خیالات اور جنسیات سے متعلق صدیوں کی پردہ شرم و حیا کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ اب لوگوں نے کھلم کھلا اس پر سوچنا اور غور کرنا شروع کیا۔ ادب کی ہر صنف میں اب بغیر کسی جھجک کے جنسی فعل اور اس کے مختلف حالات و کیفیات کا بیان ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ بغاوت، قدامت پسند لوگوں سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ اسلئے اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ اور جنسیات پر لکھنے والے بری طرح ملعون و مطعون قرار پائے۔

اُردو کے جدید شعر و ادب کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی بہرحال بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیسویں صدی کے شروع کے اُردو شاعر اس معاملے میں اتنا آگے بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ اپنی کچھ اور اُلجھنوں میں گرفتار تھے۔ اس لئے وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد جو شاعر آئے، ان میں زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار تھے۔ انہوں نے دنیا کے ادبیات، سیاسیات، اور معاشیات وغیرہ کے تمام شعبوں میں چلتی ہوئی ساری تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے ان پر ان تمام تحریکوں نے اپنا پورا اثر کیا ——— اس میں اگر تقلید کو بھی دخل ہو تو ایسی قابل اعتراض بات نہیں۔ ادب کو چھوڑ کر زندگی کے دوسرے شعبوں کو دیکھئے! ہندوستان نے کئی چیزیں مغرب سے لی ہیں۔ پھر ادب میں اگر یہ خیالات لائے جاتے ہیں تو کونسا حرج ہے؟ اور پھر جب یہ خیالات و نظریات سماج کے ہر فرد کیلئے مفید و کارآمد ہیں ——!

ایک طرف تو خیر یہ مغرب کا اثر تھا لیکن دوسری طرف خود ہندوستان کے حالات ان خیالات کو لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ہندوستان میں آزادی کے خیالات غدر کے بعد ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن جنگِ عظیم کے بعد اور خصوصاً سنہ ۱۹۳۰ء میں راوی کے کنارے جب کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کر دیا تو ان میں اور بھی تیزی آ گئی۔ چنانچہ آزادی کے خیالات نہ صرف سیاسی لحاظ سے پھیلے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے اپنا رنگ بھر دیا۔ ادیب اور شاعر بھی ان سے نہ بچ سکے۔ اور انہوں نے زندگی کے تمام مسائل پر آزادی کے ساتھ غور کرنا اور اپنی تخلیقوں میں سمونا شروع کیا ——— اور چونکہ انہوں نے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا اس لئے ان کی پیش کی ہوئی چیزوں میں روحانیت کی جگہ خالص حقیقت نگاری نے لے لی۔ چنانچہ انہوں نے کھلم کھلا ان تمام باتوں کا تذکرہ کیا، جس سے آج تک، ادیب اور شاعر اپنا دامن بچاتے رہتے تھے۔ جنسیات کے متعلق اب جن مسائل کا تذکرہ ہوا، ان میں بھی آزادی کا رنگ تھا۔ تلخی تھی ——— ان تمام بندھنوں کو توڑ دینے والی ایک جنبش کا سا انداز تھا۔ جو آج تک ہندوستانی سماج کے ہر فرد کو بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک اب زندگی میں ہر بات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی باتوں میں کوئی رازدارانہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ ہمیں ان میں جھجک کی بجائے مردانگی کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہر چیز کی پردہ پوشی اور چھپانے کا طریقہ، جاگیردارانہ اور سامنتی دور کی یادگار ہے۔ اس لئے جہاں تک بھی ہو سکے اس سے احتراز کیا جائے۔ سامنتی دور میں شاعر جس طرح چاہتے تھے۔ اپنے خیالات کو مختلف معنی پہنا دیتے تھے۔ وہ کہتے کچھ تھے اور اس کا مطلب کچھ اور لیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر متصوفانہ شاعری ہی کو دیکھئے کہ شاعر ذکر تو کرتے تھے اس میں، ان کیفیات کا جو تمام تر جنسیات سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن ان کو روحانیت کے معنی پہنا دیئے جاتے تھے۔ نئے شاعروں نے اس دورنگی کو اچھا نہیں سمجھا۔ یہ تو خود اپنے آپ کو ایک دھوکا دینے والی کیفیت، اور ایک مستقل فریب اور جھوٹ کی بین مثال ہے! ——— نئے شاعر اللہ والے نہیں۔ انہیں احساس ہے اور یقین بھی کہ وہ اللہ والے نہیں بن سکتے۔ کیونکہ انہیں بہرحال، اسی دنیا، اس کی الجھنوں اور پریشانیوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے ان کو روحانی باتوں کا خیال نہیں آ سکتا۔ وہ تو اسی دنیا کے انسان ہیں۔ اس لئے اسی دنیا کے انسانوں کے مسائل اور ان کی مختلف کیفیات کو صداقت و دیانت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

نئے شاعروں کے ان پیش کیے ہوئے خیالات میں تلخی اور قدرے زیادتی ضرور ہے، لیکن یہ ردِ عمل ہے جاگیردارانہ اور سامنتی دور کی ان رسومات کا، جن کو نئے شاعروں نے اچھا نہیں سمجھا۔ اور جن کو انہوں نے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ جنسیات سے متعلق مختلف کیفیات، جن کو آج تک مذموم و معیوب سمجھا جاتا تھا اب بیدھڑک بیان کی جانے لگیں۔

جدید اُردو شاعری میں جنبیات کی مختلف کیفیات کے بیان سے جو عریانی پیدا ہوتی ہے، اس کو ہمیں ہر شاعر کے ذہنی پس منظر میں دیکھنا چاہئے ورنہ اس کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ ہمارا جدید شاعر اب بہت کافی سمجھدار ہو چکا ہے۔ اس کے اوپر اب مختلف علوم کے دروازے کھُل چکے ہیں۔ اور اس چیز نے اس کی جذباتیت کو ختم کر کے اس کے محسوسات کو عقلیت سے ہم آغوش کر دیا ہے۔ وہ اب ہر چیز کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہے۔ —— وہ انسان ہے اور نارمل انسان —— ! اس لئے وہ ایسی حرکتیں بھی کرنی نہیں چاہتا۔ جو مافوق الفطرت انسانوں ہی سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا عشق اب ایک انسان کا عشق ہوتا ہے —— ایک ایسے انسان کا عشق جو انسانوں کے درمیان، زندگی کی اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور جس کے یہاں اس عشق کی تشکیل میں جنسی عنصر کا غلبہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اب وہ افلاطونی عشق کے خیالی نظریئے کا قائل نہیں۔ بلکہ اب اس کے عشق میں صنفِ نازک کے جسم سے پیدا شدہ جنسی لذت کو دخل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جسم و روح میں آہنگ ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس لئے دُنیا میں ایسے روحانی عشق کا وجود نہیں جس میں جسمانی لذت کو دخل نہ ہو۔ اور جو کوئی بھی اس کے خلاف سوچتا ہے، وہ ایک موہوم لذت کا شکار ہے۔ اس کی آنکھوں میں حسرتِ اظہارِ شباب کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ راشدؔ انہیں خیالات کو سامنے رکھ کر "حزنِ انسان" میں افلاطونی عشق پر طنز کرتا ہے ؎

جسم اور روح میں آہنگ نہیں
لذتِ اندوز دلآویزی موہوم ہے تو
خستۂ کشمکشِ فکر و عمل!
تجھ کو ہے حسرتِ اظہارِ شباب
اور اظہار سے معذور بھی ہے۔
جسم نیکی کے خیالات سے مفرور بھی ہے
اس قدر سادہ و معصوم ہے تو
پھر بھی نیکی ہی کئے جاتی ہے۔
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

اس کے خیال میں روح کے عظمت سے ہم آغوش ہونے کا ذریعہ جسم ہی ہے، جو ایک "منبعِ کیف و سرور" ہے۔ لیکن افلاطونی عشق پر ایمان رکھنے والا اس حقیقت سے واقف نہیں۔ اس کو کیا پتہ کہ زمستان کی حسین رات کے ہنگام کا طلسم کیا ہوتا ہے —— ؟ اس کے لئے عشق ایک نغمۂ خام ہے، —— ایک بے معنی سی چیز ہے۔ کیونکہ وہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے ؎

جسم ہے روح کی عظمت کیلئے زینۂ نور
منبعِ کیف و سرور
نارسا آج بھی ہے شوق پرستارِ جمال
آہ! انسان کہ ہے جادہ کشِ راہِ طویل

(روحِ یوناں پہ سلام)

اک زمستاں کی حسیں رات کا ہنگام تپاک

اس کی لذات سے آگاہ ہے کون؟ —

عشق ہے تیرے لئے نغمۂ خام

کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

اور پھر وہ یہ کہتا ہے کہ شب ہائے زمستاں ابھی بیکار نہیں — اور نہ ایام بہار بے سود ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تو جسم و روح کے آہنگ سے محروم ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ انسان ابھی تک وہموں کا شکار ہے۔ وہ حسن کو اب تک دھوکا دے رہا ہے۔ وہ آج بھی اس کو ذوق تقدیس پر مجبور کر رہا ہے۔ لیکن یہ حالات اس کے اندر رجائی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ اس کو مستقبل ایک دوسرا رنگ بدلتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مزامیر کے تار ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے ؎

جسم اور روح کے آہنگ سے محروم ہے تو!

ورنہ شب ہائے زمستاں ابھی بیکار نہیں

اور نہ بے سود ہیں ایام بہار!

آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی

حسن بے چارے کو دھوکا سا دیئے جاتا ہے

ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے

ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار

مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب

ہے یہی حضرت یزداں کے تمسخر کا جواب!

ظاہر ہے کہ ان خیالات کو سامنے رکھ کر جو شاعری ہوگی اس میں قدامت سے انحراف ہوگا۔ ان کے خیالی نظریوں سے مخالفت ہوگی۔ ان میں پیش کئے ہوئے خیالات کو روحانیت اور تقدس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس میں جنسی باتوں کا بیان جگہ جگہ ملے گا۔ اس میں ایک انسان —— اور نارمل انسان کے جذبات و احساسات کی تصویر نظر آئے گی۔

چنانچہ نئی شاعری ہمیں اسی دنیا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں جس عشق و محبت کا تذکرہ ہے، وہ انسانوں کا عشق ہے — فرشتوں کا نہیں۔ اس میں جن خواہشات کو پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی انسانی ہیں ملکوتی نہیں۔ نیا شاعر خیالی دنیا میں رہنا نہیں جانتا۔ وہ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، حسین لڑکیوں کے حسن سے متاثر ہوتے اور ان سے ہم آغوشی کی خواہش رکھتے ہوئے انسانوں کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے، اور اس ماحول کے اثرات جو اس کے دل و دماغ پر پڑتے ہیں۔ وہ ان کو کھل کر پیش کر دینے میں جھجکتا نہیں —— اور پھر پچھلے چند سالوں میں ہمارے سماج نے بھی تو کروٹ لی ہے۔ وہ بھی تو اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بہت سے ایسے رسوم و رواج جو آج تک اس کو بیسیوں بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، آج ختم ہو چکے ہیں۔ نئی زندگی نے اب صنف نازک کو بڑی حد تک مکانوں کے زندانوں سے باہر نکلنے کی ترغیب دی ہے۔ ان کے لباس میں تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ سجا بنا کر سر بازار شاہراہوں پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ نیا شاعر ان کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ اس کے جنسی جذبے کو تحریک ہوتی ہے۔ اور جو کچھ اس کے دل پہ گزرتی ہے، وہ اس کا بیان کھل کر کر دیتا ہے۔ پرانے شاعروں نے بھی ان چیزوں کو پیش

کیا تھا لیکن ان کے بیان میں خارجی پہلو کو زیادہ دخل تھا۔ داخلی عنصر کی اس میں کمی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ نئے شاعروں کی طرح حساس نہیں تھے۔ اور چونکہ جنسیات کے معاملے میں وہ بعض سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، اس لئے اس کے بیان میں وہ اپنے آپ کو زیادہ آلودہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ جنسی تعلقات، جنسی تحریک، اور اسی طرح کی دوسری باتوں سے دور بھاگتے تھے۔ کیونکہ ان میں سماجی بندھنوں کو توڑ دینے کی سکت نہیں تھی جو ان پر صدیوں سے عائد تھے۔ اور پھر چونکہ خود ان کے دلوں میں چور تھا اسلئے وہ کھل کر ان باتوں کا بیان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے جس ماحول میں سانس لی۔ وہ انہیں چھپ کر گناہ کرنے کا درس دیتا تھا۔ نئے شاعروں کو یہ دورنگی پسند نہ آئی —— وہ اپنی تمام کیفیات کو پیش کر دینے ہی میں اپنے آرٹ کی معراج خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ آج ہمیں، ان میں سے اکثر کے یہاں جنسی جذبات اور جنسی کیفیات کی تصویریں کھُلم کھُلا نظر آتی ہیں ——!

مثال کے طور پر جدید شاعروں میں راشد کو دیکھئے کہ وہ شروع شروع میں بالکل ایک رومانی شاعر نظر آتا ہے۔ جب وہ ایک حد تک روایتی طرز میں اپنے محبوب اور اپنی محبت کا تذکرہ کرتا ہے۔ چنانچہ "میں اسے واقفِ الفت نہ کروں"۔ "رخصت"۔ "گناہ و محبت"۔ —— اور "مری محبت جواں رہے گی"۔ وغیرہ اس کی اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ "گناہ و محبت میں وہ اپنی محبت کو بالکل روایتی طرز میں پیش کرتا ہے۔ وہ پہلے کہتا ہے کہ جوانی نے اس سے بہت سے گناہ کرائے ہیں۔ وہ برسوں شب و روز اسی معصیت کی دنیا میں رہا ہے ؎

غرض جوانی میں اہرمن کے طرب کا سامان بن گیا میں

گنہ کی آلائشوں میں لتھڑا ہوا اک انسان بن گیا میں

لیکن اس کے بعد محبت نے اس کو ایک خاص راستے پر لگایا۔ اور اس کی زندگی کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کر دیا ؎

مجھے محبت نے معصیت کے جہنموں سے بچا لیا ہے

مجھے جوانی کی تیرہ و تار پستیوں سے اٹھا لیا ہے

یہ جوانی کی تیرہ و تار پستیاں، یہ گناہ کی آلائشیں، اس کو ایک خاص دور، ایک وقت اور ایک خاص ماحول کا انسان ثابت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ شاہراہ جنسیات پر آگے بڑھتا ہے۔ تو حالات کے تیور اس کو روش بدل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اب اس کی دبی ہوئی خواہشات اور تقدس سے ہم آغوش زندگی اس کیلئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس کو رہ رہ کر اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ برسوں وہ تقدس کی دنیا میں رہا۔ کسی پر اس کی روح نمایاں نہ ہو سکی۔ اپنی امنگوں پر وہ خود حکومت کرتا رہا ؎

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو   وہیں دیا ہے شب و روز پیچ و تاب انہیں

زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو   کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انہیں

خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو   کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انہیں

لیکن یہاں پہنچکر اس کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کو اپنے ضبط کی یہ سزا مل رہی ہے کہ اس کا شباب ایک زہر سے لبریز شباب ہو چکا ہے۔ اب اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش چٹکیاں لیتی ہے۔ اور وہ حسرت کے انداز میں کہتا ہے ؎

اے کاش [illegible]

اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا   حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

[illegible]

[illegible] لیکن ان سب میں بھی اس کو اسی ایک خواب سیمگوں" کی حکومت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کا دل یہ کہتا ہے ؎

مرا دل چاہتا ہے ایک دن اس خواب سیمیں کو   حجابِ فن رقص و نغمہ سے آزاد کر ڈالوں

ابھی تک یہ گریزاں ہے محبت کی نگاہوں سے اسے اک پیکرِ انسان میں آباد کرڈالوں

اس منزل کے بعد وہ اپنی شاعری کے اس موڑ پر آجاتا ہے، جہاں اس کے یہاں تقدس کا پتہ نہیں چلتا۔ اب وہ اس دنیا کا ایک نارمل انسان بن جاتا ہے۔ اب وہ صنف نازک کے جسم کے قریب بیدھڑک پہنچ سکتا ہے، اور اس سے "اخذِ نور و نغمہ" کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سینے میں لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس موقع پر "زندگی کی لذتوں" سے "سینہ بھر لینے اور اپنی روح کی تکمیل کرلینے کا خواہشمند نظر آتا ہے ؎

دیکھ اس جذبات کے نشے کو دیکھ!
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو چلی
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے
مجھکو اپنی روح کی تکمیل کرلینے بھی دے!

اور پھر اس کے بعد وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس کی شاعری میں ہمیں کہیں "ہونٹوں کے لمس" کا تذکرہ ملتا ہے — کہیں زمستاں کی حسین رات اور اس میں کسی تاک کے سائے تلے ایک کیف و سرور کی دنیا کا بیان —! جب وہ کسی جسم کے نیستانِ بہار سے، اپنی روح کی تشنگی کو بجھاتا ہے۔ جب وہ ایک "لذتِ جاوید" کا آغاز کرتا ہے۔ جب وہ کسی کی نکہت و مستی سے کیف حاصل کرتا ہے۔ اور کسی کے سینے کے سمن زاروں میں لرزشیں سی اٹھ کر اس کے "انگاروں" کو بے تابانہ اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ اب وہ اس منزل پر آجاتا ہے جب وہ چاندنی میں شیشم کے درختوں کے نیچے اپنے بوسوں سے اپنی روح کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک روح کا اظہار ہی ایک چیز ہے —— روح تو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے۔ —— اب اگر وہ محبت بھی کرتا ہے —— اور محبت تو اس نے کئی بار کی ہے —— تو اس میں تقدس کو دخل نہیں ہوتا۔ اب وہ محبت کی دنیا میں ایک بدلا ہوا انسان ہے ؎

میں جو سرمست نہنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشیٔ عشرت کے لئے
اور تیری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذت کے لئے

لیکن اس کے باوجود، اس کی محبت ہے محبت ——! اس کی نوعیت ضرور بدل گئی ہے، لیکن یہی بدلی ہوئی نوعیت زیادہ سائنٹفک ہے —— زندگی سے قریب ہے —— حقیقت ہے —— اس میں سچائی اور وفاکیشی کو دخل ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہہ دیتا ہے ؎

مرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ!
اور مرے عشق سے مایوس نہ ہو!
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

یہ ہے راشد کے ذہنی ارتقا اور اس کی شاعری کی مختلف منزلوں کی مختصر سی کہانی —! اس نے عشق و محبت کو زیادہ سے زیادہ بنا سنوار کر حقیقت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جس میں روحانیت میں ڈوبی ہوئی خیالی باتوں کو مطلق دخل نہیں — برخلاف اس کے ان کی نوعیت شروع سے آخر تک جنسی ہے —— اور جس کا بیان شروع سے آخر تک حقیقت نگاری سے ہم آغوش ہے۔

راشد کے علاوہ بھی نئے شاعروں میں، زیادہ کا یہی حال ہے کہ وہ عشق و محبت کی تشکیل میں جنسی جذبے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور

کیا تھا لیکن ان کے بیان میں خارجی پہلو کو زیادہ دخل تھا۔ داخلی عنصر کی اس میں کمی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ نئے شاعروں کی طرح حساس نہیں تھے۔ اور چونکہ جنسیات کے معاملے میں وہ بعض سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، اس لئے اس کے بیان میں وہ اپنے آپ کو زیادہ آلودہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ جنسی تعلقات، جنسی تحریک، اور اسی طرح کی دوسری باتوں سے دور بھاگتے تھے۔ کیونکہ ان میں سماجی بندھنوں کو توڑ دینے کی سکت نہیں تھی جو ان پر صدیوں سے عائد تھے۔ اور پھر چونکہ خود ان کے دلوں میں چور تھا اسلئے وہ کھل کر ان باتوں کا بیان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے جس ماحول میں سانس لی۔ وہ انہیں چھپ کر گناہ کرنے کا درس دیتا تھا۔ نئے شاعروں کو یہ دورنگی پسند نہ آئی —— وہ اپنی تمام کیفیات کو پیش کر دینے ہی میں اپنے آرٹ کی معراج خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ آج ہمیں، ان میں سے اکثر کے یہاں جنسی جذبات اور جنسی کیفیات کی تصویریں کھلم کھلا ملتی ہیں —— !

مثال کے طور پر جدید شاعروں میں راشد کو دیکھئے! کہ وہ شروع شروع میں بالکل ایک رومانی شاعر نظر آتا ہے۔ جب وہ ایک حد تک روایتی طرز میں اپنے محبوب اور اپنی محبت کا تذکرہ کرتا ہے۔ چنانچہ "میں اسے واقفِ الفت نہ کروں"۔ "رخصت"۔ "گناہ و محبت"۔ —— اور "مری محبت جواں رہے گی"۔ وغیرہ اس کی اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ "گناہ و محبت" میں وہ اپنی محبت کو بالکل روایتی طرز میں پیش کرتا ہے۔ وہ پہلے کہتا ہے کہ جوانی نے اس سے بہت سے گناہ کرائے ہیں۔ وہ برسوں شب و روز اسی معصیت کی دنیا میں رہا ہے ؎

غرض جوانی میں اہرمن کے طرب کا سامان بن گیا میں

گنہ کی آلائشوں میں لتھڑا ہوا اک انسان بن گیا میں

لیکن اس کے بعد محبت نے اس کو ایک خاص راستے پر لگایا۔ اور اس کی زندگی کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کر دیا ؎

مجھے محبت نے معصیت کے جہنموں سے بچا لیا ہے

مجھے جوانی کی تیرہ و تار پستیوں سے اٹھا لیا ہے

یہ جوانی کی تیرہ و تار پستیاں، یہ گناہ کی آلائشیں، اس کو ایک خاص دور، ایک وقت اور ایک خاص ماحول کا انسان ثابت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ شاہراہ جنسیات پر آگے بڑھتا ہے۔ تو حالات کے تیور اس کو روش بدل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اب اس کی دبی ہوئی خواہشات اور تقدس سے ہم آغوش زندگی اس کیلئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس کو رہ رہ کر اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ برسوں وہ تقدس کی دنیا میں رہا۔ کسی پر اس کی روح نمایاں نہ ہو سکی۔ اپنی امنگوں پر وہ خود حکومت کرتا رہا ؎

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو

وہیں دیا ہے شب و روز پیچ و تاب انہیں

زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو

کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انہیں

خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو

کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انہیں

لیکن یہاں پہنچکر اس کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کو اپنے ضبط کی یہ سزا مل رہی ہے کہ اس کا شباب ایک زہر سے لبریز شباب ہو چکا ہے۔ اب اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش چٹکیاں لیتی ہے۔ اور وہ حسرت کے انداز میں کہتا ہے ؎

اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا

حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے ؟

اور پھر وہ ادب اور آرٹ میں سکون تلاش کرتا ہے۔ لیکن ان سب میں بھی اس کو اسی ایک "خوابِ سیمگوں" کی حکومت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کا دل یہ کہتا ہے ؎

مرا جی چاہتا ہے ایک دن اس خوابِ سیمیں کو

حجابِ فن رقص و نغمہ سے آزاد کر ڈالوں

ابھی تک یہ گریزاں ہے محبت کی نگاہوں سے
اسے اک پیکرِ انسان میں آباد کر ڈالوں

اس منزل کے بعد وُہ اپنی شاعری کے اس موڑ پر آجاتا ہے، جہاں اس کے یہاں تقدس کا پتہ نہیں چلتا۔ اب وُہ اس دنیا کا ایک نارمل انسان بن جاتا ہے۔ اب وُہ صنفِ نازک کے جسم کے قریب بیدھڑک پہنچ سکتا ہے، اور اس سے "اخذِ نور و نغمہ" کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سینے میں لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وُہ اس موقع پر "زندگی کی لذتوں" سے "سینہ بھر لینے اور اپنی روح کی تکمیل کر لینے کا خواہشمند نظر آتا ہے ؎

دیکھ اس جذبات کے نشّے کو دیکھ!
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو چلی
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے
مجھکو اپنی روح کی تکمیل کر لینے بھی دے!

اور پھر اس کے بعد وُہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس کی شاعری میں ہمیں کہیں "ہونٹوں کے لمس" کا تذکرہ ملتا ہے — کہیں زمستاں کی حسین رات اور اس میں کسی تاک کے سائے تلے ایک کیف و سرور کی دنیا کا بیان — ! جب وُہ کسی جسم کے نیستان بہار سے، اپنی روح کی تشنگی کو بجھاتا ہے۔ جب وُہ ایک "لذتِ جاوید" کا آغاز کرتا ہے۔ جب وُہ کسی کی نکہت و مستی سے کیف حاصل کرتا ہے۔ اور کسی کے سینے کے سمن زاروں میں لرزشیں سی اٹھ کر اس کے "انگاروں" کو بے تابانہ اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ اب وُہ اس منزل پر آجاتا ہے جب وُہ چاندنی میں شیشم کے درختوں کے نیچے اپنے بوسوں سے اپنی روح کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک روح کا اظہار ہی ایک چیز ہے — روح تو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے۔ — اب اگر وُہ محبت بھی کرتا ہے — اور محبت تو اس نے کئی بار کی ہے — تو اس میں تقدس کو دخل نہیں ہوتا۔ اب وُہ محبت کی دنیا میں ایک بدلا ہوا انسان ہے ؎

میں جو سرمست نہنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشیٔ عشرت کے لئے
اور تیری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذت کے لئے

لیکن اس کے باوجود "اس کی محبت ہے محبت — ! اس کی نوعیت ضرور بدل گئی ہے، لیکن یہی بدلی ہوئی نوعیت زیادہ سائنٹفک ہے — زندگی سے قریب ہے — حقیقت ہے — اس میں سچائی اور وفاکیشی کو دخل ہے۔ چنانچہ وُہ یہ کہہ دیتا ہے ؎

مرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ!
اور مرے عشق سے مایوس نہ ہو!
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

یہ ہے راشد کے ذہنی ارتقا اور اس کی شاعری کی مختلف منزلوں کی مختصر سی کہانی — ! اُس نے عشق و محبت کو زیادہ سے زیادہ بنا سنوار کر حقیقت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جس میں روحانیت میں ڈوبی ہوئی خیالی باتوں کو مطلق دخل نہیں — برخلاف اس کے ان کی نوعیت شروع سے آخر تک جنسی ہے — اور جس کا بیان شروع سے آخر تک حقیقت نگاری سے ہم آغوش ہے۔

راشد کے علاوہ بھی نئے شاعروں میں، زیادہ کا یہی حال ہے کہ وُہ عشق و محبت کی تشکیل میں جنسی جذبے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور

اپنے اس قسم کے جذبات و احساسات کو کھلم کھلا پیش کر دینے میں جھجکتے نہیں ـــ میراجی کو دیکھئے کہ اس کی شاعری میں شروع سے آخر تک جنسیات کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے ۔ وہ خود لکھتا ہے کہ "جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں ۔ اور جنس کے گرد آلودگی جو تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے ۔ وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے ۔ اسلئے رد عمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ـــــ جو میرا آدرش ہے" یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں قدم قدم پر جنسی جذبے کے مختلف حالات، و کیفیات کا بیان ملتا ہے ـ جو خیالات جنسی اعتبار سے آج کل کے نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ ان سب کو پیش کرتا ہے ۔ جن باتوں کو دوسرے کہنے میں جھجکتے ہیں ۔ وہ ان کو کھل کر کہہ دینے سے باز نہیں رہتا لیکن بہر حال وہ چند حقیقتوں کا بیان ہوتا ہے ۔ اس لئے اس کو صرف عریاں ہونے کے باعث مطعون نہیں کیا جاسکتا ۔ وہ جب یہ کہتا ہے ؎

آج رات
میرا دل
چاہتا ہے تو بھی میرے پاس آ
اور سوئیں ساتھ ساتھ

تیرے پیراہن مجھے
یاد آتے ہیں بہت
آسماں بھی صاف ہے
اور ستارے اور چاند
بیخود و سرمست ہیں
تازگی
ہے عیاں
ذرے ذرے سے زمیں کے آہ لیکن بے بسی،
اور تنہائی مری!

آج تو آجا مری ہمراز بن
آ بھی جا!
آ گھٹائیں آ رہی ہیں بے نشاں رفتار سے
اور ان کالی گھٹاؤں میں سے سرمستی، خمار
اور پانی کے ہیں تار
تو بھی آ
مل کے ہم

آج رات،
گا ہی لیں چاہت کے گیت ؟
جسم بھی تیرا مجھے مرغوب ہے
اور تیری ہر ادا
اور یہ چہرہ ترا
محبوب ہے

تیری یہ پیاری جوانی اک اچھوتی سی کلی
اور صورت سادی سادی سانولی،
اور ترے بالوں میں یہ چمپا کے پھول
اور نازک ہاتھ پر لپٹا ہوا گجرا ترا
اور گلے میں ایک ہار
آہ تیرے سب سنگار
کھینچتے ہیں دل کے تار
اور اک ہلکی سی گونج
اس فضا کی وسعتوں میں کھو گئی

آ مری ننھی پری!
آ مری من موہنی!
آج رات،
چاہتا ہوں تو بھی میرے پاس ہو! (سرگوشیاں)

تو نہ صرف اپنی خواہشات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ سارے نوجوانوں کی دلی کیفیات کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ کون ایسا نوجوان ہے، جو تنہائی کے لمحوں میں ایسی باتیں نہ سوچتا ہو۔ دوسرے اس کو چھپاتے ہیں۔ میرا جی ان کو بیان کر دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی شاعری میں ہمیں کہیں کہیں ایک صحت مند انسان کی جنسی کیفیات کا پتہ نہیں بھی چلتا۔ برخلاف اس کے وہ کہیں کہیں جنسی حیثیت سے مریض معلوم ہوتا ہے۔ اس نے محبت کی ہے لیکن وہ عورت سے دور رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی اس دوری نے اس کو ایسے اقدامات کرنے کیلئے مجبور کیا ہے، جو فطری نہیں ہوتے اور جن کا ارتکاب، انسان کو جنسی حیثیت سے صحت مند نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ وہ عورت کے جادو کو پچھلتی نظر سے دیکھ کر ہی جی بھر لیتا ہے۔ اب یہ عورت کے جادو کو پچھلتی نظر سے دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟ —— اس کا اندازہ آپ ہی لگائیے! آخر میں پہنچ کر اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ "لب جوئبارے" میں جب ایک عورت کو ندی کے کنارے پیشاب کرتے ہوئے دیکھتا ہے، تو اس کی کچھ بن نہیں آتی۔ اس کو یقین ہے کہ وہ جنسی فعل کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اس لئے نتیجہ مشت زنی نکلتا ہے۔ اور اس طرح اس کے رہے سہے جنسی جذبے کو تسکین ہو جاتی ہے "سرسراہٹ" میں

بھی اس نے جس جنسی کیفیت کو پیش کیا ہے، اس میں بھی یہی رنگ ہے۔ میراجی نے اس کے متعلق خود لکھا ہے "سرسراہٹ ذہنی کیفیت کا ایک لمحہ ہے جس کی نوعیت جنسی ہے" ـــــ لیکن یہ لمحہ ایک صحت مند انسان کی ذہنی کیفیت کا لمحہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں بھی ابنارمل ذہنی عیاشی کا احساس ہوتا ہے۔ سلوٹوں کے استعارے ہی میں یہ چیز موجود ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کا لکھنے والا اپنے آپ ہی ایک خاص حالت میں کیف محسوس کر رہا ہے۔ ؎

یہاں ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں
یہ لہریں ہیں، بہی جاتی، اور مجھ کو بہاتی ہیں
یہ موجِ بادہ ہیں، ساغر کی خوابیدہ فضاؤں میں
اچانک جاگ اُٹھتی ہے۔
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے
تو اس کے ہونٹ متبسّم ہوں، شائد قہقہہ اٹھ کر، جکڑ لے اپنے ہاتھوں سے
(سرسراہٹ)

یہ سلوٹوں پر ہاتھ رکھنا، یہ لہروں کا بہے جانا، یہ ساغر کی خوابیدہ فضا کا اچانک دل میں جاگ اُٹھنا، اس بات کی غمازی کرتا ہے، جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ میراجی کی اسی غیر صحت مندانہ جنسی کیفیت نے اس کو بڑی حد تک قنوطی بنا دیا ہے۔ اس کی شاعری میں امنگ اور جولانی کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ ایک بجھی بجھی سی کیفیت ہے۔

اور پھر نوجوان شاعروں میں وشوامتر عادل کو دیکھئے! اس کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی وہ بھی اپنی شاعری میں اپنے آپ کو اسی دنیا کا ایک نارمل انسان بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں زیادہ نظمیں اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ اس نے محبت کی ہے، لیکن بعض سماجی پابندیوں اور تمدنی جکڑبندیوں کے باعث، اس کو بارہا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اس کی آدرشی عورت اس کے راج محل کی رانی نہ بن سکی۔ برخلاف اس کے وہ دوسروں کے ساتھ باندھ دی گئی ـــــ جس کا اثر عادل پر ہوا کہ وہ پریشان حال پھرنے لگا ـــــ وقت کا ایک ایک لمحہ اس کو پہاڑ معلوم ہونے لگا۔ جو کسی طرح بھی کاٹے نہیں کٹتا۔ اس کی ساری زندگی بے کیف و بے رنگ و بو ہو گئی۔ وہ ایک ناکام و نامراد نوجوان کی طرح سڑکوں کی خاک چھانتا ہوا، دیوانہ وار ادھر ادھر پھرنے لگا۔ زندگی کو سکون دینے کی غرض سے قہوہ خانوں کے پیالوں میں گھلتا رہا۔ اور دفتروں کے کاغذوں میں گم بھی ہوتا رہا۔ لیکن سب سے آخر میں جب ضبط کی انتہا نہ رہی۔ تو کسی شاہراہ پر گزرتے ہوئے ـــــ ٹوٹے پھوٹے بھورے بھورے آشیانوں کی روشنی اس کے احساسات کو ترغیبِ گناہ دینے لگی۔ یعنی اس کی جنسی خواہشات میں بھی ارتعاش پیدا ہوا۔ کیونکہ وہ بہر حال فطری ہیں اور کسی طرح بھی دب نہیں سکتیں۔ اس لئے وہ کھلم کھلا ان آشیانوں کی طرف جا کر اپنی پیاس بجھانے لگا۔ لیکن اس کی آدرشی عورت کے خیال نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس کی محبت برقرار رہی۔ اور وہ ایک لمحے کیلئے بھی اس کے خیال سے بے خبر نہیں رہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عادل اپنی شاعری میں ناکامی کی تلخی کو دور کرنے اور اس سے پیدا شدہ تکلیف کو فراموش کرنے کیلئے شراب کی طرف رجوع نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ زیادہ سکون کا باعث بن سکتی ہے ـــــ لیکن جنسی جذبہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ بات پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جہاں تک جنسی جذبے کی تکمیل کا تعلق ہے وہ اس میں ہر نارمل انسان کی طرح بے بس ہے۔ کیونکہ فطرت کے سامنے کسی کی پیش نہیں جا سکتی۔ وہ شراب سے احتراز کر سکتا ہے۔ لیکن ایک فطری خواہش کی تکمیل کیلئے اس کو ٹوٹے پھوٹے بھورے آشیانوں کی طرف جانا ہی پڑتا ہے ؎

دفتروں کے کاغذوں میں گم ہوا جاتا ہوں میں
قہوہ خانوں کے پیالوں میں گھلا جاتا ہوں میں

یا اندھیری رات میں
سونے سونے راستوں کے آس پاس
سوکھے سوکھے شیشموں کے اور کھمبوں کے ہجوم
دیکھتا جاتا ہوں ——— یونہی سوچتا جاتا ہوں میں
یا بڑھا جاتا ہوں میں
ٹوٹے پھوٹے بھورے بھورے آشیانوں کی طرف
جن کی ہلکی کپکپاتی روشنی
میرے احساسات کو دیتی ہے ترغیبِ گناہ!　　　(...... کہ تو عورت نہیں)

عادل کی ایک اور نظم ہے ——— خاکے! جس میں اس نے اپنی محبت کی کہانی اور اس کی بعد کی کیفیت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنی اور شی عورت سے اپنی پہلی ملاقات کا بیان کرتا ہے۔ جب وہ عورت اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی ——— نظریں جھکائے ہوئے گویا خاموشی سے پیمانِ محبت باندھ رہی ہو۔ اور ادھر عادل کے دل میں سینکڑوں خواہشات انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اس وقت اس کو سوائے اس کے کوئی اور خیال نہیں آتا کہ اگر وفورِ شوق میں۔ اس گرم جواں، گرم، تنومند ہاتھ، اس کے خم کمر سے چھونے لگا تو کیا ہوگا۔ اور اس کے کمر کا خط گویا اس کے بازو کو بلاوا دے رہا تھا ——— یعنی وہی خیالات اور وہی خواہشات جو جنسی ہیں ——— مگر جو ہیں بالکل فطری! ——— اور جن کا پیدا ہونا ہر نوجوان کے دل میں ازبس ضروری ہے ؎

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بڑھا بڑھا کے، بڑھاتی ہوئی سکون کے ہاتھ
چمکتے کانچ کا گلدان تھا کنارے پر
سفید پھول کی گردن جھکی جھکی ہی رہی
سکوت ریشمی پردوں کی نرم لہروں کو
تھپک تھپک کے سلاتا رہا، سلاتا رہا
کھڑی ہوئی وہ دریچے کے پاس دیکھتی تھی
ردائے آبِ افق تیرتی ابابیلیں!
میں اس کے پاس کھڑا اپنے دل میں سوچتا تھا
مرے قریب، مگر پھر بھی کتنی دور ہے تو!
کمر کا خط مرے بازو کو اک بلاوا ہے
جواں گرم تنومند ہاتھ بڑھ کے اگر
خم کمر سے جو چھونے لگا تو کیا ہوگا؟
کھنچے رہے مگر احساس کے ستار کے تار
اور اس کی گود میں خاموش درد کا مارا

اداس گیت محبت کا تھرتھراتا رہا!

(خاکے)

لیکن اس وقت اس کو اس کیفیت کے ساتھ مذہب و رسم و رواج کا ایک بھوت بھی نظر آ رہا تھا۔ جو اس کی طرف جھپٹتا تھا اور اس کی محبت کو ناکام بنانے کے درپے تھا ؎

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بڑھا بڑھا کے بڑھاتی ہوئی سکون کے ہاتھ
میں اس کے پاس کھڑا تھا مگر وہ تنہا تھی
افق پہ ابر کے ٹکڑے تھے سرد آئینے
انہی پہ میری نظر تلخ انجماد بنی
جھلک رہا تھا بھیانک مہیب تیرہ و تار
جہاں کے مذہب و رسم و رواج کا اک بھوت
جو بار بار لپکتا تھا، دانت پیستا تھا
وہ ڈر گئی، وہ تو عورت تھی اس نے کچھ نہ کہا
پرے کھجور کے اوپر خموش گول سا چاند
ابھر رہا تھا، ابھرتا رہا، ابھرتا رہا

(خاکے)

جو اس کو ناکامی کا منہ دکھانے سے باز نہ رہا۔ اس کی دنیا اجڑ گئی۔ اور وقت کا ایک ایک لمحہ اس پہ بار ہونے لگا۔ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں اس کے جسم کو چپ چاپ چوستی رہیں ؎

مری تڑپتی ہوئی روح پھڑپھڑاتی ہے
نحیف زیست سے عاری ہے، پر بھی ٹوٹے ہوئے
مگر یہ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں چپ چاپ
لپٹ لپٹ کے اسے بار بار چوستی ہیں

(خاکے)

لیکن بہرحال وہ انسان تھا۔ یہ ناکامی اور اس عورت کا خیال مل کر اس کے جنسی جذبے کو ختم نہیں کر سکتے تھے جو بالکل فطری ہے۔ چنانچہ وہ تنہائی سے تنگ آ کر اپنے جسم کو (روح کو نہیں) ایک ایسے جسم کے قریب لے جاتا۔ جو چند لمحوں کے لئے اس کے قبضے میں ہے۔ وہ اس سے نگاہیں ملانا چاہے تو نگاہیں بھی ملا سکتا ہے۔ اگر اس کے بال بکھیرنا چاہے تو بال بھی بکھیر سکتا ہے۔ اگر لپٹنا چاہے تو بے دھڑک اور بغیر کسی روک کے لپٹ بھی سکتا ہے۔ غرض اس منزل پر اس کے لئے کوئی روک نہیں۔ اور وہ اب مجبوراً اسی دنیا میں رہنے لگتا ہے ؎

برہنہ جسم ہے اور اجنبی فضا لیتہ
خزاں میں فرش گلستاں کا ایک آئینہ
"ذرا نظر تو اٹھاؤ" نگاہیں ملتی ہیں
"بکھیر بھی دو حسیں بال" تو بکھرتے ہیں
"لپٹنے دو بھی مجھے"۔ میں لپٹتا جاتا ہوں

کوئی بھی روک نہیں ہے کوئی بھی روک نہیں،

فسردہ رات کی تنہائی اب سمٹتی ہے،

سمٹ سمٹ کے سکڑتی ہوئی سکڑتی ہوئی

یہ مجھ سے کہتی ہوئی اب یہاں نہ آئیں گے

(خاکے)

عادل اور اس کے علاوہ اکثر نوجوان شاعروں کا یہی حال ہے کہ وہ خیالی دنیا میں نہیں رہتے۔ بلکہ تمام حالات کو سائنٹیفک طریقے پر حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ جنسی جذبے کی اہمیت کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس جذبے کی تسکین بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں اس بنیادی جنسی جذبے کا ذکر بار بار ملتا ہے —— لیکن یہ حقیقت نگاری ہے —— عریانی نہیں۔! بعض لوگوں کے نزدیک اس قسم کے بیانات عریاں ضرور کہے جا سکتے ہیں، لیکن یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس زمانے سے بہت پیچھے ہیں۔ جو سامنتی دور میں سانس لینے اور پرورش پانے کے باعث ہر چیز کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ سامنتی دور میں نہ صرف جنسی مسائل کو بلکہ ہر چیز کو چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور آج بھی کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے شاعروں کو ایک طرف تو سامنتی دور کے خیالات سے نفرت ہے، اس لئے وہ اس کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کے خواہشمند ہیں۔ اور دوسرے اب وہ زیادہ بالغ نظر ہو چکے ہیں۔ ان کا زاویۂ نظر اور ہر بات تک پہنچنے کا طریقہ، اب زیادہ سائنٹیفک ہو گیا ہے۔ اس لئے قدامت و جدت کے درمیان ایک نمایاں فرق ہونا ہی چاہیئے —— یہ چیز شاعری میں بھی موجود ہے۔ اگر قدامت اس میں بعض پیش کی ہوئی باتوں کو عریاں سمجھتی ہے تو جدت اس کو حقیقت نگاری خیال کرتی ہے۔

نئے شاعر چونکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہیں، اس لئے وہ ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی جھجکتے نہیں، جہاں سماج کے بعض افراد، اپنی جنسی خواہشات کو تسکین دینے کیلئے بے جا دست درازیاں کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ موقع پاکر کسی دوشیزہ کی جوانی کو چند سکوں کے عوض خریدتے ہیں۔ کہیں کسی مزدور عورت کی عصمت و عفت پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ کہیں پروہت اور پجاریوں کا روپ دھار کر تقدس کے سائے میں کسی نوجوان عورت کی زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ ہمارے شاعر ان مسائل کو بھی فراموش نہیں کرتے — چنانچہ آج کل کی شاعری میں ایسی باتوں کا بیان بھی زیادہ ملتا ہے۔ کیونکہ ان سب کے یہاں موجودہ نظام زندگی کے خلاف "تنفر کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ جس نے ان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ سماج کی تمام چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ نئے شاعر جب ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، تو وہ ان سے کوئی جنسی کیف حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ سماج کے افراد میں دست دراز لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ اس لئے یہاں جو عریانی پیدا ہوتی ہے، وہ اول تو زندگی کے ایک رخ کی سچی تصویر ہے۔ اور دوسرے اپنے اندر ایک مقصد رکھتی ہے۔ جو حقیقتاً ایک بڑا مقصد ہے۔ سلام مچھلی شہری جب ایک مزدور عورت پر ایک سرمایہ دار کی دست درازیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس میں کہیں بھی اس کا شائبہ نہیں ہوتا کہ وہ اس میں خود کوئی کیف محسوس کر رہا ہے۔ بلکہ وہ تو ایک مصور کی طرح ایک خاص منظر کی تصویر کھینچتا ہے ؎

یہ سیکٹری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں،

یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے

یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں!

—— ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہے یہ!

—— ہاں اس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے

ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے
سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے، ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ!
—— اتنی جلدی مزدور عورت آخر یہ گھبے ہیں بانہیں کیوں؟
لے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے
اس ملک کے رہنے والوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے
اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں؟
—— میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پائپ کے دھوئیں کے بادل میں
میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخئیل کے میلے آنچل میں
(ڈرائنگ روم)

اسی طرح جب "بھینٹ" میں ہر ایک پجاری کی کارفرمائیوں کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ ؎

تقدس کے حسین شیطان کے قدموں کی آہٹ میں
یہاں دوشیزگی کی چیخ بھی گم ہو گئی آخر
گھنے پتوں کے نیچے مورتی کی مسکراہٹ میں
ہمیشہ کیلئے بھولی پجارن کھو گئی آخر
(بھینٹ)

تو بھی کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خود اس منظر سے کوئی دلچسپی لے رہا ہے۔ برخلاف اس کے اس کی تہ میں ایک نفرت کا جذبہ ہے۔ اور یہاں تو کوئی ایسی زیادہ عریانی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی فنکاری اس میں وہی پوشیدگی کا عنصر پیدا کر دیتی ہے، جس سے اس کا تاثر بھی بڑی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ اس قسم کی باتیں ہماری سماج کیلئے ایسی کچھ نئی نہیں ہیں۔ ایسے واقعات آئے دن ہم اپنی آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سنا اور اخباروں میں پڑھا کرتے ہیں۔ شاعر ان سے تحریک لیتے ہوئے، ان کو نظم کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ جدید شاعر ایسی باتیں ضرور کرنے لگتے ہیں، جس سے ان کی ذہنی عیاشی کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی وہ عورت کے جسم اور اس سے پیدا شدہ کیفیت کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن عورت کے جسم اور اس سے پیدا شدہ سرور و کیف کا بیان کوئی ایسی چیز نہیں، جو صرف آج کی شاعری میں کیا جا رہا ہو۔ بلکہ دنیا بھر کے ادب اور آرٹ میں عورت کے جسم کے بیان کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ شاید ہی دنیا کا کوئی شاعر، کوئی ناول نگار، کوئی افسانہ نویس، کوئی بت تراش اور کوئی مصور ہو جس نے عورت کے جسم اور اس سے پیدا شدہ لذت کا بیان اپنی تخلیقوں میں نہ کیا ہو۔ آج سے صدیوں پہلے بعضوں نے تو ایسی باتیں کہی تھیں، جن کو آج بیسویں صدی میں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن آرٹ اور ادب کو اخلاقیات کے بندھنوں سے بلند ہونا چاہئے۔ اگر اس پر بھی اخلاق کی بندشیں عائد کر دی گئیں تو فنکاروں کی آوازیں گھٹی گھٹی آوازیں معلوم ہوں گی۔ آرٹ کیلئے تو بس اتنا کافی ہے کہ وہ کسی بھی حسین چیز کی تخلیق کرے۔ اگر وہ دنیا کے کسی موضوع کو بھی اپنا کر حسن سے ہم آغوش کر سکتا ہے۔ تو وہ کامیاب ہے۔ اور یہی حسن سچائی اور حقیقت ہے۔ اس لئے آرٹ کیلئے ضروری نہیں کہ ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ چنانچہ ہیولاک ایلس نے اپنی مشہور کتاب Dance of Life میں لکھا ہے کہ آرٹ میں اخلاق سے کہیں زیادہ اخلاق ہوتا ہے Art is more morel than morelity ہمارے نئے شاعروں کے پیش نظر ایک چیز یہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ ایک ایسی سماج میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم نہیں۔ اس لئے زندگی کی قدروں میں بھی تناسب مفقود ہے۔ چنانچہ یہی چیز ہمارے آرٹ اور ادب میں جھلکتی ہے۔ کہ اس میں بھی شروع سے آخر تک ایک انتشاری اور مزاجی کیفیت ہے۔ ایسے ماحول میں سانس لینے والا انسان زندگی سے بھاگتا ہے —— فرار اختیار کرتا ہے۔ اور ایک کیف و سرور کی دنیا بسا کر سماجی تلخیوں کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ ایسا ہر دور اور ہر زمانے میں ہوا کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کیلئے ایسے انسان نہیں پیدا ہوتے۔ جو ان حالات کو ختم کرنے کیلئے کوئی اقدام کریں۔

ضرور ایسا ہوتا ہے۔ جس کی ایک بین مثال اُردو کی نئی شاعری ہی ہے۔ کہ ایک طرف تو اس میں انقلاب کے پیغام دیئے جا رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بعضوں کی شاعری میں فراری کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ساتھ ہی ساتھ چل رہی ہیں۔

میں تو ساری اُردو شاعری کو حالات و واقعات کا تقاضا سمجھتا ہوں۔ اس میں جو چیز بھی لکھی جاتی ہے، اس کو لکھا ہی جانا چاہیئے ـــــ سماجی ماحول اور ادیب کی شخصیت کے امتزاج سے آرٹ کی تخلیق ہوتی ہے۔ بعض ادیب اور شاعر اپنے اندر ایک آگے بڑھ جانے والی کیفیت رکھتے ہیں۔ دوسرے تھک کر بیٹھ جانے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ آپ صرف ایک راشد کو دیکھئے ـــــ! اس کی ذہنیت شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ وہ زندگی سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی تلخیوں کو صنفِ نازک کی کیف ہم آغوشی اور شرابِ ناب کی لہروں کے سرور میں کھو کر بھلا دینا چاہتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسائل بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ جب اس کی زبونِ حالی پر نظر دوڑاتا ہے تو اس کو یہ سرزمین جبر و استبداد کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کو ان زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، ان سے انتقام بھی لینا چاہتا ہے ـــــ لیکن اس انتقام کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ اس کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ وہ مخالفین سے میدانِ جنگ میں کھلم کھلا مقابلہ کرے۔ کیونکہ اس کے پاس نہ تو آلاتِ حرب ہیں، اور نہ اتنی ہمت کہ جو اُسے میدانِ جنگ میں آگے بڑھا دے۔ چنانچہ وہ انتقام لینے کا ایک دوسرا راستہ ڈھونڈتا ہے۔ اور وہ راستہ یہ ہے کہ وہ ایک بتِ فرنگ کو کہیں پا کر اپنے ہونٹوں سے آتشِ انتقام کو بجھاتا ہے، جس سے اس کو ذہنی سکون مل جاتا ہے۔ "انتقام" اس کی اسی طرح کی نظم ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس نظم کی تخلیق نہ ہوتی تو اُردو شاعری ہندوستان کی دو تین سو برس کی تاریخ اور اس کے اثرات سے محروم رہ جاتی۔ اب صرف اس ایک نظم میں ہندوستانی زندگی کا سارا مد و جزر اور غلامی سے پیدا شدہ یہاں کے باشندوں کی ذہنی کیفیت کے بیان کا سارا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے ؎

اس کا چہرہ ـــــ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پر سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں!
اُجلی اُجلی اُونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ
یعنی سنگِ تربتِ ہندوستان!
اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے"

اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے!
(انتقام)

اس نظم میں راشد نے اپنی ایک خاص حرکت کا بیان کیا ہے۔ جس کی نوعیت تو ضرور جنسی ہے لیکن جس سے جنسی کیف حاصل کرنا راشد کا مقصد نہیں۔ وہ تو صرف انتقام لینے کا خواہاں ہے۔ اور انتقام ہی کی خواہش اس کو یہ اقدام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ راشد کی ذہنیت شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ اور اس کی یہ حرکت، یہ اقدام، یہ عمل، اسی شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ یہ بالکل ایک نفسیاتی بات ہے کہ انسان جب حد سے زیادہ کمزور ہو جاتا ہے، اور اس میں اپنے سے طاقتور ہستی کے مقابلے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ تو سپر تو بہر حال ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ لیکن وہ دوسرے طریقوں سے مقابلہ کرتا رہتا ہے — یا کم از کم مقابلے اور انتقام کے خیال کو دل سے نہیں نکالتا۔ چنانچہ وہ یا تو اپنے حریف کو نقصان پہنچاتا ہے یا گالی دیتا ہے — گالی کو خالص علمی نقطۂ نظر سے ذرا نفسیات کی روشنی میں دیکھئے — آخر ایک شخص گالی کیوں دیتا ہے؟ — وہی انتقام کی ایک فطری خواہش اس کو ایسا کرنے کے لئے اُکساتی ہے۔ ماں اور بہن کی گالیاں کہاں عام نہیں؟ — صدیوں سے اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔ اور پھر زیادہ تر یہ دیکھا گیا ہے کہ کمزور انسان زیادہ گالیوں سے اپنی آتشِ انتقام کو بجھاتا ہے — یہ نظم کوئی گالی نہیں لیکن جب تک ان خیالات کی روشنی میں اس کو دیکھا نہیں جائے گا۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آ سکتی! — صدیوں کی غلامی نے ہندوستان کو ناکارہ کر دیا ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں کہ وہ آگے بڑھ سکے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ جبر و استبداد کی قوتوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام کر سکے۔ اس کے نزدیک ان قوتوں سے انتقام لینا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتوں سے انتقام کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ انفرادی کوشش کی ایک مثال یہ بھی ہے، جو راشد نے اختیار کی ہے۔ اور جس میں اس کی شکست خوردہ ذہنیت کی تصویر بے نقاب ہے۔ لوگ اس کو عریاں نظم کہتے ہیں۔ میں اس کو ہندوستان کی کس مپرسی، زبوں حالی، اور بے بسی کے مرثیے کا ایک رخ سمجھتا ہوں۔

ہمارے سماجی ماحول کی ایک "کارفرمائی" یہ بھی ہے کہ ہمارے نوجوان بری طرح جنسی بھوک کے شکار ہیں۔ صنفِ نازک پر یہاں جو پابندیاں عائد ہیں۔ وہ اور کسی ملک میں نظر نہیں آتیں۔ یہاں مرد اور عورت ایک دوسرے سے کھل کر مل نہیں سکتے۔ بات نہیں کر سکتے، ایک ساتھ اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کے یہاں ہمیں جنسی دباؤ Sex. Represseor کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا یہ فطری جذبہ گھٹ کر رہ گیا ہے چنانچہ جب وہ کبھی کوئی تخلیقی کارنامہ پیش کرتے ہیں، تو اس کا اثر اس میں بھی صاف جھلکتا ہے۔ نئی شاعری بھی اس سے بچ نہ سکی۔ اکثر نئے شاعروں کے یہاں یہ کیفیت جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ میراؔجی جب "ترغیب" میں یہ کہتا ہے کہ ؎

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو
مجھے حدِ ادراک سے دور لے جا رہی ہے
جوانی کا خوں ہے
بہاریں ہیں موسم زمیں پر
پسند آج مجھ کو جنوں ہے

نگاہوں میں ہے مرے لٹنے کی اُلجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا جال ہر اک حسیں پر
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے!
قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جھرمٹ، مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوس ریشم کے اور ان کی لرزش،
یہ غازہ ـــــ یہ ابٹن
نسائی خون کی ہر اک موہنی آج کرتی ہے سازش
مرے دل کو بہکا رہی ہے!
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو!　　(ترغیب)

تو وہ صرف اپنی ایک داخلی کیفیت کی تصویر ہی نہیں کھینچتا۔ بلکہ سارے ہندوستانی نوجوانوں کی ترجمانی کر دیتا ہے۔

لیکن عریانی ـــ کہ یہ پہلو، جن کا بیان اوپر ہوا، اُردو کے سارے نئے شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتے۔ ایسے شاعر بہت ہی کم ہیں۔ آج کل ہندوستان، چونکہ ایک انتشاری اور امتحانی دور سے گزر رہا ہے، اسلئے ہمارے زیادہ شاعر، اپنی شاعری میں وقت کے مزدوری اور اہم مسائل کو سمو رہے ہیں۔ وہ اپنی شاعری سے بھی صور کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پر عورت سوار نہیں ـــ! ـــ خصوصاً وہ شاعر جن کا تعلق ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند گروپ سے ہے۔ ان کے یہاں تو عریانی دور تک نظر نہیں آتی۔ بعضوں کے یہاں تو رومان تک کا فقدان ہے۔ وہ سب کے سب زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ فیض اگرچہ جدید شاعروں میں ایک بڑے مرتبے کا مالک ہے۔ لیکن اس کے یہاں عریانی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ ایک دور وہ ضرور تھا۔ جب وہ رومان کے چمن زاروں میں بھٹک رہا تھا۔ لیکن پھر رومان و حقیقت کے سنگم پر آ گیا۔ اور آخر میں زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں کو بے نقاب کرنے لگا۔ یہی حال احمد ندیم قاسمی کا ہے، کہ وہ عرصے تک رومان کی دنیا میں رہا۔ لیکن ادھر آ کر اس کی شاعری بالکل ایک دوسری راہ پر چلنے لگی ـــ علی جواد زیدی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین جاں نثار اختر اور جذبی تو اپنی شاعری میں زندگی کے مزدوری اور اہم مسائل کو پیش کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں ـــ وہ تو عورت تک کا تذکرہ کم کرتے ہیں۔ نئے شاعروں میں یوسف ظفر، قیوم نظر، اختر الایمان اور منیب الرحمٰن کے یہاں بھی بڑی سنبھلی ہوئی کیفیت ہے۔ ان کی شاعری میں بھی کوئی بے راہ روی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ ان کی شاعری میں بھی داخلی عنصر غالب ہے، لیکن وہ کسی جگہ بہکتے نہیں ـــ پھر بھی جدید شاعری کی عریانی، کے خلاف ایسا ہنگامہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ـــ!!

کنہیا لال کپور

خارستان

ایک سیاح نے جو حال ہی میں جزیرہ خارستان سے لوٹا ہے۔ اِس جزیرہ کے متعلق چند ایسے انکشافات کئے ہیں جو سندباد جہازی کے سفرناموں سے زیادہ سنسنی خیز اور الف لیلےٰ کی کہانیوں سے زیادہ ہوشربا ہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے کہ خارستان ہندوستان کے ساحل سے پندرہ سو میل کے فاصلہ پر بحرِ ہند میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ میں صرف دو قومیں بستی ہیں ہنگم اور بے ہنگم" یہ دونوں قومیں پچھلے ایک ہزار برس سے آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ ہنگم قوم کے افراد اپنے دیوتاؤں کی خوشامد کرتے وقت شمال کی طرف منہ کرتے ہیں اور بے ہنگم جنوب کی طرف۔ نیز ہنگموں کو بینگن کا بھرتہ پسند ہے اور بے ہنگموں کو آلو کا۔ خارستان میں کوئی بے ہنگم اپنی ہتھیلی پر آلو رکھ کر اُس بازار یا محلہ میں سے نہیں گزر سکتا جس میں ہنگم رہتے ہیں۔ چند سال ہوئے۔ اِس جزیرہ میں زبردست ہنگم بے ہنگم فساد ہوا۔ جس میں تین ہزار ہنگم مارے گئے اور تقریباً اتنے ہی بے ہنگموں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ہنگم نے ایک عدد بینگن ایک بے ہنگم کے سر پر دے مارا تھا۔

جس وقت کوئی نووارد خارستان کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کو اہلِ ہنگم یوں مخاطب کرتے ہیں: "اگر آپ نہ ہنگم ہیں نہ بے ہنگم۔ تو ہم آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ بے ہنگم ہیں تو ہم آپ سے لڑنے کو تیار ہیں۔ اگر آپ ہنگم ہیں۔ تو ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ فوراً بے ہنگموں کے خلاف اعلانِ جنگ کیجیے۔"

خارستان میں پچاس فیصدی لوگ نیم پاگل ہیں لیکن خارستان میں ایک بھی پاگل خانہ نہیں۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیم پاگل کہتا ہے "بٹیر متبرک پرندہ ہے۔ اس کا گوشت نہیں کھانا چاہیے"۔ دوسرا جواب دیتا ہے "بٹیر کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے میں ضرور کھاؤں گا"۔ چند منٹ آپس میں اس مسئلہ پر تکرار کرنے کے بعد پہلا نیم پاگل دوسرے کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ یہ نیم پاگل ایک دوسرے کے گھروں کو (اور کبھی کبھی اپنے گھروں کو) آگ لگا کر تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔

خارستان میں سب سے عجیب الخلقت انسان "راہنما" ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ سرے سے غائب ہے اور راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ تو ہے لیکن اس کی ساری چولیں ڈھیلی ہیں۔ ہر دو قسم کے راہنماؤں کا شغل "آدم بازی" ہے۔ بٹیروں اور مرغوں کی بجائے یہ لوگ آدمی پالتے ہیں۔ اور اُن کو آپس میں لڑا کر اپنے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ راہنما بننے کیلئے خارستان میں زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں۔ جزیرہ کے وسط میں ایک عمارت "لال کوٹھڑی" ہے۔ جو شخص اس عمارت کی سیر کر آتا ہے۔ راہنما قرار دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ "لال کوٹھڑی" میں جانے سے پہلے کوچوان یا عطار کیوں نہ رہا ہو۔

خارستان کے کھیتوں میں گندم یا دھان کی بجائے سونا۔ چاندی اور جواہرات اُگتے ہیں لیکن خارستانی کسانوں کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہے۔ کہ وہ ساری کی ساری فصل ہمسایہ جزیروں کو بھیج دیتے ہیں اور اس اقدام کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر ہم ان جزیروں کی سرپرستی نہ کریں۔ تو ان کے باشندے بالکل کنگال ہو جائیں۔ خارستان میں زراعتی مشینوں کا استعمال قانوناً ممنوع ہے۔ جو شخص ان مشینوں کے فوائد گنوائے اسے فوراً سنگسار کر دیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ ایک نووارد ایک دفعہ غلطی سے اس جزیرہ میں ایک زراعتی مشین لے آیا اور اسے اس مشین کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینکوا دیا گیا۔

خارستان میں عورتوں بالخصوص بیویوں کی حالت قابلِ رشک ہے۔ بیشتر خاوند اپنی بیویوں کی عصمت کی پاسبانی اس شدت سے کرتے ہیں کہ انہیں لوہے کے بڑے بڑے صندوقوں میں بند کر دیتے ہیں۔ جہاں وہ ساری عمر چشمِ بد سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس جزیرہ میں بہت سی عورتیں گوشت پوست کی بجائے موم کی

بنی ہوئی ہیں۔ ان پر غیر مرد کی نگاہ پڑ جائے تو فوراً پگھل جاتی ہیں۔ خارستانی عورتوں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ اس سیاح نے چند عورتوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر اسے پتہ چلا کہ سب کی سب گونگی ہیں۔

خارستان میں سب سے زیادہ نفع بخش تجارت توہمات کی ہے۔ غالباً اس لئے کہ اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ جو شخص توہمات کا بیوپار کرتے ہیں انہیں شعبدہ باز کہا جاتا ہے۔ کاروبار شروع کرنے سے پہلے وہ ایک آدھ شعبدہ دکھاتے ہیں۔ مثلاً کسی چوپائے پر سر کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی اونچے درخت سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ کسی اڑتے ہوئے پرند کو غلیل کا نشانہ بناتے ہیں۔ شعبدہ بازوں کی دکانیں قابل دید ہیں۔ کسی نے اپنی دکان میں ایک "مردہ" رکھا ہوا ہے۔ کسی نے کوئی وزنی کتاب یا پتھر۔ کسی نے ایسی تصویر جسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان دکانوں پر رات دن ہُن برستا ہے۔ خریداروں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی مُردے کو سلام کر رہا ہے۔ کوئی کتاب کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کوئی تصویر کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ سماجی لحاظ سے خارستان میں دو جماعتیں ہیں "قصاب" اور "دبیل"۔ قصابوں کا پیشہ ذبح کرنا اور دبیلوں کا ذبح ہونا ہے۔ دبیل ضرورت سے زیادہ سادہ لوح اور شریف واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شرافت کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر ان کی پیٹھ پر کوڑے بھی برسائے جائیں۔ تو خفا نہیں ہوتے۔ عموماً دبیل پیدا اپنے لئے ہوتے ہیں لیکن مرتے قصابوں کے لئے ہیں۔ ہر قصاب کے گھر دو تالاب ہوتے ہیں۔ ایک خون کا اور دوسرا شراب کا۔ خون کے تالاب میں دبیل لوگوں کی نعشیں تیرتی رہتی ہیں۔ اور شراب کے تالاب میں طوائفوں اور رقاصاؤں کی۔ قصاب لوگ تعداد میں اتنے تھوڑے اور دبیل اتنے زیادہ ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ دو قصابوں سے نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے۔ سیاح کے خیال میں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دبیلوں کو ذبح ہونے میں لطف آتا ہے۔

خارستان کی خاص چیز یہاں کا نیلام گھر ہے۔ جہاں ہر اتوار کو روحیں نیلام کی جاتی ہیں۔ نیلام گھر کا مالک "روح فروش" کو حاضرین کے سامنے پیش کرنے کے بعد بآواز بلند کہتا ہے "فلاں ابن فلاں اپنی روح بیچنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بولی دیجئے" بولی عموماً ڈیڑھ آنے سے شروع ہوتی ہے۔ اور ڈیڑھ سو روپے تک جاتی ہے۔ خارستان میں روحوں کی قیمت کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے۔ کہ اس نے ایک دفعہ ایک راہنما کی روح صرف ستر روپے میں خریدی۔

خارستان میں کئی متبرک مقامات ہیں جہاں پاکیزگی کے سوا سب کچھ ہے۔ کئی تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ جہاں صرف بربریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی باغیچے ہیں جن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ خارستانی راہنماؤں کا خیال ہے کہ جب تک خارستان میں کافی تعداد میں عبادت گاہیں نہیں بنیں گی۔ خارستان کا شیرازہ پریشان ہی رہیگا۔ سیاح کی رائے میں جب تک خارستان میں بڑے جاری پیمانے پر پاگل خانے تعمیر نہیں کئے جائیں گے "خارستان" گلستان نہیں بن سکے گا۔

حمیدہ سلطان

غالبؔ کا ایک شعر

بوجھ وُہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وُہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

ابھی جمی کے دن ہیں، سلطنتِ مغلیہ کی شان و شوکت کی شمع ابھی تک ٹمٹا رہی ہے، حضرت بہادر شاہ ظفر لال قلعے میں اپنی عظمتِ رفتہ کی مٹی مٹائی سی یادگار موجود ہیں۔

دِلّی پر جوبن ہے، چاندنی چوک کی رونق اور جامع مسجد کے جمگھٹے اپنی پوری شان پر ہیں۔ آخری وقت میں دلّی نے سنبھالا لیا ہے، ہر فن مولا اساتذہ اور باکمالانِ فن یہاں موجود ہیں۔

گلشنِ شعر و ادب ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے دم سے ہرا بھرا ہے۔ دیارِ دِلّی میں علم و فن کی جمنا لہریں لے رہی ہے، جو کوئی پیاسا آ نکلتا ہے، سیراب ہو کر جاتا ہے۔

عمائدین اور امراء کے دیوان خانے فردوسِ ارم پر چشمک زن ہیں۔ وُہ دیکھئے، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ رخشاں کے دیوان خانے "بیت الضیا" میں اس وقت کیسی بہار آ رہی ہے۔

گرمیوں کا موسم ہے، آفتاب ابھی ابھی غروب ہوا ہے، دونوں وقت مل رہے ہیں۔ نواب صاحب ابھی خس خانے سے باہر نکلے ہیں۔ بہت خوبرو اور جامہ زیب ہیں، گلے میں سفید شبنم کا کرتا ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا چمبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو، ایک برکا سفید نین سکھ کا زیر جامہ ہے، بائیں ہاتھ میں عقیق کی سمرن ہے، دائیں ہاتھ کی انگلی میں بیش قیمت ہیرے کی انگشتری جگمگا رہی ہے، لباس سے عطرِ خس کی لپٹیں چلی آ رہی ہیں۔ صحن میں سقوں نے اس قدر چھڑکاؤ کیا ہے، کہ بارش کا دھوکا ہوتا ہے، تپتی ہوئی زمین پر پانی پڑا ہے، تو سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی ہے، نواب صاحب چاندی کے پایوں کی سیج بندوں سے کسی ہوئی پلنگڑی پر بیٹھ گئے ہیں، خدامانِ باادب نے جلدی سے مرصّع کام پیچوان سامنے لگا دیا ہے، سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی پاس لا کر رکھ دی ہے، ایک صندلی پر پلنگڑی کے قریب چنگیر میں گلاب اور موتیا کے پھول رکھ دیئے گئے ہیں، چوکوں پر اُجلی براق چاندنی کا فرش ہے، اس پر سفید سوزن کاری کام کی سوزنی بچھی ہوئی ہے، چاروں جانب گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں، گلاب اور موتیا کی خوشبو سے ہوا مہکی ہوئی ہے۔

شام ہوتے ہوتے نواب صاحب کے احباب کی آمد شروع ہوگئی، سب سے قبل اُستاد میرن جان دِلّی کے مشہور کنجوس وارد ہوئے، ان کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مفتی صدر الدین خان آزردہ اور مولانا صہبائی یکے بعد دیگرے پہنچے۔

اُستاد میرن خان کی کنجوسی کی داستانیں محفلوں کی جان تھیں، دوست احباب اِن کی کنجوسی کے افسانے سُنتے اور کہتے تھے، اور استاد بگڑ بگڑ کر سب کو صلواتیں سُناتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بیٹھتے ہی استاد کو چھیڑا۔

"کہو بھئی میرن۔ کنجوسی کا کوئی اور نیا طریقہ بھی سوچا؟"

اُستاد میرن جان خلافِ عادت بہت سنجیدگی سے بولے "جی ہاں"۔

مولانا صہبائی نے تبسم آلود لہجے میں کہا۔ "ہم بھی تو سُنیں"

اُستاد میرن جان بولے۔ "سنئے حضرت۔ پرسوں ایک صاحب میرے گھر پر بیٹھے مولی نوش فرما رہے تھے، اور ساتھ ہی میری کنجوسی کے متعلق استفسار بھی فرماتے جاتے تھے، اُنہوں نے مولی کے جو پتے توڑ پھینکے تھے، میں نے صاف کر کے دھوئے اور کھا گیا، وُہ حیران رہ گئے۔ اور میں نے کہا۔ حضور۔ روپیہ یوں جمع کیا جاتا ہے۔"

اُستاد کے بخل کی یہ حیرت انگیز داستان سُن کر تمام اصحاب ہنس پڑے، اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

نواب ضیاء الدین احمد خان نے کہا "بھائی میرن۔ تمہاری کنجوسی کا شہرہ ایک دن حاتم کی سخاوت کی شہرت کو بھی مات کر دے گا۔ اور دنیا کے تمام کنجوس تم کو اپنا استاد مان لیں گے۔"

نواب مصطفیٰ خان "ارے علائی اِس مرتبہ تو لوہارو جا کر رہ ہی گئے"

نواب ضیاءُ الدین احمد خان :- "خط اُن کا پرسوں آیا، اُس میں انہوں نے لکھا ہے، آئندہ ہفتے تک آنے کا ارادہ ہے۔"

مفتی صدر الدین آزردہ :- "شاید مشاعرہ کی شرکت کے لئے آ رہے ہوں گے۔"

استاد میرن جان :- "کہاں مشاعرہ ہے؟ ہمیں تو خبر بھی نہیں۔ اور میر مشاعرہ کون ہے؟"

مفتی آزردہ :- "حکیم احسن اللہ خان اِس مشاعرے کو ترتیب دے رہے ہیں، کیوں بھائی نیر۔ آپ تو تشریف لے جائیں گے نا؟"

نواب نیر :- "نہیں بھائی۔ میں نے تو اب مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے، گذشتہ مہینے منشی فیض پارسا کے ہاں اجمیری دروازے والے مشاعرے کا انتشار میں ابھی بھولا نہیں، آپ اُن دنوں میرٹھ میں تشریف رکھتے تھے، پناہ بخدا۔ مشاعرہ تھا یا آفت!"

مفتی آزردہ :- "ہاں۔ میں نے آ کر یہ اُڑتی اُڑتی خبریں سُنی تھیں، حکیم آغا جان عیش نے میاں ہُدہُد کو شاعر بنا کر حضرت غالب کی ہجو کرائی تھی، لیکن پورا واقعہ نہیں سُنا۔"

نواب شیفتہ :- "ارے بھائی آزردہ۔ وہ تو یہ غنیمت سمجھئے کہ مصرع طرح میں "تیلیاں" ہی تھیں، اگر لاٹھیاں ہوتیں تو شاید کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ یہ ساری کارستانی استاد ذوق کی ہے۔"

مولانا صہبائی :- "اُستاد ذوق اپنی ذات سے ایسے نہیں ہیں۔ سارا کیا دھرا اُن لوگوں کا ہے، جن کو لڑائی کرانے میں لطف آتا ہے۔ حضرت غالب نے کسی مشاعرے میں جانے کی اب قسم کھالی ہے، اس لئے اب ہم لوگ بھی نہیں جائیں گے، بھائی شیفتہ۔ کیا آپ اس مشاعرے میں تشریف لے جائیں گے؟"

نواب شیفتہ :- "ارادہ تو میرا بھی، بھائی، جانے کا نہیں تھا لیکن حکیم صاحب کے اصرار سے استاد[1] نیم راضی ہو گئے ہیں، بھلا جب استاد جائیں تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں، لیکن حضرت غالب کے بغیر مشاعرے کی رونق آدھی رہ جائے گی، اور اساتذہ فن کو بالکل لطف نہ آئے گا۔"

مفتی آزردہ :- "دراصل مشاعروں کی جان یہ تینوں[2] حضرات ہیں۔ اور ان کی باہمی فنکارانہ چشمک حاصل مشاعرہ ہوا کرتی ہے۔"

نواب نیر :- "معاصرین کی باہمی نوک جھونک تو بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے، لیکن منشی فیض پارسا کے ہاں عیش نے ہُدہُد کو بیچ میں لا کر سارا مزا کرکرا کر دیا، اور اس پر لطف یہ کہ اُستاد ذوق کے چہیتے شاگرد حافظ ویران بگڑ بیٹھے، اور اُن کا بگڑنا خدا کی پناہ! اندھے ہیں تو کیا، آنکھوں والوں کے استاد ہیں۔ پھر اندھے کی مار کی داد نہ فریاد۔"

نواب شیفتہ :- "دراصل چند کور ذوقوں کی بدولت مشاعرے پہلوانوں کے اکھاڑے بن گئے ہیں۔ یہ لال قلعے والے چاہتے ہیں، کہ استاد ذوق کو ساری دنیا مانے۔ مومن خان اور مرزا غالب کو سب بھول جائیں۔"

نواب نیر :- (جوش بھری آواز میں) "یہ ممکن نہیں، غالب انشاء اللہ سب پہ غالب رہے گا۔ موجودہ زمانے میں اگر غالب کی کوئی قدر نہ کر سکا تو آنے والی نسلیں اس کو سمجھیں گی، ذوق کا کلام آسان اور عام فہم سہی، لیکن حق شاعری غالب نے ہی ادا کیا ہے۔ غزل کے محدود میدان میں "فلسفیانہ مضامین کو لانا" ذوق کے بس کی بات نہیں۔ میر کے کلام میں بہتر نشتر ہیں، لیکن غالب کا ہر شعر ایک نشتر ہے، جو رگِ دل سے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔ ابھی جو مرزا نے ایک غزل کہی ہے، ہائے کیا خوب ہے، میں نے نذیر خاں قوال کو یاد کرا دی ہے، سُنتا ہوں اور سر دھنتا ہوں۔"

نواب شیفتہ :- "مرزا کا کلام سُننے کا مزا خود اُن کے مُنہ سے ہے، لیکن اُن کو عارف کی جوانمرگی نے ایسا از خود رفتہ کر دیا ہے، کہ اپنے اشعار سناتے ہیں تو رونے لگتے ہیں۔"

مفتی آزردہ :- "عارف کی جواں مرگ تو غیروں کو خون کے آنسو رلاتی ہے، مرزا کا تو وہ چہیتا بھانجا اور محبوب شاگرد تھا۔ ہائے عارف کی خوش کلامی، عارف کی علمی و ادبی قابلیت، کمبخت موت نے جوانی کا کیسا لہلہاتا باغ لوٹا ہے۔"

مولانا صہبائی :- "مرثیہ بھی عارف کا حضرت غالب نے ایسا لکھا ہے

[1] حکیم مومن خاں

[2] مومن۔ ذوق۔ غالب

جس کے لفظ لفظ سے وہ محبت و خلوص ٹپکا پڑتا ہے جو ان کو عارف کے ساتھ تھا۔"

نواب شیفتہ :۔ " یہ مرثیہ اُردو ادب میں لافانی چیز ہے، ہائے، کس قدر حسرت بھرا شعر ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور"

نواب نیر :۔ " میری اور عارف کی معاصرانہ چشمک کو کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیرؔ سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور"

مفتی آزردہ :۔ " عارف کی جوانمرگی کا داغ تو ہم سب کے دلوں پر تازیست رہے گا۔ لیکن بھائی نیرؔ۔ مرزا کی تازہ غزل سنوائیے۔"

نواب نیر :۔ "ارے کوئی ہے! وزیر خاں کو بلاؤ۔"

چند لمحوں کے بعد وزیر خاں قوال حاضر ہو کر آداب بجا لاتا ہے، اور ہاتھ باندھ کر دریافت کرتا ہے "کیا حکم ہے عالیجاہ!"

نواب نیر :۔ " وزیر خاں۔ حضرت غالب کی وہ غزل سناؤ، جو ہم نے تم کو پرسوں یاد کرائی ہے۔"

وزیر خاں "بہت خوب" کہہ کر بیٹھ جاتا ہے، سازندے ساز ملاتے ہیں، اور وزیر خاں تھوڑی دیر تان سر ٹھیک کرنے کے بعد دھیمی اور پرسوز آواز میں موثر انداز سے گاتا ہے ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

حاضرین جھوم رہے ہیں، اور واہ واہ کی صدائیں بے اختیار سب کے لبوں پر ہیں۔ ایک عالم وجد طاری ہے، کلام کی تاثیر آفرینی نے مجمع کو بے خود کر دیا ہے، وزیر خاں نے ذرا آواز کھینچ کر دوسرا شعر ادا کیا ؎

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

نواب نیر :۔ " دیکھا بھائی کس غضب کا شعر ہے۔"

مفتی آزردہ :۔ " ہائے، کیا نرالا انداز ہے، اور کتنا دلکش تخیل۔"

وزیر خان نے تیسرا شعر دلآویز سروں میں گایا ؎

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے"

نواب شیفتہ :۔ "اُف، کیا بے مثل خیال اس شعر میں پیش کیا گیا ہے، یہ شاعری نہیں اعجاز ہے اعجاز!"

وزیر خان نے اونچی آواز سے چوتھا شعر گایا ؎

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو، کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اس پر پھر مصطفےٰ خان بے خود ہو گئے، وزیر خاں نے پانچواں شعر کہا ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

مفتی آزردہ نے جھوم کر کہا " یہ غالب ہی کا حق ہے، ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اُف، کس غضب کا شعر ہے، پھر کہو۔"

وزیر خان نے شعر دہرایا۔ اور پھر ہلکی آواز سے چھٹا شعر ادا کیا ؎

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اِس شعر پر واہ وا کا شور بلند ہوا، جب ذرا سکون ہوا تو وزیر نے مطلع دہرایا، اور پھر یہ شعر دلکش لے سے گایا ؎

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

استاد میرن جان بولے " وزیر خان۔ مصرع اولیٰ ذرا دہرانا۔"

وزیر خان نے مسکرا کر شعر پھر ادا کیا۔ تو استاد میرن جان نے طنزیہ لہجے میں کہا " ارے بھئی، اس کلام کی تم تعریف کر رہے ہو جو بالکل مہمل ہے، بھلا اس مصرع کے کیا معنی ہوئے ع

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے!

جو بوجھ گرنے کے بعد اُٹھ نہیں سکتا، وہ سر پر آ کیسے گیا۔ معلوم ہوتا

ہے، شراب کے نشے میں یہ بے تکی ہانک مرزا صاحب نے لگائی ہے، اور آپ سب صاحبان اسقدر اُن کے مداح ہیں، کہ شعری نقص بھی نہیں دیکھتے، بس مدح سرائی کئے جاتے ہیں، اسی مہمل انداز نے غالب کی شاعری کو عوام کی نظروں میں گرا دیا ہے۔"

میرن جان کی اس تنقید پر مجمع کا تمام جوش ٹھنڈا پڑ گیا، چند لمحے سب خاموش رہے، پھر نواب ضیاء الدین احمد خان بولے "بہتر ہوگا کہ اسی وقت حضرت غالب سے اس شعر کا مطلب دریافت کرایا جائے۔"

مفتی آزردہ "یہ ٹھیک ہے۔"

اُستاد میرن جان نے نواب شہاب الدین خان ثاقب خلفِ اکبر نواب ضیاء الدین احمد خان سے، جو اس وقت بالکل نوعمر تھے، اور بزرگوں کی اس محفل میں مؤدب دو زانو ایک جانب گوشے میں بیٹھے تھے، کہا "میاں ثاقب، اِدھر تو آؤ، دیکھو، مرزا صاحب کے پاس میرا پیغام لے جاؤ، کہنا، اُستاد میرن جان نے دست بستہ آداب عرض کیا ہے، اور کہا ہے کہ حضور اِس مصرع کے معنی تو سمجھا دیجئے ع

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے

جو بوجھ گرنے کے بعد پھر نہیں اُٹھ سکتا، وہ پہلے سر پر رکھا کیسے گیا تھا؟"

ثاقب حضرت غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت شغلِ مے نوشی میں مصروف تھے، اور پُرسوز لحن میں اپنی اِسی غزل کے مقطع کو گنگنا رہے تھے ؎

عشق پر زور نہیں ہے، یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اُنہوں نے باادب عرض کیا "قبلہ و کعبہ، آپ کی یہ غزل وزیر خان قوال گا رہا تھا، اور سب پر عالمِ وجد طاری تھا، مگر ساتویں شعر کے مصرعِ اولیٰ پر استاد میرن جہان نے اعتراض کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ بالکل مہمل ہے، اُنہوں نے مجھے اس مصرع کے معنی دریافت کرنے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، وہ دریافت کرتے ہیں کہ جو بوجھ سر سے گرنے کے بعد پھر سر پر رکھا نہیں جا سکتا وہ پہلے سر پر کس طرح آ گیا تھا۔"

حضرتِ غالب نے قہقہہ لگا کر کہا "اس بڈھے سے کہنا خبطی کنجوس، تو روپیہ جمع کرنے کی فکر کر، اسی کے نکات و رموز سیکھ۔ استادانِ فن کے معاملاتِ شعری سمجھنے کی تجھ کو کیا ضرورت پیش آئی۔ یہ ذرا سی بات تو نہ سمجھ سکا، ایک تیلن تیل لئے جا رہی ہے، تیل کا کُپا قدم کی لغزش سے سر سے لڑھک کر نیچے آ رہا، تیل تمام بہ گیا۔ تو اب وہ غریب تیلن تیل کس طرح سمیٹے گی (ایک دم سنجیدہ ہو کر) میرا عارف مر گیا، میری مثال اس تیلن کی سی ہے جس کا تیل گر چکا ہے، نہ وہ گرا ہوا تیل سمیٹ سکتی ہے، نہ میں دوبارہ عارف کو پا سکتا ہوں ؎

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور"

اویس احمد ادیب

ریڈیائی ڈرامے اور انکا فنی تجزیہ

ہندوستان میں ریڈیو کی ابتدا نے دنیائے ڈراما نگاری میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ایک ایکٹ کے ڈراموں کا ابھی آغاز ہی تھا۔ کہ ریڈیو کی دلفریب اور مسحور کُن آوازوں نے "اُردو دنیا" کے ڈراما نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسٹیج کے طویل یعنی پانچ ایکٹ کے ڈرامے ابھی "میلوڈراما" کی حدود بھی نہ طے کرنے پائے تھے۔ کہ پردۂ سیمیں کی نظر فریبی نے اُن کو اپنا دلدادہ بنا لیا تھا۔ بعینہٖ یہی حال ایک ایکٹ کے تمثیلی ڈراموں کا ہوا۔ اسٹیج کے ایک ایکٹ کے ڈرامے اپنے تخلیقی دور سے گذر رہے تھے۔ کہ پردۂ سیمیں نے انکو بھی اپنانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایکٹ کے ڈرامے پردۂ سیمیں کے لئے کھیلے جانے لگے۔ مگر نشری ضروریات نے ڈراما نگاروں کو اپنی طرف رجوع کر کے اُردو کے ڈراما نگاروں کے لئے ایک نیا "رخ" پیش کیا۔ حالانکہ ظاہرا طور پر ریڈیو کے لئے ڈراما لکھنا اور اس کا نشر کرنا کوئی دشوار امر نہیں معلوم ہوتا مگر اس کی طرف متوجہ ہونے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے۔ کہ ایک ایکٹ کا نشری ڈراما لکھنا۔ اسٹیج اور پردۂ سیمیں کے لئے ایک ایکٹ کے ڈرامے ضبط تحریر میں لانے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ گو ریڈیو سے کسی ڈراما نگار کے ڈرامے کا نشر ہونا اپنے اندر بڑی جاذبیت، کشش اور دلفریبی رکھتا ہے مگر اس جاذبیت میں جو دقتیں اور دشواریاں پوشیدہ ہوتی ہیں وہ اس وقت جنم لیکر سامنے آتی ہیں جب کوئی ڈراما نگار نشری ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک مکمل ڈراما لکھنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اسٹیج کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ڈراما آسانی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے پردۂ سیمیں کے ایک ایکٹ کے ڈرامے میں صرف سینیریو کی تکمیل میں دقتیں پیش آتی ہیں مگر جب ریڈیو کے لئے نشری ضروریات کے ماتحت ڈراما لکھا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیج اور اسکرین کی دقتیں اس کی دقتوں کے مقابلہ میں گرد ہیں۔ اسٹیج اور اسکرین کی فنی خوبیاں نشری ڈرامے کی فنی خوبیوں سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ فنی خوبیوں سے مراد ریڈیو ٹکنیک ہے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈراما فنی ضروریات کا تابع ہوتا ہے۔ ٹکنیک کو ڈرامے کا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔

ہندوستان کی ریڈیائی دُنیا میں اگر بہترین شاہکار تلاش کئے جائیں تو کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے ہندوستان کے بہترین ڈراما نگار ڈرامے نشر کرا رہے ہیں۔ ریاستوں میں نشرگاہ لاسلکی سرکار عالی حیدرآباد، دکن معیاری ڈرامے پیش کرنے میں کوشاں ہے۔ یہ دور ہندوستان کے ریڈیائی ڈراموں کا ابتدائی دور ہے۔ گو انہوں نے اس قلیل مدت میں کافی کامیابی حاصل کر لی ہے مگر یہ ابھی اطمینان بخش نہیں۔ ممالک غیر کے ریڈیائی ڈراموں پر جب غور کیا جاتا ہے۔ اور ان کے معیار کا ہندوستان کے ریڈیائی ڈراموں کے معیار سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ڈرامے ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ "موضوع" اور "فن" کی حیثیت سے ابھی اس قدر بلند پایہ نشری ڈرامے نہ لکھے جا سکے کہ وُہ ہندوستان کی ریڈیائی دنیا کی بہترین پیداوار کہلا سکیں۔ پھر بھی گذشتہ چند سال میں انہوں نے جو تدریجی ترقی کی ہے وہ اس کے امید افزا مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ فنی حیثیت سے ان میں سقم ضرور ہیں۔ مگر نقش اول کی حیثیت سے وُہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔ نظر انداز کر دینے سے یہ مقصد نہیں۔ کہ ان غلطیوں کی اصلاح نہ کی جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابتدائی دور کی یہ کوششیں مستحسن ہیں۔ مگر ان تسکین بخش جملوں سے مطمئن ہو کر اپنی آئندہ ترقیوں کو مسدود کر دینا نقصان دہ ہوگا۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ بہترین فنی ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جائیں۔ اور ان میں ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ہندوستانی ریڈیائی ڈراموں کی ابھی نہ تو کوئی مبسوط تاریخ لکھی جا سکتی ہے اور نہ اس کی ٹکنیک کے متعلق سخت ترین قواعد بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ مغربی ایجاد ہے اور مغرب سے ہمیں ملی ہے اسوجہ

سے اس کے مغربی اصولوں کو اپنی ضروریات اور اپنے ماحول کے مطابق
اپنانا ہوگا۔ اگر انہیں اپنانے اور ان میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوششیں
نہیں کی گئیں۔ تو وہ ہندوستانی پیدائش رکھنے کے بعد بھی غیر ملکی ہی محسوس
ہوں گے۔ ان میں "وطنیت اور قومیت" کہیں بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ فی
الحال ہندوستانی ریڈیائی ڈرامانگار کو اپنے اوپر چند پابندیاں عاید کر لینا
پڑتی ہیں۔ انہی کو اگر ایک ایکٹ کے ریڈیائی ڈراموں کے فنی قوانین کہہ دیا
جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

تماشائی یا سامعین ریڈیائی ڈرامانگار کے لئے یہ ضروری ہے
کہ وہ ڈراما لکھنے سے پہلے یہ سوچے کہ وہ کن لوگوں کے لئے ڈراما لکھ
رہا ہے۔ اسٹیج کے لئے ایک ایکٹ کا ڈراما لکھتے وقت ڈرامانگار کو اس
کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ ایسے لوگوں کے سامنے اپنی ڈرامائی
کوششوں کو منظم طور پر پیش کریگا۔ جو اپنی آنکھوں سے اُسے از ابتدا
تا انتہا اسٹیج پر دیکھیں گے۔ اداکار اپنی اداکاری سے اس کے مفہوم
کو تماشائیوں کے ذہن نشین کر دیں گے۔ ناظرین ڈراما کو دیکھ اس کی قدر
و قیمت کا خود بخود اندازہ لگائیں گے۔ ڈرامانگار اسٹیج پر اپنے ڈرامے
کو پیش کرکے اس کے معائب و محاسن کا فیصلہ تماشائیوں پر چھوڑ دیتا
ہے۔ کیونکہ ان کے پیشِ نظر ہر چیز ہوتی ہے۔ وہ اس کو مجموعی حیثیت
سے دیکھتے ہیں اور جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا احساس بھی کرتے
ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اسٹیج کے لئے ڈراما لکھتے وقت ڈرامانگار کے
تخیل میں اس کے تماشائی ہوتے ہیں۔ وہ ان کی ضرورت سے آگاہ ہوتا ہے۔
ان کے رجحانات اُسے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان کا اندازہ لگا کر ایسے
مناظر پیش کرتا ہے جو اُن کی دلچسپیوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ تماشائی کی
آنکھیں خود مسحور ہو کر اس کی تمامتر قوتوں کو ڈراما کی طرف رجوع کر دیتی
ہیں۔ دردناک مناظر پیش کرکے وہ اپنے ناظرین سے رشکِ عقیدت
حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے طربیہ مناظر پیش کرکے وہ ان سے خراج
تحسین حاصل کر سکتا ہے۔ جس سے ان کی روح میں بالیدگی پیدا ہو
جائے۔ مزاحیہ سین پیش کرکے وہ اپنے تماشائیوں کو زیرِ لب مسکراہٹ
کے لئے ہی نہیں بلکہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر سکتا ہے یہ تمام انقلابات
اسٹیج کے ڈرامانگار کے جادو نگار قلم کی سحرکاری کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ مگر
اس میں اداکاری، مکالمہ، منظر، اور روشنی کے مجموعی اثرات بھی شامل ہوتے
ہیں۔ غرض ڈرامانگار اپنے تماشائیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ اپنے
ڈرامے کے ذریعہ سے ان کے دل و دماغ پر چھا کر اُن کی زبان سے اپنے
ڈرامے کی خوبیاں گنوا لیتا ہے۔ وہ بعض اوقات تماشائیوں کو دھکدکی
(Suspense) میں مبتلا کر دیتا ہے اور بعض اوقات ان کے جذبات
میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ تماشائی اپنے خیالات اور احساسات سے
مجبور ہو کر اس کی ہمنوائی کرنے لگتے ہیں۔

ناظرین ڈرامانگار کی نظر میں مجموعی حیثیت (Collectively)
سے رہتے ہیں۔ وہ اپنے تصور میں وہ منظر پیدا کرتا ہے جہاں سیکڑوں
تماشائی انفرادی حیثیت سے آ کر جمع ہوتے ہیں — کسی تھیٹر میں —
کسی ڈراما ہال میں — کسی سینما ہال میں — وہ سب مجموعی حیثیت سے
ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت۔ اجتماعیت
میں مدغم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک گروہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس
کے نزدیک وہ شخصیت کے مالک نہیں رہتے، وہ سب کو یکساں تصور
کرکے سب کے لئے ایک ہی ڈراما پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں سب
کی ذہانت، قابلیت، طباعی اور مرتبہ وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ڈرامے
کی تخلیق کے وقت اس کے ذہن میں تماشائیوں کی تعداد بھی رہتی ہے۔
کتنا بڑا ہال ہوگا؟ کتنے تماشائی بیک وقت اس کو دیکھ سکیں گے؟ پانچسو،
ایک ہزار، دو ہزار .... وغیرہ وغیرہ۔ میرا مقصد ایک ایسی تعداد
سے ہے جو اس کے ذہن میں بہ آسانی آ سکتی ہے۔ مگر ریڈیائی ڈرامانگار
کے لئے یہ صورتیں قطعاً سود مند نہیں ہو سکتیں۔ جہاں ڈرامے کے ساتھ
"ریڈیو" کا لفظ متعلق ہوا، تمام تر صورتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

ریڈیائی ڈرامانگار کے لئے "تماشائی" یا "ناظرین" "سامعین" کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے لئے وہ ڈراما لکھتا ہے
وہ اس کو دیکھ نہیں سکتے، نہ تو ڈرامانگار اُن کی نظروں کے سامنے ہوگا۔ نہ اداکار
ان کو نظر آئیں گے۔ اور نہ وہ اداکاری کے نمونے دیکھ سکیں گے۔ نہ سین
اور سینریاں ان کو متاثر کر سکیں گی۔ اس کے سامعین صرف آوازیں سن
سکیں گے۔ یہ "سامعین" انفرادی حیثیت اور انفرادی شخصیت کے
مالک رہیں گے۔ اُن کی اجتماعیت، انفرادیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس

پانچ آدمی اگر کسی ریڈیو سٹ کے سامنے بیٹھ کر کوئی ڈراما سن سکیں یا کسی خاص وقت کسی خاص مقام پر یکجا ہو کر ڈراما سنیں تو اس صورت میں بھی ان کی حیثیت ڈراما نگار کے لئے انفرادی ہی ہوگی کیونکہ اس کا تخیل ان کو مجموعی حیثیت سے کسی سینما ہال یا تھیٹر ہال میں جمع ہو کر ڈراما سننے کے خیال سے نہیں پیش کرتا۔ یہ اجتماعیت بھی اس کے نزدیک انفرادیت ہی رہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر اس قسم کے اجتماع اکثر دیکھے گئے ہیں مثلاً کانپور جیسے مزدوروں کے شہر میں لیبر ویلفیئر سنٹر قائم ہیں۔ وہاں سرکاری ریڈیو سٹ مزدوروں کی دلچسپی کے لئے لگائے گئے ہیں۔ گورنمنٹ کے دیہی شعبوں نے دیہاتوں میں ایسے سنٹر قائم کئے ہیں جہاں بیٹری کے ریڈیو سٹ پر نزدیک کے دیہاتوں اور گاؤں کے لوگ جمع ہو کر ضروری خبریں اور دیہاتی پروگرام سن سکیں مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے پیش نظر ان کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ شہروں میں کافی ہاؤس ہوٹل، دوکانیں، کلب وغیرہ ایسے مقامات ہیں جہاں ریڈیو سٹ اکثر لگے ہوئے ملتے ہیں اور جہاں نادار اور مفلس ریڈیو کے شیدائی جمع ہو کر اپنی ریڈیائی تشنگی دُور کرتے ہیں۔ مگر ریڈیائی ڈراما نگار ان کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ ریڈیو ڈراما نگار کے لئے ریڈیائی سامعین کی حیثیت انفرادی ہی ہوتی ہے۔ وہ سامع خواہ دس روپیہ سالانہ لائسنس پر خرچ کرکے پانچسو روپیہ کا سیٹ اپنے گھر میں لگائے یا بغیر پیسہ صرف کئے کہیں بیٹھ کر یا کسی دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر ڈراما سن لے۔ اُسے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

انفرادیت سے یہ مقصد نہیں کہ ریڈیو کے سامعین کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ان کی تعداد کا تعین کسی طرح بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک وقت میں کتنے اصحاب ایک ڈراما ریڈیو سے نشر ہوتے ہوئے سنتے ہیں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کسی ڈراما نگار کے شیدائیوں کی تعداد بھی متعین نہیں کی جاسکتی۔ سٹیج اور پردہ سیمیں کے ایک ایکٹ کے ڈراما کے تماشائیوں کی تعداد ہال کی گنجائش کا اندازہ لگا کر ایک وقت بتائی جاسکتی ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے سامعین کسی طرح گنے نہیں جاسکتے۔ ایک وقت میں دس ہزار آدمی بھی اس کا ڈراما سن کر سامعین بن سکتے ہیں اور دوسرے وقت صرف پانچ چھ آدمی اس کا ڈراما سن سکتے ہیں یعنی کبھی سامعین کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کم اور کبھی اوسط پر آکر رک جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہ طریقہ وضع کرلیا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ریڈیائی ڈرامے کے سامعین لاتعداد ہیں۔ مگر اس اکثریت کے باوجود اُن کی اجتماعی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ ان کی انفرادی شخصیت کبھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔

اس انفرادیت کی وجہ سے ڈراما نگار ہر فرد کے نزدیک تر پہنچنے کی کوششیں کرتا ہے۔ وہ اپنے ڈراما کو ایسا بنانا چاہتا ہے جس میں ان کا ہر سامع اپنی زندگی کے واقعات محسوس کرے۔ اُسے اپنے دل کی دھڑکنیں اس میں سنائی دیں۔ اُسے اپنی زندگی کی خامکاریاں اس میں نظر آئیں۔ غرض اسے یہ محسوس ہونے لگے کہ یہ ڈراما "شخصی" ہے۔ اس میں اس کی شخصی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما نگار کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے اگر وہ ہر سامع کو یہ محسوس کرا دے کہ جو واقعات اس نے پیش کئے ہیں۔ وہ اسے اپنی لہراتی اور بل کھاتی ہوئی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ اس خیال کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ ڈراما نگار کا انداز "شخصی" ہو جاتا ہے اس میں "عمومیت" باقی نہیں رہتی یعنی، اس کے پیش کرنے کا انداز عام نہیں رہتا۔ اس کے نشر کرنے میں بھی فنی تکمیل کے علاوہ یہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ وہ سامعین کی زندگی کا پرتو ہے۔ یہاں پر ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان بھی ہے ——— اور وہ یہ کہ ہر سامع یہ تصور کرے کہ ریڈیو کا ہر ڈراما اس کی زندگی کا پرتو ہوگا۔ کسی قدر صحیح نہیں ہے۔ سامعین کی تعداد میں سے اکثریت کی تعداد ایسی ہوتی ہے جن کی زندگی سے اس کا ڈراما مطابقت کرے گا۔ یہ اکثریت کے خیال سے تحریر کیا گیا ہے کیونکہ کوئی اصول اور کوئی قانون اکثریت ہی کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔

اسٹیج کے ڈراما ——— میں تماشائی ڈراما نگار کا مددگار بھی بن جاتا ہے کبھی کبھی ایسے پہلو بھی نکل آتے ہیں کہ ڈراما نگار اپنے ڈراما کے مداح یا حامی یا مددگار یا پسند کرنے والے تماشائیوں کے گروہ میں پیدا کرلیتا ہے وہی کسی خاص تھیٹر یا ڈراما ہال میں اُس کے ڈرامے کو کامیاب بنا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ وہ خود تالیاں بجاکر ان کی گونج سے دوسروں کو بھی تالیاں بجانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ اپنی طبیعت اور اپنی پسند ہوتی

ہے۔ جو کسی ڈراما نگار کے مداح ہوتے ہیں۔ یا اس کی قلمی کاوشوں کو اسٹیج پر پسند کرتے ہیں تو وہ جا و بیجا اس کی تعریفیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی طبیعت کے بہاؤ کے ساتھ دوسروں کو بھی بہا لیجانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ مگر ریڈیائی ڈراما نگار کا ایسا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی ہمدرد اور معاون نہیں بنتا۔ وہ اور اس کا ڈراما دونوں پروڈکشن انچارج کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں وہ اگر چاہے تو اس کے ڈرامے میں چار چاند لگا دے اور اگر چاہے تو اُسے ملیا میٹ کر دے۔ اُس کے سامعین میں سے کوئی تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ قہقہہ لگا کر بھی کوئی اس کی ہمت نہیں بڑھا سکتا۔ ان سامعین کے لئے اور ایسے حالات کے ماتحت ڈراما نگار ریڈیو کے لئے ڈراما لکھتا ہے۔ وہ گویا اوچھے ہتھیاروں سے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اس کے سامعین کو اداکاروں اور ڈراما نگار سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ وہ نقاد کی حیثیت سے کان لگا کر اس کے ڈراما کو سنتے ہیں۔ اور فوراً ہی اپنی رائے ظاہر کر کے اس کے ڈرامے کی قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

ریڈیو کا ڈراما ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے سامعین کو دلچسپی پیدا ہو جائے وہ اس کو ادھورا چھوڑ کر نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ یا اس سے بدمزہ ہو کر ریڈیو سٹ بند نہ کر دیں۔ وہ اس کو دلچسپی کے ساتھ سنیں اور اس سے استفادہ بھی کریں۔ ڈراما نگار نشری ڈرامہ ضبط تحریر میں لاتے وقت صرف یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کے سننے والے کسی خاص قوم، مذہب، ملت سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ مختلف اقوام، مختلف مذاہب اور مختلف گروہوں کے افراد ہوتے ہیں۔ وہ صرف گورے نہیں ہوتے بلکہ گندمی اور کالے رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں پڑھے لکھے اور جاہل بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان میں رؤسا اور امراء بھی ہوتے ہیں جو اپنے گول کمروں میں بیٹھ کر ڈراما سنتے ہیں اور ایسے غرباء بھی ہوتے ہیں جو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ڈرامے سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اوسط درجہ کے لوگ بھی اپنے کسی دوست یا محسن کے سیٹ پر ریڈیائی ڈراما سُن کر اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ڈراما نگار اپنے سامعین کی مختلف النوع طبیعتوں اور رجحانات کی وجہ سے ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایسا کونسا موضوع اختیار کرے جو ان سب میں مشترک ہو اور جو ریڈیائی بھی ہو۔ اس کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ مگر اس کی یہ کوشش رائگاں نہیں جاتی۔ وہ اپنی مسلسل کوشش سے ایک نہ ایک ایسا موضوع ڈھونڈ نکالتا ہے۔ جو مذکورہ بالا قسم کے سامعین کے رجحانات سے مطابقت کرتا ہے۔ مگر مزید فکر اُسے اور دقتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ کس عمر کے سامعین کے لئے اپنا ڈراما لکھ رہا ہے۔ اس کے سامعین میں عمر کی کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ بچے۔ بوڑھے، نوجوان اور ادھیڑ سب ہی عمر کے سامعین ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں؟ صنف نازک یا صنف قوی سے؟ ڈرامے میں کس کو فضیلت دی جائے؟ اور کس کو پچھاڑا جائے؟ مگر ایسے نزاعی مسئلہ اور ایسی بحثیں عام طور پر تکلیف کا باعث بن جاتی ہیں اُسے اس کو بھی دُور کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے نشری ڈرامے سے کسی کو صدمہ پہنچتا ہے تو آئندہ وہ اُس ڈراما نگار کے ڈراموں کو سننا پسند نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی مقبولیت کم ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے "دلچسپی" اس کا مطمح النظر ہونا چاہئے۔ اور ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہئے۔ جو عام دلچسپی کے ہوں۔ جن کو سن کر کسی کو افسوس یا رنج نہ ہو۔ بلکہ سامعین کے دماغ میں خوش عقیدگی پیدا ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈراما ایسا اچھوتا اور نرالا ہو کہ ملک کے طول و عرض میں پسند کیا جائے۔ کیونکہ نشری ڈراما کے خلاق کو یہ تصور کر لینا پڑتا ہے۔ کہ اس کے سامعین ملک کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

قبولِ عام کی سند اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جبکہ ڈراما نگار اپنے فن پر پورے طور سے حاوی ہو اور اپنے موضوع سے بخوبی واقف ہو۔ مگر یہ واقفیت اس کی دقتوں میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ اُسے اپنے ڈراما کو ایسے چونکا دینے والے جملوں سے شروع کرنا پڑتا ہے جو سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ سامعین کو متوجہ کرنیکا اس بیکس ڈراما نگار کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس کا ڈراما دیکھا نہیں جا سکتا۔ صرف سُنا جا سکتا ہے۔ یہ کمی، کہ ڈراما نگار اپنے ڈرامے کو صرف آوازوں کے ذریعہ پیش کرے۔ اس کے فن کو اور زیادہ مشکل بنا دیتی ہے۔ اگر سامعین ڈراما کے شروع ہوتے ہی اس

کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو یہ ڈرامانگار کے طرزِ تحریر کی زبردست خامی ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ خوبی پروڈکشن انچارج پیدا کردیتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ریڈیائی ڈراما کی کامیابی کا راز اس کی ابتدا میں مضمر ہوتا ہے۔ اگر ابتدائی نقوش اچھے ہوئے تو بعد کے نقوش کی کمزوری ڈرامے کی تباہی میں معاون نہیں ہونے پاتی۔ اگر ابتدا بے ہنگم طور پر ہوئی تو بعد کی خوبیاں بھی سامعین پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں۔ وہ پریشان ہوکر اور ڈرامانگار کو صلواتوں سے نواز کر ریڈیو سیٹ بند کردیتا ہے۔

ایک ایکٹ کا فلمی ڈراما انسان کی دو نمایاں قوتوں سے متعلق ہوتا ہے یعنی قوتِ سامعہ اور قوتِ بصارت۔ وہ سُنا بھی جاتا ہے۔ اور دیکھا بھی جاتا ہے۔ اس وجہ سے عوام کی خاص دلچسپی کا مرکز بنا رہتا ہے مکالمے اور گانے سُنے جاتے ہیں اور تصویروں کے ذریعہ سے اداکاری واقعات اور پلاٹ کی نوعیت کو دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما صرف "قوتِ سامعہ" کو نوازتا ہے۔ اس وجہ سے وہ فلمی ایک ایکٹ کے ڈرامے سے زیادہ مقبول نہیں ہوسکتا۔ اس "کمی" کو دور کرنے کے لئے اس میں دیگر دلچسپیاں پیدا کرنا پڑتی ہیں جو اس کی کمی کے احساس کی تلافی کردیتی ہیں۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ریڈیائی ڈراما اپنے مقصد کی تکمیل عموماً پورے طور سے نہیں کرنے پاتا۔ مگر اس کے باوجود بھی ریڈیائی ڈراموں کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اس کی ابتدا نے ہندوستان کے ڈرامانگاروں کے لئے ایک وسیع میدان پیش کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے ڈرامانگاروں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی جارہی ہے۔ عوام کی دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے جیسا کہ لائسنسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پتہ چلتا ہے۔

تمثیلی اور نشری ڈرامے

ریڈیائی ڈراموں میں بھرتی کے واقعات پیش نہیں کئے جاسکتے۔ ڈرامانگار کا یہ اولین فرض ہوتا ہے۔ کہ وہ ایسے واقعات یکجا کرے جن کو وہ اپنے ڈرامے کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ وہ اُن کا انتخاب کرتا ہے اور ان میں یہ دیکھتا ہے کہ اس کی ضرورت کے مطابق کونسے ایسے ڈراما کے واقعات ہیں جن کو وہ پہلے پیش کرے اور کونسے ایسے ہیں جن کو وہ بعد میں لائے۔ گویا اسے اپنے ڈراما کے لئے واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ازاں بعد وہ اُن میں ربط پیدا کرتا ہے۔

اس طرح اس کے ریڈیائی ڈرامے کا پلاٹ مکمل ہوتا ہے۔ اسے تنقیدی نظر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس پلاٹ کے منظم واقعات میں سے کون کون سے ایسے ہیں جن کو آواز کے شیدائیوں کے لئے پیش کرنا سودمند ہوگا۔ اور جو ڈرامانگار کی شہرت کا سنگِ بنیاد بن جائیں گے۔ اور کون کون سے ایسے ہیں جو اس کی شہرت کو صدمہ پہنچائیں گے۔ اسوقت اُسے قطع وبرید اور تخفیف و اضافہ سے کام لینا پڑے گا۔ بھرتی کے غیر ضروری واقعات کو نکال کر ان کی جگہ ضروری واقعات کو دینا پڑے گی۔ اُس کے بعد وہ نشری ضروریات کے ماتحت اس کی تشکیل کرے گا۔ ریڈیائی ڈراما میں غیر منظم پلاٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں ترتیب اور تسلسل کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ بے ہنگم طور پر واقعات کا آجانا سامعین کی طبع پر زیادہ بھاری گذرے گا۔ اس میں جو واقعہ پیش کیا جائے وہ انتہائی واضح ہو۔ گنجلک واقعات کی اس میں قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ وضاحت کے ساتھ ہر واقعہ پیش ہونا چاہیئے۔ مبہم طریقہ پر واقعات بھی پیش نہیں کئے جاسکتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر واقعہ، متعلقہ نکتہ، نظریہ یا خیال کی وضاحت کرے اور جس جذبہ کے تحت میں وہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ خود اس کی تفسیر ہو۔ اس کے پیش کرنے کے انداز میں سادگی ہو تاکہ سامعین ریڈیو سیٹ کی پہلی آواز کے ساتھ ہی واقعات کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اگر واقعات اُلجھے ہوئے رہے تو خاتمۂ ڈراما تک مکمل ڈراما ایک معمہ بن جائے گا۔ ایسے معمے ممکن ہے کہ اسٹیج کے لئے زیادہ مفید ہوسکیں۔ مگر ریڈیائی ڈراموں کے لئے مفید نہیں ہوسکتے۔

بعض ڈرامانگار اپنے ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھتے ہیں اور اسٹیج کی تمام ضروریات کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ مگر جب اُن کا ڈراما کسی وجہ سے اسٹیج پر کامیاب نہیں ہوتا تو وہ اُسے نشر ہونے کیلئے کسی نشرگاہ میں بھیجدیتے ہیں، جہاں سے وہ شکریہ کے ساتھ واپس کردیا جاتا ہے۔ وہ یہ حرکت اس نظریہ کے تحت میں کرتے ہیں کہ جو ڈراما اسٹیج پر کامیاب نہیں ہوسکتا وہ آواز کے ذریعہ سے زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ یہ خیال ایسے ڈرامانگاروں کا ہوتا ہے۔ جن کو ریڈیو کی تکنیک کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا اور جو ریڈیائی ڈرامے کی فنی ضروریات سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ریڈیائی ڈراما وہ ہوسکتا ہے جو اسٹیج پر ناکامیاب رہے

مبتدی ڈراما نگار عموماً اس غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ابتدائی کوششوں کو مکمل ریڈیائی ڈرامہ سمجھ کر اُسے نشر گاہ روانہ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ انکے نشری ڈراما کے تجزیہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ نومشقی کہنہ مشقی میں صرف اسی وقت تبدیل ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس فن کی باقاعدہ تکمیل کی جائے۔ مگر اُن کی جلد بازی انہیں کچھ نہیں سیکھنے دیتی۔ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ بلا کسی محنت کے وہ جلد از جلد ڈراما نگاروں کی اولین صف میں آ کھڑے ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ان خامیوں کو دُور کرنا نہیں چاہتے جو نومشقی کی وجہ سے ہوتی ہیں، ان کی ذرا سی توجہ ان کو کامیاب ڈراما نگار بنا سکتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر وہ ڈراما جو اسٹیج پر نہیں پیش کیا جا سکتا' ریڈیائی نہیں بن سکتا۔ ایسے ڈراموں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ جو تمثیلی نہ ہونے کے باوجود ریڈیو سے نشر کئے جا سکیں۔ ممکن ہے کہ فنی خامیوں کی وجہ سے وہ اسٹیج پر ناکامیاب رہا ہو۔ مگر ہو سکتا ہے۔ کہ اُس کا موضوع مائیکروفون کی ضرورت کے مطابق ہو۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد ایک انتہائی اہم نتیجہ نکلتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک حیثیت سے تمثیلی اور نشری ڈرامے ایک ہیں یعنی ان دونوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ اور وہ اس کا موضوع ہے۔ اس کلیہ میں بھی بعض صورتوں میں شاید ہمیں ترمیم کرنا پڑے۔ کیونکہ تمام موضوع ایسے نہیں ہوتے، بعض تو صرف اسٹیج کی ضروریات کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور بعض ریڈیو کے لئے کچھ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو دونوں میں مشترک بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ جن کے موضوع کے متعلق ڈراما نگار کو کچھ کہنا اور بیان کرنا ہوتا ہے۔ انہیں وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ یہ ضرورت وقت اور موقع و محل پر منحصر ہوتا ہے۔

اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ ڈراما تمثیل کے لئے لکھا جائے اور وہ اسٹیج پر ناکامیاب ہو تو ڈراما نگار کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے موضوع کا تجزیہ کرے۔ اور پھر یہ دیکھے کہ اسٹیج پر ڈرامے کی ناکامیابی کے اسباب کیا تھے؟ اس وقت وہ یہ غور کر سکتا ہے۔ کہ وہ موضوع ریڈیو کا موضوع بن سکتا ہے یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ملے تو اُس ڈرامے کو یکلخت نظر انداز کر کے دوسرا لکھنا چاہیئے۔ سابقہ ڈرامے کو توڑ مروڑ کر ریڈیائی نہ بنا دینا چاہیئے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈراما سامعین کے لئے لکھا جائے گا۔ نہ کہ تماشائیوں کے لئے۔ اگر اسٹیج اور ریڈیائی ڈرامے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے تو وہ مقصد کی نوعیت سے بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ دونوں کے لئے ڈراما نگار ڈرامے لکھتا ہے مگر ایک ہی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ گو راہیں اور تکنیک مختلف ہوتی ہیں۔

صوتی اثرات کے متعلق لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر ریڈیو ڈراما میں زیادہ سے زیادہ آوازیں پیدا کر کے اثرات مرتب کئے جائیں تو ڈراما زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ کہیں پر شور و غل اور کہیں پر رونے پیٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ گھنٹیوں کی آواز سے گاڑیوں کی کثرت' اور ریکارڈ بجا کر ہزاروں آدمیوں کا مجمع پیش کیا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے مگر ان آوازوں کو پورے طور پر ڈراما کی کامیابی کا ضامن قرار دے دینا غلطی ہے۔ حالانکہ ماہرین فن کا یہ خیال ہے کہ کامیاب ڈراما میں کم سے کم صوتی اثرات ہوں گے۔ اور تجربہ نے بھی یہی بتایا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ایک کلیہ ہو گیا۔ بعض ڈراموں میں زیادہ آوازیں پیدا کرنے کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ مستحسن نہیں تصور کیا جاتا۔ آوازوں کی زیادتی ڈراما کو گنجلک بنا دیتی ہے اور اس کی وضاحت میں خلل انداز ہوتی ہے۔

جہاں یہ دشواریاں ہوتی ہیں وہاں ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے وقت کا سوال بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ پردہ سیمیں یا اسٹیج کے لئے اپنی اپنی مرضی کے مطابق طویل یا مختصر ڈراما لکھ سکتا ہے مگر ریڈیو کی ضرورت اسٹیج کی ضرورت سے مختلف ہوتی ہے۔ کس نوعیت کے ڈرامے کی ضرورت ہے؟ کس موضوع پر ڈراما ہونا چاہیئے؟ اور اس کو کتنا وقت دیا جا سکتا ہے؟ ممالک غیر میں نشری ڈراما کبھی سوا گھنٹے کی مدت کا، کبھی ایک گھنٹے کا اور کبھی اس سے بھی کم مدت کے لئے لکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طویل ڈرامے یا تو کامیاب نہیں ہوتے یا سامعین کی طبع پر گراں گذرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان کی ریڈیائی دنیا میں بھی ڈرامے عموماً کم وقفہ کیلئے لکھے جاتے ہیں۔ کوئی پانچ منٹ کا ہے تو کوئی دس منٹ کا۔ اس طرح پچیس اور تیس منٹ سے لیکر گھنٹے اور سوا گھنٹے کے ڈرامے لکھے جا

رہے ہیں۔ یہاں پر بھی اس کی وہی وجوہ ہیں جو ممالکِ غیر میں۔ اوّل تو ریڈیو کے پروگرام مرتب کرنے والے اپنی مختلف النوع ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، دوسرے روزانہ زندگی کے تجربوں نے ان کو یہ سکھایا ہے کہ سامعین زیادہ دیر تک اپنی قوتِ سامعہ پر زور دیکر اس کو ایک طرف رجوع نہیں رکھ سکتے۔ سامع چاہتا ہے کہ پروگرام جلد از جلد تبدیل ہوتا رہے۔ اس وجہ سے طویل ڈرامے ان کو محظوظ کرنے کے بجائے ان کی تکلیف کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ ریڈیائی ڈرامے بغیر کسی وقفہ (Interval) کے پیش کئے جاتے ہیں۔ اسٹیج پر جہاں 'مناظر' اور اداکاری مجموعی حیثیت سے ڈرامے کی پیدا کردہ "تکان" کو کم کر دیتی ہیں وہاں "وقفہ" بھی اس کی طوالت کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔ پردۂ سیمیں کے ڈراموں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما کا تسلسل ہی اس کی زبردست خوبی ہوتی ہے۔ اس کا پروگرام اس طرح مرتب کیا جاتا ہے۔ کہ اس کی رنگارنگی اس تکان کو دور کر دیتی ہے۔ مگر ڈراما کے درمیان کوئی وقفہ نہیں دیا جاتا۔ خواہ سامع اس کو سنے یا ریڈیو سیٹ کو بند کر دے اگر کوئی سامع چند لمحات کے لئے کسی اور طرف متوجہ ہو جاتا ہے یا کسی ضرورت سے اُٹھ کر کہیں چلا جاتا ہے تو وہ ڈرامے کا بہت سا حصہ نہیں سن سکتا۔ اگر وہ اس کو دوبارہ سُننا چاہے گا۔ تو وہ اپنی خواہش کی تکمیل میں ناکام رہے گا۔ اس وجہ سے ریڈیائی ڈراما نگار کو اپنے ڈرامے پر مقابلتاً زیادہ توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے۔ تاکہ اس کا ڈراما ریڈیائی ٹکنیک کے مطابق ہو اور وہ سامعین کے لئے بارگراں نہ ہو۔

ان پابندیوں کے درمیان نشری ڈراما نگار۔ اپنے ڈرامے کا آغاز کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسے موضوع کا انتخاب کرے جو انتہائی آسانی کے ساتھ کم سے کم وقت میں پیش کیا جا سکے۔ جن کے ساتھ کردار نگاری دشوار نہ ہو جائے اور جن کے پلاٹ سادہ ہوں۔ مخلوط پلاٹ یا گنجلک واقعات ریڈیو ڈراما کیلئے موزوں نہیں ہوتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ "ظرفِ زماں" اور "ظرفِ مکاں" کی پابندی بھی عاید ہو جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ پابندی ان دقتوں کو کم کر دیتی ہے جو ایک اسٹیج کے ڈراما نگار کو پیش آتی ہیں۔

یعنی یہ کہ اسٹیج کے ڈراما نگار کو "ظرفِ زماں" کے سلسلہ میں دو دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اول وہ 'وقت' جو کھیل میں ظاہر کیا جاتا ہے دوئم وہ 'وقت' جو اس وقت کو ظاہر کرنے میں صرف ہوتا ہے جب ڈراما کے وقت کو کم کرنا ہوتا ہے تو اکثر اوقات گھڑی کے ذریعہ سے یہ وقت کم کر دیا جاتا ہے۔ گھنٹہ اسٹیج پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور وہ چند منٹ میں گھنٹے بجا کر وقت گذار دیتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ کھیل کے وقت کی طوالت میں کمی ہو جائے۔ ورنہ شاید ڈراما کے ختم ہونے کیلئے ایک عرصہ کی ضرورت ہو۔ مگر ریڈیائی ڈراما میں "ظرفِ زماں" کی دقتیں کم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ گھنٹے کی آواز مدت کے گذرنے کا صحیح اندازہ دے دیتی ہے کیونکہ سامعین ڈراما سُنتے وقت ہر چیز پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ توجہ انہیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر لیتی ہے کہ وقت گذر رہا ہے۔ اسٹیج پر جو نظر فریب واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ تماشائی اور اسٹیج کے درمیان فاصلہ کافی ہو۔ دوسری چیز کھیل کا "ظرفِ مکاں" ہے۔ پردے، روشنی، اداکاری اور مناظر ایمائی اثرات پیدا کرتے ہیں مگر ریڈیو ڈراما میں ان چیزوں سے ایمائی اثرات (Suggestive Effects) نہیں پیدا کئے جا سکتے بلکہ ریڈیائی ڈراموں کا مکالمہ یہ اثرات خود پیدا کرتا ہے۔ یہ آسانیاں اپنے اندر بہت سی مشکلات بھی پوشیدہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ ایسے حالات اور ایسی صورتیں پیدا کرنا پڑتی ہیں کہ تمام کردار کسی نہ کسی بہانے اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے ایک مقام یا ایک جگہ پر آتے جائیں۔ اتنا ضرور ہے کہ سین کی تبدیلیاں اس میں بہت معاون ہوتی ہیں۔ یکے بعد دیگرے تمام سین بہ آسانی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ کہیں ڈراما بے ربط نہ ہو جائے۔ اس کا تسلسل ختم نہ ہو جائے اور وہ مضحکہ خیز نہ بن جائے۔ یہ ابتدا ہی میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ سامعین آنکھیں رکھنے کے باوجود ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اور نہ ان سے کچھ دیکھ کر حظ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ اندھوں کی طرح سے ریڈیو سیٹ کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "زماں" و مکان کے ساتھ ساتھ ڈراما نگار کو پلاٹ، کردار

نگاری اور کردار کی متعین تعداد کی طرف زیادہ توجہ دینا پڑتی ہے۔ اور بہت محتاط ہو کر ڈراما کو پیش کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کا ڈراما چیستان بن کر نہ رہ جائے۔

ریڈیائی ڈراما کی قسمیں ریڈیائی ڈراما لکھنے اور پیش کرنے کے دو طریقے فی الحال رائج ہیں۔ ان میں ایک آسان ہے اور دوسرا کسی قدر مشکل — آسان طریقہ "فیچر" Feature سے متعلق ہے۔ فیچر دراصل وہ بیانیہ ڈراما ہوتا ہے۔ جس میں راوی حالات اور واقعات مکالمہ کی صورت میں بیان کرتا جاتا ہے یا خود ڈراما نگار اپنے قلم سے بیانات لکھتا جاتا ہے اور ایسے مواقع پیدا کرتا جاتا ہے۔ جہاں وہ اصل واقعات۔ ڈرامائی انداز میں پیش کر کے ڈرامائی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس منظر کے ختم ہوتے ہی "راوی" پھر اپنا بیان شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ گذشتہ واقعات اور آنے والے بیانات میں ایک ربط قائم کر کے ان کو آنے والے واقعات سے ایک خاص رشتہ اور تناسب کے ذریعہ سے ملا دیتا ہے۔ کبھی کبھی دو یا تین کردار کی گفتگو سے بھی فیچر کی ابتدا کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک واقعات اور حالات سے واقف کرتا ہے اور دوسرے استفسار کے ذریعہ سے صرف اپنی معلومات ہی میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ قصہ کی تدریجی ترقی میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہ طریقہ دراصل اسوقت مناسب سمجھا جاتا ہے جبکہ برسوں کے واقعات کو کسی ڈراما میں پیش کیا جائے۔ یا مختلف عہد کے واقعات میں پیوند لگایا جائے۔ عموماً شعراء کی منظوم مثنویوں اور نقصوں کو بھی فیچر ہی کے ذریعہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ سنگیت ناٹک بھی اکثر فیچر کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ناول نگاروں کی طویل ناولوں کو ریڈیائی ڈراما میں صرف فیچر ہی کے ذریعہ سے کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے قصوں میں اختصار پیدا کرتے وقت "ریڈیائی پیش کشی" اور "ریڈیائی اثرات" نہیں پیدا ہو سکتے۔ اگر ضروری بیانات راوی کی زبان سے نہ سُنے جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ بعض واقعات بذات خود ڈرامائی ہوں مگر دوسرے واقعات سے تسلسل اور ربط قائم رکھنے کے لئے ان کو فیچر ہی کی شکل دینا ہوگی۔ "فیچر" نگار کو بھی اپنے پیش نظریہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ڈرامے میں اثرات، کردار، سین اور اداکاری سے نہیں پیدا کئے جا سکتے۔ انسانی چہرے، ان کا میک اپ اور ان کا طریقۂ اظہار جذبات بھی فیچر کی کامیابی میں معاون نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ یہ نظر سے غائب رہتی ہیں۔ صرف مکالمہ اور ان کے پیش کرنے کا انداز اس کے جذبات اور احساسات کو پیش کر دیتا ہے۔

"فیچر" نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ "سحر نگار" قلم رکھتا ہو۔ اس کو اپنی ایمائی قوت سے۔ سامعین کی قوت سامعہ اور قوت تخیل کو متاثر کر کے اپنا ہمنوا بنانا پڑتا ہے۔ اسے چاہئیے کہ وہ اپنے بیانات میں جادو بھر دے۔ یہ جادو نگاری سامعین کے دماغ میں آنے والے تصورات کی مکمل تصویریں بنانے میں مدد دیتی ہے۔ کیونکہ قوت سامعہ سینری، ملبوسات اور روشنی وغیرہ کے اثرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ ان کے اثرات پُر زور بیانات اور مؤثر مکالموں سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ راوی جس قدر پُر زور انداز میں پس منظر پیش کریگا اسی قدر مکمل خاکے سامع کے تخیل میں مرتب ہو کر اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو سکیں گے۔ غیر مؤثر انداز دراصل فیچر کے تسلسل کو ختم کر کے اس میں ایک خلا پیدا کر دیتا ہے۔ اور صحیح اثر مرتب نہیں ہونے پاتا، اس کے بیانات صدیوں کے واقعات میں ربط پیدا کر کے انہیں ایک کڑی بنا دیتے ہیں۔ فیچر میں ایک مبتدی کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مکالموں کی طوالت فیچر کی کامیابی کا سبب ہوتی ہے۔ مکالمہ صرف مناظر کو پیش کرنے کے لئے کم سے کم ہونے چاہئیں۔ فیچر کے مرکزی کردار میں بھی کوئی کمی نہ ہونی چاہئیے۔ پورا فیچر کئی حصوں پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اور ہر حصہ ایک خاص زمانے اور ایک خاص وقت سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اور ہر ایک میں ایک نیا واقعہ اور ایک نیا نظریہ پیش کیا جا سکتا ہے مگر ان کے ربط اور تسلسل میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا۔ غلو کو اس میں جگہ نہ دینی چاہئیے۔ ادبی بیانات مکالمہ میں نہ آنے چاہئیں۔ وہ منظری اثرات پیدا کرنے میں استعمال ہو سکتے ہیں۔

اکثر فیچر کے واقعات، بیانات اور مکالموں میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ یکسانیت مختلف طریقوں سے پیدا ہوتی ہے کبھی

تو راوی کے بیانات ایک تھکا دینے والے انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کا انداز کہیں تبدیل ہی نہیں ہوتا۔ فیچر نگار کو مختلف طریقوں سے بیانات پیش کرنا چاہئیں۔ مختلف طریقوں سے مطلب یہ ہے کہ طرزِ تحریر میں نمایاں فرق ہونا چاہئیے ورنہ یہ یکسانیت فیچر کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ فیچر کے مختلف حصّوں کے واقعات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ واقعات مختلف کردار سے ضرور متعلق ہوتے ہیں مگر سب ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی نُدرت اور کوئی عجوبہ پن نہیں ہوتا۔ یہی حال مکالموں کا بھی ہے۔ ان کی یکسانیت تو فیچر کی تمام خوبیوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ مکالموں کو علیحدہ علیحدہ حصّوں سے علیحدہ علیحدہ نظریوں سے متعلق ہونا چاہئیے۔ الفاظ فقرے اور جملے بھی مختلف ہوں۔ ہر کردار کی زبان سے ایک ہی طرح کی باتوں کا نکلنا ان کے کرداری امتیاز کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ فیچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہئیے کہ وہ سامع میں "تذبذب" کی کیفیت پیدا کر دے۔ اس طرح ان کے اندر ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ آئندہ کے واقعات اور بیانات کو سُننے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

نشری ڈراما ذرا فیچر سے مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں راوی کا گذر نہیں ہوتا۔ پس منظر، تاریخی بیانات یا سماجی حالات صرف ڈراما نگار ہی پیش کر سکتا ہے اور وہ بھی اپنے کردار کے ذریعہ سے۔ ریڈیو ڈراما میں کردار کے معنی مکالمہ کے ہوتے ہیں کیونکہ مکالمہ ہی اُس کا سب سے ضروری جزو ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے کرداری ارتقا پیش کیا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے پلاٹ، کہانی اور واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مکالمہ پر سب سے زیادہ زور دینا چاہئیے اس کا تسلسل تھکا دینے والا نہ ہونا چاہئیے۔ مکالمے ایسے ہوں جو گفتگو سے خود بخود پیدا ہوں اور ڈرامے کو خود بخود ایک خاص نتیجہ کی طرف رجوع کر دیں۔ ڈراما ابتداء کے بعد ہی جوشش اور تحریک کا حامل ہو کر منتہا کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، واقعات بھی یکے بعد دیگرے اور تیزی سے آتے جاتے ہیں۔ کردار بھی آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ غیر ضروری کردار کہیں نہ آنے چاہئیں۔ ڈراما کسی ایک پہلو یا ایک رُخ سے متعلق ہونا چاہئیے۔ اس میں مختلف نظریوں کے پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ڈرامے کی ابتدا ایسی ہو کہ سامعین اس کا پہلا جملہ سنتے ہی اس کو کامل طور پر سننے کے لئے مجبور ہو جائیں اور منتہا تک پہنچتے پہنچتے اُن کی بھی سانس اسی قدر تیز چلنے لگے جیسی کہ کردار کی۔ ڈرامے میں ایکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وہ صرف مکالمہ اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے پیش کی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیائی ڈراما نگار کے پاس "فضا" پیدا کرنے کے لئے خارجی طور پر کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ صرف مکالمہ اس کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے اسے اپنے ڈراما کو کامیاب بنانا پڑتا ہے۔

ریڈیائی ڈراموں میں کردار بھی زیادہ تعداد میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ کردار کی کم تعداد ڈراما نگار کو بہت سی دقتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ زیادہ کیریکٹروں کی تعداد میں آواز کے امتیاز کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا مگر کردار کے تعداد کی کمی اس مشکل کو جلد از جلد حل کر دیتی ہے۔ بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ وہ ڈراما بہترین ریڈیائی ڈراما کہا جا سکتا ہے جس میں کرداروں کی تعداد کافی ہو، کافی سے وہ متعدد کردار مراد لیتے ہیں۔ اور جس میں ایک سے زیادہ اسٹوڈیو کام میں لائے جائیں، مختلف قسم کے صوتی اثرات پیدا کئے جائیں۔ طرح طرح کی موسیقی کے کمالات بھی دکھائے جائیں۔ ایسی صورت میں نہ صرف ڈراما نگار بلکہ پروڈیوسر بھی حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے ڈراموں کو سادہ ہی رکھنا بہتر ہوتا ہے۔ گنجلک اور پیچیدہ اور زیادہ صوتی اثرات رکھنے والے ڈرامے زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں دو باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے اول تو یہ کہ مکالمہ تیر بہدف ہو اور اس کو تخیل کی امداد سے انتہائی رنگ آمیز بنایا گیا ہو۔ اور دوئم موضوع ریڈیائی ضرورت کے مطابق ہو۔

موضوع | موضوع کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق مختلف مقامات پر اشارات کئے گئے ہیں۔ مگر کہیں بھی اس کا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا "موضوع" کی اہمیت کا اندازہ گذشتہ بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما نگار کو نشری ڈراما تحریر کرنے سے قبل یہ سوچ لینا چاہئیے کہ زیرِ نظر موضوع مائیکروفون کے ذریعہ سے سامعین تک کامیابی

کے ساتھ پہنچایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ سمجھ لینا غلطی ہے کہ ہر موضوع ریڈیائی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے اور اگر نہیں ہوتا ہے تو زبردستی بنایا جا سکتا ہے۔ موضوع کی تلاش اور جستجو ریڈیائی ٹکنیک کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہئے۔ آلات کی پابندیاں بھی موضوع کی تلاش و جستجو میں روڑا بن سکتی ہیں۔ موضوع کی تلاش و جستجو میں یہ امر مد نظر رکھنا ہوگا۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامعین کی طبیعت سے مطابقت کرے۔ اگر کسی ڈراما نگار کے ڈرامے سے کسی شخص کو تکلیف پہنچتی ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ڈراما نگار موضوع کے انتخاب میں کامیاب نہیں ہوا۔ ان کے موضوع ایسے ہونے چاہئیں کہ عوام ان سے دلچسپی لیں جن کو ہر شخص سن کر خوش ہو اور جو اس میں ایسا جذبہ پیدا کریں جس سے وہ اس ڈراما نگار کے ڈرامے آئندہ سننے کے لئے تیار ہو جائے۔ "دل آزاری" کی ریڈیائی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی ڈراما سے کسی متنفس کو ذرا سا بھی آزار پہنچتا ہے۔ تو وہ ڈراما "ناقص" تصور کیا جائے گا۔ ہندوستان کی "فضا" عرصہ دراز سے مکدر چلی آ رہی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کی ریڈیائی دنیا نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ ہندوستان کی کثیر سے کثیر آبادی سے لیکر قلیل سے قلیل آبادی تک کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ایسے موضوع انتخاب کئے جائیں جن کا نزاعی مسئلوں سے کوئی لگاؤ نہ ہو۔ ایسے ڈرامے جو ہندوستان کی دو بڑی اقوام ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات پر مبنی ہوں یا ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی گئی ہو یا ایسے تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہوں۔ جن میں کسی قوم یا فرقہ کی سبکی ہوتی ہو یا مجموعی حیثیت سے قومی احساس اور قومی وقار کو ٹھیس لگتی ہو۔ یا کسی خاص طبقہ کے رہن سہن کے طریقے اور رسم و رواج کو دکھلا کر اسے مطعون کرنے کی کوشش کی گئی ہو ہندوستان کی ریڈیائی دنیا سے نشر نہیں کئے جا سکتے۔ اگر کوئی ڈراما نگار ایسا موضوع اختیار کرکے ڈراما لکھتا ہے۔ اور نشر کیا جاتا ہے تو صدائے احتجاج ملک کے مختلف گوشوں سے بلند کی جاتی ہے۔ ایسے ڈرامے جو کسی ایسے خاص موضوع پر لکھے جائیں۔ ممکن ہے کہ وہ کسی خاص طبقہ کے تماشائیوں کو خوش کر سکیں اسٹیج پر بھی "دل آزاری" کو پیش نظر رکھا جاتا ہے مگر ریڈیائی دنیا میں تو اس قسم کے ڈراموں کا گذر ہی نہیں۔ آواز کے شیدائیوں کے لئے ڈراما نگار ایسے ڈرامے لکھے جو کسی طرح کسی کی بھی دل شکنی نہ کرے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ عام موضوع مثلاً طلاق، منگنی، کورٹ شپ اور طوائف، بھی ریڈیائی ڈراموں کے لئے موزوں تصور نہیں کئے جاتے۔ ایسے موضوع جن میں کہیں بھی اختلاف پیدا ہوتا ہو فوراً حذف کر دینے چاہئیں۔ نظریوں کے اختلافات کی بھی ریڈیائی ڈراموں میں گنجائش نہیں۔

ڈراموں کے موضوع ایسے ہونا ضروری ہیں۔ جن کو سن کر سامعین میں اچھے جذبات پیدا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہئے کہ ان کی روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے۔ مجھے ڈراما کے قدیم پرستاروں کی وہ باتیں یاد ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ڈراما کو تماشائیوں میں "جذبۂ رحم اور جذبۂ خوف و ہراس" پیدا کر دینا چاہئے۔ ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایسے جذبات پیدا کر کے بہترین انسان بنا دیئے گئے ہوں۔ آج کی دنیا میں "رحم" کی جگہ تو کسی قدر ضرور ہے۔ مگر خوف و ہراس کی قطعی گنجائش نہیں۔ آج کل ایسے ڈراموں کی ضرورت ہے جو تعلیمی ہوں اور جو ساتھ ساتھ تفریح طبع کا باعث بھی ہوں۔ اسٹیج کے ڈراما نگار موضوع کے انتخاب کے وقت یہ تصور کر لیتا ہے کہ تماشائی اس کا ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ ان میں کس قوم، کس نسل، کس طبقہ اور کس کس مذہب کے لوگ ہیں مگر ریڈیائی ڈراما نگار یہ تصور نہیں کر سکتا۔ کہ کون کون سامعین، کہاں کہاں، کس کس ماحول میں اور کن کن جذبات اور احساسات کے ساتھ اس ڈرامے کو سن رہے ہیں وہ لاتعداد سامعین کے لئے ایک موضوع انتخاب کرکے ایک ڈراما لکھتا ہے۔

"موضوع" کا انتخاب ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے بہت دشوار ہے۔ اسے ہر فرد کی دلچسپی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ "صنفی" "جذبات کا اسے احترام کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کے سامعین صرف مرد ہیں یا صرف عورتیں۔ اسے یہ قیاس آرائی کرنا پڑتی ہے اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں اس کے ڈرامے کو سنتے ہیں۔ دونوں صنف کے سامعین اپنی اپنی انفرادیت کے علاوہ "صنفی خوبیاں" بھی رکھتے ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ صنفی، قومی اور

صنفِ نازک میں سے کسی کو بھی اس کے ڈرامے سے صدمہ نہ پہنچے۔ "موضوع" ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک کے مخالف پڑے اور دوسرے کے موافق۔ اسے ڈرامے کو اس طرح تحریک کے بعد جوش میں لاکر منتہا تک پہنچانا پڑتا ہے۔ کہ دونوں میں سے کسی میں بھی "احساس کمتری" پیدا نہیں ہونے پاتا۔ غرض ڈرامے کا "موضوع" نوعیت کے لحاظ سے انتہائی بلند ہونا چاہیئے اور اس موضوع کے پیش کرنے کا انداز بھی اچھوتا ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ بوڑھوں، بچوں، جوانوں، نوجوانوں، مردوں اور عورتوں کی طبیعتوں کو یکساں طور پر خوش کر سکے۔ سوسائٹی کے مختلف طبقے امیر و غریب، سب کے سب اس سے محظوظ ہوں۔ جہاں تک مختلف فنون کا تعلق ہے، ڈرامے کو ہر فن کے ماہر کے لئے دلچسپ ہونا چاہیئے یعنی "موضوع" عام دلچسپی کا ہو نہ کہ چند مخصوص افراد کے لئے وہ موزوں ہو۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ "موضوع" ایسا ہو جو ہر فرد کو خوش کر سکے۔ یقیناً ڈرامے کو ایسا ہونا چاہیئے مگر یہ امر محال معلوم ہوتا ہے کہ ہر سامع ڈرامے سے محظوظ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سامع کی طبیعت خود کسی ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے بدمزہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت اسے کوئی ڈراما اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں ڈراما نگار کی تمام تر کوششیں بیکار اور فضول ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ صرف اس سامع کے نقطۂ نظر سے۔ ہر کلیہ کے لئے دو ایک مستثنیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ڈراما چند سامعین کو خوش نہ کر سکا یا اس کا موضوع ان کی طبیعت کے مناسب حال نہ ہوا تو اکثریت کی خوشنودیٔ طبع پر ڈرامے کے "موضوع" کی کامیابی کا انحصار ہوگا۔

گانے کہا جاتا ہے کہ "گانے" ریڈیائی ڈراموں کے لئے اسی قدر ضروری ہیں جس قدر کہ انسانی زندگی کے بقاء کے لئے نمک۔ اگر انسان نمک کا استعمال جاری نہ رکھے تو وہ متعدد امراض کا شکار ہو جائے۔ اسی طرح اگر ریڈیائی ڈراموں میں موسیقی نہ پیش کی جائے تو اس میں کوئی جاذبیت اور دلکشی باقی نہ رہے گی۔ عوام ڈراما دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں سُننے کے نہیں۔ مگر آواز کے شیدائیوں کو ڈراما سُننے کا عادی بننا پڑتا ہے۔ اور دیکھنے کی عادت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پہ لوگ گانا سننے کے عادی ہوتے ہیں پھر اگر سُننے والے ڈراموں میں موسیقی یا گانے نہ ہوں تو اُن کی قوت سامعہ تشنہ رہ جاتی ہے اور اس کو کچھ کمی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ یہی کمی نشری ڈرامے میں عیب بن کر ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر "موسیقی" اور "گانے" کا مقصد ان پکے گانوں سے نہیں جن میں آواز کے زیر و بم سے راکشسوں کی لڑائی کا سا اظہار کیا جاتا ہے۔ میرا مطلب ان ہلکے پھلکے گانوں سے ہے جو بہ آسانی عوام کی سمجھ میں آجائیں اور جن سے وہ دلچسپی لے سکیں۔ اگر "پکے" گانوں کو ڈراما کے لئے ضروری قرار دے دیا جائے تو ڈرامے خاک میں مل جائیں۔ وہ صرف راگ اور راگنیوں کا مرقع بن جائیں گے۔ انکے سامعین کی تعداد میں بھی کمی ہو جائے گی۔ عام طور پر عوام کی سمجھ کے مطابق گانے نشری ڈراموں میں پسند کئے جاتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں، موقع اور محل کے لحاظ سے ڈراما کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ کیونکہ "احساس سامعہ" میں برتری پیدا ہو جاتی ہے۔ گانوں کا اصل پلاٹ سے تعلق ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ بے موقع اور بغیر کسی واقعہ کی ضرورت کے لحاظ سے پیش کر دیئے گئے تو وہ بدنما پیوند ہو جائیں گے۔ اور اُن کی تمام تر خوبی خاک میں مل جائے گی۔ ان کا پلاٹ میں ایک جزو کی حیثیت سے شامل ہو جانا ضروری ہے۔ تاکہ پلاٹ میں دلکشی اور بڑھ جائے۔ کردار اور ان کے ماحول سے بھی گانوں کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ ایک ریڈیائی ڈرامے میں کتنے گانے ہونے چاہئیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب میں "گانوں" کی تعداد کو متعین کر دینا چاہیئے۔ مگر اس کے لئے کوئی قانون، کلیہ یا اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈراما نگار کے ڈرامائی احساس یا ریڈیائی احساس پر منحصر ہوتا ہے۔ کہ اس کے ڈرامے کو کتنے گانوں کی ضرورت ہے؟ کبھی ابتدا میں، کبھی درمیان میں اور کبھی اختتام پر ان کی ضرورت پڑتی ہے کبھی ہر وقفہ پر گانوں سے کرداروں کی کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے اور قصہ کی تدریجی ترقی میں مدد لی جاتی ہے۔

غرض گانوں اور سازوں کے پیش کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جس طرح ریڈیائی ڈراموں کے کردار اپنی آواز

کی وجہ سے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ اسی طرح "گنگنے" بھی
پس پشت نہیں ڈالے جا سکتے۔ کبھی کبھی پس منظر سازوں کے ذریعہ
سے پیش کیا جاتا ہے، کبھی ریڈیائی فضا پس منظر کے گانوں اور
نغموں سے مرتب کی جاتی ہے۔ بعض اوقات کیا اکثر اوقات یہ نغمے
اور گانے کرداری جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یعنی
گانوں کی نوعیت یہ بخوبی ظاہر کر دیتی ہے کہ کردار کس ماحول سے گزر
رہا ہے۔ اور اس کا کیا اثر اس کے دل و دماغ پر مرتب ہو رہا ہے۔
اس کے نغمے کبھی خوشی کے پیامبر ہوتے ہیں اور کبھی درد و غم کا پتہ
دیتے ہیں۔ کبھی وہ مایوس ہو کر گاتا ہے اور کبھی امید کو سہارا بنا کر
پھولے نہیں سماتا اور گا گا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے کس طرح
کا گانا کس قسم کے ریڈیائی ڈرامے میں ہونا چاہیئے؟ دراصل ایک
غور طلب مسئلہ ہے مگر گانوں کی قسم کے متعلق کوئی تحقیقی بات تحریر
نہیں کی جا سکتی۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ گانے دو طرح کے ہوتے
ہیں۔ ایک وہ جو انسانی روح کو سرور بخشیں اور دوسرے وہ جو
انسان کو مغموم بنا دیں۔ ان کے بارے میں اتنا بتایا جا سکتا ہے۔ کہ
ریڈیائی ڈراما میں گانے کا انحصار ضرورت پر ہونا چاہیئے جس طرح
کے حالات ہوں، جیسی فضا ہو اور جس قسم کا ماحول ہو۔ یعنی ماحول
کے مطابق گانے بھی ڈراما کی طرح المیہ اور طربیہ ہوں گے۔ اگر ماحول
اور ریڈیائی فضا کے خلاف گانے ہوں گے تو ڈرامائی اثرات خاک میں
مل جائیں گے۔ یہ گانے ہلکے پھلکے اور عوام کی سمجھ اور پسند کے مطابق
ہونا چاہئیں۔ اگر کوئی ریڈیائی ڈراما نگار گانوں پر قدرت نہیں رکھتا
تو اُسے یہ کام غزلوں اور نظموں سے نکال لینا چاہیئے۔ غزلوں اور
نظموں یا گیتوں کو جگہ دیتے وقت ان کی موزونیت پر بھی غور کر لینا
چاہیئے۔ دوسروں کی غزلوں اور نظموں کو لیتے وقت ان کے مصنف
یا ناشر کی اجازت لینا واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ نشرگاہ کبھی ان کی
ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہوا تو اُس کا
تمام تر ذمہ دار ڈراما نگار ہوتا ہے۔

گانے کبھی کبھی بالکل جذباتی ہو جاتے ہیں یعنی وہ سامعین میں بھی
وہی جذبات پیدا کر دیتے ہیں جو کہ اس وقت کردار کے دل و دماغ
پر حاوی ہوتے ہیں۔ ایسے گانے بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ مگر
وہ گانے جو جذباتی نہیں ہوتے اُس قدر مؤثر بھی نہیں ہوتے اور ان
سے اتنے اثرات بھی مرتب نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی "نغموں" پر ڈرامے
کا انحصار ہوتا ہے یعنی ڈراما سنگیت ناٹک کا روپ لے لیتا ہے۔
اس میں بھی ڈرامے کی نوعیت کا خیال رکھ کر گانے پیش کرنے چاہئیں۔
اگر کوئی "نغمہ" کسی ڈرامے کے وجود کا سبب بن جائے تو اسے
ڈراما کی "جان" سمجھ کر اسی نوعیت کے اور گانے لانے چاہئیں۔
گانوں کو ڈراموں میں جگہ نہ دینا گویا جسم کو "روح" سے محروم رکھنا
ہے۔ ایسے ڈرامے دراصل مکالمے بن جاتے ہیں۔ اس لئے ہندی
ڈراما نگاروں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ڈراما کو مسحور کُن اثرات سے
معمور کر کے گانوں کو مناسب وقفوں کے ساتھ مناسب موقعوں پر
پیش کرنا چاہیئے۔

کردار اور اداکار

اسٹیج اور اسکرین پر کرداروں کو پیش کرنا
بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے کیونکہ سامعین کے بجائے وہاں تماشائی
ہوتے ہیں جو اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ پارٹ کی ادائیگی کے لئے
ان کا انتخاب صحیح بھی ہوا یا نہیں۔ ان کو تماشائیوں کے روبرو اسٹیج
اور اسکرین پر نمودار ہو کر ...... اپنی اداکاری اور اپنے مکالموں سے
مسحور کرنا پڑتا ہے۔ ان کا قدرتی حُسن سڈول جسم، خوبصورت چہرہ
اور مقناطیسی آنکھیں ان پر مجموعی حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہیں سونے
پر سہاگہ یہ کہ میک اپ مناظر اور روشنی وغیرہ اس اثر کو مکمل بنانے
میں اور معاون ثابت ہوتی ہیں مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے ان
میں سے کوئی بھی معاون ثابت نہیں ہو سکتیں کیونکہ مناظر، روشنی،
میک اپ اور قدرتی حُسن اس کے سامعین کے روبرو پیش نہیں
کئے جا سکتے۔ اس وجہ سے نشری ڈراما نگار کے لئے اپنے سامعین
کو رام کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ ملبوسات سے بھی ریڈیائی ڈرامے
کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ایک اداکار فقیر کا لباس پہن کر بادشاہ
کے بول ادا کرتا ہے۔ تو ریڈیو کے سامعین پر اس متضاد پہلو کا کوئی
اثر نہیں پڑتا۔ مگر اسٹیج اور پردۂ سیمیں کے سلسلہ میں ایسی متضاد
صورتوں کی زبردست اہمیت ہے۔ مائکروفون کے ڈراما میں کردار

کی اہمیت کسی طرح نظر انداز نہیں کیجا سکتی کیونکہ ڈرامے کی تخلیق کیساتھ ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کردار کو پیش کرنے کیلئے کس قسم کے افراد کا انتخاب کیا جائے؟ اداکاروں کا انتخاب دراصل ڈرامے کے موضوع پر ہوتا ہے پروڈکشن انچارج کو اس امر کا اندازہ لگانا پڑتا ہے کہ کس قسم کے اداکار کیلئے کون کون سے آرٹسٹ اور افراد موزوں ہیں۔ یہ موزونیت جسم اور چہرہ یا اُن کی اداکاری کی نوعیت سے نہ ہوگی بلکہ اس کا انحصار "آوازوں" پر ہوگا۔ کس قسم کے کردار کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی آوازوں کی ضرورت ہے؟ اس ضرورت کے مطابق پروڈیوسر کردار پیش کرنے والے افراد کا انتخاب کرے گا۔ اگر عورتوں کی آوازوں کی ضرورت ہے تو وہ مختلف الآواز عورتیں تلاش کرے گا۔ جس طرح کا کیریکٹر ہوگا۔ اسی طرح کی آوازیں بھی ان کو پیدا کرنا ہوں گی۔ اگر مخنی آواز کی عورت کی ضرورت ہے تو ایسی ہی آواز والی اداکار کو پسند کرنا ہوگا۔ کڑک کر بولنے والی آواز کے لئے اس قسم کی عورت کی ضرورت ہوگی۔ سن وسال کے لحاظ سے بھی اداکاروں کا انتخاب ضروری ہوگا۔ بوڑھی جوان۔ ادھیڑ اور کمسن عورتوں اور لڑکیوں کی آوازوں میں امتیاز قائم رکھنے کے لئے علیحدہ علیحدہ کرداروں کا انتخاب صنفِ نازک سے کرنا پڑے گا۔ مردانہ کرداروں میں بھی "آواز" انکے انتخاب کا فیصلہ کرتی ہے۔ بوڑھے۔ جوان اور کمسن۔ جس عمر کے کیریکٹر کیلئے اداکاروں کی ضرورت ہوگی ویسے ہی ان کو انتخاب کرنا ہوگا۔ بچوں کے پروگرام میں اگر بچوں کی ضرورت ہو تو بچوں کا "آواز" کی مناسبت سے انتخاب کرنا چاہئے۔

ڈرامانگار اپنے ڈرامے میں ایسے کردار عموماً رکھتا ہے جو انسانی زندگی سے انتخاب کیئے گئے ہوں۔ تاکہ سامعین کو یہ معلوم نہ ہونے لگے۔ کہ تمام اداکار اپنی ہی سوسائٹی کے افراد ہیں انکا چناؤ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سامعین کے بالکل نزدیک آجائیں اور انہیں وہ اپنے ہی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے افعال اور ان کی آوازیں ایسی ہوں جو برقی لہروں کے ذریعہ سے سامعین تک پہنچا دی جائیں۔ اگر وہ کامیابی کے ساتھ نشر کی جا سکتی ہیں۔ تو یقیناً ڈراما کامیاب ہوگا۔ ورنہ اس کے نقص کا احساس ہو جائے گا۔ نشری ڈراما میں کرداری ارتقا اور کرداری تکمیل کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔

نشری ڈراما لکھتے وقت کردار کی تعداد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر ڈرامانگار غیر ضروری کردار پیش کرتا ہے تو یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہ یہ غیر ضروری کردار ڈراما کی ناکامیابی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ نشری ڈراما میں کردار کا تصور پہلے "صوتی" ہونا چاہئے۔ اس کے کردار گوشت اور پوست کے کردار بن کر سامعین کو دکھائی نہیں دے سکتے وہ کردار دراصل وہ آوازیں ہوتی ہیں جو اپنے امتیازات کی بدولت علیحدہ علیحدہ کردار کی خصوصیت ظاہر کرتی ہیں۔ اس طرح گویا ریڈیائی کردار "آوازیں" ہیں جو کردار کے نام بتا کر نشر کی جاتی ہیں۔ زیادہ کردار کے معنی زیادہ آوازیں ہیں۔ زیادہ آوازوں کے معنی آوازوں کے امتیاز کی دشواری کے ہیں۔ ایک آواز عموماً ایک کردار ظاہر کرتی ہے۔ آوازیں اکثر ملتی جلتی بھی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے پیش کرنے والے کی دقتوں کا احساس بھی ڈرامانگار کو رکھنا چاہئے۔ وہی ڈراما کامیابی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔ جن میں کردار کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی یعنی جن میں آوازوں کے امتیازات کی دشواریاں زیادہ نہیں پائی جاتیں۔ آواز کے امتیاز کے مٹ جانے سے پورا ڈراما خاک میں مل جاتا ہے۔ اور سامعین متنفر ہو کر اپنا سیٹ بند کر دیتے ہیں۔

مکالمے | ریڈیائی ڈراما کامل طور پر آوازوں کے ذریعہ سے سامعین تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس میں کہیں گانے پیش کئے جاتے ہیں اور کہیں صوتی اثرات پیدا کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کا بیشتر حصہ مکالموں پر مبنی ہوتا ہے۔ مکالموں ہی کے ذریعہ پلاٹ کے واقعات۔ ان کی ترتیب اور کردار کے جذبات اور احساسات پیش کئے جاتے ہیں۔ گویا ریڈیائی ڈرامے دراصل مکالمے ہوتے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا گویا اصل ڈرامے کو ختم کر دینا ہوتا ہے۔ عام طور پر ڈرامانگاروں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مکالمے ہماری روزانہ زندگی کی بات چیت کے مانند ہوں۔ مگر اس میں اس قدر اضافہ کی ضرورت ہے کہ ان مکالموں میں ڈرامائی اثرات بھی ہوں۔ ہماری روزانہ زندگی کے بہت سے مکالمے، بیکار، فضول، لغو اور لچر ہوتے ہیں۔ ان میں کبھی نہ تو زور ہوتا ہے۔ اور نہ کیف، نہ ان سے کوئی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ ان سے کوئی مطلب برآری ہوتی ہے۔ اگر ریڈیائی ڈراما کے مکالمے ایسے ہوئے تو وہ بھی بے کیف ہونگے۔ اس کے روزانہ زندگی سے متعلق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ غیر

فطری نہ ہو جائیں۔ ان میں مافوق العادت باتیں نہ پیش کردی جائیں۔ جو مکالمہ ہو وہ فطرت سے مطابقت رکھتا ہو۔ غیر ضروری اور بھرتی کے مکالمے نہ ہوں۔ ان میں جگہ جگہ اور موزوں مقامات پر سوال و جواب استفہام و تعجب، غم و غصہ اور طرب و تاسف کے انداز کو پیش نظر رکھا گیا ہو مگر یہ انداز بھی غیر فطری نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ مکالموں کی کامیابی کا انحصار کردار کے طرز ادا پر ہوتا ہے۔ مگر کردار تو در اصل ڈرامانگار کے تحریر کردہ مکالموں کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک حد تک اداکار اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مگر پوری ذمہ داری اس کی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ مصنف کے مقرر کردہ انداز میں مکالموں کو ادا کرے گا۔ اس وجہ سے ریڈیائی ڈرامانگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جن جذبات کو جہاں ادا کرنا چاہئے وہاں وہ اسی طرح کے پُر جوش مکالمے پیش کرے تاکہ اس کا مفہوم، اس کا مقصد اور اس کے جذبات پورے طور پر ادا ہو جائیں۔ اگر وہ عبارت کے اختتام پر تعجب، سوال، استفہام وغیرہ کی علامتیں بھی لگاتا جائے تو اس غلطی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

ریڈیائی ڈرامانگار کا یہ اولین فرض ہوتا ہے کہ وہ مکالمے "موضوع" سے متعلق لکھے اور اس طرح کہ مکالمہ موضوع میں پیوست ہو جائے۔ دونوں میں کوئی جوڑ اور پیوند محسوس نہ ہو۔ یہ نہ محسوس ہو سکے کہ ڈرامانگار کو الفاظ محاورے اور فقرے ایسے نہ مل سکے جو وضاحت کے ساتھ اس کے موضوع کو پیش کر دیتے۔ مکالمے کے جملوں اور فقروں کو برجستہ، برمحل اور چست ہونا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مکالموں کو برجستہ بنانے میں غیر ضروری اور غیر متعلق مکالمے آجائیں۔ بات چیت کا جو فطری جواب ہو وہی آئے۔ بلا وجہ تمثیلیں اور استعارے لانا در اصل ڈرامے کو بوجھل اور غیر فطری بنانا ہوتا ہے۔ مکالموں کی طوالت سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ ان کی بہترین خوبی ان کا اختصار ہے۔ مگر اختصار بھی کبھی کبھی بدنما معلوم ہونے لگتا ہے اختصار اتنا نہ ہو کہ اصل مطلب کی وضاحت بھی نہ ہونے پائے جہاں زیادہ اختصار سے یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ وہاں طوالت بھی قوت سامعہ پر گراں گذرنے لگتی ہے۔ ایجاز یا اختصار کو ریڈیائی محدود وقت کی وجہ سے اور بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈرامے مقررہ وقت میں ختم ہو جاتے ہیں جو ڈرامے مقررہ وقت کے اندر ختم نہیں ہوتے ان کو مستحسن تصور نہیں کیا جاتا۔

مکالمے پیش کرتے وقت کردار کے سماجی مرتبہ کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ وہ کس طبقہ کے لوگوں سے متعلق ہے؟ اس طبقہ کے لوگوں کا مخصوص انداز گفتگو، ان کے مخصوص جملے اور فقرے مکالموں میں جان ڈال دیتے ہیں اور لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ادنیٰ طبقہ لوگوں کی رکیک اور ناگفتہ بہ باتوں کو مکالموں میں لایا جائے۔ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہماری زندگی کا ہر مکالمہ، ہر گفتگو اور ہر بات چیت، صفحۂ کاغذ پر نہیں پیش کی جا سکتی اور وہ آوازوں میں بھی منتقل نہیں کی جا سکتیں۔ اس وجہ سے پاکیزہ گفتگو اور پاکیزہ مکالموں کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اور تب ان مکالموں کو صاف اور شستہ انداز میں پیش کیا جا سکے گا۔ تاکہ ابتذال بھی نہ پیدا ہونے پائے۔ اور ناگفتہ بہ باتیں سننے والوں کی قوت سامعہ پر گراں نہ گذریں۔ اسی طرح اعلیٰ طبقہ کے افراد کی گفتگو بھی من و عن پیش کر دینا درست نہیں ہوتا۔ ان کی باتوں میں سے انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور صاف، ستھری اور سلجھی ہوئی گفتگو کو پیش کیا جاتا ہے پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام گفتگو پاکیزہ، صاف اور سلیس ہو کسی قسم کا تنفر سامعین کے دلوں میں پیدا نہ ہو۔ ایسی باتیں مکالموں سے نکال دینی چاہئیں جو افراد یا طبقوں یا پیشہ وروں میں اختلافات پیدا کریں۔

'مکالمے' لکھتے وقت کرداروں کے سن و سال کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کس عمر کا کیرکٹر ہے؟ وہ کس جذبہ کے تحت میں جملے بول رہا ہے؟ اگر ڈرامانگار یہ بات اپنے پیش نظر رکھے۔ تو اس کے مکالمے کبھی غیر فطری نہیں ہو سکتے۔ سن و سال کے لحاظ سے جو مکالمے ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں۔ وہ انتہائی مؤثر ہو جاتے ہیں اور ڈرامے کی کامیابی میں مدد کرتے ہیں۔ بچوں کی زبان سے بچوں کے تخیل کے مطابق جملے ادا ہونے چاہئیں۔ ان کی زبان سے بوڑھوں کی باتیں قبل از وقت معلوم ہوتی ہیں یا بوڑھوں کی زبان

سے جوانوں کی سی باتیں مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں - جوانوں کی باتوں سے اگر یہ مترشح ہو کہ وہ بوڑھے ہیں یا بچے ہیں تو اُن کی جوانی کا سامعین پر کوئی اثر نہیں پڑتا - وہ قبل از وقت بوڑھے معلوم ہونے لگتے ہیں یا ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے قویٰ نے پورے طور پر نشوونما نہیں پائی - مطلب صرف یہ ہے کہ گفتگو غیر متاثر اور غیر فطری نہ ہونے پائے - ریڈیائی ڈراموں میں مکالمے انتہائی سادے ہونے چاہئیں جو آسانی سے سمجھ میں آ جائیں - یہ مکالمے سادے اسی وقت ہو سکتے ہیں - جبکہ کردار کی صنف کو پیشِ نظر رکھا جائے ، عورتوں کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کرائے جائیں جن میں نسوانیت پورے طور پر جلوہ گر ہو - مردوں کے مکالمے ان کی پوزیشن یا مرتبہ کے مطابق ہونا چاہئے - اس وقت مکالمے زیادہ فصیح ہوں گے - ریڈیو میں 'بلاغت' کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی - بلیغ جملے اور فقرے اس کے حسن کو ختم کر دیتے ہیں -

ریڈیائی ڈراموں کی زبان

ریڈیو کی زبان کا مسئلہ صرف مسئلہ زبان نہیں رہا ہے - بلکہ وہ ادبی حدود سے گذر کر کسی حد تک سیاسی بن گیا ہے - ریڈیائی ڈراموں کی زبان کیا ہونی چاہئے ؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب یکلخت نہیں دیا جا سکتا - یہ مسئلہ ہندی اور اردو کا نزاعی مسئلہ ہے - کوئی راشٹر بھاشا استعمال کرنا چاہتا ہے اور کوئی فارسی اور عربی آمیز اُردو یعنی کوئی ریڈیائی ڈراموں کی زبان کو ہندی کے سنسکرت آمیز الفاظ سے سنوارنا چاہتا ہے - اور کوئی عربی اور فارسی کے الفاظ ، محاورات اور فقرے استعمال کرکے اس میں زور پیدا کرنا چاہتا ہے - ریڈیو کی حکمت عملی اس کا تصفیہ کر سکتی ہے - مگر یہ حکمت عملی ان دونوں طبائع کے تابع ہوتی ہے اور جہاں جس کو موقع ملتا ہے وہ اپنی سی کر گذرتا ہے - یہ حکمتِ عملی ریڈیو کے سامعین کی تعداد کا تعیّن کرتی ہے - جس ملک میں ایک قوم اور ایک مذہب کے لوگ آباد ہوتے ہیں - وہاں اُن کی مادری زبان بھی ایک ہوتی ہے - مگر جو ملک " اُردو " یعنی لشکر گاہ بن جاتا ہے - وہاں ایک قوم نہیں رہتی - وہاں ایک قومیت کی تشکیل نہیں ہونے پاتی ، اس وجہ سے وہاں ایک زبان بھی نہیں ہوتی جتنی قومیں ہوتی ہیں اتنی ذیلی زبانیں ہوتی ہیں - ان میں سے چند زبانیں (Languages) بن جاتی ہیں ایسے ممالک میں زبان کا مسئلہ ہمیشہ جھگڑے کا سبب بن جاتا ہے - یہاں بھی یہی دشواری ہے - پھر بھی اس کا ایک حل نکالا گیا ہے - اور اس کے لئے ایک لفظ اختیار کر لیا گیا ہے " ہندوستانی " ــــــ اس سے مراد وہ زبان ہے جو گفتگو اور کاروبار کی زبان ہے - ملک کا اکثر و بیشتر طبقہ اسی کو بولتا اور سمجھتا ہے - یہ ضرور ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو ایک خاص زبان سے منسوب کرنے کی کوشش کی مگر اس کا عام مفہوم یہی ہے - اس کو ریڈیو کی ضرورت کے ماتحت اختیار کیا گیا ہے - اس کے لئے ڈرامے عام طور پر ہندوستانی میں لکھے جاتے ہیں - ڈرامانگار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ڈراموں میں ہندوستانی کو جگہ دے یعنی وہ عوام کی سمجھ کے لئے آسان سے آسان زبان استعمال کرے - ریڈیائی ڈراموں میں اگر ادبیت پیدا کی جائیگی اور زبان کی نکات پیش کی جائیں گی تو وہ صرف ایک طبقہ تک محدود ہو کر رہ جائیگا - اس میں تشبیہات ، استعارات ، صنائع لفظی و معنوی - اور تلمیحات کی کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی - اس وجہ سے ہمیشہ عام فہم زبان ، عام فہم انداز ، اور عام فہم لب و لہجہ میں پورا ریڈیائی ڈراما پیش کرنا پڑتا ہے - تاکہ وہ ہر طبقہ کے سامعین سے خراجِ تحسین حاصل کر سکے -

مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے - وہ ریڈیائی ڈراموں کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے مگر ریڈیائی ڈرامانویسی کے فن کے متعلق قواعد و ضوابط مرتب کرنا دراصل ڈرامانویسی کے فن کو محدود کرنا ہے - ڈرامانگار ایک فنکار ہوتا ہے - وہ اپنے آرٹ کو بخوبی سمجھتا ہے - مگر صرف آرٹ کے سمجھ لینے سے وہ کامیاب ڈرامانگار نہیں بن سکتا - اسے اپنے اوپر پابندیاں عائد کرکے ڈراما لکھنے کی مشق بہم پہنچانا پڑتی ہے - اور ساتھ ہی ساتھ وقت کی تبدیلیوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے - اگر وہ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ قدم نہیں اٹھاتا تو اس کا فن کُند ہو کر رہ جاتا ہے - اس کے ڈرامے قبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکتے - اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سامعین کے رجحانات کی تبدیلیوں کا بھی اندازہ لگاتا رہے جس زمانے میں عوام طربیہ ڈرامے پسند کریں تو اسے ان کی طرف توجہ دینا چاہئے - اگر المیہ ڈراموں کی مانگ ہو - تو اُسے المیہ لکھنے چاہئیں - اگر سامعین مذاحیہ ڈرامے پسند کرتے ہوں تو مذاحیہ ڈرامے لکھنا ضروری ہیں - مگر یہ سب اسوقت جبکہ ڈرامانگار کو ان تمام اسالیب نگارش پر قدرت ہو

عندلیب شادانی

ترانہ، دوبیتی، رُباعی

جولائی، اگست ۱۹۴۴ء کے شاعر (آگرہ) میں یہ سطریں نظر سے گذریں

استفسار:

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر
جِسے نانِ جویں بخشی ہے تُو نے اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

مندرجہ بالا کو بعض لوگ رُباعی کہتے ہیں اور بعض قطعہ۔ اس سلسلہ میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے"...

... ولی شاہ بسمل دھوراجی

جواب:- "یہ اشعار بطورِ قطعہ ہیں۔ رباعی نہیں۔ کیونکہ اِن کی بحرِ ہزج مسدس مقصور ہے۔ جس کا وزن یہ ہے:- مفاعیلن، مفاعیلن۔ مفاعیل[1]

رُباعی کے مخصوص اوزان یہ ہیں:- مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع (رُباعی کے ۲۴ وزن اور لکھے ہیں) ان اوزان میں سے جواب طلب۔ اشعار کسی وزن پر نہیں۔ اس لئے وُہ بطور قطعہ جاننے چاہئیں"۔ آثم مظفر نگری

پھر اکتوبر ۱۹۴۴ء کے شاعر میں یہ استفسار و جواب شائع ہوا:-

استفسار:- "جولائی، اگست کے شاعر میں آپ نے لکھا ہے کہ اقبال کے اشعار "دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر" الخ قطعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن کتاب رباعیات ابو سعید ابو الخیر میں مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی وزن میں ہیں:-

خداوندا بگردانی بلا را
ازیں آفت نگہداری تو ما را
بحقِ آں دو گیسوئے محمّد
مشرف کُن خراب آباد ما را

کتاب کا نام ظاہر کرتا ہے کہ مندرجہ بالا دو شعر "رباعی" ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے"... گلشن جلال آبادی

جواب:- "ہاں اقبال کے اشعار کو رباعی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وُہ رباعی کے مقررہ اوزان سے باہر ہیں۔ اسی طرح ابو سعید ابو الخیر کے اشعار بھی رباعی نہیں۔ رہی یہ بات کہ پھر وُہ رباعیات کے سلسلے میں کیوں درج کر دئے گئے۔ اس کی ذمہ داری مدوّن کتاب پر ہے نہ کہ مصنف پر"...

... آثم مظفر نگری"

۱۹۲۳ء میں جس وقت علامہ اقبال کی "پیامِ مشرق" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو میں لاہور میں موجود تھا۔ وہیں اور انہی دنوں میں نے اس کتاب کو پہلی بار سرسری طور سے دیکھا۔ فہرست عنوانات میں ایک عنوان ہے "لالۂ طور" اور اس کے نیچے لفظ "رباعیات" تحریر ہے۔ اس عنوان کے ماتحت جو "رباعیات" درج ہیں۔ ان کا نمونہ یہ ہے:-

تنے پیدا کُن از مشتِ غبارے ٭ تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ دردآشنائے ٭ چو جوئے در کنارِ کہسارے

ظاہر ہے کہ یہ اشعار رباعی کے مخصوص وزن پر نہیں۔ اسلئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے کس بنیاد پر انہیں رُباعی قرار دیا اور عنوان "رباعیات" ان کے لئے درست سمجھا۔

کئی دن تک یہ سوال میرے دل میں کھٹکتا رہا اور اس کا کوئی تسلی بخش جواب میری سمجھ میں نہ آیا۔ بالآخر ایک دن میں نے علامہ مرحوم سے پوچھا کہ پیامِ مشرق میں لالۂ طور کے ماتحت جو اشعار درج ہیں اُن کے لئے آپ نے "رباعیات" کا عنوان کس بنا پر اختیار فرمایا ہے۔ حالانکہ وُہ اشعار رباعی کے مخصوص وزن پر نہیں ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ بابا طاہر[2] عریاں ہمدانی کی

---

[1] اقبال کی مندرجہ بالا "رباعی" کا یہ وزن نہیں جو آثم صاحب نے لکھا ہے۔ اس کا وزن ہے: مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن اور اس بحر کا نام ہے ہزج مسدس محذوف (شادانی)

[2] بقول بعض بابا طاہر، فردوسی کا ہم عصر ہے۔ بعض نے اس کو سلجوقیوں کا معاصر مانا ہے

"رباعیات[1]" تو آپ نے دیکھی ہوں گی۔ میں نے عرض کیا کہ دیکھی ہیں۔

اس پر علّامہ نے بابا طاہر کی یہ رُباعی پڑھی :۔

نسیمے کز بنِ آں کاکل آیو (آید)   مرا خوشتر ز بوئے سُنبل آیو (آید)
بہ شو گیرم خیالش را در آغوش (شب)   سحر از بسترم بوئے گل آیو (آید)[2]

اور فرمایا کہ دیکھئے اسکا بھی وہی وزن ہے جو میرے زیرِ بحث اشعار کا ہے۔ اور رباعی کا مخصوص وزن نہیں۔ اس کے باوجود اہلِ ایران انہیں رباعی ہی کہتے ہیں اور ایران، ہندوستان اور یورپ میں جتنے مجموعے کلام بابا طاہر کے چھپے ہیں۔ اُن سب کے سرورق پر" رباعیات بابا طاہر" ہی لکھا ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے۔ ایرانی اہل زباں ہیں اور ہم زباں دان اور اصولاً زبان کے معاملے میں جمہور اہل زباں کا تتبع زبان دانوں کیلئے ضروری ہے۔ دستورِ زبان کے کلیات بجائے خود درست ہیں لیکن استثناء کی صورتوں میں اہلِ زبان کی پیروی لازم ہے۔ مانا کہ رباعی کا ایک مخصوص وزن ہے۔ لیکن بابا طاہر کے اشعار کو اگر اہلِ ایران عام طور پر رباعی کہتے ہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ عروض کی کتابوں کا سہارا لے کر ہم ان پر اعتراض کریں۔ اسی بنا پر میں نے اپنے اشعار زیرِ بحث کو رُباعی کہنا درست سمجھا۔ کیونکہ وُہ بھی بابا طاہر کی رباعیات کے وزن پر ہیں

میں نے عرض کیا کہ مخصوص وزن کے علاوہ رُباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے اگر پہلے مصرع میں قافیہ نہ ہو تو ہم اُسے قطعہ کہتے ہیں اور آپ کی رباعیات میں اس قسم کے قطعات بھی شامل ہیں۔ ان کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ فرمایا کہ یہ اعتراض آپ کا صحیح ہے اور یہ سہو کاتب ہے کہ رباعیات وقطعات کے بجائے اُس نے صرف رباعیات لکھا

علامہ کے اس بیان سے میں مطمئن ہو گیا اور ۱۹۴۲ء میں جس وقت میں نے رباعیات بابا طاہر کا ایک خاص ایڈیشن (مع ترجمہ وشرح) لاہور سے شائع کیا تو اُس کا نام "الدّری الزاہر فی شرح رباعیات بابا طاہر" رکھا

۱۹۴۳ء میں جب مجھے سیاحتِ ایران کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہاں صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی اشعار بابا طاہر کو عموماً رباعیات ہی کہتے ہیں۔

رضا قلی خاں ہدایت نے جو قاچاری دور کا ایک نامور شاعر مصنف اور لغت نویس ہے۔ اپنی مشہور تالیف مجمع الفصحا میں بابا طاہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"رباعیات بدیع ومضامین رفیع بزبانِ قدیم دارند"

آج سے بیس سال قبل آقا سے وحید دست گردی ایڈیٹر مجلّۂ ارمغان نے طہران سے اشعار بابا طاہر کا جو مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ نگار آقائے محمود خاں عرفاں شیرازی نے بھی ان اشعار کو "رُباعیات" کہا ہے

فاضل مستشرق پروفیسر براؤن نے المعجم فی معاییرِ اشعار العجم تالیفِ شمس قیس رازی کا جو یورپین ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اُس کے حاشیئے (صفحہ ۸۰) میں بابا طاہر کے اشعار کا ایک حوالہ دیتے ہوئے انہیں "رباعیات" ہی کہا ہے

ظاہر ہے کہ رضا قلی خاں ہدایت۔ عرفان شیرازی۔ پروفیسر براؤن اور علامہ اقبال جیسے فضلا کی متفقہ رائے کو ہم آسانی سے غلط قرار نہیں دے سکتے۔ علّامہ اقبال کی رائے کا سبب تو ہمیں معلوم ہو گیا۔ پروفیسر براؤن اور دوسرے مستشرقین نے بھی غالباً اہلِ ایران کے تتبع میں اشعار بابا طاہر کو رباعیات قرار دیا۔ لیکن اس امر کی تحقیق ہنوز باقی ہے کہ خود اہلِ ایران کس بنا پر ان اشعار کو رباعی کہتے ہیں۔

شمس قیس رازی جس نے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اپنی بیش بہا تالیف "المعجم فی معاییر اشعار العجم" مرتب کی۔ وزن رباعی کے ذکر میں لکھتا ہے :۔

"اہلِ دانش نے اس وزن کے گانوں کا نام "ترانہ" رکھا اور اس کے اشعار کو دوبیتی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی بنا دوبیت پر ہے اور عربی خوان

---

[1] اُس زمانہ میں رباعیات بابا طاہر پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے فارسی کے کورس میں داخل تھیں (شادانی)

[2] میں نے اس شعر کو تھوڑے سے تغیر بلکہ اضافے کے ساتھ اردو میں اس طرح نظم کیا ہے :

تھا شب تمہارا خیال ہم آغوش خواب میں   بستر مہک رہا ہے مرا بوئے گل سے آج

اسے رباعی کہتے ہیں"

المعجم کے علاوہ چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی میں جو ۵۵۱ھ کی تالیف ہے۔ ایسی تصریحات موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ترانہ دوبیتی اور رُباعی ایک ہی مُسمّٰی کے تین مختلف نام ہیں۔ چنانچہ مقالۂ دوم میں امیر معزی کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ

"سب سے پہلے سلطان نے چاند دیکھا اور بہت مسرور ہوا۔ علاؤالدولہ نے مجھ سے کہا کہ تم برہانی کے بیٹے ہو۔ اس ماہِ نو کے متعلق کچھ کہو۔ میں نے فوراً یہ دوبیتی کہی:-

اے ماہ چو ابروانِ یاری گوئی ؛ یا نے چو کمانِ شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زرعیاری گوئی ؛ در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

جس وقت میں نے یہ (دوبیتی) پیش کی تو امیر علی نے بہت تعریف کی اور سلطان نے کہا کہ جاؤ، شاہی اصطبل سے جو گھوڑا تمہیں پسند ہو کھول لاؤ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ہم سب دسترخوان پر بیٹھے۔ امیر علی نے کہا کہ اے پسرِ برہانی خداوندِ جہاں نے تمہیں جو انعام دیا ہے۔ اس کے متعلق تم نے کچھ نہیں کہا۔ ابھی ایک دوبیتی کہو۔ میں فوراً اُٹھ کر تعظیم بجا لایا اور فی البدیہہ یہ دوبیتی کہی:-

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید ؛ از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید ؛ چوں باد یکے مرکبِ خاصم بخشید

ظاہر ہے کہ یہ دونوں دوبیتیاں رباعیاں ہیں اور انہیں میں سے پہلی رباعی کو شاعر نے "ترانہ" بھی کہا ہے۔

اسدی طوسی نے لغتِ فرس میں جو پانچویں صدی ہجری کی تالیف ہے ترانہ کے معنی دوبیتی لکھے ہیں اور فرخی کا یہ شعر سند میں نقل کیا ہے

زدل آویزی و تری چو غزل ہائے شہید
وز غم انجامی و خوشی چو ترانہ بوطلب

ان بیانات سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ترانہ۔ دوبیتی۔ اور رباعی ایک ہی چیز کے تین مختلف نام ہیں اور وُہ نظم کی ایک مخصوص صنف ہے جو بحرِ ہزج مثمن اخرم اور اخرب میں لکھی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اہلِ ایران بابا طاہر کی "رباعیات" کو جو رباعی کے مخصوص وزن بحرِ ہزج مثمن اخرب یا اخرم کی بجائے بحرِ ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں ہیں۔ کس معیار پر رباعیات کہتے ہیں۔

اہلِ ایران کے قول کے مطابق[1] جس طرح وزنِ رُباعی ایرانی موسیقی کے لئے نہایت مناسب و موزوں ہے۔ اسی طرح بابا طاہر کی رباعیات کا وزن بھی ایرانیوں کو بے حد پسند ہے۔ چنانچہ شمس قیس نے اس وزن کو "خوشترینِ اوزان"[2] کہا ہے اور اس وزن کے اشعار خصوصاً رباعیات بابا طاہر عام طور پر ایران میں ستار پر گائی جاتی ہیں۔ جس طرح وضع کے اعتبار سے رباعی کو دوبیتی کہتے ہیں۔ اسی طرح بابا طاہر کے اشعار کو بھی دوبیتی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی دو دو شعروں کے جوڑے ہیں اور ہر جوڑے میں پہلا، دوسرا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہیں۔ چنانچہ مرزا لطف علی بیگ آذر نے "آتش کدہ" میں بابا طاہر کے اشعار کو "دوبیتی" کے نام سے موسوم کیا ہے اور گذشتہ بیس سال میں اشعار بابا طاہر کے دو ایڈیشن جو آقائے وحید دستگردی مدیر مجلۂ ارمغان کے اہتمام سے طہران سے شائع ہوئے۔ اُن میں بھی اُنہیں دوبیتی کہا گیا ہے اور چونکہ یہ دوبیتیاں اپنے سادہ و دل نشین مضامین نیز اپنے مطبوع و دل پسند وزن کی وجہ سے ایران میں عام طور پر گائی جاتی ہیں۔ اس لئے اُن میں اور عام رباعیات میں کئی باتیں مشترک ہیں:-

(۱) وضع کے اعتبار سے دونوں کو دوبیتی کہتے ہیں

(۲) اپنی خوش آہنگی کی بنا پر دونوں کو ایرانی موسیقی سے خاص مناسبت ہے اور دونوں گانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ گویا دونوں "ترانہ" ہیں۔

(۳) دونوں بحرِ ہزج میں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ رُباعی کا وزن مثمن ہوتا ہے اور ان دوبیتیوں کا مسدس۔

اسی مماثلت کی بنا پر اہلِ ایران انہیں بھی رباعیات کہتے ہیں اور اُنہیں قطعہ کہنا اس لئے درست نہیں کہ قطعے کے پہلے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا اور رُباعی میں ضروری ہے۔ چنانچہ جن دوبیتیوں میں بابا طاہر نے پہلے مصرع میں قافیہ اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ وزن ایک سا ہے

---

[1] دیکھو المعجم تالیف شمس قیس یورپین ایڈیشن صفحہ ۸۸ [2] دیکھو المعجم تالیف شمس قیس یورپین صفحہ ۸۰

اہل ایران نے اُنہیں قطعہ کہا ہے۔

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ چونکہ اُردو کا عروض فارسی کے عروض پر مبنی ہے لہذا اگر اہلِ ایران اُن دوبیتیوں کو بھی رباعی کہتے ہیں جو بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں لکھی جاتی ہیں اور جس کا نمونہ باباطاہر کی رباعیات ہیں تو اقبال یا کسی دوسرے شاعر کی لکھی ہوئی اردو یا فارسی کی اُن دوبیتیوں کو بھی رباعی کہنا جائز ہے جو اسی بحر و وزن میں ہوں۔ لہذا اقبال کی اس دو بیتی کو جو اس مضمون کے شروع میں نقل کی گئی۔ رباعی کہنا صحیح اور قطعہ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ جیسا ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں۔ قطعہ کے پہلے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا۔ زیر بحث دوبیتی میں رباعی کی طرح پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہیں۔

یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ زبان کے معاملے میں قیاس کو دخل نہیں دوبیتیاں اور بحروں میں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہر بحر کی دوبیتی کو رُباعی نہیں کہہ سکتے۔ بحر ہزج مثمن اخرب یا اخرم میں جو دوبیتیاں لکھی جائیں۔ اُنہیں رُباعی کہتے ہیں۔ یہ قاعدۂ کلیہ ہے اور بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں جو دوبیتیاں لکھی جائیں اُنہیں بھی رباعی کہتے ہیں یہ اُس قاعدۂ کلیہ کا استثنا ہے۔

۱؎ دیکھو دیوان باباطاہر مرتبہ وحید دستگردی پہلا ایڈیشن صفحہ ۴۴)

اختر اورینوی

غالب کے بعد

[ادبی تنقید اور علم النفس، کے موضوع پر پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک سیر حاصل اور بدیع مقالہ انگریزی میں تحریر فرمایا ہے۔ اس زاویۂ خاص سے علم تنقید کا جائزہ اب تک کسی نے اُردو میں نہیں لیا کاش پروفیسر کلیم کا گرانمایہ مضمون اردو کا لباس پہن لے!

ایک دفعہ ادب لطیف، لاہور میں کسی صاحب کا مضمون اختر شیرانی کی ایک نظم کے نفسی تجزیہ پر شائع ہوا تھا۔ پروفیسر سید محمد محسن، شعبۂ فلسفہ و نفسیات پٹنہ کالج اسی رنگ میں تفصیلی کام کر رہے ہیں۔ اوّل الذکر مضمون بہت تشنہ تھا۔ پروفیسر محسن اردو غزل گو شعراء کی پوری نسل پر نفسیاتی تجزیہ کا نازک نشتر چلا رہے ہیں۔ اگر یہ کام پورا ہو گیا تو گذشتہ تین صدیوں کی اندرونی کھڑکیاں کھل جائیں گی اور ایک قوم کی ذہنی و نفسی زندگی کی تصویر سامنے آجائے گی۔ کیونکہ شعراء سماج کے نمائندہ، اشاریہ اور قبلہ نما ہوتے ہیں۔

میرا ایک طویل مضمون سنہ ۱۹۴[illegible]ء اکتوبر رسالہ اردو، دہلی میں بعنوان "غالبؔ کا فن اور اس کا نفسیاتی پس منظر" شائع ہوا تھا۔ میں نے غالبؔ کے ادبی اذہنی اور نفسی ورثوں اور پھر اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے اس جلیل القدر شاعر کی قماش نفس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور میں نے یہ بھی دکھلایا تھا کہ اس قماش کا ٹھپہ غالبؔ کی شاعری معناً اور طرز ادا پر نمایاں طور سے پڑا ہے۔ اس طرح غالبؔ اور غالبؔ کے قبل کی شاعری پر اس رنگ میں تنقید ہو گئی تھی۔ ماحول کے سلسلے میں اس کے زمانہ کی شاعری بھی زیر بحث و نظر آگئی تھی۔ میں مندرجہ ذیل مقالہ میں غالب کے بعد کی شاعری کا جائزہ لینا چاہتا ہوں]

ادب میں روحانی نتائج کا سلسلہ چلتا ہے اور روایات ادب کے ذریعہ ورثہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح ماضی کی پکار برابر سنائی دیتی ہے۔ مگر تاریخ پورے طور پر کبھی دہرائی نہیں جاتی۔ فطرت کے خزانے میں نئے نمونوں کی کمی نہیں۔ حال کے مطالبات بھی اٹل ہوتے ہیں۔ ماحول کا اثر بھی ایک بہت بڑی قوت ہے۔ غرض ورثہ اور ماحول کا قانون ادب کی زندگی میں بڑی شدت سے کارفرما رہتا ہے۔ ادب حیات کے دوسرے مظاہر کی طرح ایک تسلسل ہے۔ لیکن فنکار صرف ورثہ اور ماحول کے اثرات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں فیضان رحمت کا بلاواسطہ دخل بھی ہوتا ہے۔ یہ فیضان ورثہ اور ماحول کو بعض دفعہ غیر متوقع انداز میں ترکیب دیتا ہے اور فنکار کی شخصیت کی انوکھی تنظیم رونما ہوتی ہے علم الکیمیا میں ایک عمل (Catalysis) کہلاتا ہے۔ دو اجزاء مل کر عام طور سے جس طرح ترکیب پاتے ہیں، وہ ترکیبی صورت اور نوعیت ایک تیسرے چھوٹے سے کیمیاوی جز کی محض موجودگی سے بدل جاتی ہے اور وہ جز خود نہیں بدلتا۔ یعنی نئے مرکب میں وہ خود نہیں ملتا۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں جو حیثیت مشّاطہ یا اگوا کی ہوتی ہے وہی Catalytic ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ میں اسے عمل مشّاطگی کہوں گا۔ مشّاطۂ فطرت بھی ورثہ اور ماحول کو کبھی نئی طرح سے سنوارتی اور انوکھے انداز سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیتی ہے اور جب فیضان فطرت کا یہ عمل ہوتا ہے تو ورثہ اور ماحول کے انہیں تاثرات کی ترکیبی شکل نرالی اور خاص الخاص ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دور یا دبستان میں کوئی شاعر یا ادیب بالکل نرالا اور انوکھا نظر آتا ہے۔ مثلاً دبستان دہلی میں غالبؔ اور دبستان لکھنؤ میں میرانیسؔ۔

اس انوکھے پن کی ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے۔ اس کی تشریح میں نے غالبؔ والے مقالہ میں علم الحیات کے قانون بداعت (Mutation) سے کی تھی۔ یعنی یہ کہ ورثے کے ذریعہ نسلی خصوصیات تمام کی تمام ایک ساتھ رونما نہیں ہوتیں بلکہ بعض دفعہ ایک خصوصیت کئی پشت بعد اچانک ظاہر ہو جاتی ہے اور اس درمیان میں دبی دبائی رہتی ہے۔ بچہ باپ، ماں، چچا، ماموں سے تھوڑی یا بہت مشابہت تو رکھتا ہی ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خاندان کے کسی نزدیکی رشتہ والے

کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی بلکہ پردادا یا لکڑدادا یا نانا سے صورت ملتی ہے۔ جن خاندانوں میں تصویریں یا فوٹو رکھے جاتے ہیں۔ وہاں اس امر کی تصدیق گاہے گاہے ہوتی رہتی ہے۔ ادب میں بھی یہ بداعت کا قانون عمل کرتا ہے۔ روایاتِ ادب کے تسلسل میں الگ الگ روایتی سلسلے بھی ہوتے ہیں۔ ہم میر انیس کی شاعری میں خارجیت اور داخلیت کے امتزاج کو اس وقت تک پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک سودا اور ملا وجہی دکنی کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کی آمیزش کا مطالعہ نہ کرلیں۔ حسرت موہانی۔ مومن اور سوز کے سلسلے میں شامل ہیں۔ اصغر گونڈوی نے غالب اور درد کی وراثت پائی ہے۔ خیال عظیم آبادی کی فنکارانہ نثر۔ آزاد، غالب اور سعدی شیرازی کی ورثہ ہے۔ اور شاد کی شاعری انیس، سودا اور میر کی۔

"بداعت" اور "مشاطگی" کے قوانین کا ادب و فن میں اس لئے نفاذ ہوتا ہے کہ تخلیق ادب کا تعلق براہ راست دل ودماغ سے ہے اور یہ ذی حیات وجود حیاتیاتی، نفسیاتی اور کیمیاوی قوانین کے ماتحت ہیں۔ اس کے علاوہ مطالعہ ومشاہدہ اور دوسرے نوع در نوع تجرباتِ زندگی اور فیضانِ فطرت، تاثیر و تاثر اور عمل ورد عمل کے ذریعہ دماغ ودل کی قماش کو بدلتے رہتے ہیں۔ ادب وشاعری کی جڑیں بطنِ زندگی میں ہیں۔ لہٰذا ان کی پوری سمجھ بوجھ کے لئے علم الحیات اور علم النفس کی روشنی ضروری ہے۔

میں نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں یہ عرض کیا تھا کہ غالب ایک دوراہے پر کھڑا تھا اس کے زمانہ میں ایک عصر ختم ہو رہا تھا۔ اور دوسرا سروع۔ غالب دونوں کے درمیان تھا اور ایک نفسی دوبدھے میں مبتلا۔ عصر دہلی کے فیضانہ رجحانات کے ساتھ بدلتی ہوئی فضا کے اثباتی عناصر بھی غالب کی شاعری میں ظاہر ہوتے ہیں۔ غالب کے بعد اُردو شاعری میں نئے رجحانات کے دو سلسلے نظر آتے ہیں۔ ایک ارتقائی اور دوسرا انحطاطی۔ مگر ان دونوں کا تعلق اپنے ماقبل کے دور سے براہ راست ہے۔ غالب کے بعد کے ارتقائی سلسلہ کی پہلی کڑی حالی کی شاعری ہے۔ اس کی دوسری اہم کڑی اکبر الہ آبادی کی شاعری اور تیسری اقبال کی شاعری ہے۔ انحطاطی سلسلہ دبستان لکھنؤ ہے۔ میں پہلے مدرسہ لکھنؤ سے بحث کروں گا۔ اور بعد ازاں ارتقائی زنجیر کے سرے کو ہاتھ لگاؤں گا۔

دبستان لکھنؤ کا نفسیاتی تعلق دبستان دہلی سے ہرچند کہ نمایاں نہیں معلوم ہوتا مگر وہ بہت گہرا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خصوصیات جو دبستان لکھنؤ میں بالیدہ ہوئیں ان کی ابتداء دلی میں ہی ہوگئی تھی یعنی رجحانات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ آیئے پہلے اس تعلق کا تجزیہ کیا جائے۔

ادب وشاعری پر اجتماعی قماش دماغ کا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ فنکار کی نفسی ترکیب اجتماعی رجحانات سے متاثر ہوتی ہے اور تخلیقِ فن دماغ کے کارخانے میں ہی ہوتی ہے۔ یہ اجتماعی نفسی قماش قانون ورثہ اور ماحول کے مطابق حال اور ماضی کی ادبی، اخلاقی، سیاسی واقتصادی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ادب وشاعری کی پیدائش اور ان کی نوعیت کی تشکیل میں مذکورہ بالا چیزوں کا بڑا دخل ہے۔

دبستان دہلی کی فیضانہ خصوصیات اس عہد کی عام خصوصیات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ اپنے پہلے مضمون میں میں نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ عام دبستانی خصوصیات کا رنگ تو دبستان کے سارے شعراء پر چڑھتا ہے۔ مگر کچھ انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو انفرادی ردعمل، قانون بداعت اور قانون مشاطگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ بہرکیف دبستان دلی کی عام خصوصیات کی تہ میں نفسی وذہنی اضمحلال، فرار وگریز، غم والم، آہ ونالہ ہی ہیں۔ غرض کہ ایک فیضانہ کیفیت طاری ہے۔ جس کے اثر سے داخلیت، شدید انفرادیت جذبات پرستی، رقت خیز تخیلات، مبہم تصورات کی صورت نمائی اور ظاہری رکھ رکھاؤ، آرائش ونفاست طرز ادا کی صنعت گری سے بیگانگی وغیرہ باتیں ہوئیں۔ دبستان دلی کے پہلے دور میں یعنی عہد میر، سوز درد وسودا میں یہ کیفیات بہ نسبت دوسرے دور یعنی عہد مومن، ذوق وغالب کے زیادہ ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نفسی ردعمل کو نوعیت اور ماحول بدل رہے تھے۔ پہلے دور میں اجتماعی احساسِ زوال تازہ تھا زمانہ نے دلوں پر جو چرکے لگائے تھے۔ اس کا زخم ابھی ہرا تھا ٹیسیں رہ رہ کے اٹھتی تھی۔ اضطراب میں کسی پہلو چین نہ ملتا تھا۔ مگر اقدام

کے لئے کسی جانب راہ بھی نہ ملتی تھی۔ سارے دروازے بند تھے۔ ناامیدی ویاس وحسرت کی کالی بدلیاں ہر سو بلاؤں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ ایسی فضا میں فنکاروں نے اپنے من مندر میں پناہ لینی چاہی مگر اس باطنی دنیا میں تلخ احساسات نے بے چین ہی رکھا۔ ماضی کی یاد کے نشتر لگتے رہے ناکامی ونامرادی، پستی وذلت، انحطاط وزوال، پسپائی وگریز نے ان کے قدم اکھاڑ دیئے مگر بھاگ کر بھی انہیں سوز ودرد سے نجات نہ ملی۔ دل میں ہوکیں اٹھتی رہیں، خلش واضطراب باقی رہے۔ وہ غم عشق بھول سکے نہ غم روزگار۔ سوداؔ کی بالیدہ ونسبتاً متوازن شخصیت بھی اپنی غزلوں میں کراہ اٹھی اور اپنے ہجوؤں میں چڑچڑی اور کف دردہن ہوگئی۔ میرؔ تو مجنون سا ہی ہوگیا۔ دوسرے دور میں اجتماعی تجربہ نے ماضی کی نامرادیوں کو تھوڑا تھوڑا بھولنا شروع کیا۔ زخم اب ناسور بن چکا تھا۔ درد دل کا مرض مزمن ہو چکا تھا۔ نیا گھاؤ زیادہ دکھ دیتا ہے۔ پرانے زخم میں اتنی ٹیس نہیں ہوتی۔ کم از کم گھائل کا اضطراب کم ہو جاتا ہے عادی ہو جانے کے سبب یا تڑپتے تڑپتے تھک کر نڈھال ہو جانے سے۔

ع۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالبؔ)

غالبؔ کو اس امر کا گہرا ادراک تھا اور کہتا ہے۔ ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دوسرے دور میں مشکلیں کم نہیں ہوئی تھیں، درد گھٹا نہیں تھا، بلکہ صبر مجبور پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا صبر نہیں جو حالات کو بدل دینے کی تحریک کرتا اور عمل کی خاموشی قسم کھا لیتا ہے۔ مغنیانہ کیفیت طاری ہی رہی، صرف سوز واضطراب۔ اور آہ ونالہ گھٹ گئے۔ دلیؔ کی شہر آشوب بلائیں دور تو ہوئیں۔ مگر ان لعنتوں کے دور ہو جانے کے بعد سطحی امن پیدا ہوا۔ اور نقلی برکتوں نے تاڑ کی چھاؤں کی طرح دلیؔ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ کچھ تو اپنی افتادِ طبع اور پرزور شخصیت کے سبب اور کچھ بدلی ہوئی مصنوعی فضاء کی وجہ سے غالبؔ مثبت اور منفی اثرات کی کشاکش میں مبتلا ہو کر مذبذب اور متشکک ہو گیا۔ اردو شاعری میں نشاطِ حیات اور زندگی سے محبت کا جوش سب سے پہلے دکنی شعراء میں ملتا ہے۔ اس کی کرن سوداؔ کی تشبیہوں میں پھوٹتی ہے مگر کالی گھٹاؤں میں پھر چھپ جاتی ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں نئے نور کے ساتھ امید کی پو پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس نئے رنگ کا مکمل جلوہ اقبالؔ و جوشؔ میں نظر آیا۔

نصیرؔ دہلوی اور ذوقؔ دبستانِ لکھنؤ کے اسی طرح پیش رو تھے جیسے محمد شاہ رنگیلے واجد علی شاہ کا نقش اول تھا۔ دلیؔ میں بھی وہی نفسی اور ثقافتی تبدیلیاں شروع ہو گئی تھیں جس کے عروج نے دبستانِ لکھنؤ پیدا کیا اور بعد میں بھی خود دلیؔ میں داغؔ پیدا ہوئے جو اپنے ذہنیت کے اعتبار سے بالکل لکھنوی اور رامپوری ہے۔ امیرؔ مینائی ثم لکھنوی اور داغؔ دہلوی ایک ہی قماش نفس کی پیداوار ہیں۔ اُن پر ایک ہی مہر لگی ہوئی ہے، داغؔ جہاں آباد کا آخری شاعر نہیں، میر مہدی مجروحؔ آخری شاعر تھا۔ خزاں رسیدہ باغ کا آخری تنہا پتہ! اور اسے بھی صرصر نے جلد گرا دیا۔

زوال وانحطاط کی جب انتہائی منزلیں پہنچ جاتی ہیں اور معاشرہ میں شکست خوردگی کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اس حال میں دو طرح کے رد عمل ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ نفسی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے قرآن حکیم نے یوں پیش کیا ہے:-

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ یعنی بداعمالیوں اور بدفکریوں کے نتیجے میں قوانین فطرت کا اس طرح عمل شروع ہوتا ہے کہ بیماری اور بڑھ جاتی ہے اور اس فزونیٔ مرض کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ سماج کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد فریب کی ایک دنیا بنا لیتی اور سراب آسا عشرت میں مبتلا ہو کر طغیان میں بھٹکتی پھرتی ہے جدید علم النفس بھی اس نفسی کیفیت کی مثالیں پیش کرتا اور اسے خود فریبی کہتا ہے۔ دوسرا رد عمل یہ ہو سکتا ہے۔ کہ حالت زوال کو بدلنے کی خواہش پیدا ہو اور موت کے بعد زندگی کی ہوا چلنے لگے۔ یُحْیِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ آخر الذکر تبدیلی غالبؔ کے بعد حالیؔ کی شاعری سے شروع ہوئی۔ حالیؔ کی شاعری محاسبۂ نفس کی شاعری ہے اکبرؔ الہ آبادی میں تنقید وطنز دونوں چیزیں مل گئیں اور اقبالؔ محاسبہ وتنقید کے بعد پیام عمل سنانے لگا۔ یہ مثبت ارتقائی سلسلہ تھا۔ اول الذکر نوع کا ردِ عمل دبستانِ لکھنؤ میں ظاہر ہوا۔ فریب زندگی اور سراب نشاط۔ انحطاطی منفی سلسلہ، دونوں

طرح کی تبدیلیاں معاشرہ کی تہذیب و ثقافت میں عام طور پر پیدا ہوتی ہیں کیونکہ اجتماعی نفسی حالت بھی ویسی ہوتی ہے۔ پھر عام ثقافتی رجحانات کا اثر ادبی زندگی پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ حالؔی کے خاص ماحول کا اثر حالؔی کی شاعری پر پڑا۔ اسی طرح لکھنوی کلچر کی عام خصوصیات کا اثر لکھنؤ کے ادب پر پڑا اور ان ثقافتی خصوصیات کی پیدائش اجتماعی نفس کے بطن سے پیدا ہوئی۔

آیئے اب لکھنؤ کلچر کے نفسی محرکات کا جائزہ لیا جائے اور پھر اُسکی خصوصیات کا یہی خصوصیات وہاں کے ادب میں بھی جلوہ گر ہوں گی۔ مغلیہ تہذیب اورنگ زیب کے بعد مائل بہ انحطاط و زوال ہوتی گئی۔ اس تہذیب کا مرکز دہلی طرح طرح کی اندرونی و بیرونی شہر آشوبیوں میں گرفتار رہا۔ اس کلچر کے علمبردار خصوصاً اور سارا ملک عموماً ناکامی و نامرادی، شکست و افتاد، پھر بے عملی و بے غیرتی اور یاس و حسرت میں مبتلا ہو گیا۔ اس گراوٹ کی انتہا یہ ہوئی کہ وہ درد خیز حقیقتوں سے بچنے کے لئے عیش کوشیوں کا فریب کھا یا گیا۔ ایک ذہنیت نے صبر مجبور کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کی اور وہ اپنے دل کی دنیا کو چپ چاپ الٹ پلٹ کرتی رہی۔ دوسری نے غم غلط کرنے کیلئے فریب رنگ و بو کا ایک عالم پیدا کیا اور اُسی میں رنگ رلیاں منائیں۔ شتی لٹاتی دلّی سے غداری کرکے نوابانِ اودھ نے لکھنؤ کو ایک سلطنت کا مرکز بنایا۔ گومتی کے کنارے ایک رونق سی پیدا ہوئی۔ ایک عروج سا رونما ہوا۔ اہلِ لکھنؤ نے سمجھا دن پھرے ہیں، قسمت کا پانسہ پلٹا ہے، قومی استیلا کا دور پھر آیا ہے۔ مگر یہ سربلندی کسی نئی تحریک، کسی جیتے جاگتے ولولے کسی فتح و اقدام کے نتیجے میں نہ تھی۔ ایک سڑتے ہوئے جسم کے بہ ظاہر صحت مند مگر بہ باطن جراثیم زدہ عضو کا کٹ کر الگ ہونا تھا۔ بیمار و مفلوج سلطنت مغلیہ کا ایک ٹکڑا۔ اس دراصل روگی ٹکڑے نے اپنے کو نئی سلطنت سمجھا حالانکہ گھن سارے ملک کو لگ چکا تھا۔ لکھنؤ کلچر کی بانی کوئی غالب و صحت مند نفسی رو نہ تھی، کوئی زبردست مطالبۂ حیات نہ تھا۔ کوئی عظیم الشان قومی تحریک نہ تھی۔ بلکہ ایک بزدل غداری ایک مفلوک الحال حرص۔ ایک درباری سازش۔ دلّی کلچر کی ابتدا محمد غوری اور اس کے ہم جلو ایک تازہ دم عظیم الشان قوم کی حوصلہ مندیوں سے ہوئی تھی۔ بانئ لکھنؤ کے پیچھے اِنے گنے ٹکے سپاہی تھے۔ جن کی روحوں کو گرم کرنے والی کوئی قوت نہ تھی۔ وہ تو ایک عیش زدہ قوم کے مطلب پرست

تلور یئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ دبستانِ دلّی کی اُردو شاعری کو دلّی کا دورِ ظفر مند نہ ملا۔ پھر بھی کہتے ہیں۔ ہاتھی مُرا بھی تو سوا لاکھ کا۔ دبستان دلّی کی فضائے بعید تو رواں دواں و جواں تھی انحطاط کے دور میں بھی دلّی والے اتنے نہ گرے تھے۔ کہ زوال کو عروج سمجھنے لگیں۔ میرؔ اور سوداؔ کی شہر آشوبیں اسکا ثبوت ہیں۔ گئی گذری حالت میں بھی دلّی کے اندر کچھ جان باقی تھی۔ آخر نادر شاہ کو قتل عام کی سزا کیوں دینی پڑی۔ دلّی والے کچھ تو ترنگ میں آئے تھے۔ حضرت اسمٰعیل شہید (مومنؔ کے پیر بھائی) خاکستر دہلی کی ایک رشکِ مہر چنگاری تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بھی دلّی لکھنؤ سے کہیں زیادہ چونچال تھی۔ اسی سبب سے اغیار کو بقول غالبؔ چوک کو مقتل بنانا پڑا اور جب واجد علی شاہ کی گرفتاری کو . . . . . انگریز سپاہی لکھنؤ میں داخل ہوئے تو کہتے ہیں کہ شہر کے رنگیلے بالا خانوں میں بیٹھے شطرنج و گنجفہ کی بازی لگائے داؤں پر داؤں لگا رہے تھے۔ نیچے سے گوروں کی پلٹن جو گذری تو یارانِ حلقہ نے کہا:۔

”بھئی دیکھو! کیا سجیلے جوان ہیں!“ اور پھر اُسی سرگرمی سے بازی چلنے لگی۔

بات یہ ہے کہ دلّی پر زوال آیا اور لکھنؤ اس سے بھی نیچے گرا۔ لکھنؤ میں صرف زوال نہیں بلکہ ابتذال زوال ظاہر ہوا۔ انحطاط و پستی کی وہ بدترین صورت جب پستی کو عروج سمجھا جانے لگے۔ ہمارے ملک کی اس وقت وہی حالت ہو گئی تھی۔ لکھنؤ تو صرف زوال و ابتذال کا دار الخلافہ تھا۔ فریب مسرت و نشاط میں غرق۔ جہانگیر کے عیش اور واجد علی کے عیش میں جنت اور باغِ عدن کا فرق ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کی عشرت کوشیاں بھی نفسی ہونے کے باوجود اسفل السافلین تک نہیں پہنچی تھیں۔ یہ مقام تو رنگیلے پیا کے لئے ہی مخصوص تھا۔

لکھنؤ کی تہذیب ایک ایسا کوڑھی جسم ہے۔ جسے حریر و پرنیاں کے اندر چھپایا گیا ہو۔ ایک ایسا مرصع نیام جس کے اندر تلوار ہو ہی نہیں، بیگانۂ روح ایک رنگیلا، سجیلا، جسد خاکی! مصر کی حنوط شدہ لاشوں کی طرح، زر و جواہر سے آراستہ و پیراستہ۔ لکھنؤ کی شاعری بہ استثنائے انیسؔ سحر سامری کا فروغ لئے ہوئے ہے۔ اس کے نغمے سامری کے بچھڑے کی آواز۔ کھوکھلی!

لکھنؤ کلچر کی نفسی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک لاشعوری فریب کھانے کے سبب شعور کی سچی تنقید اور ضمیر کی آواز کو سن ہی نہیں سکتی تھی۔ لاشعور نے شعور کی درد خیز حالت سے اکتا کر خارجی دنیا کی طرف توجہ منعطف کی۔ شعور بیمار ہو کر بالکل بے دست و پا مفلوج ہو گیا۔ تعاون قائم نہ رہ سکا۔ اور

.... ایک پر فریب لاشعوری رد کے ماتحت شخصیت ایک سطحی خارجیت کی رنگینیوں میں مبتلا ہو گئی۔ اُسے "پروردشن" (Perversion) کہتے ہیں۔ جس طرح فرد کو اس کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ مثلاً Megalomania یا Hallucination بالکل اسی طرح کسی کلچر کو بھی اس نوع کا روگ لگ سکتا ہے۔ جب احساس کمتری کے نشتر برداشت نہیں ہوتے تو اس قسم کی پر فریب سنک پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کلچر ایک اُلٹے دماغ کی تہذیب ہے۔ Perverted توازنِ شخصیت تو دلی کلچر کے عہد زوال میں بھی نہیں۔ اُس عہد کے فن کاروں نے اپنے دل کے نہاں خانے میں پناہ لی تھی، مگر انہیں حقیقی تلخی کا احساس باقی تھا۔ اُن کی شخصیت (Introverted) داخلیت کی جانب منقلب تھی۔ کبھی کبھی یہ داخلیت حد سے زیادہ ہو کر ملنکولیا (Melan-cholia) کے آثار ظاہر کرتی تھی۔ شخصیت کا توازن حالیؔ سے پیدا ہونا شروع ہوا۔

آیئے اب لکھنؤ کلچر کے مظاہرہ کا جائزہ لیا جائے۔ فسانۂ آزاد کا خوجی لکھنوی نفسی کیفیت کا مظہر اعلیٰ ہے۔ آپ اپنے خیال میں مرد میدان و کمیداں ہیں مگر نحیف الجثہ اور خفیف الحرکت بھگوڑے ہیں۔ "افسوس نہ ہوئی قرولی! ورنہ ...." یہی ذہنیت وہاں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مبالغہ و لاف زنی لکھنؤ کی خصوصیات ہیں۔ آپ پانچ روپیہ کے وثیقہ دار ہیں مگر ابن رئیس بننے اور کہلانے کا شوق۔ پیٹ خالی اور مونچھ میں گھی لگا کر اینڈتے ہوئے نکلنا اور گھر سے پلاؤ کھا کر آنے کی دھونس جمانا۔ نواب صاحب کا بٹیر شیر کو مار گراتا ہے۔ افیون کا نشہ اس نفسی کیفیت کی ہم آہنگی بڑی کامیابی سے کرتا ہے اور فریبِ تخیّل کو دو چند کر دیتا ہے۔ لکھنؤ میں اسی وجہ سے افیون کی بڑی قدر ہوئی۔ اس کے لئے ایک داخلی مطالبہ موجود تھا۔ حسن لب بام کی عام حکومت تھی۔ چوک میں بیٹھے ہوئے رئیسوں، بھاڑے کے ٹٹو تلوریوں، اور شہدوں کی زیٹ زپٹ۔ مرغ اور بٹیر کی پالیاں، کنکوے بازی اور بیجڑوں اور زنخوں کے نخرے۔ یہ سب "الٹے دماغی" (Perversion) کے مظاہر تھے۔ جب کسی قوم میں جہد و مقابلہ کی صلاحیت نہیں رہتی تو پھر مرغے، بٹیر اور کنکوے لڑا کر فطرت صحیحہ کو فریب دیا جاتا ہے۔ داخلی اخلاقی خوبیاں بھی ایسی قوم سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ نمائش، ظاہر داری اور تصنع کا دور دورہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب اس فن میں بھی ماہر تھی۔

اس سطحیت اور خارجیت کا اظہار فنون لطیفہ میں بھی ہوا۔ لکھنوی تہذیب کے فن تعمیر کے نمونوں کو دیکھئے۔ ان کی بنیاد میں کوئی گہرا تجربۂ حیات نہیں نہ احساس نہ جذبہ۔ اُن میں اعلیٰ حُسن مقصود ہے صرف سطحی نزاکت اور آرائش پائی جاتی ہے۔ رفعتِ جمال (Sub-limity) بالکل نہیں۔ مسجد قوۃ الاسلام دہلی، تاج یا جامع مسجد دہلی کا مقابلہ لکھنؤ کے امام باڑوں سے تو بالکل فضول ہے۔ مغولِ متاخرین کی عمارتیں بھی ان سے فنکارانہ طور پر بلند ہیں۔

لکھنوی مصوّری اور موسیقی بھی اس سطحی خارجیت کی شکار ہوئی۔ عمیق ترنم و توازن وہاں مفقود ہیں۔ لکھنوی مصوّر نہیں ...... محض نقاش تھے اور وہاں کے موسیقار صرف "چلتی ہوئی" چیزیں ہی ایجاد کر سکے مثلاً ٹھمری اور خیال۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھمری خود رنگیلے پیا نے ایجاد کی۔

غرض لکھنوی کلچر کی ایک خاص نفسی حالت نے ہر شعبۂ تمدن پر اپنا سایہ ڈالا۔ ادب و شاعری بھی اسی فریبِ نشاط اور سطحی خارجیت کے شکار ہوئے۔ لکھنوی دبستان شاعری کی نمود اور اس کا جوش و رقص کسی گہرے، بیکراں جذبۂ حیات کے نتیجہ میں نہیں۔ اس کی جڑیں زندگی کے باطنی سرچشموں سے غذا حاصل نہیں کرتیں۔ اس کے رخسارِ شاعری کی سُرخی صحت مند لالہ فام خون سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ غازۂ رنگین سے۔ اس کی سرمستی افیون کا نشہ ہے اور اس کی قوت اور اس کا طنطنہ ایسا ہے جیسے مُقوّی دوا اور طلا سے رجولیت پیدا کی جائے۔ لکھنؤ کی شاعری میں باطنی محاسن گویا مفقود ہیں۔ صرف ظاہری صنعت گری پر اس کا دارومدار ہے۔ اعلیٰ صناعت نہیں بلکہ تصنّع۔ تجربہ کا عمق، اصلیت اور جوش نہیں، بلکہ صرف طرز بیان کی رنگینی و آرائش محض الفاظ کے رکھ رکھاؤ یا نشست، لوچ لچک، نوک پلک، بالش اور رعایت لفظی، ضلع جگت، محاورات وغیرہ پر لکھنوی شاعری کی ساری چمک دمک اور لذت آفرینی منحصر ہے۔ اس دبستان کی عشقیہ شاعری میں حُسن کے جمالِ باطنی اور اس کی تاثیرات کو پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ محض اس کے جوبن، انگیا، سُرمہ اور مسی کو۔ لکھنؤ کے فنکار اوصافِ حُسن کی مصوّری نہیں کرتے۔ صرف سراپائے محبوب کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ وہ واردات محبت کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

صرف معاملاتِ عشق کی عکاسی کر پاتے ہیں۔ خیالات و افکار کی شاعری میں وہ بلند پروازی و نکتہ آفرینی کے بجائے امام باڑے کی صرف بھول بھلیاں تعمیر کرتے ہیں۔ ناسخ کی شاعری ایک پہیلی ہے۔ جس میں ذہن کی رسائی و طباعی نہیں۔ ذہن کی پیچیدگی اور شعبدہ گری ہے۔

اہلِ لکھنؤ تخلص رکھتے ہیں بھی خارجی ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں۔ دلی والے اس امر میں بھی باطنی نظر رکھتے ہیں۔ لکھنؤ میں آتش ہے تو دلی میں سوز۔ آتش، ناسخ، صبا، رند، نسیم۔ ان تخلصوں کی خارجیت ظاہری ہے۔ میر درد، سوز، سودا، جانجاناں، مومن، ذوق، غالب یہ سب داخلی رنگ ظاہر کرتے ہیں۔

منظومات :—

نظمیں :-

غزلیں :-

جدید شعری ادب

جوش (ملیح آبادی):-
سیف و سبو
آیات و نغمات
جنون و حکمت

ن۔م۔ راشد:-
ماوراء

فیض احمد فیض:-
نقشِ فریادی

فراق گورکھپوری:-
شعلۂ ساز

ساغر نظامی:-
بادۂ مشرق

اسرار الحق مجاز:-
آہنگ

معین احسن جذبی:-
فروزاں

یوسف ظفر:-
زہر خند

مخمور جالندھری:- تلاطم
جلوہ گاہ

ساحر لدھیانوی:-
تلخیاں

سلام مچھلی شہری:-
وسعتیں

اختر انصاری:-
خوناب

حفیظ ہوشیارپوری:-
غزلیں

اختر الایمان:-
تاریک سیارہ

عبدالحمید عدم:- آتش کدہ (غزلیں)
آبگینے (قطعات)

جاں نثار اختر:-
پرتو

احمد ندیم قاسمی:-
جلال و جمال

اختر اورینوی:- ؟

حمید نسیم:-
سلسلہ (غزلیں)

گوپال متل (مرتب):-
گھن گرج (انقلابی نظمیں)

رام پرکاش اشک (مرتب)
سارنگ۔ (گیت)

ادارۂ ادبِ لطیف:-
۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں
۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں
۱۹۴۵ء کی منتخب نظمیں

حلقۂ اربابِ ذوق
۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں
۱۹۴۳ء کی بہترین نظمیں

ن ۔ م راشد

آواز

(ایک فوجی پروگرام کے تاثرات)

"یہ دلّی ہے
اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لئے
ہار غزلوں کے لائی ہے اُن کی بہن
اور گیتوں کے گجرے بنا کر......
"چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رے
یہ دنیا ہے طوفان میل
او مدینے کے عربی جواں
تیری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر" ——
مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے
جو لے گیا ایک پل میں
ہزاروں کو غارِ فراموشگاری
میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
کہ صدیاں گذرنے
پر اُن کی سیہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟

جہاں سے یہ آواز آئی
اُسی سرزمیں میں
سمندر کے ساحل پہ لاکھوں گھروں میں
دیئے ٹمٹمانے لگے
اور اک دوسرے سے
بہت دھیمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے:
"لو سنو اب سحر ہونے والی ہے
لیکن مسافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے!"

اختر الایمان

ریت کے محل

تجھے تو یاد نہ ہوگی وہ شامِ کیف آگیں
شفق کے رنگ میں لکھی ہوئی کہانی سی
مچل رہی تھی ترے رُخ پہ تیری آنکھوں میں
ترے لبوں پہ حکایت تھی اِک سہانی سی
مجھے گماں ہوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہو کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جائے مفر
جو ڈھونڈتا ہو اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے، دلوں کے سرمائے
نہ سنگِ میل، نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی!
ہر ایک گام پہ صحرا بدوش تھے فتنے
بھٹک رہے تھے بگولے سے رہنما لاکھوں
کہیں نہ چشمۂ شیریں نہ سایۂ اشجار
پڑے ہوئے تھے سرِ رہ شکستہ پا لاکھوں
جو اپنے دل میں کبھی شوق بیکراں لیکر
چلے تھے بارِ زمیں سوئے آسماں لے کر
دلوں کا درد نگاہوں کا سوز کام آیا!
"ڈیار ہُو" میں لبوں پر کسی کا نام آیا!
یہ کاروبار، یہ محفل، یہ ریگ زار، یہ دھوم
سرودِ نالہ کہیں، رقصِ ناتمام کہیں
صدائیں کھوئی ہوئیں وسعتِ بیاباں میں
طلوعِ صبح میں غلطاں وہ رنگِ شام کہیں
حکایتِ گل و لالہ کے باب وا نہ ہوئے
کسی کے اشک بھی اُس وقت آسرا نہ ہوئے

میں استخوانِ شکستہ کے ڈھیر سے بچتا
"دیارِ ہُو" میں پریشاں خیال، آوارا
اسی تلاش میں پھرتا تھا کوئی رہ نکلے
اِس اضطرابِ مسلسل سے پاؤں چھٹکارا
پھر ایک شام، ترے حسنِ لازوال کی خیر!
صدائیں آئیں، ادھر آ ترے مآل کی خیر!
پھر ایک بار تصوّر کے رنگ محلوں میں
ہجومِ شوق ہوا، شورِ نائے و نوش ہوا
دیئے جلائے گئے، راستوں میں پھول بچھے
حیاتِ رفتہ کا افسانہ بارِ گوش ہوا
تڑپ کے ساز کے تاروں سے غم رُبا نغمے!
بساطِ خواب پہ انگڑائی توڑتے نکلے!
سکوں نواز دھندلکا سا چھا گیا ہر سُو
مرا یہ حال کہ جیسے کسی کو نیند آئے
خمارِ لطفِ مسلسل سے لڑکھڑا یا میں
کنارِ ساز میں رقصاں تھے ہر طرف سائے
بڑھایا دستِ تمنّا کہ دامنِ امید
کہیں نہ عالمِ وارفتگی میں چھوٹ جائے
تلاش کرتا ہوں وہ ساعتیں جو کھوئی تھیں!
بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں بوئی تھیں!
نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں نہ وہ شب و روز
کبھی سمٹتی، کبھی پھیلتی ہیں غم کی حدود
ٹھہر گئی ہے اک ایسے مقام پہ دنیا
جہاں نہ رات نہ دن ہے نہ بیکلی نہ جمود
پکارتے ہیں ستارے سنبھالتی ہے زمیں
ہر ایک شے سے گریزاں ابھی ہے میرا وجود
میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوش بہار و خمارِ زہر آلود!

علی سردار جعفری

یاد

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اُٹھائے ہوئے

ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے

سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے

اُبھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے

خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل،
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے

مری جوان تمنّا کے سرخ پھولوں سے
سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے، سجائے ہوئے

وہ دُھندلے دھندلے ستاروں کے نرم جھرمٹ ہیں
کنارے سبز دوپٹے کے جگمگائے ہوئے

دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں
گذشتہ شب کی حسیں چاندنی چھپائے ہوئے

سڈول اور سُبک بازوؤں کی لرزش میں
شباب و شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے

کھڑی ہے خواب و فسانے کی سرحدوں کے قریب
اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے

وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی
حیا کے رنگ سے رخسار تمتمائے ہوئے

بھوؤں پہ کتنی ہی انکار کی حسیں شکنیں
لبوں پہ کتنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے

مگر جبیں پہ محبّت کے خون کا ٹیکا
بڑے غرور، بڑے ناز سے لگائے ہوئے

یہ ایک یاد ہے بیتے ہوئے زمانے کی
جو میرے سینے پہ بیٹھی ہے چھن اٹھائے ہوئے

احمد ندیم قاسمی

فن

ایک رقاصہ تھی ــــ کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں، اداؤں میں توازن نہ رہا،
ڈگمگائی، تو سب اطراف سے آواز آئی ــــ
"فن کے اس اوج پہ اک تیرے سوا کون گیا!"
فرشِ مرمر پہ گری، گر کے اُٹھی، اُٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا
اوک اُٹھائی تو تماشائی سنبھل کر بولے ــــ
"رقص کا یہ بھی اک انداز ہے ــــ اللہ! اللہ!"
ہاتھ پھیلے رہے، سِل سی گئی ہونٹوں سے زباں ــــ
ایک رقّاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا،
پردہ سرکا، تو معاً فن کے پجاری گرجے ــــ
"رقص کیوں ختم ہُوا؟ وقت ابھی باقی تھا!"

منظور حسین شورؔ

دوراہا

میں کہ تیری بزم سے اٹھا تھا ساغر توڑ کر،
کتنے طوفانوں سے الجھا ہوں سفینہ چھوڑ کر

اِک طرف رود و رباب و عنبر و عطر و گلاب،
ایک جانب جنت آدم کے لیے تعبیر خواب

اک طرف زلف و جبین و عارض و رخ نور پاش
اور اک جانب افق کے دوش پر سورج کی لاش،

اک طرف حسن و شباب و نور و نکہت کا فشار
اک طرف صدیوں کی راتوں کو سحر کا انتظار،

اک طرف تاروں کے سایے میں فسانوں کی تلاش
اک طرف احساس کے سینے پہ نظروں کی خراش

دہکی دہکی اک طرف آنچل میں رخساروں کی آگ
اک طرف کرب و الم کی زد پہ چہروں کا سہاگ

ایک جانب جلوہ جلوہ نکھرا نکھرا سا جمال
ایک جانب وقت کے رخسار پر خونیں گلال،

اک طرف سیال سی چاندی میں بھیگی بھیگی رات
اک طرف سورج کی کرنوں سے سلگتی کائنات

اک طرف نغمات سے دہکے ہوئے طاؤس و رود
ایک جانب سرد سینوں میں جوانی کا جمود

ایک جانب چنگ و تار و عود و بربط نغمہ بار
ایک جانب ہر روش پر سرخ صبحوں کی پکار

اک طرف آنکھوں میں کچھ ناگفتہ افسانوں کی رات
ایک جانب زہر سے لبریز پیمانوں کی رات

ایک جانب قہقہے آواز سی دیتے ہوئے
اک طرف نغمے لہو میں کشتیاں کھیتے ہوئے

اِک طرف چھڑتا ہوا حسن و محبت کا رباب
اک طرف جلتی ہوئی عرفان و حکمت کی کتاب

ایک جانب عشق کو اپنی ہی عظمت کا غرور
اک طرف ہر آبگینہ وقت کی ٹھوکر سے چور

ایک جانب عشق کو توہین فطرت ناگوار
اور اک جانب جنوں خود بیڑیوں کا سوگوار

اک طرف حسن و جنوں عالم کو ٹھکراتے ہوئے
اِک طرف دنیا پہ بادل کرب کے چھائے ہوئے

ایک وہ عالم کہ تجھ بن سانس تک لینا گناہ
اک طرف ناسور سینے میں چھپائے خانقاہ

ایک جانب حسن خود مشتاق پیغام و سلام
اِک طرف جینا بھی ذلت اور مرنا بھی حرام

تو سراپا پیکرِ حسن و جمال و رنگ و نور
تیری جنت کا تصور میرے دوزخ میں قصور

یاد کر سکتا نہیں، دل سے بھلا سکتا نہیں
دور جا سکتا نہیں نزدیک آ سکتا نہیں

عہد بھی ممکن نہیں، اقرار بھی ممکن نہیں
اور تیرے پیار سے انکار بھی ممکن نہیں

محمورؔ جالندھری

مگرمچھ کے آنسو

سنتے ہیں۔ یاد مصیبت میں خدا آتا ہے
آسرا ۔۔ اک یہی مجبور کی تقدیر میں رہ جاتا ہے

"کھول دو بند کلیساؤں کے در کھول بھی دو
مانا مانوس نہیں ہاتھ دعاؤں سے ۔۔ دعائیں مانگیں
مملکت پر کہیں خورشید نہ ہو جائے غروب
حکم دیدو کہ سبھی اپنے خداؤں سے دعائیں مانگیں"

جی پہ بن جائے تو ذلت بھی اُٹھا لیتے ہیں
سنتے ہیں ۔۔ باپ مصیبت میں گدھے کو بھی بنا لیتے ہیں

"ناگ ہے اپنا معاون تو کوئی بات نہیں
کام لینا ہے ہمیں ناگ خزانے پہ بٹھا لو اپنے
شہد کا گھونٹ سمجھ کر سمِ قاتل پی جاؤ
کسی قیمت، کسی اُجرت پہ اسے ساتھ ملا لو اپنے"

"سب کو بخشیں گے مصائب کی سلاسل سے نجات
جنگ لڑتے ہیں صداقت کی، مساوات کی اعلاں کر دو
اپنی من مانی ہی آخر میں کریں گے، اب تو
دہر کو وعدۂ پُر کیف سے منت کشِ احساں کر دو"

ناگ ڈستا ہے۔ اسے دودھ پلاؤ کتنا
سُوکھی بیری سے کبھی بیر نہیں جھڑتے ہلاؤ کتنا

"عہدِ آلام بھی معدوم، خدا بھی معدوم
کوئی خدشہ نہیں پھر سے ستم و جور کو ارزاں کر لو
فتح کا جشن منانا ہے مگر دھوم کے ساتھ
اپنے گھر جشن سے یا خون کی بوندوں سے چراغاں کر لو
اپنے محکوموں کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے
یہ تو وعدوں پہ بھی جی سکتے ہیں ان سے نئے پیماں کر لو"

سارا دھن جاتا ہے تو نصف لٹا دیتے ہیں
سنتے ہیں ۔۔ بچے جو ضد کرتے ہیں انہیں افیون کھلا دیتے ہیں

تیرگی بڑھتی ہے طوفان اُمڈ آتا ہے
بدلیاں چھا کے برستی ہیں فلک پھر سے نکھر جاتا ہے

جاں نثار اختر

اُس جانِ کائنات کے نام

رات کا پیچ و خم تری زلفیں
چاندنی کا نکھار تیرا بدن

صبح کی نرم لو جبیں تیری
پگھلا پگھلا سا آنچ پر کندن

ہونٹ تیرے شفق کا مے خانہ
آنکھ تیری خمار کا مسکن

اک لچکتا ہلال یا ابرو
اک لپکتی شعاع یا چتون

تیری مژگاں کی جنبشِ پیہم
سینۂ کائنات کی دھڑکن

نکہتِ ماہ و عطرِ بادِ صبا
کیا ہے! جز تیرا فیضِ پیراہن

جنبشِ مہر و ماہ تیرا خرام
گردشِ روز و شب ترا دامن

تیری لَے نظمِ ثابت و سیار
تیرا نغمہ کشش کا رازِ کہن

شمعِ کونین ہے کہ تیرا نفس
حسنِ تقدیر ہے کہ تیرا سخن

تجھ سے بیدار قلبِ آب و گل
تجھ سے سرشار روحِ سرو و سمن

لطف تیرا کہ سیلِ ابرِ بہار
قہر تیرا کہ آتشِ خرمن

ہر تلطف میں ہر تغافل میں
تو جنوں دوست، آگہی دشمن

اور وہ تیرے سکوت کا عالم
جیسے سکتے میں ہوں زمان و زمن

عشق! تیرا جلال مہر شکار
حسن! تیرا جمال ماہ شکن

زندگی ہے کہ تیرا آئینہ!
تو ہے یا کائنات کا جوبن!!

مجید امجد

معیّت

.... دوست!

تجھ کو جینا دوبھر کیوں؟

مجھ سے کہہ دے من کی بات!
آہ یہ شیتل چاندنی رات،
گردوں پہ تاروں کا ناچ
چھنن چھنن چھوچھم چھم چھاچ
نیچے خاک کی بستی — ہم
نیندیں زخمی — آنکھیں نم
سوئی گلیاں، سویا شہر
جھونکوں کے امرت میں زہر
یہ سب سچ ہے پھر بھی دوست
جی، دو دن اور بھی جی، دوست،
دو دن اور بھی میرے ساتھ
کہہ لے کہہ لے من کی بات

پلکیں ہیں تیری نم کیوں؟

.... دوست!

تجھ کو جینا دوبھر کیوں؟

دنیا تیرے آگے ہے
ہنستے لب پہ ہنستی لے
اس وادی میں گاتا پھر
من کی تان اڑاتا پھر
تو نے دیکھی کھیتوں میں
کھردری کھردری ریتوں میں
اک کتے کی سڑتی لاش
ٹکڑے ٹکڑے قاش ہی قاش

گدھ بوٹی بوٹی کھائیں
انتڑیاں نوچے جائیں
یہ انجام؟ ہمارا ہو؟
ساتھی! کیسے گوارا ہو؟
تیری آنکھیں مند جائیں؟
تو اور یہ خواہش؟ ہائیں!
کیا کہتا ہے؟ یوں مت کہہ،
یہ رودادِ جنوں مت کہہ!
کون مرے اور کون جیے،
آ ہاتھوں میں ہاتھ لیے
چلتے جائیں — میں اور تو
سونی سڑک کے کارخ دو
سوچیں: یہ راہی ہیں کون؟
سوچیں: کون ہے تو؟ میں کون؟
ہم ان کے سایوں کے تلے
چلتے جائیں رات ڈھلے
ہونٹوں پر ہو من کی بات
شیتل شیتل چاندنی رات
گردوں پر تاروں کا ناچ
چھنن چھنن چھوچھم چھم چھاچ!
بھلا نہیں یہ منظر؟ کیوں

———— دوست

تجھ کو جینا دوبھر کیوں؟

حامد عزیز مدنی

مادرِ گیتی سے

یہ ترا ہمدمِ دیرینہ، رفیق و غمخوار
شبنمی نور میں ملبوس یہ مہتاب الجھتا ہوا برگد کی حزیں شاخوں سے
زہر خند اس کی ضیائے خاموش
یوں سرِ راہ تجھے دیکھ کے عریاں شاید
اپنے ہی سینے کے داغوں میں بدل سکتا تھا۔
توڑ کر رات کی زنجیر نکل سکتا تھا۔
دور اِس حلقۂ پروین و ثریا سے بھی دور
شب کے زندانِ بے سوز سے یہ بھی نہ ہوا۔!

کیا مرے سامنے دہراتی ہے
وہ اساطیرِ جنوں خیز وہ پارینہ حدیث
جو کبھی بابل و یونان کی خوابیدہ فضاؤں میں لہو بنکے رواں رہتے تھے
لوٹ کر لے گئے کچھ لوگ تبسم تیرا
درسگاہیں بھی ارسطو کی کمیں گاہیں تھیں
مشعلیں جلتی رہیں تیرہ مگر راہیں تھیں!

اور افسانے ہیں گذرے ہوئے روز و شب کے
خوں ٹپکتا ہے در و بام کی پیشانی سے!
اور ویرانی لپٹ جاتی ہے ویرانی سے
شمعیں بجھتی ہیں، دھواں اُٹھتا ہے!
اک نہ اک پردۂ اسرارِ جہاں اٹھتا ہے
اور تغیر کے اشاراتِ نہاں پا ہی گئے
— راہ اپنی، تیرے اشکوں میں تیری آہوں میں
تجھے آنا ہی پڑا —
سنگ و آہن کے ستونوں کی کڑی باہوں میں
تیرے سینے سے لپٹتے رہے ہیں یہ شعلہ و دود!

آج باقی نہیں پیراہنِ صد رنگ ترے
چھوڑ گلتی ہوئی پوشاک کے انباروں کو
اپنی عریانی پہ ہنس لینے دے سیاروں کو
آئیگا آئیگا کوئی تو شہابِ ثاقب
اسکے دامن میں دہکتے ہوئے انگاروں کی چادر کا اک آنچل ہی سہی!
میں تماشائی سہی آج تری خلوت کا
میری اس حیرتِ طفلی پہ نہ جا
ماں! تجھے گھورتے رہنے کا خطا کار ہوں میں!

انجم رومانی

روپ اور بہروپ

پھیکی پھیکی سی رنگینی　　اب روپ نیا کیوں بھرتی ہے
اپنی سی کوئی بات نہیں　　دنیا بہروپ پہ مرتی ہے

بہروپ پہ مرنے دو مجھ کو　　میں اپنے روپ کو پا نہ سکا
ہر آن تک و دو رہتی ہے　　سایہ ہوں، دھوپ کو پا نہ سکا

سورج نکلا، پھر آنکھ کھلی　　بھینی بھینی رنگینی کی
پھر ہر صورت یوں آئی نظر　　جیسے ہو مورتی چینی کی

اک مورتی ایسی سنتا ہوں　　جو روپ بھی ہے بہروپ بھی ہے
میں سایہ ہوں، وہ بھی سایہ ہے　　میں دھوپ نہیں، وہ دھوپ بھی ہے

کب سایہ دھوپ کو پائے گا؟　　وہ اس کا غم کب کرتی ہے!
پھیکی پھیکی سی رنگینی
اب روپ نیا کیوں بھرتی ہے؟

سلام مچھلی شہری

"— لیکن اب دنیا میری ہے!"

پیپل کے گھنیرے پتّوں نے
پھر سارا مندر گھیر لیا
اور اُڑ کر اک دیوتا آیا۔ مندر کے کلس کو چُوم گیا!
دیو داسی نے انگڑائی لی —
شمعیں جاگیں کلیاں مہکیں اور ڈھیر ڈھیر دیو داسی کے ناچ سے مندر جھُوم گیا
مندر کے پجاری نے شانوں پر اپنی جٹائیں پھیلا دیں —

جگمگ کرتی ریکھائیں پھر ننگی گلیوں میں ناچ گئیں۔
اور سب سے بڑے راجہ نے اک رنگین تبسم فرمایا!
کنیائیں سج دھج کر آئیں —
پیالے کھنکے کنگن چھلکے اور کنیاؤں کے جوبن پر سنسار سمٹ کر لہرایا۔
اور "اندر" نے جیون مدھ شالہ پر پھر سے گھٹائیں پھیلا دیں —!!

پھر بار سنگھار کی شاخوں نے
مسجد کے مناروں پر گر کر
پھولوں کی طرف سے سجدہ کیا —
اور ایک فرشتے کی آمد سے تکبیریں کچھ تیز ہوئیں!
فانوس جلے گلزار کھِلے اور ڈھیر ڈھیر ہر جانب ایمان کی دھڑکنیں دوڑ گئیں
واعظ نے منبر کے زینے پر زرد عبائیں پھیلا دیں —!!

پھر اونچے نگمگ کے محلوں میں
چاندی سونے کے دیپ جلے

صدیوں سے یہ ہوتا آیا ہے
صدیوں سے یہی دیکھا میں نے —
بیمار زمیں کے چہرے پر جب صحّت کے آثار آئے
جب دھرتی کچھ شاداب ہوئی
جب دنیا کچھ بیدار ہوئی —
اس مندر نے۔ اس مسجد نے۔ ان اونچے اونچے محلوں نے
دھرتی کو اپنانا چاہا
اس پر قابو پانا چاہا —
لیکن اب دھرتی میری ہے
لیکن اب دنیا میری ہے

سیّد فیضی

مَیں گنہگار ہُوں

ستارہ ٹوٹا کہ شعلہ بھڑکا!

سیاہ دیوِ فلک کا سینہ بس ایک لمحے کو کھل گیا تھا،

تڑپتی۔ بل کھاتی ایک زرّیں لکیر آنکھوں میں پھر گئی تھی،

نہیں —! یہ شیطاں کے سر پہ انگارے آسماں سے برس رہے ہیں

غریب کو جگمگاتے افعی نہ جانے کس دن سے ڈس رہے ہیں!

میں سوچتا ہوں۔ خموش ہوں۔ دم بخود ہوں اور پھر بھی سوچتا ہوں

عجب نہیں کم نگاہیاں مجھ کو میری نظروں میں پست کر دیں

قصور ہی کیا تھا چشم پوشی۔ اور اس پہ فطرت کی گرمجوشی!

نہ جانے یہ جگمگاتے افعی غریب کو کب سے ڈس رہے ہیں۔

سیاہ چادر کی چھاؤں میں یوں تو کھُل چکے ہیں ہزار سینے

چمکتے اور پُر بہار سینے!

تڑپتے۔ بل کھاتے ایک زرّیں لکیر سے داغدار سینے!!

اور آج بھی کھُل رہے ہیں لاکھوں —

قصور ہی کیا ہے؟ چشم پوشی — اور اس پہ فطرت کی نرم کوشی!

نہ تارا ٹوٹا — نہ شعلہ بھڑکا

بس ایک دھڑکا سا دل نے آخر میں خود ہی محسوس کر لیا تھا۔

اداؔ بدایونی

سہارا

اِدھر دیکھ یہ ریشمیں، مرمریں، نرم باہیں
یہ کلیوں کے گجرے، یہ حُسنِ شبستاں
لچیلی، رسیلی، حسیں مسکراتی ہوئی شوخ کلیوں کے گجرے
یہ حُسنِ فروغِ جمالِ شبستاں!
یہ مرکز تری آرزوئے جواں کا
یہ حاصل تری زحمتِ جاوداں کا
تری سینہ کوبیٔ پیہم کا، دردِ نہاں کا
"یہ قوسِ قزح کی چرائی ہوئی شوخ رنگت"
"یہ پھولوں کی نرمی، یہ کلیوں کی نزہت"
"ستاروں کی شوخی، بہاروں کی فطرت"
یہ جاتی ہوئی کہکشاں کو سبک گام راہیں!
یہ بے چین ہیں امتحاں کو،
یہی ریشمیں نرم باہیں،
فروغِ شبستاں سے اب پھیر بھی لے نگاہیں،
یہ مانا کہ چشمِ فلک نے نہ اب تک جھلک دیکھ پائی
مبادا پڑے بال ان آئینوں میں
نہ زخمِ نگہ آنے پائے!
مگر اب ذرا آزما ان کی ہمت
یہ مدت سے بے چین ہیں امتحاں کو
تری تیرہ بختی، تری بے نوائی
ترے اشکِ پیہم، تری آہِ سوزاں
ترے درد کا اب بھی ممکن ہے درماں!
تجھے جس سہارے کی ہے جستجو مدتوں سے
ز فیضِ تمنا ابھی مل بھی جائے
بہت ہے کہ اب تک جواں ہیں ارادے
ذرا حوصلے دیکھ ان کے!
یہی ریشمیں، مخملیں، مرمریں باہیں
جو چاہیں،
اٹھا کر پٹک دیں زمین و زماں کو
ترے آسماں کو
ترے آسمانوں کے رازِ نہاں کو
یہ حُسنِ فروغِ جمالِ شبستاں!

نجیب الرحمٰن

ھرجائی

نہ جانے کب یہ پہاڑ سی رات ختم ہو گی
نہ جانے کب آفتاب کی قرمزی شعاعیں ہمیں پیامِ حیات دیں گی!
سکوت بردوش ہیں فضائیں
چراغ بھی ٹمٹما رہے ہیں
اور ایک بے برگ و بار چیری کا پیڑ اپنی نگاہیں نیچی کئے کسی سوچ میں مگن ہے
تمہاری آنکھوں میں ایسی واماندگی ہے گویا وہ کہہ رہی ہوں،
نہ جانے کب یہ پہاڑ سی رات ختم ہو گی
ہمیں تو اب نیند آ رہی ہے!

میں لوٹتا ہوں تو اس کی پرچھائیں میرے کمرے کے زرد پردوں سے جھانک کر مجھ سے پوچھتی ہے
"بتاؤ کیا تم مری محبت سے بے خبر ہو؟
ذرا نگاہیں اٹھا کے دیکھو
تمہاری آوارہ و پریشان حال چیزوں کو کس سلیقے سے میں نے آراستہ کیا ہے —!
مگر یہ باتیں تمہیں سنانے سے فائدہ کیا؟
میں جانتی ہوں کہ تم انہیں ہنس کے ٹال دو گے!"

وہ مجھ سے کہنے لگی (نگاہیں تو اس کی دیوار پر جمی تھیں!)
"کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ اپنے کپڑوں کو پھاڑ کر ایک دن نکل جاؤں گھر سے باہر
برہنہ پا بھاگتی پھروں میں
ہواؤں میں اُڑ رہے ہوں میرے سنہری گیسو"
پھر ایک حسرت بھری نظر مجھ پہ ڈال کر — "ہاں بتاؤ کیا یہ کبھی بھی ممکن نہیں کہ میں خود کو بھول جاؤں؟"

کسے خبر تھی کہ ایک ہی جام اس کے جذبات کی فصیلوں کو توڑ دیگا۔
وہ میرے شانے پہ اپنا سر رکھے رو رہی تھی
نہ جانے پہلے بھی کتنی موہوم سی تمنائیں اس کی آنکھوں میں آئی ہونگی
مگر — یہ کیا، تم بھی رو رہی ہو!
سنو مری جان! قبل اس کے کہ تم کو ہو جائے مجھ سے نفرت
خدارا اک بار مسکرا دو!!

ضمیر جعفری

چورنگی

(کلکتہ کا پُر رونق بازار)

سڈول جسم پہ یہ تنگ ریشمیں ملبوس!
لبوں کی نرم لکیروں سے پھوٹتے نغمات
اُلجھ کے سینے کی پیشانیوں سے گرتے ہوئے
یہ رنگ و رقص میں ڈوبے ہوئے نشاط کدے
سیاہ زلفوں کی چھاؤں میں آتشیں رخسار
یہ زر پہ بکتی ہوئیں "مہوشانِ نیم فرنگ"
"مسافروں" کے قوی بازوؤں کے حلقوں میں
تفکّرات سے عاری کھلی جبینوں پر
یہ کائنات کی نازک تھمی تھمی نبضیں!

جوان چہروں پہ خوش رنگ آنچلوں کا خرام
حسین آنکھوں کی جھیلوں میں ٹوٹتے سے جام
طویل زلفوں کے تاریک آبشار کہ دام
یہ برق تاب چراغوں سے جھلملاتے بام
افق میں جیسے گلے مل رہی ہو صبح سے شام
(بساطِ سبزہ پہ ہوتی ہیں عصمتیں نیلام)
مچل رہا ہے خریدا ہوا "جمالِ تمام"
مسرّتوں کی رُباب چاندنی کا رقص و خرام
یہ ایک نکتہ پہ ٹھہری سی گردشِ ایّام

الٰہی! کیا یہ وہی خطّۂ زمیں ہے جہاں
یہی وہ ارضِ ستم دیدہ ہے جہاں اب بھی؟
یہیں پہ کھائے تھے کیا بیچ بھوکی ماؤں نے؟
غلط غلط کہ ہے بدلا ہوا نظامِ جہاں
غریب ہے اُسی صورت رہینِ فاقہ و غم
میرے لئے تو معمّہ ہے زیست کا یہ تضاد؟

ترس کے مر گئے روٹی کو چار لاکھ غلام -؟
ہے "کارگر" پہ مشقت روا، اناج حرام؟
جگر کے لختِ نظر کے قرار، دل آرام؟
ستم ستم کہ بشر ہے ابھی بشر کا غلام
امیر کو وہی حاصل فراغِ عیشِ مدام
مرے لئے تو اِک عبرت ہے یہ سنہری شام

فکرؔ تونسوی

وہاں سے یہاں تک

پلٹ کے دیکھو
کہ دیوتاؤں نے دیکھ پایا تھا عرش کی چوٹیوں سے مجھ کو
زمیں کے بے برگ و بار سینے پہ، ایک سوکھے شجر کے نیچے
مقامِ برتر سے لَو لگائے، کہیں فلک پر نظر جمائے
جبیں پہ تلوار سی لکیریں، علامتِ سرکشی ہوں — گویا
وہ ایک گمبھیر بے نیازی، وہ ایک اندازِ خود پسندی
کہ "اندر دیوتا" کے تختِ زرّیں سے چھین ہی لونگا سربلندی
— مگر مجھے تم معاف کر دو!
وہ میری اک بھول تھی رفیقو!
غلام بندہ، گناہ گارہ!
ذلیل جسمو، مریض روحو، حقیر کیڑو! — معاف کر دو!!
اُسے مری ایک بھول سمجھو
کہ پاکبازانِ عرش سے جا کے اپنی نظریں ملا سکوں گا
کہ نیکیوں کی بلند چوٹی سے دیکھ پاؤں گا زندگی کو
کہ "برتری" کی عبادتوں سے میں اندر کا تخت جیت لوں گا

(۲)

ٹھہر کے دیکھو
ٹھہر کے دیکھو — ! کہ دیوتاؤں کی بستیوں سے دھواں سا اُٹھا
دھوئیں کے جنباں پروں کے جھولے پہ ایک شعلہ اُتر رہا ہے
وہ ایک شعلہ، وہ ایک گندم کا دانۂ زرنگار — جس نے
ادا و عشوہ سے میرے آبا کی جنتوں کو جلا دیا تھا
وہ ایک دانہ، وہ ایک شعلہ، وہ ایک ناگن اُتر رہی ہے
(وہ آزمودہ گناہ کا تیر، عرش کی نیک ہستیوں کا)
اُتر رہی ہے وہ رقص کرتی، وہ چھم چھماتی، فسوں جگاتی
مری نگاہوں میں سرسراتی
مرے خیالوں میں گنگناتی
مرے ارادوں کو ڈگمگاتی

مری چٹانوں کو تھرتھراتی
مری لکیروں پہ چہچہاتی
مجھے جگاتی، مجھے سلاتی، مجھے سلاتی، مجھے جگاتی
خزاں کے سینے پہ گل کھلاتی
بلند نیکی نے آزمودہ بدی سے مجھکو ہرا دیا ہے
وہ "مہرشی بسوامتر" — لب ہائے شعلہ ساماں کو چومتا ہے
وہ گرسنہ بے نیاز، اک زرنگار دانے پہ جھومتا ہے
وہ سرکش و تیغ باز جھٹلا رہا ہے اپنی عبادتوں کو
وہ — آسماں کا دھواں فضاؤں میں قہقہہ بن کے گھومتا ہے

(۳)

سنبھل کے دیکھو
سنبھل کے دیکھو یہ آسماں بوس محل، یہ سیم گوں عمارت
بلند ہیں دیوتا ابھی تک، ابھی مقدس ہیں عرش والے
ابھی ہے ان چوٹیوں میں وہ جادوئے لب شعلہ بار پنہاں
جو اپنی تقدیر ہے ازل سے، جو اپنا مقصود ہے ابد تک
ابھی ہے ان ترکشوں میں وہ تیرِ آزمودہ — وہ نانِ گندم
دھوئیں کے جھولے پہ جس کو یہ دیوتا، زمیں پر اُتارتے ہیں
جسے یہ اب بھی اُتارتے ہیں
سنوارتے ہیں نکھارتے ہیں
ہماری تلواریں کاٹتے ہیں
بموں کی تانوں پہ ناچتے ہیں
اُبھار کر آہنی منارے
"مقامِ برتر کو تھامتے ہیں"
ذلیل جسموں، مریض روحوں، حقیر کیڑوں کو جانتے ہیں
انہیں یہ اب بھی نوازتے ہیں
کہ اب بھی ہیں ان تختے پیچ کھاتے دھوئیں سے معمور یہ فضائیں
کہ اب بھی ہیں آسمانِ برتر کے پاس وہ سیمگوں ادائیں
کہ جب بھی ہم زندگی کے بے برگ و بار گوشوں سے سر اُٹھائیں
تو دیوتا، نیکیوں کی چوٹی پہ تلملا اُٹھیں، بم گرائیں
کہ ہم کہیں اندر دیوتا کا وہ تختِ زرّیں نہ چھین پائیں
سنبھل کے دیکھو
پلٹ کے دیکھو، ٹھہر کے دیکھو، بلندیوں کو سنبھل کے دیکھو!

تغیر

عبدالمجید بھٹی

ایک سنگین وسیہ ہاتھ نہ جانے کب سے
گلشنِ دہر میں تھا جبرِ مسلسل کی نمود

اس کے ہونے سے بہاروں میں بھی تھا خوفِ خزاں
اس کے ہونے سے ہر اک شے پہ تھی لرزش طاری
کپکپاتی ہوئی کلیاں تھیں، شگوفے لرزاں
پھول اس دستِ ستمگر سے ہراساں، ترساں
جس کو جب چاہے وہ چٹکی میں مسل دیتا تھا
روکتا کوئی نہ تھا اس کو تہِ چرخِ کبود!

اس کے ہونے سے تھی معصوم جوانی مبہوت
اس کے ہونے سے تھے بہکے ہوئے ارماں خاموش
اس کے ہونے سے چہک پر بھی کھٹک تھی غالب
اس کے ہونے سے مہک پر بھی تھا اک خوف محیط
نقرئی قہقہے یوں ٹوٹ کے رہ جاتے تھے
جیسے آوارہ فضاؤں میں کسی کی فریاد
جیسے دم توڑتی راتوں میں سسکتی جانیں
روکتا کوئی نہ تھا اس کو تہِ چرخِ کبود

میں نے اس دستِ ستمگار کو دیکھا تو کہا:-

کاش تجھ پر ترا اپنا ہی غضب ٹوٹ پڑے
قہر اللہ کا تجھ پر کسی ڈھب ٹوٹ پڑے
اُنگلیاں تیری جھڑیں اور یہ تباہی تھم جائے
تیرا تاریک لہو تیری رگوں میں جم جائے
تجھ پہ بجلی گرے، ہو ختم تری تاب و تواں
گلشنِ دہر میں باقی نہ رہے خوفِ خزاں
کوئی باقی نہ رہے دہر میں بن کر تقدیر
کوئی باقی نہ رہے بخت و مقدر کا شکار
اپنے ہاتھوں میں ہو سب سلسلہ بست و کشود

میری نفرت بھری آنکھوں نے جو روکا اس کو
قہر آلود نگاہوں نے جو ٹوکا اس کو،
اس طرح اس کے ارادوں کی کماں ٹوٹ گئی
اس طرح سمٹی لپک اس کی جھپٹ چھوٹ گئی
جیسے اک ننھی دلہن ساس کی دھمکی سہ جائے
جیسے دہشت زدہ خرگوش سمٹ کر رہ جائے
اور بے معنی ہوا مسئلہ بود و نبود

ظہیر کاشمیری

بین الاقوامیت

دُور اُدھر — جب میرے اجداد نے تقسیم کیا
رنگ اور نسل کی بنیاد پہ انسانوں کو
پرچمِ امن اتارے گئے تحقیر کے ساتھ
جنگ کی گونج نے تھرّا دیا ویرانوں کو

— تیغ بردار جگر دار جواں آتے تھے
اور وہ انکے رجز — "ہم ہیں قبیلے کے امیر
وہ قبیلہ کہ پہاڑوں کو دھنک کر رکھدے
وہ قبیلہ کہ تہوّر میں نہیں جس کی نظیر
وہ قبیلہ کہ نگوں پہ کمندیں ڈالے
وہ قبیلہ کہ شہیدوں کا لہو جس کا خمیر
کون اس آہنی دیوار سے ٹکرائے گا؟
پنجۂ موت میں لے آئی ہے کس کو تقدیر؟"

اسی انداز سے بہتا رہا انساں کا لہو
اسی انداز سے ہر ملک میں چمکی شمشیر

صبح ہوتی ہے تو سورج کی طلائی کرنیں
مشرقی کوہ پہ سمٹی ہوئی تھرّاتی ہیں
دن چڑھے تک یہی سمٹی سی طلائی کرنیں
بحر و بر حلقۂ انوار میں لے آتی ہیں

تابشِ زیست قبیلوں سے نکل کر پھیلی
جالی پیکن و پیرو کے سمن زاروں میں،
نور کی موج کسی طور نہیں بٹ سکتی
رنگ اور نسل کی گرتی ہوئی دیواروں میں

تاج، اہرام، ابوالہول، معلّق باغات
ایک مضبوط تسلسل کا پتہ دیتے ہیں۔

ساحر لدھیانوی

مادام

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام!
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدّن کی جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِّ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک، آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں — تو لوگوں پہ تعجّب کیسا
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزت کیسی
لوگ کہتے ہیں! مگر آپ ابھی تک چُپ ہیں
آپ بھی کہئے، غریبوں میں شرافت کیسی

نیک مادام! بہت جلد وہ دَور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہونگے
اپنی ذلت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہونگے

ہم نے ہر دَور میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دَور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں الفت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دَور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہونگے

قتیل شفائی

ہرجائی

کھیت سے دُور دمکتے ہوئے دوراہے پر
ایک سرشار جواں میں نے کھڑا پایا تھا
تمتماتے ہوئے چہرے پہ سلگتی آنکھیں
جیسے مہکے ہوئے گلنار کا خواب آیا تھا

کھیت بھرپُور جوانی کو لٹا بیٹھے تھے
ہر درانتی پہ تسلسل کا جنوں طاری تھا
جانے کیا دیکھ رہا تھا وہ مرے چہرے پر
اِس قدر یاد ہے، انگلی سے لہو جاری تھا

سر پہ پانی کے چھلکنے سے جو تارے ٹوٹے
آسماں جھانک رہا تھا مجھے حیرانی سے
ٹن سے کنکر جو پڑا میری حسیں گاگر پر
ایک نغمہ سا اُبھرنے لگا پیشانی سے

"کانچ کی چوڑیاں کل رات نہ ہوں باہوں میں
اتنی اُونچی تری پازیب کی جھنکار نہ ہو
سرسراتا ہوا ملبوس نہ لہرا جائے
کسی سائے کا گماں بھی پسِ دیوار نہ ہو"

لُوٹتی رات گئے، گھر کو پلٹنا میرا
اک لپکتے ہوئے سائے نے ڈرایا تھا مجھے
"تم؟ اری تم؟" (وہی سرشار جواں تھا شاید)
"جی یونہی ایک سہیلی نے بلایا تھا مجھے"

جب کبھی چاند سے پگھلی ہوئی چاندی برسی
اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے
بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اِس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے

اب مگر چاندنی رات آ کے گذر جاتی ہے
پوچھتا ہی نہیں کوئی مری تنہائی کو
کھیت سے دُور، دمکتے ہوئے دوراہے پر
ڈھونڈتی ہیں مری آنکھیں کسی ہرجائی کو

تصدّق حسین خالد

یاد

خود بخود دل میں کھبے جاتے تھے
مجھے معلوم نہ تھا
تیرے نظاروں میں یہ کیفیتِ جذب بھی ہے
کسی منزل کی حدیں چھو لی تھیں

زندگی، گرمِ سفر۔
روز نئی اک الجھن
آج کیا کرنا ہے
کل کیا ہوگا۔

ریت کا سیلِ رواں
اور یہ ابوہر کی چلچلتی ہوئی دھوپ
دل کے اک دور سے کونے میں چھپی بیٹھی تھی۔
دلہن کی طرح
وقت کچھ نہ کہہ سکا
پھر تری یادِ خراماں آئی

گیت ہی گیت
محبت کے پرانے رسنے
کسی نوخیز جوانی کا دہکتا ہوا پھول
روح کہتی ہے لگاؤں گی ستاروں کا سراغ
یہ مسرت میں چبھن کیسی ہے؟

مقبول حسین احمد پوری

گیت

اِس یُووَن[1] کی مادکتا[2] سے نت انگ[3] میں رہتی جولانی!

ہر رنگ میں ہے اک سُندرتا　　ہر بھاؤ میں شوبھا من مانی

ہر شبد لئے سنگیت نیا　　ہر بات میں موہنی نادانی

اِس یُووَن کی مادکتا سے نت انگ میں رہتی جولانی!

وہ پریم جو دو نینوں میں پلے　　آشاؤں کی چھایا پیاری

وہ مُورتی جو ہردے میں ڈھلے　　ابھلاکھا[4] کی مایا[5] نیاری

اِس یُووَن کی مادکتا سے نت انگ میں رہتی جولانی!

اے پریمی تجھ سے بھول ہُئی　　جس بھاؤ[6] پہ ہے تو بولایا

وہ ایک ترنگ ہے جیون کی اور تیری آتما کی چھایا

تو بنا پجاری مایا کا اور تتو[8] سے کی آنا کانی[9]

اِس یُووَن کی مادکتا سے نت انگ میں رہتی جولانی!

---

۱ جوانی ۲ نشہ ۳ جسم ۴ آرزو ۵ نرالی ۶ جذبہ ۷ دیوانہ ہوا ۸ حقیقت ۹ غفلت

کرشن موہن

سراغ

میں نے خاموش ستاروں سے محبت کی ہے
مرے محبوب رہے ہیں یہ الم خیز مزار
بارہا میں نے جلائے ہیں چراغ

میں نے دیکھا ہے فضاؤں کا تبسم اکثر
مجھے مرغوب رہی ہے یہ مسرت کی بہار
میں نے دیکھے ہیں یہ شبنم کے ایاغ

کہکشاں زارِ تمنا کے امیں، یہ چہرے
میں نے ان چہروں پہ بھی دیکھا ہے حسرت کا نکھار،
جلوہ گستر — دلِ مایوس کے داغ

مجھے تسلیم کہ تخلیق کا سرچشمہ ہے دل
کتنے ارمانوں کا مقتل ہے یہی نادرہ کار
کتنے مفقود عزیزوں کا سراغ

میں نے اس شہرِ خموشاں میں چراغاں بھی کیا
میں نے ان داغوں میں دیکھی ہے چراغوں کی قطار
دشتِ افسردہ میں سرسبز تھے باغ

سیّد مظفر برنی

ایک منظر

چاند ستارو! مل کر گاؤ!

آج زمیں پر خون کی ندی
بہتے بہتے سوکھ گئی ہے
درد کے سائے ظلم کی چھاؤں
سمٹ سمٹ کر دور ہوئی ہے

چاند ستارے مل کر بولے
ہم نے اس آکاش کے نیچے
روز یہی منظر دیکھا ہے

چاند ستارو! اشک بہاؤ!

آج زمیں پہ خون کی ندی
بڑھتے بڑھتے یہ نکلی ہے
ظلم کے سائے، درد کی چھاؤں
سارے جہاں پر پھیل گئی ہے

چاند ستارے ہنس کر بولے
ہم نے اس آکاش کے نیچے
روز یہی منظر دیکھا ہے

جگرؔ مراد آبادی

جگر پارے

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کہتے ہیں نہیں ہم کو تری عہد وفا یاد
اب دیکھئے کب تک انہیں رہتا ہے خدا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ میرے بھولنے والے نے کیا یاد

بندے کی نہیں تاب کرے یاد خدا کی
بندے کو اگر خود نہ کرے اس کا خدا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تری نظر نے
اب تک ہے وہ اک نغمہ بے ساز و صدا یاد

کیا جانئے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

مدت ہوئی اک حادثہ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدت غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

اثر لکھنوی

غزل

عشق کی گرمیٔ بازار کہاں سے لاؤں
یوسفِ دل کا خریدار کہاں سے لاؤں

جن سے میں اپنی محبت کا چمن سمجھا تھا
آہ وہ پھول سے رخسار کہاں سے لاؤں

سنتے ہی نغموں کی اک لہر رگوں میں دوڑے
میں تری شوخیٔ گفتار کہاں سے لاؤں

وہی شوریدہ سری ہے، وہی ایذا طلبی،
عشق میں جادۂ ہموار کہاں سے لاؤں

دلِ بیتاب خدارا تری تسکیں کے لئے
جلوۂ حسن بتکرار کہاں سے لاؤں

تو ہی بتلا دے اگر تجھ کو ہو معلوم کوئی
تجھ سا اک بے سببِ آزار کہاں سے لاؤں

تیرے انوارِ تجلی کی جھلک تھی جس میں
وہ دلِ آئینہ اسرار کہاں سے لاؤں

ہو گئیں آنکھوں سے وہ مست ادائیں اوجھل
عشرتِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں

دل کی دھڑکن میں سنا کرتا تھا پیغام ترا
اب وہ ہنگامۂ بسیار کہاں سے لاؤں

اُس پہ آئینہ ہو کس طرح تمنا دل کی
شوق منت کشِ اظہار کہاں سے لاؤں

مجکو اب دعوتِ گل چینیٔ نظارہ نہ دے
دل حریفِ گل و گلزار کہاں سے لاؤں

تو وہی ہے، وہی شانیں، وہی جلوے تیرے
پہلی سی طاقتِ دیدار کہاں سے لاؤں

سر وہی، شوق وہی، جوش وہی سجدوں کا
کوچہ و سنگِ درِ یار کہاں سے لاؤں

معبدِ دل میں پرستارِ محبت ہوں اثر
روشِ کافر و دیندار کہاں سے لاؤں

آتشکدہ

عبدالحمید عدمؔ

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
پہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو، تمام ماحول جل رہا ہے

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

مسکرانے لگی تھی ایک کلی
کہ اچانک بہار بیت گئی

ایک عنواں کا تجسس ہے کہانی کے لئے
ایک صدمے کی ضرورت ہے جوانی کے لئے

ذرا اک تبسم کی تکلیف کرنا
کہ گلزار میں پھول مرجھا رہے ہیں

بے خودی میں مرا آغوش ہے مجھ سے آگے
شرم مت کیجئے میں شاملِ آغوش نہیں

میں نے شراب، تو نے مروّت کا خوں پیا
میرا قصور نرم ہے تیرے قصور سے

اس چاند سی جبیں پہ عبادت کا تلخ بوجھ
ظالم خیال کر، ابھی عہدِ شباب ہے

یہ کائنات تری اے طلسم بندِ ازل
بڑی حسین ہے، لیکن بہت پرانی ہے

اک ستارہ، اک کلی، اک مے کا قطرہ، ایک زلف
جب اکٹھے ہو گئے، تعمیر جنت ہو گئی

جہاں جہاں رہِ ہستی میں تیرگی دیکھی
وہاں وہاں ترے رخ سے نقاب اُٹھا دونگا

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

نہیں ہے کِس کی خبر، کیا تمہیں نہیں معلوم
مگر جو حال ہے میرا، تمہیں نہیں معلوم

سکونِ ضبط و سکوتِ الم کہیں جس کو
وہ اضطرابِ تمنّا تمہیں نہیں معلوم

مری نگاہ کو ذوقِ نگاہ سمجھے تم
مری نگاہ میں کیا تھا تمہیں نہیں معلوم

مری نظر کے تقاضوں پہ یہ عتابِ نظر!
ابھی تو دل کا تقاضا تمہیں نہیں معلوم

یہ احترامِ تمنّا، یہ احتیاطِ نظر
کچھ اس طرح تمہیں دیکھا تمہیں نہیں معلوم

یہ میرے دل سے، یہ میری نگاہ سے پوچھو
"جہاں میں ہے کوئی تم سا" تمہیں نہیں معلوم

جفائے دوست وفا ہے یہ جانتا ہوں میں
کہے گی کیا تمہیں دُنیا تمہیں نہیں معلوم

ستا رہی ہے تمہیں کِس لئے حفیظؔ کی یاد
وہ تُم کو بھول چکا، کیا تمہیں نہیں معلوم؟

اختر شیرانی

غزل

یہ کون آیا بزمِ گل و یاسمن میں؟
کہ شادابیاں جاگ اُٹھیں چمن میں

تری یاد باقی، ترا غم سلامت!
بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں

یہ کس نے نگاہِ بہاریں سے دیکھا
بہاروں نے انگڑائیاں لیں چمن میں

بہت پھول دیکھے کسی میں نہ پائی
جو خوشبو بسی تھی ترے پیرہن میں

چمن کیا جواب اس چمن وش کا دیگا
بہت فرق ہے گل میں اور گلبدن میں

ہر اک ذرہ اک آنکھ بن کر ہے مضطر
وہ کب آئیں گے میرے دارالمحن میں

یہ سیمیں بدن اور شفق رنگ عارض
کہ گلہائے احمر ہیں شاخِ سمن میں

وہ جانِ چمن آج آئے گی اختر
چلو چل کے کلیاں بچھا دیں چمن میں

احمد ندیم قاسمی

غزل

مری نگاہ سے یہ پردہ کس نے سرکایا
جبینِ شوق کو سجدوں کا پھر خیال آیا

یہی لُٹی ہوئی نیندیں، یہی فسردہ دلی
میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

یہاں نہ ساز کی جھنکار ہے نہ رقص کی دھن
خیال نے مجھے کس انجمن میں پہنچایا

یہ تیری بزم ہے یا پتلیوں کا ناٹک ہے
ابھی تو لا کے بٹھایا، ابھی نکلوایا

حنا کا اب نہ بہانہ تراش، میں خوش ہوں
کہ دل کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آیا

خدا کو مدِ نظر تھی جمال کی تخلیق
تو اک فرشتہ ہیولیٰ ترا اُٹھا لایا

ترے جہاں میں ہے کیوں پختگی فنا کی دلیل
کہ غنچہ ہنستا رہا، اور پھول مرجھایا

مجھے بھی دیکھ، ستاروں کو ڈھانپنے والے
بجھا کے اپنا دیا، تیرا نام چمکایا

سیف اللہ سیف

غزل

راہ آسان ہوگئی ہوگی
جان پہچان ہوگئی ہوگی

موت سے تیرے دردمندوں کی
مشکل آسان ہوگئی ہوگی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہوگئی ہوگی

اُن سے بھی چھین لوگے یاد اپنی
جن کا ایمان ہوگئی ہوگی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہوگئی ہوگی

دل کی تسکین پوچھتے ہیں آپ
ہاں مری جان ہوگئی ہوگی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہوگئی ہوگی

ناصر کاظمی

غزل مسلسل

محرومِ خواب دیدۂ حیراں نہ تھا کبھی
یہ تیرا رنگ اے شبِ ہجراں نہ تھا کبھی

تھا لطفِ وصل اور کبھی افسونِ انتظار
یوں دردِ ہجر سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی

پرساں نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں
ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی

ہر چند غم بھی تھا مگر احساسِ غم نہ تھا
درماں نہ تھا تو ماتمِ درماں نہ تھا کبھی

دن بھی اداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

اے عشق کیا ہوئے ترے لمحاتِ پُرسرور؟
میں بے نصیبِ خلوتِ جاناں نہ تھا کبھی

دورِ خزاں میں یوں مرے دل کو قرار ہے
میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

بے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات
جینا اگرچہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی

شکیل بدایونی

غزل

اب تک شکایتیں ہیں دلِ بدنصیب سے
اک دن کسی کو دیکھ لیا تھا قریب سے

اکثر بہ زعمِ ترکِ محبت خدا گواہ
گذرا چلا گیا ہوں دیارِ حبیب سے

دستِ خزاں نے اُس کو وہیں بڑھ کے چن لیا
جو پھول گر گیا نگہِ عندلیب سے

اہلِ سکوں سے کھیل نہ اے موجِ انبساط
اک دن الجھ کے دیکھ کسی غم نصیب سے

نا اہلِ ناز کو بھی ملے فرصتِ نیاز
میں دور ہٹ گیا جو وہ گذرے قریب سے

یہ کس خطا پہ روٹھ گئی چشمِ التفات
یہ کب کا انتقام لیا مجھ غریب سے

اُن کے بغیر بھی ہے وہی زندگی مگر
حالاتِ زندگی ہیں مگر کچھ عجیب سے

سمجھے ہوئے تھے حُسنِ ازل جس کو ہم شکیل
اپنا ہی عکسِ رُخ نظر آیا قریب سے

موجؔ (علیگ)

غزل

شوخیِ دیدۂ تر، کیفِ نظر باقی ہے
آج بھی اُنکی محبّت کا اثر باقی ہے

ابھی رنگین ہیں مری نغمہ و پیمانہ بلب
آج بھی انجمنِ شمس و قمر باقی ہے

ابھی قائم ہیں نگاہوں میں جوانی کی حدیں
ابھی پہلو میں کوئی شعلۂ تر باقی ہے

میں کہاں اور بلندی کے مقامات کہاں
آج بھی حسرتِ پرواز مگر باقی ہے

ابھی قائم ہے سنورنے کیلئے ایک جہاں
ابھی اُٹھنے کیلئے اُنکی نظر باقی ہے

مدتوں سے غمِ انساں کا مقدر ہے وہی
آج بھی وقت کی پلکوں میں گہر باقی ہے

اور اُبھرے گا ابھی لیلیٔ گیتی کا شباب
ابھی اندیشۂ طوفانِ دگر باقی ہے

آج بھی دوڑ رہا ہے رگِ احساس میں خوں
آج بھی غیرتِ توہینِ بشر باقی ہے

ابھی مشرق کی فضائیں ہیں رہینِ ظلمت
اس اندھیرے سے اُبھرنے کو سحر باقی ہے

مسعود پرویز

غزل

ساحل ملا تو موجِ بلا ڈھونڈتے رہے
ہم عرصۂ حیات میں کیا ڈھونڈتے رہے

گذری بہار چاک گریباں کئے ہوئے
ہم اپنے ضبطِ غم کا صلا ڈھونڈتے رہے

آنکھوں میں اپنی خونِ تمنّا لئے ہوئے
ہر نقشِ پا میں رنگِ حنا ڈھونڈتے رہے

وارفتگی تھی خاک بسر کوئے غیر میں
اے دوست آج تیری وفا ڈھونڈتے رہے

شاید تری نگاہِ کرم ہی میں تھا نہاں
وہ قہر جس کو اہلِ جفا ڈھونڈتے رہے

پاکیزگی شریکِ ہوس تھی، جو آج ہم
بیباکیٔ نظر میں حیا ڈھونڈتے رہے

اِک جست میں جنوں کی میانِ حریمِ ناز
بابِ اثر کو دستِ دعا ڈھونڈتے رہے

افسانے اور ڈرامے

کرشن چندر
اختر حسین رائے پوری
پرکاش موہن
جاوید اقبال
راجندر سنگھ بیدی
عصمت چغتائی
احمد ندیم قاسمی
علی عباس حسینی
ابراہیم جلیس
دھرم پرکاش آنند
ممتاز مفتی
ہاجرہ مسرور
عزیز احمد
بلونت سنگھ
مہندر ناتھ
شفیق الرحمن

جدید افسانوی ادب

منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو
بگولے	احمد ندیم قاسمی
طلوع وغروب	"
ان کہی	ممتاز مفتی
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر
ٹوٹے ہوئے تارے	"
طلسم خیال	"
ان داتا	"
چراغ تلے	"
چٹان	اپندر ناتھ اشک
کونپل	"
باسی پھول	علی عباس حسینی
میلہ گھومنی	"
رفیق تنہائی	"
گرہن	راجندر سنگھ بیدی
دانہ ودام	"
چاندی کے تار	مھندر ناتھ
کرنیں	شفیق الرحمن
بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری
درپن	شکیلہ اختر
ہائے اللہ	ھاجرہ مسرور
ایک بات	عصمت چغتائی
زندگی کا میلہ	اختر حسین رائپوری
جدید، جدید تر	دھرم پرکاش آنند
جگا	بلونت سنگھ
منظر وپس منظر	اختر اورینوی
کلیاں اور کانٹے	"
خونی	اختر انصاری
ایک لڑکی	خواجہ احمد عباس
الاؤ	سہیل عظیم آبادی
تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبد الغفار
پردہ سیمیں	ڈاکٹر نصیر الدین

پودے

(ایک رپورتاژ)

۱- بوری بندر
۲- گاڑی میں
۳- حیدرآباد اسٹیشن
۴- حیدرگوڑہ
۵- اجلاس
۶- پرانا محل
۷- بطخوں کے ساتھ ایک شام
۸- واپسی
۹- منزل

کردار، مقام، واقعات سب حقیقی ہیں مصنف صرف ترتیب اور تسلسل کا ذمہ دار ہے

کرشن چندر

جب کرشن چندر بوری بندر کے سٹیشن پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سید سجاد ظہیر جو کمیونسٹ ہونے کے باوجود اپنے نام سے پہلے سید لکھتے ہیں۔ کچھ اُداس، کچھ پریشان سے کھڑے گیارہ نمبر کے پلیٹ فارم کے باہر اُس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ پستہ قد مصنف نے جس کے فراخ ماتھے سے بال بڑی تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ اور جس نے اپنی بھینی آنکھوں کو عینک کے دبیز شیشوں سے ڈھانپ رکھا تھا، سید سجاد ظہیر کے قریب جا کر ملتجیانہ انداز میں معذرت پیش کرنے کی جرأت کی۔

"بھئی" —— سید سجاد ظہیر نے شروع کیا، لیکن کرشن چندر اُسی لمحے بول اٹھا "بھئی معاف کرنا دیر ہو گئی" اُس نے اپنے لبوں پر ایک چھوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "یہ تو دیکھو۔ ملاڈ سے آ رہا ہوں۔ یہاں سے اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔ پھر بیوی بچوں سے بھی رخصت ہونا تھا۔ اور کمبخت یہ سامان ساتھ تھا۔ اور نوکر عین وقت پر کہیں بھاگ گیا۔ اور ....."

بس کرشن چندر اسی طرح بے ربط جملے کہتا جا رہا تھا۔ بظاہر بے ربط لیکن بباطن بدرجۂ غائت مرتب جملے یہ بے ربطی جو اُس کے افسانوں میں ہے۔ اُس کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ لوگ بہر صورت دھوکا کھاتے ہیں —— بے چارے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے لبوں تک بھی ایک مسکراہٹ آ گئی یہ کس قدر لطیف پاکیزہ نورانی مسکراہٹ تھی۔ سید سجاد ظہیر اطوار و گفتار میں بالکل چمڑے کے سوداگر معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی متین اور خاموش صورت دیکھ کر کوئی اُن کی جودتِ طبع کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جب وہ مسکراتے ہیں تو ذہانت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تبسم ہے کہ ہنستا ہوا کنول ہے شعر ہے، خوبصورت ہے، دلکش ہے، نور کا فوارہ ہے، تخیل کا کوندا ہے، ذہانت کی لہر ہے، اُمڈتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی۔ ہیجانی، سیلابی، طوفانی۔ جو چشم زدن میں، ایک سیدھے سادے، موٹے موٹے، رُوکھے رُوکھے چہرہ کو سر سبز و شاداب بنا دیتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سجاد ظہیر کے پاس اِس تبسم کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ (شاید اب وہ ہر روز آئینے میں دیکھ کر مسکرایا کریں گے۔ ایں واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تبسم۔ سچ مچ ..... بخدا)

سید سجاد ظہیر نے مسکرا کر معاف کر دیا "چلو بھئی۔ بس اب ..... یہ لو اپنا ٹکٹ، گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی ہیں"۔ اتنا کہہ کر انہوں نے گھبرا کر پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔

دفعتاً علی سردار جعفری سر پر آن کھڑے ہوئے۔ اُن کی بے کریز پتلون، بڑھے ہوئے بال اور گھونسہ مار کہ چہرہ بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر رعشہ طاری کر دیتا ہے۔ کرشن چندر نے انہیں آتے دیکھ کر اپنی پلکیں جھپکائیں اور اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ان حرکتوں سے کیا ہوتا تھا۔ سردار نے بڑے زور سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیوں بھائی۔ یہ کیا حرکت ہے۔ اس وقت چلے آ رہے ہو، گیارہ بجے کا وقت نہیں دیا تھا، اب دیکھو ایک بج رہا ہے، خیر اب جلدی سے سامان ....." یکایک سید سجاد ظہیر نے چونک کر کہا۔ "ہاں بھئی چلو"۔ خدا جانے اب تک وہ وہاں کھڑے کیا سوچ رہے تھے۔

(۲)

تھرڈ کے ڈبے پر سکندر آباد لکھا تھا۔ سکندر آباد جو حیدر آباد دکن میں واقع ہے، تھرڈ کا ڈبہ جو نظام اسٹیٹ ریلوے کی ملکیت تھا۔ اُس وقت بوری بندر کے سٹیشن پر کھڑا تھا۔ اور مسافر اس میں گڑ کی بھیلیوں کی طرح لدے ہوئے تھے۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے تیسرے درجے کے ڈبوں میں بھی بجلی کے پنکھے لگے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جہاں ترقی پسند ادیبوں کا گروہ بیٹھا تھا وہاں اتنی گھٹن نہ تھی۔ دراصل ان لوگوں نے اپنے بیٹھنے کیلئے اچھی جگہ حاصل کر لی تھی، پورے ڈبے میں صرف دو پنکھے تھے اور جہاں یہ پنکھے تھے وہیں ترقی پسند ادیب بھی تھے، دونوں پنکھوں کے نیچے آمنے سامنے ٹولیاں بنا کے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں اس لئے بیٹھے تھے۔ کیونکہ حیدر آباد دکن جا رہے تھے۔ اور حیدر آباد دکن اس لئے جا رہے تھے۔

کہ وہاں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کُل ہند کانفرنس تھی۔

ایک ٹولی میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، مدن گوپال، سبطے حسن اور مہندر ناتھ شامل تھے۔ دوسری ٹولی میں علی سردار جعفری، رفعت سروش، قدوس صہبائی، عادل رشید، کرشن چندر اور کیفی اعظمی تھے، کیفی اعظمی نے اپنی صورت ایک چرس پینے والے فقیر کی سی بنا رکھی تھی، وُہ ایک بوسیدہ کمبل اوڑھے ہوئے کھڑکی سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے اور دوران سفر میں کبھی کبھی آنکھیں کھول کر کمال حیرت و استعجاب سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ لیتے۔ اُن کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی۔ ہائیں۔ تم لوگ ابھی تک اس ڈبے میں ہو۔ کچھ کھا کے سو کیوں نہیں گئے۔ اُن کی شکایت آمیز نگاہ کا نوحہ دوسرے ادیبوں کیلئے ایک مسلسل مرثیہ تھا۔ عادل رشید اپنی سیٹ پر اس طرح بیٹھے تھے گویا فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں، سبطے حسن اور مہندر ناتھ نے دنیا کی بے ثباتی اور موجودہ دور کی رجعت پسندی پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد شطرنج بچھالی تھی اور مہرُوں کو پیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ امیر لوگوں کو پیٹنے سے تو یہ لوگ رہے۔ رفعت سروش کا سانولا چہرہ اپنی معصومیت اور خطرناک سادگی کی مکمل رعنائیاں لئے ہوئے اک سرمئی کبوتر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کہ جو اپنی چھتری پر بیٹھا ہُوا بڑی بے صبری سے دانے کا انتظار کر رہا ہو۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے کان میں چپکے سے کہہ دے "غٹر غوں بول کبوتر بول"۔

گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے، کرشن چندر نے جو حال ہی میں کسی فلم کمپنی میں ملازم ہُوا تھا اپنی نئی امارت جتانے کیلئے چار روپے کے سنگترے پھل والے سے خرید کئے اور انہیں اپنے ساتھیوں میں بانٹنے لگا۔ ازل کا بھوکا اور کمینہ ساتھ ساتھ کہتا جا رہا تھا، "لو بھئی کھاؤ نا۔ ارے یار۔ بہت میٹھے ہیں یہ سنگترے" اور چہرے پر وہی جھوٹی مسکراہٹ تھی "خوب ہیں یہ سنگترے۔ رنگترے۔ رس بھرے۔ ارے بھائی اس میں وٹامن بھی ہے، اماں یار ایک تو چکھو" پلکیں جھپکا جھپکا کر وُہ سنگترے تقسیم کر رہا تھا۔ راک فیلر کا سالا!

ادیبوں کے کاہن ملک راج آنند اور سید سجاد ظہیر آمنے سامنے بیٹھے تھے، دونوں براق کھدر میں ملبوس تھے۔ سجاد ظہیر کے کھدر کا رنگ سپید تھا تو ملک راج آنند کا رنگ جوگیا تھا۔ لیکن لباس دونوں کا وہی تھا وہی ٹوپی، وہی جواہر جیکٹ، وہی پائجامہ، ملک راج آنند کے مُنہ میں پائپ تھا تو سید سجاد ظہیر کے لبوں پر تبسم ملک راج آنند کے گداز اور سرخ گلے اور اس کے بھرے بھرے فربہ ہونٹ انگلستان کی آسودگی کے مظہر تھے۔ اُن کے پائپ کا دھواں اُڑ کر چھت کی طرف جاتا تھا اور پھر یکایک پنکھے کی ہوا سے فضا میں منتشر ہو جاتا تھا۔ آنند اور سجاد ظہیر دونوں ادبی کانفرنس کے پروگرام طے کر رہے تھے اور مدن گوپال جنہوں نے منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے اُن کے قریب بیٹھے ہوئے اپنا مُنہ کھولے ہوئے ان دونوں ادیبوں کی گفتگو اس انہماک سے سُن رہے تھے گویا کسی الہامی تفسیر سے روشناس ہو رہے ہوں۔ مدن گوپال کا خاصہ یہ ہے کہ وُہ اپنی خاموشی ہی سے لوگوں کو پریشانی میں مُبتلا کر سکتے ہیں۔ مہندر ناتھ اور سبطے حسن کبھی کبھی لباط سے گردن اُٹھا کر نگاہ پھیر کر ڈبے میں چاروں طرف دیکھ لیتے اور کہیں آسودگی نہ پا کر پھر مہروں کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ قدوس صہبائی مدیر نظام تکیہ کا سہارا لئے منہ میں یوکلپٹس کی گولی ڈالے دونوں ٹانگیں سکیڑے اس طرح بیٹھے تھے۔ گویا پُرانی بواسیر کے شکار ہیں۔ کرشن چندر نے از راہِ ہمدردی اُن سے کہا۔ "لیجئے۔ آپ بھی کھائیے نا!"

"شکریہ۔" وُہ بولے۔ "مجھے تو نزلہ ہے۔" اس کے بعد انہوں نے خود سگرٹ پیش کیا۔ "لیجئے۔"

"شکریہ" کرشن چندر نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو پیچش ہے اور پیچش میں تمباکو۔ آپ خود جانتے ہیں۔"

قدوس صہبائی نے شہیدوں کا سا تبسم اپنے چہرے پر لا کر کہا۔

"مجھے دس سال سے پیچش ہے۔"

"مجھے پندرہ سال سے ہے" کرشن چندر نے عاجزی سے کہا۔

"اور میرے نرخرے کے اعصاب میں ورم بھی ہے۔" قدوس صہبائی نے نہایت انکسار سے جواب دیا۔

"میری آنتوں میں سوزش ہے اور دل میں اختلاج ہے اور جگر میں پتھری ہے۔" کرشن چندر نے نہایت مسکین میٹھے لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میں صرف تین سال تک زندہ رہوں گا۔ خدا کرے وُہ میرا ناول مکمل ہو جائے"

"کونسا ناول"، قدوس صہبائی نے پوچھا۔ "کوئی نیا ناول آپ لکھ رہے ہیں۔ بھئی ذرا جی لگا کے لکھیئے گا۔ وہ آپ کا ناول "شکست" تو بالکل ۔۔۔ اف کیجئے گا۔ بھئی ملاپ ہے بالکل ۔۔۔۔۔۔"

کرشن چندر سنگترے کی پھانک کھاتے کھاتے اس کے کڑوے بیج بھی نگل گیا۔ کہنے لگا۔ "ذرا یہ ۔ اس پنکھے کا رُخ اِس طرف موڑ دیجئے اماں کسقدر گرمی ہے۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔"

قدوس صہبائی نے مسکرا کر کہا۔ "یہ یوکلپٹس کی گولی لیجئے مفرح ہے۔"

"وہ مارا ——— وہ مارا ——— دوستو ——— وہ مارا"۔ یکایک مہندر ناتھ دہاڑا۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" یکایک کیفی اعظمی نے گھبرا کر اور آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"دوستو۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ بس اسی سبطے حسن سے پوچھو۔ مات دے دی اسے کہ نہیں؟ وزیر اور فیل اور سب پیادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دوستو!"

سبطے نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اک لاتعلق انداز میں کہا۔ "اماں ہٹاؤ بھی کیوں شور مچاتے ہو بیکار۔ آخر پنجابی ہو نا۔ لو آؤ اب کے تمہیں مات نہ دے دیں تو۔"

گارڈ نے یا خدا جانے کس نے سیٹی بجائی اور گاڑی چلنے لگی۔ ادیب گاڑی سے باہر جھانکنے لگے۔ لیکن ان بیچاروں کو الوداع کہنے والا وہاں کون تھا۔ ایک خوبصورت ایرانی عورت اپنے خاوند کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک پارسی لڑکی قوس قزحی ساڑھی پہنے دوسرے درجے میں کھڑی رومال ہلا رہی تھی اور اس کا محبوب پیار بھری نگاہوں سے اُسے تکتا گیا۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ایک مرہٹے نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شولاپور پر بھائی صاحب تجھے گاڑی سے اُتار لیں گے۔ گھبراؤ نہیں۔" لیکن ان ادیبوں کے لئے وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ باپ۔ نہ محبوب۔ نہ مداح۔ بیچارے خوخی ہاتھ ہلا ہلا کے رہ گئے۔ اور جب گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ تو پھر اپنی سیٹوں پر آن بیٹھے اور بے بسی کے عالم میں اونگھنے لگے۔

کرشن چندر جب اُداس ہوتا ہے تو سگرٹ پیتا ہے۔ لیکن خود خرید کر کبھی نہیں پیتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں سے مانگ کر پیتا ہے۔ اُس کی عادت سے اُس کے دوست اچھی طرح واقف ہیں اور اُسے اکثر پریشان بھی کیا کرتے ہیں۔ اِس وقت بھی کرشن چندر کو سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ لیکن اُسے کسی نے سگریٹ نہیں دیا۔ نجانے اُن لوگوں کے پاس سگریٹ نہیں تھا یا اُن لوگوں نے اُسے پریشان کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بہرحال اُسے اپنے ساتھیوں سے سگریٹ نہیں ملا اور وہ مایوس ہو کر اور گردن جھکا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کے دل کی ویرانی اور بڑھ گئی۔ یکایک اُس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ ایک کالا بھجنگ بدصورت نوجوان ہے جس کے دانت سپید سپید ہیں اور اپنی جلا سے موتیوں کو بھی شرماتے ہیں۔ اور وہ اسے سگریٹ پیش کر رہا ہے۔ کرشن چندر نے شکریہ کے ساتھ اُس سگریٹ کو قبول کیا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ نوجوان نظام اسٹیٹ ریلوے میں مزدور ہے اور حیدرآباد دکن جا رہا ہے۔ کرشن چندر کو یاد آیا کہ سنگترے تقسیم کرتے وقت اُس نے اپنے ہمسائے کو سنگترہ نہیں پیش کیا تھا۔ کیونکہ اُس کے کپڑے نیلے رنگ کے تھے اور میلے کچیلے تھے اور اس کا رنگ کالا تھا۔ اور وہ بدصورت بے ڈول اور کریہہ منظر تھا اور مزدور تھا۔ کرشن چندر نے سگریٹ پیتے وقت سوچا کہ وہ ابھی تک بورژوائی اخلاق کے تضاد میں گرفتار ہے۔ سردار نے اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے ایک پرولتاری کا اخلاق" اور پھر فوراً چپ ہو گیا۔ رفعت سروش نے عادل رشید سے کہا۔ "بھئی ہمیں تو بھوک لگی ہے۔" سیٹ کے نیچے ایک ٹوکری میں کچھ سامان خورد و نوش بھی تھا۔ عادل رشید نے وہ ٹوکری اُٹھا کر اپنی رانوں پر رکھ لی۔ اور اب وہ دونوں انڈے اور روٹی مکھن نکال نکال کر کھانے لگے۔ مکھن ٹین کے ڈبے میں بند تھا۔ اور چاقو کسی کے پاس نہ تھا۔ اس وقت بھی وہی مزدور اپنے کام آیا۔ اور سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی کرشن چندر نے اپنے ہمسائے کو کھانے کیلئے پوچھنا بھول گیا۔ سب لوگ جلدی جلدی انڈے اور مکھن اور پھل ڈکار گئے۔ بہت عرصے کے بعد یکایک کرشن چندر کو خیال آیا اور اُس نے چونک کر کہا "ارے بھائی۔ کچھ اسے بھی دے دیا ہوتا اپنے ساتھی کو۔"

مزدور مسکرایا۔ وہ ان کا ساتھی تھا۔ لیکن انڈے توس مکھن اور پھل کھانے والا ساتھی نہیں۔ وہ تو فرشِ خاک پر بیٹھ کر تقریریں سُننے والا ساتھی تھا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے چاقو سے مکھن کو الگ کیا۔ اور اُسے بند کر کے اپنی جیب میں ڈال کر چار مینار کا سیگرٹ پینے لگا۔

ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اُس ڈبے میں کوئی سو ڈیڑھ سو آدمی اور ہوں گے، دو مولوی تھے۔ چار سود خور پٹھان سے آسودہ رہنے تھے جو دوسرے درجے میں سفر کر سکتے تھے لیکن روپیہ بچانے کی خاطر تھرڈ میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ کوئی پندرہ بیس ریلوے کے مزدور تھے۔ ایک چنا جور گرم بیچنے والا تھا۔ ایک دیسی عیسائی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بیوی نے اپنے تین بچے سیٹوں پر سُلا رکھے تھے۔ اور خود بھی نیلا سایہ پہن کر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اُس کی سیاہ اور مضبوط ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی نظر آتی تھیں۔ اور بالوں سے پُر تھیں۔ ٹخنوں پر اُونچی ایڑی کے سپید سینڈل کا تسمہ بندھا تھا۔ اُس ڈبے کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے پر مفلوک الحال کسان بوسیدہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے اور بلند آواز میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ کتنی عجیب باتیں تھیں وہ۔ زمین کی باتیں۔ پٹواری کی باتیں۔ جریب اور کھتونی کی باتیں۔ تحصیلدار کی باتیں۔ ہل کی باتیں۔ بیل کی باتیں۔ قحط کی باتیں۔ بیاہ کیلئے بنئے سے سود پر رقم حاصل کرنے کی باتیں۔ گھر کو گروی اور زمین کو رہن کرنے کی باتیں۔ عجیب و غریب باتیں۔ نہ عشق و محبت کی باتیں نہ حسن جہانسوز کی باتیں، ساقی کی باتیں نہ شراب ناب کی باتیں، مذہب کی باتیں نہ جنت کی باتیں، اک بے پناہ شور تھا۔ ایک مسلسل ہنگامہ۔ ایک مستقل دوزخ، اک آگ، اِک بُو۔ اِک سڑاند، جیسے تھرڈ کا پورا ڈبہ انسانیت کی سنڈاس تھا۔ اور جس میں وہ ترقی پسند ادیب اس طرح دھرے تھے۔ جس طرح کوئی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سیب کی سُرخ و سپید قاش پھینک دے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا۔ ”ادب کی دوامی قدریں بھی ہوتی ہیں“۔

”بے شک۔ بے شک“۔ مدن گوپال نے طوطے کی طرح رٹتے ہوئے کہا۔

”کونسی دوامی قدریں ہوتی ہیں جناب“۔ علی سردار جعفری نے گویا گھونسا دکھلاتے ہوئے کہا۔ سردار کے چہرے پر سیاسی موں کی صعوبتوں کے تمام نشانات موجود ہیں۔ اس کی پیشانی پر مستقبل کے نئے عزائم کی مہر ہے، وہ جب بات کرتا ہے دانت پیس کر، قہر میں ڈوب کر، ایک جلالی مجذوبانہ انداز میں، جو بات چہرہ میں ہے وہی چال ڈھال میں، وہی گفتار میں اک تنا ہوا ٹھوس گھونسا، اک جامد ہتوڑا اور ہنسیا، سُرخ جھنڈا گویا اس کے چہرہ پر گڑا ہوا ہے، سردار کی ذاتی شخصیت اب گھٹتے گھٹتے صفر ہو کے رہ گئی ہے۔ اس سے بات چیت کیجئے معلوم ہوتا ہے آپ ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ایک تحریک کا سامنا کر رہے ہیں۔ فلسفے کی اک شق کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اک نئے انداز فکر سے دوچار ہو رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کس نے اُس کے دل کو شاعر بنا دیا ہے ؎

پھول سے کھل گئے تصور میں   دامن شوق بھر گیا کوئی ....

ملک راج آنند نے پائپ کی راکھ جھاڑ کر اک مخصوص مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”یہی۔ خوبصورتی۔ ترتیب۔ تزئین جمال، مجھے یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ جہاں ہندوستانی ادیبوں نے سماجی مواد کی فراہمی میں اتنی مستعدی سے کام لیا ہے، وہاں وہ اُسے پیش کرنے میں کمال فن کا ثبوت نہیں دے سکے ...... میری مراد ہیئت سے ہے۔ سماجی مواد کو خوبصورتی سے پیش کرنا ہی صحیح حسن کاری ہے۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے کونسا ایسا قابل فخر کارنامہ ......“

کرشن چندر نے جھلا کر کہا۔ ”اور آپ کے انگریزی ادیبوں نے کونسا ایسا کمال کر کے دکھا دیا ہے۔ آپ کے آڈن نے ......“

”آڈن بہت بڑا شاعر ہے جناب“ آنند نے جواب دیا۔ ”اس کی شاعری میں شیکسپیئر کے کلام کی سی عظمت ہے۔“

لیکن کرشن چندر نے سنی ان سُنی کر کے کہا۔ ”آپ کے آڈن نے، سینڈر نے، میک نیس نے، ہکسلے نے، پریسٹلے نے، کوئی یوگا میں اُلجھ کے رہ گیا تو کوئی سٹنٹ فلموں کے مکالمے لکھنے لگا۔ پریسٹلے سیدھا سادھا پراپیگنڈا کرتے ہیں، ....

انگریزی استعماریت کے حق میں بیورلے نکلس ہندوستانیوں کو صلواتیں سناتے ہیں۔ کچھ لوگ۔ اے۔ آر۔ پی پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ واہ رے حسن کاری ....“

”یہ میں مانتا ہوں کہ ابھی تک بیشتر امریکی اور انگریزی مصنف اس

ہم جمہوری استعماریت کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اُن کا خیال ہے کہ اُن کی تہذیب اور اُن کا سماج اور ان کا اقتصادی نظام ابھی بیس پچیس برس اور چلے گا۔ اس لئے وہ کیوں خواہ مخواہ اس سے لڑائی مول لیں اور اپنی روزی خطرے میں ڈالیں وہ اتنے بیوقوف نہیں ہیں۔ اب یورپی مصنفوں کو لیجئے۔ جدید یورپی شاعری کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہو رہا ہے" سردار نے جلکر کہا۔ "ایک آراگاں کو چھوڑ دیجئے اور دو ایک اور کو۔ باقی شاعروں نے کیا اپنے آپ کو اور اپنے فن کو نازیوں کے حوالے نہیں کر دیا تھا۔ خاص طور پر فرانسیسی زوال پسندوں نے۔ کہئے تو ایک نہیں درجنوں مثالیں پیش کردوں۔ ابن الوقتی پر آدرش کو قربان کر دینے سے کبھی آرٹ یا آرٹسٹ عظیم نہیں ہو سکتا۔"

"Apocalyptics" آنند نے شروع کیا۔ لیکن اب اُس پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ کیفی نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس گروپ کا کیا کہتے ہو۔ ایک ہی مجموعہ چھاپ کر رہ گئے۔ لغویات کا پلندہ۔ چلے تھے ویلیش دیو مالا کے بل پر قوم کی حالت سُدھارنے ویلیش دیو مالا جس میں انسانی بھیڑیوں کے قصے اور جہاں دوست کی بیوی کو بہکانا دیوتائی میں شامل ہے۔ . . . .

. . . کیا یہی ادب کی دوامی قدریں ہیں۔ کیا انہی قدروں کی بنا پر اک نئے بہتر اور بھرپور سماج کی داغ بیل ڈالی جائے گی۔؟"

"ارے کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو" سردار نے کہا۔ "وہ بیچارے تو کب کے ختم ہو گئے اب تو شاعری چھوڑ چھاڑ کر صرف اپنے پیٹ کا دھندا کر رہے ہیں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" مدن گوپال نے دریں چہ شک کی گردان دہرائی۔ اور عادل رشید بے ساختہ ہنس پڑے۔ جس پر مدن گوپال کو غصہ آگیا اور وہ عادل رشید کو گھورنے لگے۔

آنند نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی ہم نے بھی سب پڑھا ہے۔ ہم نے بھی اقبال اور جوش کا مطالعہ کیا ہے، لندن میں بیٹھ کے جھک نہیں مارتا رہا ہوں، مجھے تو معاف کیجئے ان میں کوئی عظیم بات نظر نہیں آئی۔ اقبال بہت اچھے ہیں لیکن ان کا فلسفہ متضاد خیالات کا مجموعہ ہے اور جوش اردو میں بہت شور و غل مچاتے ہیں۔ لیکن جب بھی انگریزی میں ترجمہ

کردو۔ گھانس معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل گھانس۔"

"آپ خود گھاس کھا گئے ہیں۔" سردار نے غصے میں آکر کہا۔ "آنند صاحب پہلے آپ اس ملک کی حالت کا اندازہ کیجئے اس کی ادبی تحریکات کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے سیاسی رجحانات کا تجزیہ . . . ."

"دوستو!" مہندر ناتھ نے چیخ کر کہا۔ "دوستو۔ مار ڈالا۔ کچل کے رکھ دیا۔ دوستو۔ میدان جنگ سے بھگا دیا۔"

"کیا ہوا بھئی" سجاد ظہیر نے سخت پریشان ہو کر پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں ہوا۔" سبطے نے چیں بر جبیں ہو کے کہا۔ "بس ایک دفعہ اور مات کیا دے دی۔ جب سے گلہ پھاڑ کے چلا رہے ہیں میرے یار پنجابی ڈھگے ہیں نا آخر، تہذیب چھو تک نہیں گئی ہے۔ ہٹاؤ یہ بساط۔ ہم نہیں کھیلتے۔"

"لاؤ ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔" علی سردار جعفری نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔ آپ میری مدد کریں گے۔ آپ!" سبطے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے۔" سردار نے چونک کر پوچھا۔

"آپ؟" سبطے حسن ہنسا۔

"ہاں ہیں!"

"آپ!"

"ہاں! ہاں ہیں!" —— اب سردار کو واقعی غصہ آگیا۔

"تم!"

"میں!!"

"تم!!!"

"بے شک بے شک"۔ مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا اور سب ہنس پڑے۔

گفتگو ایک لمبے عرصے کیلئے خود بخود بند ہو گئی۔ سجاد ظہیر، رفعت سروش، عادل رشید اور مہندر ناتھ کسی نہ کسی طرح سو گئے۔ جب یہ سب سو گئے تو چرس پینے والا فقیر کیفی اعظمی اک گونہ بے خودی سے سرشار ہو کر گنگنانے لگا۔ قدوس صہبائی چسکی لے کر یوکلپٹس کی میٹھی گولی چوسنے لگے۔ آنند الکسی ٹالسٹائی کی Road to Lelvery پڑھنے لگے۔ مدن گوپال

نے پریم چند کے متعلق اپنا انگریزی شاہکار پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور اس پر پنسل سے نشان لگاتا گیا۔ گویا دوسرے ایڈیشن کے لئے اُسے نئی نئی باتیں ابھی سے سُوجھ رہی تھیں۔ کرشن چندر کا جی پان کھانے کو چاہتا تھا۔ لیکن گاڑی کہیں رُکتی نظر نہ آتی تھی۔ اُس نے سبطے حسن سے کہا "دم گھٹتا جا رہا ہے۔"

"اگلے اسٹیشن پر اُتر کر ڈائننگ کار میں چلیں گے"۔ سبطے نے تجویز پیش کی۔

"میں بھی چلوں گا۔" سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ یعنی ڈبے کے بیچ میں خاموشی تھی، ورنہ چاروں طرف شور تھا۔ اور کسان اور مزدور اور غریب بدصورت مفلوک الحال لوگ چلا چلا کے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس قدر اکیلے، کمینے اور بھوکے لوگ تھے۔ کہ اگر نہ چلاتے تو شاید پاگل ہو جاتے۔ اس خاموشی۔ کائنات کی اندھی بسیط گنہگار خاموشی میں دب کر رہ جاتے۔ اسی لئے تو اُن کی روحیں چیخ چیخ کر اپنی زندگی کا نوحہ بیان کر رہی تھیں۔ وہ ہنستے تھے۔ وہ بات کرتے تھے۔ وہ مسکراتے تھے۔ وہ خوش ہوتے تھے۔ وہ غصہ میں آ کر چیختے تھے۔ لیکن بات ایک تھی۔ نوحہ، مرثیہ، دفنائی ہوئی، کفنائی ہوئی، آرزوؤں کے ننگے مزار، ہر ہنسی کے پیچھے ہر تبسم کے پیچھے۔ ہر انداز گفتگو کے مرکز میں گویا اپنا سینہ کھولے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "ہمیں دیکھ لو۔ جاہل وحشی ظالم درندو۔ ہمیں بھنبھوڑ کر کھا جانے والے دیوتا نما شیطانو۔ آؤ۔ آؤ ہمیں قریب سے دیکھ لو ......" کرشن چندر نے مُنہ پھیر لیا۔ باہر شفق کھل گئی۔

سبطے کے ذہین چہرے پر کرب کی ایک لہر آئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "وہ دیکھا تم نے .....؟" سبطے کے چہرے پر کرب کی بے شمار لکیریں ہیں۔ جیسے سمندر کا جھاگ ساحل سے ٹکرا ٹکرا کے پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذہنی احساسات کا تموج سالہا سال سے اس کے نازک چہرے پر یخ بستہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خفیف سے خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس ہے۔ اور اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سبطے نے زندگی سے کرب ہی اخذ کیا ہے زندگی کی بے پناہ صعوبتوں اور گہری سے گہری مسرتوں سے بھی اُس نے کرب ہی حاصل کیا ہے۔ غالباً اس کے انداز فکر میں ایک ایسی تازگی ہے اور اُس کے احساسات اور جذبات پر ایک ایسی شدت کی کیفیت ہے جو اسے ہر غم اور ہر مسرت سے ایک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے۔ ایک حسین کلی کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر ایسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک فلاکت زدہ بھکاری کو دیکھ کے۔ اس کا چہرہ شدتِ احساس کا وہ مرکز اتصال ہے جہاں حسن اور غربت دونوں ایک ہی درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی جواں سالی کے باوجود یہ چہرہ بوڑھا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں کی پختگی آ چکی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے کے ہر روزن سے شب و روز جھانکتی نظر آتی ہیں جیسے انہوں نے دنیا کے سارے غم کا احاطہ کر لیا ہو۔

شفق کے نازک رنگوں کو دیکھ کر سبطے کے چہرہ پر وہی مخصوص کربناک کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔"

کرشن چندر نے شفق کی طرف دیکھا۔ افق پر پھُولی ہوئی سرسوں کی کیاریاں۔ کشمیر کی کشت ہائے زعفران اسے بھی شفق بیحد پسند ہے شفق جو اس کے دل میں نہ تھی، یہ پیلا پیلا سنہرا جادو جو اُس کی روح میں نہ تھا۔ یہ شادابی۔ یہ رنگینی۔ یہ حسن کاری جس کے نہ ہونے سے اُس کا رواں رواں بھوکا تھا ...... یہ شفق جواب سونا نہ تھی۔ جواب زعفران بھی نہ تھی۔ جواب گل مہر کے پھولوں کی طرح شعلہ بداماں تھی۔ سورج نیچے ڈھل گیا تھا بادلوں کا ہر غرفہ پھُول پھُول تھا۔

سبطے نے کہا .... "وہ دیکھو ...... وہ دیکھو ......"

سیاہ بادلوں کے پیچھے سونا ابل رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے مرکز میں آسمان نیلا تھا۔ ایک کھڑکی سی کھُلی تھی۔ سمندر پر کھڑکی کھُل گئی تھی۔ اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور وہ کھڑکی میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو تک رہا تھا۔ اور لہریں ریت کو چوم کر واپس چلی جا رہی تھیں۔ یہ نور کی لہریں یہ سورج کا سمندر ...... یہ خدائی کا مرکز۔ "وہ دیکھو ..... وہ دیکھو"

شام بڑھنے لگی، شفق ڈوبنے لگی۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔ اس تاریکی کے سمندر میں وہ سُنہرا رنگ کہیں کھو گیا۔ وہ گلابی تاج محل شہابی ہو گئے۔ مرمریں سے گلابی گلابی سے شہابی، شہابی سے قرمزی۔ محل ہاتھی بن گئے اور پھر تاریکی۔ نور کی آخری لہر اُفق سے ٹکرا کر ڈوب گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

"اب کچھ نظر نہیں آتا"۔ سبطے نے افسردگی سے کہا۔ اور اُسے

ڈائننگ کار یاد آئی۔" اگلے سٹیشن پر وہاں چلیں گے۔"

"اب کچھ نظر نہیں آتا" کرشن چندر نے کہا "بجلی کے پنکھے اور ہرے بھرے کھیت اور پھونس کے جھونپڑے اور دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں۔"

"عورت کا ذکر تم ضرور کروگے" سردار نے چڑ کر کہا "میاں کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ اپنا۔ شفق کو دیکھ کر تمہیں عورت ہی یاد آتی ہے۔ اس خونیں منظر کو دیکھ کے بھلا تمہیں میدان جنگ کیوں یاد نہیں آتا؟"......

گاڑی دھیمی ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ چلتی چلتی رک گئی۔ سردار سبطے اور کرشن چندر اتر کر ڈائننگ کار میں بیٹھ گئے۔

ڈائننگ کار میں خوبصورت فانوس تھے۔ شفاف بلوریں میزیں تھیں۔ انگریزی شراب تھی۔ ہنستے ہوئے چہرے تھے اور عورتیں جن کے چہرے گلاب تھے۔ قد بوٹا۔ ہنسی نقرئی اور جسم برفاب ان کے لباس کا سرسراتا ہوا ریشم اپنے رنگ و نور سے نگاہوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ اور وہ بیٹھی ہوئیں اور مسکراتی ہوئیں اور چلتی ہوئیں اس طرح دکھائی دیتی تھیں گویا کسی شیشے کی صراحی میں رنگین مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ یہ ڈائننگ کار کی مچھلیاں تھیں۔ یہ وہ مچھلیاں نہ تھیں جو ساحل سمندر پر گھومنے والے ماہی گیروں کی میراث ہوتی ہیں۔

سبطے سردار اور کرشن چندر کو معلوم ہوا گویا وہ کسی نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔ ویٹر سپید مکلف لباس پہنے مؤدب کھڑے تھے تین کورس کا انگریزی کھانا.... اس کے بعد کافی پھر وہ لوگ اخروٹ کھانے لگے۔

لوگ اخروٹ توڑنے والا ہتھوڑا استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دانتوں سے وہی کام لیا۔ مقابل کی میز پر تین انگریز فوجی بیٹھے تھے ایک دوسرے سے شناسا نہ تھے۔ اس لئے بات نہ کر سکتے تھے ہاں وہ ان قہقہہ مار کر ہنسنے والے ادیبوں کی بدتمیزیوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان تین انگریز فوجیوں کے ساتھ چوتھی کرسی پر ایک موٹا پارسی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہہ اٹھتا "میں پریشان ہوں۔ میں بےحد پریشان ہوں جانی!"

"ٹھیک ہے"۔ ایک انگریز فوجی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں تم نہیں جانتے۔ میں زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ بیرا ایک لارج برانڈی لاؤ۔ آپ پئیں گے؟"

"نو تھینکس" دوسرے فوجی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا میں کس قدر پریشان ہوں" فوجی افسر اٹھ گئے۔ موٹے پارسی نے سبطے کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا "بھائی میں بہت پریشان ہوں"۔

"آپ پریشان نہ ہوں" سبطے نے مشورہ دیا۔

"کیسے پریشان نہ ہوں۔ میں تو پریشان ہوں۔ میں اس زندگی سے اس دنیا سے پریشان ہو چکا ہوں۔ یہ سب دھوکا ہے۔ سراب ہے۔" اس نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا "بیرا ایک لارج برانڈی اور لاؤ — آپ پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ!" کرشن چندر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بہت پریشان ہوں!"

اتنے میں ایک اور موٹا پارسی آخری میز سے اٹھ کر ادھر آیا۔ دونوں پارسیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بڑے ٹھاٹ سے "صاحب جی" ہوا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے؟" نووارد نے پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو؟ دوست یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔ سراب ہے۔ مایا ہے۔ میں تو بےحد پریشان ہوں"۔

"آخر ہوا کیا ہے"۔ دوسرے پارسی نے پوچھا۔

"ارے بھائی۔ امسال ایک کروڑ انکم ٹیکس میں جا رہا ہے۔ اس سال کے بزنس پر۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کمائیں گے۔ جب اسی فیصدی تو سرکار ہی منافع میں سے لے جائے گی۔ I tell you - it is a Swindle. میں بہت پریشان ہوں۔ کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں بوائے دو لارج برانڈی لاؤ۔ جلدی" اتنا کہہ کر وہ موٹا پارسی میز پر سر ٹیک کر رونے لگا۔

(۳)

دوسرے روز صبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی نظام اسٹیٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اور ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں کھجری لئے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اپنی دلدوز آواز میں گا کر بیان کر رہا تھا۔ باہر میلوں تک

کے کھیت تھے۔ یا میلوں تک چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا جنگل تھا خرگوش اور تیتر گاڑی کی آواز سے چونک کر جھاڑیوں سے نکل بھاگتے تھے۔
پگڈنڈی پر چرواہا ریوڑ لئے جارہا تھا اور بیلوں کے پاؤں سے اُڑتی ہوئی گرد میں سورج کی کرنیں اک زریں دھند کے میں کھوئی گئی تھیں۔ یہ دھند لکا اُفق پر بھی تھا۔ جہاں سورج سُرخ لحاف سے سر نکال کر نئے دن کو دیکھ رہا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے سُتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کھجری کا نغمہ سُن رہا تھا جو مچلتی ہوئی زندگی کو برفیلی موت کا پیغام دے رہی تھی۔ مسافر آنے والی موت سے مرعوب ہو کر اندھے کو خیرات بانٹ رہے تھے۔ ہزاروں سالوں سے یہی آسا کی دھن اور یہی موت کا نغمہ صبح سویرے سارے ہندوستان میں گونج اُٹھتا ہے۔ چھوڑ دو دُنیا۔ چار دن کی چاندنی ہے۔ پھر اندھیری رات ہے۔ مایا کا جنجال ہے مسافر کس بھول میں پڑا ہے۔ ان گیتوں میں سراب ہے، اندھیرا ہے، تاریکی ہے، موت ہے۔ زندگی نہیں۔ حرکت نہیں۔ خوشی نہیں۔ خود اعتمادی کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن نہیں جو انسان کو صبح سے شام تک دنیا کے تکلیف دہ کاموں میں مسرت و شادمانی سے مصروف رکھتی ہے۔ اسی لئے تو یہاں ہر فرد فاقہ مست ہے۔ ہر شخص کا چہرہ سُتا ہوا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اُس نے اپنے باپ کے انتقال کی خبر سُنی ہو۔ اسی لئے تو یہاں ہنسی ہونٹوں سے غائب ہے۔ کرۂ ارض پر شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنسنا بد تمیزی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور رونا عین ثواب ہے۔ رونا ہمارے نغمے میں ہے، ہمارے فلسفے میں ہے، ہمارے سماج میں ہے، ہمارے فن میں ہے، ہمارے مذہب میں ہے۔ رونا ہمارے تمدن کی معراج کامل ہے "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا......" کھجری والے اندھے نے دوسرا رونا شروع کیا۔ اور سردار نے جھلّا کر اُسے دو تنی دی اور کہا۔ "بس کرو اور اگر ضرور ہی کچھ گانا چاہتے ہو تو کوئی کام کی چیز گاؤ۔" اندھا بے چارہ چند لمحے چُپ رہا۔ اُس کے ساتھی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ ڈبے میں مسلمان مسافروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اُس نے اندھے کے کان میں کچھ کہا اور اندھے نے کھجری کی تھاپ سے ایک نعت شروع کی۔ اور جب وہ نعت گا چکا اور صرف مسلمان مسافروں سے پیسے وصول کر چکا تو اُس نے اب دُوسری چیز شروع کی۔ "مُرلی والے گھنشام....."

اب کے صرف ہندو مسافروں نے اُسے پیسے دیئے۔ اس وقت گاڑی میں بیٹھا ہوا ہر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے کچا ہی کھا جائے گا۔ اور کرشن چندر کو ایسا محسوس ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں اک گہری خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ دو فرقوں کے درمیان، دو نظریوں کے درمیان، دو زندگیوں کے درمیان، جیسے کوئی سویا ہوا احساسِ نفرت یکایک بیدار ہو گیا تھا۔ اور سانپ کے پھن کی طرح سر اُٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا۔

یکایک گاڑی رُک گئی اور اندھا اُتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ وہاں سے پھر صدا آنے لگی، سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا.... کملی والے ..... مُرلی والے گھنشام ...... اور کیفی اعظمی نے اس طرح بُرا سا مُنہ بنایا جیسے کسی نے زبردستی اُس کے گلے میں زہر اُنڈیل دیا ہو۔

مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا۔ "ظالم نے کیسا اچھا گلا پایا ہے۔"

"ہائیں!" یکایک سب ترقی پسند ادیب جھلّا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اُسے اسی وقت گاڑی سے نیچے اُتار دیتے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہے۔ کہ اس آدمی نے منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ہر طرف بیزار سے چہرے تھے۔ عادل رشید کھٹے ڈکار لے رہے تھے۔ ملک راج آنند مُنہ پر ہاتھ رکھے شریفانہ انداز میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مہندر ناتھ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھُجا رہے تھے۔ رفعت سروش بے وجہ مُسکرا رہے تھے۔ کرشن چندر پائنچوں میں دونوں ہاتھ ڈالے سیٹ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ قدوس اپنے حلق میں یوکلپٹس کی گولی رکھ رہے تھے سبطے آنکھیں مل رہے تھے۔ اور سجاد اونگھ رہے تھے اور علی سردار جعفری لوٹا لئے باتھ روم کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے۔ گویا کسی انقلابی مہم پر روانہ ہو رہے ہوں۔

"مسلم چائے، مُسلم چائے"۔ کسی نے پکارا۔

یہاں بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ "لاؤ"۔

"کتنی چائے؟"

"پندرہ بیس تیس۔ چالیس۔ جتنی ہو لے آؤ"۔ عادل رشید نے حکم دیا۔

چائے والے نے کہا۔ "اگلے سٹیشن پر ملے گی۔" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اگلا سٹیشن بیگم پیٹھ تھا اور جب تک یہ لوگ چائے ختم کرتے حیدرآباد کا سٹیشن آگیا۔ یہاں استقبالیہ کمیٹی کے دس پندرہ ارکان حاضر تھے۔ اور صبح سویرے یوں چلے آنے پر برافروختہ سے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے چہرے خوش آمدید کہنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر بشرے سے یہی عیاں ہوتا تھا "میاں، اگر انسان ہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ صبح سویرے ہمیں جگایا۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے تمہاری ترقی پسندی۔ یاں حیدرآباد میں ہم لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے۔ دوکانوں کے دروازے گیارہ بجے کھلتے ہیں اور بارہ بجے کے قریب کہیں کوئی اکا دُکا خریدار سردی میں ٹھٹھرتا ہوا شیروانی کے بٹن کالر تک بند کئے اک معذرتی انداز میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک آپ ڈھیٹ ہیں۔ کہ نو بجے ہی اسٹیشن پر آدھمکے ہیں۔ لعنت!"

چند لمحوں تک مہمانوں نے میزبانوں کو اور میزبانوں نے مہمانوں کو دیکھا پھر ہونٹوں پر تبسم آتے گئے۔ یہ تبسم بھی خوب ہے۔ کاروباری۔ تجارتی معذرتی احمقانہ، ہر طرح کا تبسم ہوتا ہے۔ مایوس تبسم، عیار تبسم، محبوب تبسم، منغض تبسم، جاہل تبسم۔ عالم تبسم جیسے ہم سب کچھ جانتے ہیں اور آپ بڑے چُغد ہیں کامران تبسم، جیسے میاں بتاؤ اب کیا کرو گے تمہاری لونڈیا تو ہم لے اُڑے۔ اور تبسم جس میں حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس کے چہرے پر بھی تبسم تھا۔ کچھ عجیب قسم کا ملتجیانہ، مٹیالا مایوس تبسم۔ گویا کہہ رہا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا۔ اور اس پر ایک فٹ کی اونچی رومی ٹوپی پہن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی کسی سرکس سے نکل بھاگے ہیں۔ یہ شہاب ہیں۔ پستہ قد۔ گندمی رنگ۔ گول چہرہ سیدھا سادہ۔ لیکن آنکھیں بیحد ذہین۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ "ہم تمہیں پہچان گئے۔ ایک ہی لمحے میں۔" یہ نظر حیدرآبادی ہیں۔ چوڑا سیاہ چہرہ۔ چوڑا ماتھا۔ چوڑا دہانہ۔ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے بال۔ ہر چیز میں وسعت کا احساس دکن کا شمالی باشندہ جسے دکن نے خود اپنی وسیع، عریض چٹانوں سے تراشا ہو۔ بے باک قہقہہ۔ بے جھجک تبسم جو خود بخود لبوں پر آتا جاتا ہے۔ نظر شاعر ہو کر بھی زمین کے اس قدر قریب کیسے ہو سکتا ہے۔ اُس کا اندازہ اُسے دیکھتے ہی ہو سکتا ہے یہ مُسلم ضیائی ...... پستہ قد۔ سنولا رنگ، گنجا سر۔ آنکھوں پر دبیز شیشے ہونٹوں پر شرمیلی کنواریوں کی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ جو کھو جاتی تھی اور آجاتی تھی...... پیچھے ہٹ جاتی تھی اور سامنے آجاتی تھی۔ اسی قدر حساس مسکراہٹ تھی۔ وہ کہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی تھی۔ کہ یہ باہر کے لوگ میرے دوست ہیں یا دشمن۔ اجنبی ہیں یا عزیز۔ مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی۔ میں اکیلی ہوں۔ میں تنہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ سب کچھ کھو دیا ہے پھر بھی معصوم ہوں۔ اکیلی ہوں، مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمہیں اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اپنے آپ پر اعتبار نہیں۔ اس ذلیل ماحول پر اعتبار نہیں۔ جو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ تم میرے رفیق ہو سکتے ہو۔ ہاں۔ ہاں...... نہیں۔ نہیں...... مجھے چھوڑ دو نہیں۔ میرے پاس اب اپنا کچھ نہیں۔ ایک نام تھا وہ بھی اپنا نہیں رہا۔ "ضیائی میرا ایک دوست تھا۔ وہ مر گیا۔ اس کا نام میں نے اپنا لیا۔" اب وہ مجھ میں زندہ ہے۔ تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے ہو۔ ایلو میں چلی۔ نہیں تم مجھے نہیں سمجھو گے اس دوست نے مجھ سے مرتے وقت کہا تھا کہ میں شراب نہ پیئوں۔ اُس دن سے میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ تم پھر ہنسنے لگے۔ ایلو میں ہونٹوں سے غائب ہوتی جا رہی ہوں ...... تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ میں جو معصومیت کی میراث ہوں۔ میں جو محبت کے آنسو سے پیدا ہوتی ہوں اور ناکامی کی گود میں موتی بن کر چھپی رہتی ہوں ......

مُسلم ضیائی اور مہندر ناتھ گلے ملنے لگے۔

"آپ سے ملئے"۔ کسی نے کرشن چندر سے کہا اور کرشن چندر نے مڑ کر دیکھا۔ معمولی قد و قامت کا بے ڈول سا انسان۔ چہرہ پر اک لایعنی۔ بے مطلب تبسم۔ پُر اسرار تبسم نہیں کہ جسے آدمی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ ایک ایسا تبسم جو اپنی تفسیر میں کسی طرح اسم مہمل سے نہ بڑھ سکے۔ بے حد روکھا پھیکا چہرہ۔ نہ لبوں پر چمک نہ آنکھوں میں ذہانت، نہ پیشانی پہ نور۔ چپ چاپ گم سُم۔ مٹی کا مادھو۔ چہرے کا رنگ پیلا۔ نہیں مٹیالا۔ نہیں خاکستری...... نہیں کچھ خاکستری کچھ سبز سا...... بالکل مینڈک جیسا۔ "لاحول ولا قوۃ"۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں کہا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر متلی سی ہو رہی تھی۔ کس کا مُنہ دیکھنا پڑا صبح سویرے......

"آپ جگر حیدرآبادی ہیں۔ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی ہیں۔"

"اوہ جگر حیدرآبادی ہیں! بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔" کرشن چندر نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے غلیظ کثیف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مڑ کر سبطے کے کان میں "جگر جہاں بھی دیکھو، جلا بُھنا ہی ملتا ہے کمبخت!"

سبطے نے ہنس کر کہا۔ "ہاں۔ حیدرآباد میں ہو یا مراد آباد میں یا اردو شاعری میں۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے۔"

سردار نے سبطے اور کرشن چندر دونوں کو ڈانٹا۔ "آئینے میں اپنی صورتیں ملاحظہ فرمایئے ذرا۔ پھر دوسرے پر انگلی اٹھایئے گا۔"

"کچھ بھی ہو مجھے تو اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے۔" کرشن چندر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی بدقسمتی ہے کیونکہ قیام و طعام کے تمام انتظامات جگر صاحب کے ذمہ ہیں۔" سردار نے ہر لفظ پر زور دے کے کہا۔

"باپ رے" کرشن چندر چونک کر اچھل پڑا۔

(۴)

جس مکان میں مہمان ادیبوں کو ٹھہرایا گیا۔ وہ حیدر گوڑے میں واقع تھا۔ علی سردار جعفری نے کرشن چندر کو حیدر گوڑہ جاتے راستے میں ایک محل کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ گذشتہ مرتبہ اردو کانگریس کے موقع پر ہم لوگ اُس محل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ قیام و طعام کا اس قدر اچھا انتظام تھا۔ بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ ہر مہمان کیلئے دو نوکر وقف کئے گئے تھے۔ جو ہر وقت اُس کے کمرے کے باہر بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت کے نظم و نسق میں جاگیرداری کا مکمل شکوہ موجود تھا۔ اور کرشن چندر نے سوچا اب کے پرولتاریت کی حد ہو گئی ہے۔ دراصل اُسے جگر سے بغض للہی ہو گیا تھا اس لئے اسے یہ مکان بھی پسند نہ آیا۔ حالانکہ مکان نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اور پورا مکان اُن لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں سب کو گالیاں دیتے ہوئے سب سے اچھا کمرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باقی تین کمروں میں چھ چھ سات سات آدمی ٹولی بنا کر بس گئے۔ اور بستر فرش پر بچھ گئے۔ اُنھ چارپائی تک تو میسر نہیں۔ اور یہ باتھ روم کی کنڈی بھی غائب ہے اور نہانے کے لئے برتن موجود نہیں۔ جگر اُس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے اور اُس کے دل کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اُس نے رُک کر جگر صاحب کو مخاطب کیا۔

"بہت اچھا مکان لیا ہے آپ نے"

"اجی صاحب۔ ابھی ابھی بنا ہے۔" جگر معصومیت سے فرمانے لگے۔

"وہ دیتا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے حاصل کیا۔ آپ لوگوں کے لئے۔ بالکل نیا ہے۔ ڈپٹی جلال الدین جو ہیں نا......"

کرشن چندر نے دل میں کہا۔ "اب آپ اس مکان کی کہانی سنائیں گے۔ اس کا شجرۂ نسب بیان کریں گے۔ ٹھیک ہے صاحب۔ کہئے۔ ہم سنیں گے۔ آپ کے مہمان جو ٹھہرے۔"

اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ "جگر صاحب سجاد ظہیر صاحب پلنگ مانگ رہے ہیں۔ اُن کے کمرے میں پلنگ ڈلوا دیجئے۔"

جگر صاحب نے کہا۔ "پلنگ تو یہاں نہیں ہے۔ مگر ٹھہرو میں انتظام کرتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کے چل دیئے اور کرشن چندر نے سوچا۔ کس قدر عجیب آدمی ہے۔ بھئی تم اپنی کہانی تو پوری کرتے جاؤ۔ یہ کیا بدتمیزی ہے کہ عین گفتگو کے بیچ میں اٹھ کے چل دیئے۔ کس قدر بری بات ہے یہ۔ اچھی تہذیب ہے یہ۔ واہ!

پھر اُسے سجاد ظہیر کے پلنگ کا خیال آیا۔ بنّے سجاد پلنگ ہی پر سو سکتے ہیں۔ فرش پر نہیں۔ آخر اُن کے لئے پلنگ کیوں منگایا جا رہا ہے۔ وہ کیوں پلنگ پر سوئیں۔ اور ہم کیوں نہ پلنگ پر سوئیں۔ واہ۔ یہ اچھی رہی۔ کرشن چندر نے سوچا۔ بنّے پلنگ پر سوئیں گے تو میں بھی پلنگ پر سوؤں گا۔ بنّے کیلئے پلنگ آئیگا تو میرے لئے بھی آئے گا۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ اور یہ جگر صاحب کس صفائی سے مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے بنّے کے لئے پلنگ کا انتظام کرنے کیلئے چلے گئے۔ میں بھی تو اُن کا مہمان ہوں۔ مہمان ہوں۔ خاک مہمان ہوں۔ گھنٹوں سے یہاں خالی کمرے میں کھڑا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے اور بنّے کیلئے پلنگ منگایا جا رہا ہے اور میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب میں نے جگر کو سٹیشن پر دیکھا تھا۔ خباثت اُس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پلنگ لانے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر اُن کے رشتہ دار ہوتے ہیں کیا۔ میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں لیکن۔ لیکن۔ میں جب سے یہاں کھڑا ہوں کوئی نوکر بھی تو اس کمرے میں جھاڑو دینے نہیں آیا۔ اور دوسرے کمروں میں پلنگ بچھائے جا رہے ہیں۔ "کون پوچھتا ہے مجھے۔ میں کون ہوں جو مجھے کوئی پوچھے گا۔ دراصل یہ سب سازش ہے مجھے ذلیل کرنے کیلئے یہاں بلایا ہے۔ وہ بیچارا احمد علی ٹھیک کہتا تھا۔ کرشن چندر کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اور اُس کی آنکھیں غم و غصہ کے آنسوؤں سے نمناک ہو گئیں۔ اتنے میں مجلس استقبالیہ کے ایک رکن تشریف لائے۔

"چلئے چائے پی لیجئے۔"

”نہیں - میں چائے نہیں پیوں گا۔“ کرشن چندر نے کہا۔

”آپ چائے نہیں پیتے ؟“

”پیتا ہوں - مگر اس وقت نہیں پیوں گا۔“

”کیوں کوئی خاص بات ہے ؟“

”جی نہیں - مجھے ذرا ---- پیچش ہے۔“

”تو پیچش میں تو چائے مفید ہوتی ہے۔“

”ہوتی ہو گی - مگر میرے لئے نہیں۔“

”اچھا تو چلئے - تھوڑا سا ناشتہ ہی کر لیجئے۔“

”ناشتہ ! میں ناشتہ بھی نہیں کروں گا۔“

”چلئے بھائی - تکلف نہ کیجئے - آپ ناشتہ نہیں کریں گے، تو جگر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔“

”جگر صاحب کہاں ہیں - انہیں میرے پاس بھیجدیئے۔“

”وہ ابھی آتے ہوں گے - سجاد ظہیر کیلئے پلنگ کا انتظام کرنے گئے ہیں۔“

یکایک کرشن چندر نے چلا کر کہا - نہیں صاحب میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ مجھے پیچش ہے - سر میں درد ہے - ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔

”بخار ہے - پیچش ہے - سر میں درد ہے - تو ٹھیریئے - میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں“

کرشن چندر نے کہا ”ٹھیریئے ٹھیریئے“ مگر وہ رُکا نہیں اور ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

اتنے میں سردار قریب سے گزرا ”یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ کرشن، چلو ناشتہ پر لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ اور وہ دونوں بانہوں میں بازو ڈال کر چل دیے - ناشتہ سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے کمرے کو گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ باہر دہلیز پر جگر کھڑے ہیں اور اس کے کمرے میں پلنگ بچھوایا جا رہا ہے - جگر نے کہا ”ڈاکٹر ابھی آتا ہو گا - میں ابھی بستر کے دیتا ہوں آپ اس پر آرام کیجئے۔“

(۵)

کانفرنس کا پہلا اجلاس، افتتاح کے موقعہ پر مسز سروجنی نائیڈو کی شعلہ بیانی، کیا عورت ہے - معمر ہونے پر بھی آنکھوں کی جواں سالی نہیں کھوئی، تبسم کی حیرانی نہیں کھوئی، روح کی جستجو اور پیہم کاوش نہیں کھوئی۔ بدلتا ہوا زمانہ ہر بار اک نیا مرحلہ سامنے لے آتا ہے، اور یہ شاعرہ اس مرحلے کا یوں استقبال کرتی ہے - گویا وہ مدت سے اس کی منتظر تھی، اٹھتی ہوئی لہریں بار بار ساحل سے ٹکراتی ہیں - اور ان رواں دواں بلند و بالا موجوں کے تخت پر آپ اس عورت کو دیکھیں گے جس نے ہندوستانی سیاست اور ادب کے سارے رنگ دیکھے ہیں - فن سے زندگی تک، اور ہوم رول سے جمہوریت تک، وہ کبھی پیچھے نہیں رہی - اُس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ زمانے سے ہمیشہ دو قدم آگے رہی ہے۔ ”ممکن ہے اپنے باغیانہ خیالات کی بنا پر اب کے اُسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ نہ ملے۔“ سردار نے سبطے سے کہا۔ ”ش“ سبطے نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ سنو - کرشن اپنا مقالہ پڑھنے جا رہا ہے - ہال میں خاموشی تھی - پانچ ہزار آدمی چپ چپ بیٹھے ہوئے ایک ادبی مقالہ سُن رہے تھے - اس سے پہلے ایسا نہ ہوا تھا - یہاں مشاعرہ نہ تھا - خطیبانہ انداز تکلم نہ تھا - کوئی گہری فلسفہ طرازی نہ تھی - لیکن لوگ خاموشی سے سُن رہے تھے - پانچ ہزار آدمی کالج کے طالبعلم، سکول کی لڑکیاں، سرکاری ملازم، دوکاندار، ریلوے مزدور، بے کار - ہر طبقے کے لوگ شامل تھے - اور خاموشی سے سُن رہے تھے۔ اور جب مقالہ نگار نے مراکو سے لے کے جاوا تک کے آزادی پسندوں کی تحریک کا ذکر کیا تو ہال نعروں سے گونج اُٹھا - اور جب ادب میں اشتراکیت کا ذکر آیا - انسانیت کا ذکر آیا - ایک بہتر نظام زندگی کا ذکر آیا عشق کی انقلابی ماہیت کا ذکر آیا - اور ان طبقوں کا ذکر آیا جن پر ہمارے ادب کے دروازے ابھی تک بند ہیں - تو سُننے والوں کے دلوں کے تار جھنجھنا اُٹھے جیسے مقالہ نگار کی زبان اور اُن کے دل مل گئے تھے - جیسے اُس مقالے میں وہ لوگ خود بول رہے تھے - پہلے روز یہ ہوا - دوسرے روز بھی اسی طرح ہوا تیسرے روز اور چوتھے روز بھی یہی ہوا - یہ مکمل انہماک، یہ سچائی کو پا لینے کی پاکیزہ جستجو ہر چہرے سے عیاں نظر آئی - گذشتہ دس سال سے لوگ تہذیبی اور ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دینے لگے تھے - انہیں اپنی قومی زندگی کا عنصر بھی سمجھنے لگے تھے - اور گو تعمیری تنقید نے اتنی ترقی نہ کی تھی - پھر بھی باشعور پڑھے لکھے طبقے میں ان باتوں کا چرچا تھا - نئی تحریروں پر بحثیں ہوتی تھیں - بہ تعمق نگاہ ہر مضمون کے حسن و قبح پر اس کے افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر - اس کے ترقی پسند یا ترقی پسند رجحانات پر بڑی تفصیل سے گفتگو

ہوتی تھی۔ مختلف نظریئے تھے۔ مختلف اذہان تھے۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ لیکن ایک چیز ان سب میں وجہ اشتراک تھی۔ ادب اور کلچر اور تمدن سے دلچسپی۔ حقیقی دلچسپی اور قومی اور ملکی ادب کو اُس راہ پر گامزن کرنے کی آرزو ...... جہاں وہ اس کی بڑھتی، اُٹھتی، مچلتی ہوئی زندگی کا ترجمان بن جائے۔ ہندوستان کے نوجوان کا دل جاگ اُٹھا تھا۔ اور ادب کی ہر تفسیر میں اپنی جگمگاتی ہوئی تمناؤں کے فانوس خیال روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ جو اندھیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ گیت جس کے ہر مصرعے میں اِک نئی لے کی چمک تھی۔ اور جس کی ہر لے میں کروڑوں انسانوں کی آرزوؤں کی گونج تھی۔ اس نئے نغمے نے ہر ادیب کے دل کو بہجت سے لبریز کر دیا اور اُن کے دلوں کی دھڑکنیں اُن ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں میں کھو گئیں جو اس وقت ہال میں موجود تھے۔ روشن چہرے ذہین آنکھیں۔ تالیوں کا شور اور نئی زندگی، نیا ادب۔ نئے انقلاب کے نعرے، یکایک کئی ادیبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا سب کے دل معاً شدت سے یہی محسوس کرنے لگے کہ ادب صرف تخیل کی چار دیواری میں محبوس ہو کر کس قدر محدود ہو جاتا ہے۔ اور اس بڑھتی ہوئی زندگی۔ کشمکش حیات کی آویزشوں سے ٹکراتی ہوئی زندگی کے بحرانی لمحوں میں گھل مل کر ادب اور ادیب کیسے اک نئی وسعت، اک نئے رُخ، اک نئے کیف وکم سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

پہلے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد بہت رات گئے اجلاس کی کامیابی پر گفتگو ہوتی رہی۔

—— کالجوں کے لڑکے بڑے انہماک سے ادیبوں کی گفتگو سنتے رہے اور آٹوگراف لیتے رہے۔ یہ آٹوگراف کی بدعت بھی خوب ہے۔ ادیب جلدی میں یوں دستخط کرتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں۔ ارے بھئی۔ ان لوگوں نے تو پریشان کر دیا۔ اب کوئی کہاں تک دستخط کرے۔ کبھی کبھی کسی لڑکی کی آٹوگراف بک آ جاتی تو قلم لے کے بیٹھ جاتے اور سوچتے کہ کس طرح ایک فقرے میں لیلیٰ و مجنوں کی پوری داستان بیان کر دیں۔ بعض لوگ بہت ہی کلبی بننے کی کوشش کرتے۔ ایں۔ اس میں ہے کیا آخر۔ آخر تو عورت ہی تو ہے۔ شوپن ہار والی عورت، جا معاف کر دیا تجھے۔ مدن گوپال سے کسی نے آٹوگراف نہیں مانگا۔ تو آپ تبھی نکالے ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں۔ بھئی۔ اُس خوبصورت لڑکی کی بعید بدصورت آٹوگراف بک پر تم نے کیا لکھا۔ ہی ہی ہی۔ اب کوئی پوچھے اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ آٹوگراف بک جو مُسلم ضیائی کے پاس تھی کئی اعتبار سے بہت دلچسپ تھی۔ سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔ "اشتراکیت زندہ باد"۔ کرشن چندر نے لکھا تھا "انسانیت زندہ باد" جوش نے لکھا تھا "ابھی تم دونوں بچے ہو"۔ آگے ساغر نے لکھا تھا۔ "نورٹرا چار سو بیس ہے"۔ یہاں آ کے تسلسل ٹوٹ گیا اور جوش اور ساغر کے مناقشات پر گفتگو ہونے لگی۔ جوش کی رُباعیوں کا ذکر آیا۔ فراق نے بھی رباعیاں کہنا شروع کی تھیں۔ موازنہ ہوا۔ اس جھگڑے میں رات کے دو بج گئے۔ صبح ہی سردار کو نظام کالج میں ایک تقریر کرنا باقی تھی۔ اُس نے سوچا لاؤ ابھی شیو کر ڈالوں۔ کرشن تمہارا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کرشن کا سامان غائب تھا۔ اُس نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن کہیں نہ ملا۔ اُس نے گھور گھور کر جگر صاحب کی طرف دیکھا۔ جگر نے کوئی توجہ نہ کی۔ کرشن چندر کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔ خوب۔ اب یہ پوچھتے تک بھی نہیں کہ بھئی آپ کا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کیسے گم ہوا۔ یہیں کہیں ہوگا۔ میں ڈھنڈوا دیتا ہوں۔ مگر جگر نے جمائی لے کے کہا۔ "میں تو چلتا ہوں۔ صبح فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبد العلیم تشریف لائیں گے۔ اسٹیشن جانا ہوگا۔"

"اور ہمیں تو نظام کالج جانا ہے۔" کرشن چندر نے کہا۔ "گاڑی کا انتظام کر دیجئے۔"

"میں دیکھتا ہوں" جگر نے سرسری طور پر کہا۔ اور کرشن چندر کا جی جل کے کباب ہو گیا۔ اور وہ اسی لمحے اپنے کمرے میں جا کے بستر پر دراز ہو گیا اور اس نے سوچا۔ میں کل نظام کالج نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔ چاہے مجھے کوئی کچھ بھی کہے۔ میری بلا سے۔" وہ صبح اُٹھا تو شیو کا سامان غائب ہی تھا۔ دوبارہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ سردار بے چارہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھوم رہا تھا۔ لیکن کسی کا شیو کا سامان خالی نہ تھا۔ آنند داڑھی مونڈ رہے تھے۔ سبطے نیند میں کراہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے شیو کا سامان کسی کو مستعار نہیں دیتے۔ قدوس صہبائی نے جب دونوں ادیبوں کو نظام کالج کا عزم کرتے دیکھا۔ تو بولے "آپ لوگ شیو بنا لیتے تو اچھا تھا۔ سنا ہے نظام کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں"۔ سردار کا چہرہ تنا ہوا گھونسا تھا۔ اور کرشن چندر کا چہرہ ایک بھوکی بھیڑ کا۔ اتنے میں جگر گاڑی لے

آئے۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ نہ غم، نہ مسرت، نہ حیرانی۔ نہ دلچسپی۔ نہ وہ ادیبوں سے مرعوب تھے۔ نہ اُن سے بیزار نظر آتے تھے۔ جیسے کوئی خاص دلچسپی انہیں اُن لوگوں سے نہ تھی۔ اور پھر کوئی ایسی اجنبیت بھی نہ تھی۔ کچھ عجیب قسم کی لاتعلقی چہرہ پر عیاں تھی جسے دیکھ کر کرشن چندر اور بھی جھنجھلا گیا۔ اور اپنے چہرے کی بڑھی ہوئی داڑھی پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا۔ گویا جگر ہی نے اُس کا شیو کا سامان گم کیا تھا۔

جب سردار اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پر بیٹھے عریانی پر بحث کر رہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہاتھ میں لیکر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی اور بحث طویل ہوتی گئی۔ فراق حسن کار ہیں۔ اس لئے انہیں عُریانی سے اتنی نفرت نہیں۔ احتشام کی طبیعت میں نوجوانی کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بِدکتے نہیں۔ برافروختہ نہیں ہو جاتے صلواتیں سُنانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا اندازیہ تھا "میاں ابھی تم بچے ہو۔ کیا طفلانہ باتیں کر رہے ہو"! اُن کے ہشاش بشاش چہرے پر مُسکراہٹ کی لہر دوڑ دوڑ کے گم ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی داڑھی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم ہوتے ہیں۔ اور اپنے درشت اندازِ تکلم سے ہیڈ ماسٹر اور آگ بگولہ ہوتے وقت سو فیصدی کمیونسٹ نظر آتے ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقع پر کہتے ہیں یا غلط بات صحیح موقع پر کہتے ہیں یا صحیح بات صحیح موقع پر کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقعہ پر کہتے ہیں۔

چدر گھاٹ کالج میں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے طلبا کے مجمع میں اُن کے اُستادوں کو وہ ڈانٹ پلائی کہ بیچارے اب تک یاد کرتے ہوں گے اسی طرح P.E.N کانفرنس کے موقعہ پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلوپیڈسٹ کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکار بھی شامل تھے لیکن صرف ایک آدمی کی پر زور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہیں کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اُٹھ کر کہا۔ تجویز تو بہت معقول ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں۔ کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ رُوسو اور والیٹر۔ یہاں ایسا کون ادیب ہے، کون ایسا مفکر ہے آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈالکر کہا۔ مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اُس پائے کا نظر نہیں آتا۔ اُس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمع میں سے کسی من چلے نے پوچھا:۔

"اور کیا ڈائیس پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا!"

ڈائیس پر سروجنی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ جواہر لال نہرو تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن تھے۔ فارسٹر۔ اور ملک راج آنند، ہرمن اولڈ، اور احمد شاہ بخاری، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے ڈائس پر بھی نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا اور پھر مڑکر مجمع کو مخاطب کر کے کہا۔ "نہیں۔ ان میں بھی کوئی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔!"

تحریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدتِ احساس سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات ہمدرد بھی مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی انہیں کوئی پروا نہیں۔ وہ ادیبوں کے مہاتما گاندھی ہیں۔ لیکن ذرا عدم تشدد کے قائل نہیں۔ اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی فکری۔ ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگی۔ تو اس احتساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب کے ہی سپرد ہوگا۔ اُن کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ ان سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اسی میں اُن کی عظمت ہے اور اگر اس صنف میں کوئی اُن سے ٹکر لے سکتا ہے۔ تو وہ حسرت موہانی ہیں جو خوش قسمتی سے وہیں کانفرنس میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بلا ناغہ اس کے ہر اجلاس میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عُریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا۔ کہ شاید اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی اور اُن کی تخیلی مزرک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پُر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔ سبطے بیحد ناخوش تھا۔ کہنے لگا "اماں مولانا کا ہمیشہ سے یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے تو ہوم رول کے دنوں میں آزادی کا ذکر کر کے

کانگریس ہائی کمانڈ کو خالف کیا کرتے تھے۔ اور جب کانگریس نے لاہور کانگریس کے موقع پر مکمّل آزادی کی قرارداد منظور کر لی تو اپنے اشتراکیت کی بیخ لگادی اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو اب بیچارے شریف خاں بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اور مکمّل آزادی کا ریزولیوشن پاس کئے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ مصیبت میں ڈالتے ہیں یہ لوگوں کو۔ بھئی اب اچھا بھلا ریزولیوشن پاس ہو رہا تھا..... خیر... ہٹاؤ اب اس قصّے کو۔" یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔ اور اس کے چہرہ پر ہزاروں درد کی لکیریں یکایک معدوم ہو گئیں اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "مگر بھئی۔ یہ خوب ہیں مولانا۔ چٹان ہیں۔ بس کسی کی نہیں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔"

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی۔ ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کر کے کلب میں پہنچایا گیا۔ حالانکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمائش مقصود تھی کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ کوئی پچاس کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت پر اتنا صرف کیا گیا تھا کہ غالباً پریم چند کو اپنی زندگی میں اتنی رائلٹی نہ ملی ہو گی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے بعد اُسے پوچھا جاتا ہے چنانچہ آج پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار تقریر کر رہے تھے۔ اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ اور جھیل کے منظر سے ادیب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی شخصیت پر متانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان کی جبلی خوش طبعی اس متانت کے اندر سے جھلک نہ اُٹھے۔ متانت ہے لیکن بوجھل نہیں ہے، خوش طبعی ہے۔ لیکن کھُل کر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کس چیز نے، کسی خاص واقعہ نے یا کسی خاص ماحول نے ان کے ذہن کے، اُن کے فکر کے، اُن کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ وہ اس پر بھی مجبور ہیں۔ اُس پر بھی۔ دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پیرس کی رنگینی بھی ہے۔ عالمانہ زہد بھی ہے، شگفتہ انشاپردازی بھی ہے اور فکری ٹھہراؤ بھی، لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں حلم کی چاشنی، تیور جاگیردارانہ ہیں۔ اور ذہن باغیانہ، قاضی صاحب ایک ایسے نوجوان ہیں۔ جسے عرصے سے کسی نے گدگدایا نہ ہو۔ لیکن خود اُس کے اپنے دل میں شوخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں کاش کوئی مصنّف لیلہ کے خطوط کو گدگدا دے۔ اس طرح کہ وہ بھری محفل میں ـــــ یاروں کی محفل میں نہیں۔ ہزاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ گدگدی ایک بہت بڑے شاہکار کا پیش خیمہ ہو گی۔

کرشن چندر نے مسلم ضیائی سے پوچھا "بھئی تم شادی کیوں نہیں کرتے ہو اب تو تمہاری آنکھوں پر عینک بھی آ چکی ہے۔"

مسلم ضیائی نے اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے کہا "تم نہیں جانتے۔ آہ!"

"کون ہے وہ ظالم!" کرشن چندر نے پوچھا۔

"وہ ہر روز کانفرنس میں آتی ہے۔ آہ!"

گاڑی چار مینار کے گرد گھوم کر ایک گُل فروش کی دوکان پر کھڑی ہو گئی۔ مسلم ضیائی اُتر کر گجرے خریدنے لگے۔

"یہ گجرے کیا کرو گے؟"

"میں اُسے بھیجوں گا۔ اُسے یہ گجرے بہت پسند ہیں۔"

"آہ!" کرشن چندر نے کہا۔ "مجھے اپنی بیوی کیلئے چوڑیاں خریدنا ہیں۔ اور ایک مرادآبادی پاندان۔"

"واہ! یہ سب چیزیں تو قریب ہی کے بازار میں مل سکتی ہیں۔" مسلم ضیائی نے جواب دیا۔

"آہ!" کرشن نے کہا۔

قریب کے بازار سے سب چیزیں مول لیکر واپس ہوئے تو چار مینار کے قریب گاڑی روک کر ایک طرف کھڑی کر دی گئی۔ مینار پر گھڑی میں ابھی پانچ نہ بجے تھے۔ چاروں طرف سیٹیاں بج رہی تھیں۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اُتر کر۔ گھوڑا گاڑی والے گاڑی ٹھیرا کر۔ کار والے کار ایک طرف کر کے اور پیدل چلنے والے جہاں تھے وہیں رُک کر جامد و ساکت ہو گئے۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی تھی۔ خاموشی تھی۔ گہرا سناٹا اور مخلوق کے سر جھکے ہوئے تھے اور شیروانیوں کے بٹن گلے تک بند تھے۔ اور آنکھیں آسمان کی پہنائیوں کو چھوڑ کر زمین کی پتھریلی سطح پر جھکی ہوئی تھیں۔ اور پسینہ میں عرق عرق پیشانیاں کسی نظر نہ آنے والے خدا کے آستانے کی جبہ سائی کر رہی تھیں۔ یکایک کہیں سے ایک سیاہ موٹر گزر گئی۔ مینار کے

سامنے کھڑے ہوئے سپاہیوں نے سلامی اتاری، اور گاڑی بہت دُور چلی گئی اور یکایک مینار کے گھڑیال نے پانچ بجائے۔ اور یکایک جیسے ساری فضا کی خاموشی چھن سے ٹوٹ گئی۔ اور جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھ گئیں۔ اور موٹر اور سائیکل اور گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں۔ اور دکاندار گاہکوں کو سودا دینے لگے۔ اب پھر وہی شور و غل تھا۔ وہی ہاؤ ہو۔ وہی زندگی۔

"کیا ہوا تھا بھئی؟" کرشن چندر نے ایک چاؤش سے پوچھا جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

چاؤش نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اور اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ابھی سرکار کی سواری ادھر سے گزر گئی ہے۔ اندھے ہو کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟"

"چلو۔ چلو۔ گاڑی بڑھاؤ۔" مسلم ضیائی نے ٹیکسی والے سے کہا اور پھر مڑ کر کرشن چندر سے کہنے لگا۔

"یہ چاؤش آزاد عرب کے لوگ ہیں۔ ان سے" یا چاؤش "کہہ کے گفتگو کرنا چاہیئے۔" بھئی "کہنے کے نہیں۔ وہ تو یوں کہو۔ شریف چاؤش تھا۔ لڑا کا ہوتا تو ابھی اس بات پر تمہارے پیٹ میں چھری بھونک دیتا۔"

"یا چاؤش"! کرشن چندر نے گھبرا کر کہا "اب کہاں چلو گے"؟

"راجہ شامراج جی کے ہاں دعوت ہے۔ چھ بجے!"

راجہ شامراج کا محل۔ پُرانا محل۔ شہر میں واقع ہے۔ اونچی فصیل کے اندر ایک باغیچہ ہے۔ باغیچہ میں ایک مور ناچ رہا تھا۔ جب ادیب لوگ وہاں پہنچے تو دس بارہ موٹریں ایک طرف استقبال کیلئے کھڑی تھیں۔ راجہ صاحب غائب تھے۔ ادیبوں کو موٹر ڈرائیوروں۔ سپاہیوں اور راجہ صاحب کے مصاحبوں نے جھک کر سلام کیا۔ اور یہ بیچارے کچھ حیران، کچھ پریشان، کچھ پشیمان سے، محل کی سیڑھیوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔ "ادھر تشریف لایئے۔ ادھر لائبریری کی طرف" یہاں راجہ صاحب سے تعارف ہوا۔ بظاہر صدق و صفا کی مورت۔ دُبلے پتلے، پیشانی پر تلک، اتنی بڑی لائبریری۔ اتنی اچھی لائبریری، ہر موضوع پر کتابیں جنہیں غالباً آج تک کسی نے کھول کر پڑھا نہ تھا۔ بہت سی کتابوں کے ورق بھی کاٹے نہیں گئے تھے۔ پوری لائبریری میں صرف دو بچے پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے مجسمے تھے اور ایک سنگ مرمر کی کتاب کھولے ہوئے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اور نجانے کتنے سالوں سے اسی طرح جھکے ہوئے اس کتاب کے اِس صفحے کو پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے صفحے۔ یہ سنگ مرمر کے بت۔ یہ سنگ مرمر کے محل، لیکن ہم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیوں اس دیارِ غیر میں اجنبیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ گھر جو اپنا نہ تھا۔ جس کے ہر سنگ مرمر کی رگ کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سامنے مور ناچ رہا تھا۔ ایک کمرہ اشتراکیت کے موضوع سے متعلق تھا۔ یہاں ہزاروں کتابیں جمع تھیں۔ مصاحب ادیبوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے۔ گویا یہ تماشہ ہوں اور وہ تماشائی۔ اُن کی نظریں گویا کہہ رہی تھیں "تمہارے ایسے سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں اور دعوت کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم ادیبوں کو بُلاتے ہیں۔ اور سرکس والوں اور مداریوں کو۔ اور مسخروں کو۔ یہاں سیاح آتے ہیں۔ اور بھک منگے بھی۔ اور سیاست دان بھی۔ ہمارے راجہ صاحب سب کو دعوت پر بُلاتے ہیں۔

ہمارے راجہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ لیکن اُن کے اچھا ہونے سے آپ لوگ اچھے نہیں ہو سکتے۔ سردار صاحب آپ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ آپ کی شیروانی کا بٹن غائب ہے سبطے میاں۔ فردوس صاحب آپ نے یہ جھولا کیسے لٹکا رکھا ہے۔ مہندر بھائی آپ نے سر پہ یہ جنگل سا کیا اُگا رکھا ہے۔ کرشن چندر صاحب آپ کی پتلون پر دس پیوند ہیں۔ آپ لوگ یہاں کیا کھا کر ترقی پسندی کا دعویٰ کریں گے۔"

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

ایک صاحب جو غالباً راجہ صاحب کے وزیر معلوم ہوتے تھے بولے "سرکار کا عجائب گھر بھی دیکھیے گا۔" سرکار کا عجائب گھر اس وقت تو یہ سارا محل عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا جس میں نمونے کے طور پر ترقی پسند ادیب مختلف کمروں میں رکھ دیے گئے تھے۔ اس بالکونی میں سجاد ظہیر۔ ڈاکٹر تارا چند اور ملک راج آنند قید تھے۔ اس کمرے میں سردار اور عادل رشید۔ سبطے حسن اور رفعت سروش محبوس تھے۔ اس شیشے کی الماری کے قریب کرشن چندر، مدن گوپال اور فراق گورکھپوری ایستادہ تھے۔ فراق صاحب کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ اور اُن کی گول گول پتلیاں حیرت و استعجاب میں [illegible] کو ادھر اُدھر مجذوبانہ انداز میں تک رہی تھیں۔ ایں۔ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم دعوت کھانے

آئے ہیں یا اپنا خون پینے آئے ہیں۔

فراق بولے۔ بلند آواز میں "بھئی میں تو چلتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلے۔

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وزیر نے کہا "وہ راجہ صاحب کا عجائب گھر!"

"اچھا صاحب" فراق صاحب نے، رمان کر کہا "چلیئے! وہ بھی ہو جائے"

ایک کمرے میں پتھر کے بُت۔ ایک کمرے میں دیوتاؤں کے بُت۔ پتھر کے نہیں دھات کے۔ ایک کمرہ میں آصفیہ خاندان کے خطوط جو راجہ صاحب کے بزرگوں کو لکھے گئے تھے۔ راجہ صاحب کے بچوں کے خطوط جو انہوں نے اُردو میں لکھے تھے۔ یہ خط شاید اُردو سے محبت کے ثبوت میں تھے ایک کمرے میں مختلف تصاویر۔

وزیر نے کہا۔ "مجھے وہ تصویر بہت پسند ہے۔"

کوئی خاص بات اس تصویر میں نہ تھی۔ ایک خوبصورت عورت کی تصویر تھی۔ جس نے ایک سپید ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس طرح کہ ساڑھی کے اندر عورت تقریباً ننگی نظر آتی تھی۔ کمر کے خم میں گاگر لئے کھڑی تھی۔

"بے حد پسند ہے مجھے" وزیر کے ہونٹ کھُلے تھے۔ ہائے وہ موٹے موٹے کھُلے گھُلے بدصورت ہونٹ!

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

"میں جا رہا ہوں بھئی کرشن" فراق نے جھلا کے کہا۔

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وزیر نے گھبرا کے کہا "چائے پی کے جایئے"

"ہوں" فراق صاحب نے جھلّا کے کہا اور باغیچہ میں جا کے چائے پینے لگے۔

چائے پینے کے بعد راجہ صاحب کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں کا فوٹو کھینچا گیا۔ دائیں طرف سجاد ظہیر بائیں طرف کرشن چندر اور کرسیوں پر دوسرے ادیب اور بہت سے ادیب مصاحبوں کی طرح پیچھے کھڑے تھے۔ سردار اور سبطے اور دوسرے انقلابی ادیب۔

"میں حاضر ہوں سرکار" فوٹوگرافر نے کہا۔

راجہ صاحب نے اشارہ کیا۔ اور فوٹو لے لیا گیا۔

فراق کے بدن میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ لیکن اب فوٹو لے لیا گیا تھا۔ فوٹو بہت ضروری تھا۔ فوٹو سے راجہ صاحب کی ترقی پسندی تو کیا ظاہر ہوتی تھی۔ اپنی ذلت پسندی کی انتہا ہو گئی تھی۔ سردار نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا" سبطے بولا "انقلاب کے دوران میں جاگیردار ایسے ایسے کئی فوٹو پیش کر کے اپنے آپ کو اشتراکیت کا علمبردار ثابت کریں گے۔ اور ان باتوں سے کیا ہوتا ہے" قدوس صہبائی بولے "فوراً گردن ناپ دی جائے گی" "مگر ایسا ہوا کیوں؟" مدن گوپال چیخے "ہم یہاں آئے کیوں"۔

فراق بولے "اگر کوئی میرے ساتھ چلتا ہے تو چلے۔ ورنہ میں تو ابھی چلا"

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وزیر نے چلا کر کہا "پان اور عطر حاضر ہے"۔

سونے کا عطردان اور چاندی کا پاندان اور پان کھلا کے اور عطر لگا کے اور ہاتھ میں ایک گلدستہ تھما کے ادیبوں کو رخصت کر دیا گیا۔ چلتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے منہ پر تھوک دیا ہے۔ پیشانی پر کیچڑ مل دی ہے اور روح میں غلاظت کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہر شخص اُلو کا پٹھا معلوم ہو رہا تھا۔

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

واپس قیام گاہ پہنچ گئے۔ تو دیکھا سامنے صحن میں جگر حیدرآبادی کھڑے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ "کہیئے صاحب۔ راجہ صاحب کی دعوت سے فارغ ہو گئے"

اس کے بعد ہنسے۔ ہونٹ لال۔ مسوڑھے لال۔ دانت لال۔ زعفرانی رنگ چہرے پر یہ رستا ہوا سرخ زخم جی میں آیا گلا گھونٹ دیا جائے۔ سردار نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنے آپ پر بیجا جبر کر کے بولے۔ بندۂ خدا بتا تو دیا ہوتا۔ کہاں دعوت ہے۔ ہمیں کیا معلوم یہ شامراج رامراج جی کون ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے کوئی ادب نواز صاحب ہیں۔"

"ادب نواز تو وہ ہیں ورنہ آپ کو بُلاتے کیوں

"یہ تو ٹھیک ہے مگر ــــ مگر، یہ راجہ، یہ نواب، یہ یار جنگ بہادر، تم سمجھو گے نہیں" جگر گھوم گئے۔ مطبخ کی طرف جاتے ہوئے بولے "آپ کے لئے شام کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ شام کے کھانے سے پہلے اردو مجلس کے یہاں سے تمام مندوبین کو بلاوا آیا ہے۔ جانا ہو گا"

وہ مڑ کر گھوم گئے۔ فراق نے انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے بولے "یار دو عجب آدمی ہے۔ چوبیس گھنٹے سر پر سوار

رہتا ہے۔ جب دیکھو قیام گاہ میں حاضر ہے۔ یہ شخص سوتا نہیں۔ کھاتا نہیں۔ پیتا نہیں۔ جب دیکھو اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر گھومتا رہتا ہے۔ اسے کیا ہوا ہے؟"

اس کے بعد خود ہی حیران اور ششدر کھڑے رہ گئے۔ دیر کے بعد سبطے سے مخاطب ہوئے "کچھ سمجھ میں نہیں آتا — آؤ بھئی تمہیں کچھ رباعیاں سنائیں۔"

"آپ چلیے۔ میں ابھی آتا ہوں" سبطے نے کہا۔

بعد میں سبطے نے کرشن کو بھی گھسیٹنا چاہا۔ "چلو۔ رباعیاں سنو تم بھی۔ کمبخت رباعی بہت اچھی کہتا ہے۔"

عادل رشید پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولے "بہت بڑا شاعر ہے۔"

سبطے نے کہا۔ "اس کی شاعری ہندمسلمانی کلچر کی معراج ہے۔"

کرشن چندر نے کہا "میں نہیں جاؤں گا سننے اس وقت۔"

لہجے میں ضرورت سے زیادہ تلخی تھی۔ حسد اور رشک اور اک مجبور گرا ہوا۔ حریفانہ رقابت کہ ہائے میں شاعر کیوں نہیں۔ یہ ہر محفل میں شاعر کیوں چھا جاتا ہے۔ اور کیوں افسانہ سنتے ہی لوگوں کو جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ کاش میرا افسانہ فراق کی رباعی کی طرح خوبصورت ہوتا......

(۷)

شام اور رات کے بیچ کے وقفے کی دھندلی اُداسی ادیبوں کی پھیکی پھیکی، اکتائی ہوئی، تھکی ہوئی صورتیں میرزا فرحت اللہ بیگ کے وسیع و عریض برآمدے کے باہر بطخوں کا بے ہنگم خرام۔ اردو مجلس میں چائے اور مشاعرے کا بندوبست۔ شاعروں کی آوازیں اور چینی کے پیالوں میں چلتے ہوئے چمچے اور سرکیوں کے پیچھے پردہ پوش خواتین کی کڑی تنقید۔

"ہائیں۔ یہ کرشن چندر ہیں"

"کون وہ ٹھنگنے سے...... اری وہ"

"کرشن چندر نہیں چند چندر معلوم ہوتے ہیں"

قہقہہ۔

کرشن چندر کا کھانسنا۔ وہ کھانسی گویا کہہ رہی ہو۔ دیکھیے۔ ہم بھی سن رہے ہیں۔

عادل رشید اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا میر مشاعرہ وہی تھے۔

قدوس صہبائی۔ گویا ابھی چوتھے درویش کی سرگزشت سنا کے ستا رہے ہوں۔

فضا میں اُجلے پن کے باوجود تیرگی۔ عرصۂ زماں میں حال کے باوجود ماضی کا دھندلکا۔ محبت کے باوجود اک کربناک کھنچاؤ جیسے رگیں ٹوٹ رہی ہوں۔ جیسے دو زمانے۔ دو نسلیں اور دو زاویہ ہائے نگاہ ایک دوسرے کے قریب آنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے اندھیرا جا رہا ہو اور ماضی مستقبل میں۔ اور موت، زندگی میں اپنا عکس ڈھونڈ رہی ہو۔

کیفی نے اپنی نظم مرثیہ خوانوں کے انداز میں سنائی۔

خاموشی۔ گہرا سناٹا۔

ایک پیر و مرشد نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "آپ شاعر ہیں۔"

پھر خاموشی۔ لوگ اس جملے کی اہمیت پر غور کر رہے ہیں۔

سب مؤدب بیٹھے ہوئے ہیں گویا کسی ایٹم بم کا انتظار کر رہے ہیں۔

پھر کسی نے کہا۔ مرزا صاحب آپ کچھ سنائیے۔

مرزا صاحب سنانے لگے۔ "جمنا کا کنارہ"

سرکیوں کے پیچھے کسی نے کہا "کنارہ نہیں کنارہ کہیے۔"

تہذیب اور کلچر موت کے زہراب میں گرفتار ہوں۔ لیکن گرامر نہیں بدل سکتی۔ زندگی بدل جائے۔ لیکن زبان کی ہیئت نہیں بدل سکتی۔ زمان و مکان میں تغیر کی نمو ہو سکتی ہے۔ ملک و ملت اور افراد و کردار کی ہیئت میں، اطوار و گفتار میں، ان کی سماجی، سیاسی، شعوری زندگی میں انقلاب آسکتا ہے۔ لیکن زبان میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ وہ موت کی طرح اور خدا کے آخری حکم کی طرح قطعی ہے۔

اے لسانی مقابر کو پوجنے والی مخلوق، سر جھکائے مؤدب بیٹھی رہ۔ اس کی فکر نہ کر کہ سر سے طوفان گزرا جا رہا ہے۔ قائزر کی بیش قیمت چائے دانیوں سے ابلتی ہوئی چائے انڈیل۔ صحن میں آہستہ خرام، کڑکڑاتی ہوئی بدصورت بطخوں کو دیکھ اور سن۔ جمنا کا کنارہ...... نہیں...... نہیں...... جمنا کا کنارہ...... معاف کیجیے گا۔

کرشن چندر نے جھک کر نظر کے کان میں کہا "خودکشی کیلئے کونسی جگہ بہتر رہے گی۔"

نظر نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا "ایکاجی کا ہوٹل"

"تو چلو پھر دیں۔"

آخر کانفرنس ختم ہو گئی۔ سبطے نے فنِ صحافت پر اپنا مقالہ بھی پڑھ لیا۔ کسی شخص نے اُسے ٹوکا نہیں۔ سردار نے اقبال کے رجعت پسند نقادوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں چھُرا نہیں بھونکا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اُردو کا شجرۂ نسب دو ہزار سال کے پُرانے ہندوستان کی تہذیب سے جا ملایا۔ کسی ہندو مہاسبھائی نے اُف تک نہ کی۔ لیکن جب کانفرنس ختم ہونے کے بعد مخدوم نے آہستہ سے کہا۔ "بھئی۔ وُہ ریلوے کے مزدور تم لوگوں کو اپنے جلسے میں بُلانا چاہتے ہیں۔" تو بہت سے لوگ زکام اور ہیضہ اور بخار سے بیمار پڑ گئے۔ جگر صاحب نے بڑی مستعدی سے لوگوں کے بستر باندھنا شروع کر دیئے۔ کچھ لوگ بازار میں خرید و فروخت کرنے کیلئے چلے گئے۔ کچھ لوگ بی، ای، این کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے اسٹیشن سے جے پور کے ٹکٹ لانے کے لئے چلے گئے۔ کچھ لوگ بیمار بن کر بستر پر دراز ہو گئے۔ مزدوروں کے جلسے کیلئے صرف کیفی، سردار اور ساحر پہنچے۔

مخدوم نے تعارف کرایا۔ یہ کیفی ہیں

انقلاب زندہ باد

یہ سردار ہیں —— انقلاب زندہ باد

یہ ساحر لدھیانوی ہیں

انقلاب زندہ باد

سٹیشنوں پر کام کرنے والے لوگ، سانولے کالے لوگ، موٹے موٹے چہروں کھُردرے ہاتھ پاؤں والے لوگ، بدصورت لوگ۔ غلیظ لباس پہننے والے لوگ۔ بُرا کھانا کھانے والے لوگ۔ لوگ جو نہ "واللہ" کہہ سکتے تھے۔ نہ "مکرر ارشاد"۔ نہ "ہیئے کیا شعر ہُوا ہے"۔ لوگ جن کے آداب ان کی زندگیوں کی طرح کھُردرے تھے۔ اُن کے لباس کی طرح وحشی تھے۔ اور اُن کے اعتقاد کی طرح مضبوط تھے۔ یہ لوگ خوبصورت الفاظ میں شاعروں کی تعریف نہیں کر سکتے تھے۔ یہ لوگ جو خاموش تھے۔ اور سُن رہے تھے۔ اور مکرر ارشاد نہ کہنے کے باوجود اُن کے چہروں کی آب اور اُن کی آنکھوں کی چمک، اور اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گویا کہہ رہی تھی۔ ہم خوش ہیں۔ کیونکہ تم ہمارے ہو۔ ہم میں سے ایک ہو۔ ہماری خوشیوں اور غمیوں کے گیت گاتے ہو۔ اور اپنے الفاظ کی حسین تصویروں میں ہمارے دُکھ کا مداوا ڈھونڈتے ہو۔ تم ہماری برادری میں سے ہو۔ اُن انسانوں کی عظیم برادری میں سے جہاں کسی انسان کا حق دوسرے انسان کے حق پر فائق نہیں سمجھا جاتا۔ آؤ۔ آؤ۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے۔ خاموش کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اور بھینچی مضبوط مٹھیوں سے۔ خوش آمدید ساتھیو۔ اب تک تم ویرانے میں گھومتے رہے۔ آج تم گھر میں آئے ہو۔ ہمارے پاس حریری پردے نہیں ننگی دیواریں ہیں۔ سونے کے پلنگ نہیں۔ پتھر کا فرش ہے۔ ہماری جیبیں خالی ہیں۔ لیکن دل آنسوؤں سے معمور ہیں۔ محبت کے آنسو۔ شفقت کے آنسو۔ رفاقت کے آنسو! .... آؤ .... آؤ ...... ساتھیو!

ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھر آئیں اور وُہ شعر کہتے کہتے رُک گیا۔ اور اس کی نمناک آنکھوں میں جیسے سارا مجمع ناچ گیا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہُوا جیسے وُہ اپنے گھر میں بیٹھا ہُوا اپنے عزیزوں سے گلے مل رہا ہو۔ یہ اس کی ماں تھی۔ یہ بھائی۔ یہ بہن۔ یہ بچپن کا محبوب ساتھی ...... آؤ ...... آؤ ..... ساتھیو!

اب وُہ لوگ فارغ ہو کر حیدر آباد کے سٹیشن پر پہنچ گئے تھے ریلوے کے مزدوروں نے تھرڈ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ اُن کے لئے وقف کرا دیا تھا۔ تاکہ انہیں دورانِ سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب اِس کمرے میں اُن کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم تھرڈ کلاس کی مخلوق سے اٹا ہُوا تھا۔ اور غلیظ بستروں اور زنگ آلود سیاہ ٹرنکوں۔ بدبودار ٹوکروں اور کھانچیوں سے ایک غلیظ مال گودام کی صورت میں مبدل ہو چکا تھا۔ جالی والی ٹوکریوں میں مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں اور اُن کے قریب سیاہ فام گھاٹنیں اپنے کمر کے گرد لپٹی ہوئی مرہٹی ساڑھی کے پلّو سے جوئیں چُننے میں مصرُوف تھیں۔ اتنے میں زور سے ایک موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آئی۔ اور ایک سیاہ رنگ سیڈان سٹیشن کے پلیٹ فارم پر جہاں موٹر گاڑیوں کا آنا ممنوع ہے چلتی ہوئی دکھائی دی۔ پوں۔ پوں۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔ پوں۔ پوں ...... پولیس کے آدمی ہنٹر لئے ہوئے لوگوں کو پرے ہٹانے لگے۔ قُلی اسباب راستے سے اُٹھانے لگے۔ راستہ صاف ہو گیا۔ پوں پوں۔ موٹر پلیٹ فارم پر چلتی گئی اور آخر رُک کر ایسے ڈبے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جو کسی بڑے آدمی کا سپیشل سیلون معلوم ہوتا تھا۔

کار میں سے پہلے سنہری وردی میں ملبوس ایک اردلی اترا۔ پھر اس نے کار کے دروازے کا پٹ کھولا اور جب تک پولیس کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا اور پھر کوئی کچھ نہ دیکھ سکا کہ کیا ہے۔

"کیا ہے"۔ ایک نے پوچھا۔

"سر سلطان بالقابہ کا سپیشل سیلون ہے۔"

"سر سلطان احمد جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں؟"

"جی ہاں وہی"

"یہاں حیدر آباد میں کیا کرنے آئے تھے؟

"آپ کس عزیز کی شادی میں یہاں آئے تھے۔ وہ دلہن کمپارٹمنٹ ہے اور یہ باہر کیا رکھا ہوا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ یہ جہیز کا سامان ہی تو ہے۔

مُرغی کے بدبودار ٹوکروں۔ اور غلیظ جام سے بھرے ہوئے کھانچیوں اور زنگ آلود ٹرنکوں سے نظریں پھسلتی ہوئی اُس سازو سامان پر پڑیں۔ جہاں چاندی کے برتن پڑے تھے۔ اور اخروٹ کی بیش قیمت چیزیں اور رو پہلے پایوں والے پلنگ۔ اور صراحیاں جن پر طلائی آب و رنگ تھا اور پھر نظریں وہاں سے پھسلتی ہوئی جوئیں چُنتی ہوئی مٹیالی کالی سنولی غلیظ گھاٹنوں کے جسموں کو انداز تنفر دیکھتی ہوئی اُس کھڑکی کے باہر جاکر رُک گئیں۔ جہاں ریشمی پردہ لہرا رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ ریشمی پردہ کہہ رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ یہ ریشم کی دیوار ہے۔ اس دیوار کے ادھر تمہاری دنیا ہے۔ غریبی کی کیچڑ میں کلبلاتی ہوئی مخلوق، ریشم کی دیوار کے اُس طرف دوسری دُنیا ہے۔ جس کی ہر سانس میں آسودہ تعیّش کا تعطر ہے۔ ہر تبسم میں کامران امنگوں کی شراب ہے۔ ہر لے میں فتح کا مغرور نغمہ ہے اور ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں ایک پتلی شفاف سی ریشم کی دیوار ہے۔ اتنی پتلی اور ایسی شفاف کہ لوگ آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ اس دُنیا کے لوگ اُس دُنیا کے لوگوں کو اور اُس دنیا کے لوگ اِس دنیا کے لوگوں کو اجنبی نگاہوں سے۔ دشمن نگاہوں۔ نفرت کی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ تک رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ ڈر رہے ہیں لیکن کوئی اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر نہیں آتا۔ کوئی اس پتلے شفاف سے پردے کو ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے چاک کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

آؤ۔ آؤ۔ ساتھیو۔ دیکھو یہ سر سلطان احمد کا سپیشل سیلون ہے۔

وہ تمہارا تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ یہ اُن کا سنہری وردی میں ملبوس بیرا ہے وہ پھٹے ہوئے کالروں والا علی سردار جعفری ہے۔ یہ اخروٹ کا میز ہے۔ جس پر کشمیر کے کاریگروں نے حسین پچی کاری کی ہے۔ وہ رفعت سروش کا بستر ہے۔ جس میں درجنوں پیوند لگے ہیں۔ یہ طلائی صراحی ہے۔ وہ تانبے کا لوٹا ہے۔ یہ کمخواب کی رضائی ہے۔ وہ کھدر کی اوڑھنی ہے۔

یہ موت ہے۔　　وہ زندگی ہے

یہ ماضی ہے　　وہ مستقبل ہے

یہ اندھیرا ہے　　وہ اُجالا ہے

دیکھو دیکھو۔ وہ دیوار ٹوٹ گئی۔ موت زندگی سے، ماضی مستقبل اور رات سحر سے گلے مل رہی ہے۔ لیکن نہیں دیوار کہاں ٹوٹی ہے۔ یہ تو گاڑی چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ الوداع کہہ رہے ہیں۔ مسلم ضیائی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ابراہیم جلیس کے رخساروں کے گڑھے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ نظر کے بال اور بکھر گئے ہیں۔ اور شبّر جائمی کی محبوب نگاہیں کہہ رہی ہیں۔

"ہم شرمندہ ہیں۔ بیحد شرمندہ ہیں۔ نجانے کیوں"

گاڑی چل رہی ہے۔

جگر صاحب ہاتھ ہلا کر جلیس سے کہہ رہے ہیں۔ "میں بہت جلد گاؤں سے لوٹ آؤں گا۔ اور چھوٹی بہن کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ضرور لیتا آؤں گا۔ فکر نہ کرنا۔ اچھا ہے۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تھوڑی دور ساتھ رہے گا۔ میرا خیال ہے اب وہ اچھی ہو گئی ہو گی چھوٹی بہن . . . . "

گاڑی چل رہی ہے۔

سورج ڈوبتا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب گیا۔

حیدر آباد غائب ہو گیا۔

گاڑی پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ گویا ان بھک منگوں کا منہ چڑا رہی تھی جو پلیٹ فارم کے کنارے کنارے اور بعد میں ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے بھاگ رہے تھے۔ سگنل مینوں کے کیبن سور کے چھوٹے چھوٹے ڈربوں کی طرح سطح زمین سے اوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی آگے چلی جا رہی تھی لیکن

انجن نے ابھی اپنی رفتار تیز نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی گودام سے
کوئلہ اور نل سے پانی لے کر فارغ ہوا تھا اور ایک تازہ دم حُقّے کی طرح
گڑگڑا رہا تھا۔ بھکاری چلا رہے تھے۔ بابو۔ صاحب۔ پیسہ۔ بابو صاحب
پیسہ۔ گاڑی شہر سے باہر میدان میں آگئی تھی۔ سٹیشن کی عمارت بہت دُور
پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب یہاں سطح مرتفع پر گارے کی بنی ہوئی جھونپڑیاں
نظر آتی تھیں۔ اُن پر کھپریل کی چھت تھی۔ سوکھیا کی ماری ہوئی بھینسیں
میدان میں کھڑی جگالی کر رہی تھیں۔ اور سورنیاں اور سور آس پاس چر
رہے تھے۔ اور اتنی دُور سے وہ بھی بھینس کے بچے معلوم ہوتے تھے۔
جوہڑوں میں بدبودار غلیظ گہرا سبز پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں گھاٹیوں
میں لوگ رفع حاجت کے لئے گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ بھک
منگوں کی آواز بار بار کانوں میں آ رہی تھی۔ بابو، صاحب پیسہ۔ بدھ کے
وقت میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ یہی غلیظ جوہڑ۔ یہی گارے کی جھونپڑیاں
یہی بھک منگے، اشوک کے عہد میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ اکبر کے عہد میں
بھی یہی۔ اور آج دو سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح
گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔

آئے۔ آئے۔ کہیں سے آئے۔ وہ زندگی کی بیدار افق۔ اس ساکن
منجمد بے حس دُنیا میں۔ اس گہری اتھاہ تیرگی میں آئے۔ کہیں سے آئے
وہ نور کی کرن وہ صبح کی سُرخ لکیر، محبوب کے پائیل کی ناچتی ہوئی آواز
آئے کہیں سے آئے۔ اور تاروں بھری افشاں کی طرح چمک کر ہندوستان
کے ماتھے پر جگمگائے ....

پھر گاڑی تیز چلنے لگی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ تاریکیاں شبنمی لبادے
اوڑھ کر چاروں طرف چھا گئیں۔ دل کسی نامعلوم خوف اور اُداسی سے
معمور ہو گئے۔ سب چُپ تھے۔ صرف جگر اک ملتجیانہ تبسم سے ادیبوں کی طرف
دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔"

سب خاموش رہے۔

"میری بہن بیمار ہے۔"

کوئی نہیں بولا۔

"مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت ہے۔ مجھے اپنے گھر میں بہن ہی سب سے
پیاری ہے۔ ہماری ایک ہی بہن ہے۔ اور ایک عرصے سے بیمار ہے۔ لیکن
میں اُسے چند وجوہات سے اب تک حیدرآباد نہ لا سکا"

چُپ چاپ . . . گاڑی چلتی رہی۔

"میں اُسے حیدرآباد لے آؤں گا۔ ڈاکٹر اجنگیا سے اُس کا علاج
کراؤں گا۔ ڈاکٹر نائیڈو کو بھی دکھاؤں گا۔ میں نے دو سو روپیہ اس کی بیماری
کے علاج کیلئے بچا کے رکھا ہے۔

ہم دونوں کچے امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ میں اس کے لئے لچھمن کے
گھر سے املی چُرا کے لایا کرتا تھا۔ اُسے میٹھے بیر بہت پسند ہیں ......"

وہ اپنی یادوں میں کھو گیا۔ سب لوگ چپ رہے۔

ہولے ہولے کیفی گنگنانے لگا۔ اپنی محزوں محبت کا گیت۔ وہ
گیت جس میں اُس نے اپنے کھانستے ہوئے سینے کی آرزوئیں اپنی اندر دھنسی
ہوئی آنکھوں کا نور اور اپنے زرد چہرے کی حسرتوں کی راکھ کوٹ کوٹ کر بھر
دی تھی۔ وہ ہولے ہولے گا رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے دل کے بچے کو لوری دے
رہا ہو۔ وہ خود اپنے لئے گا رہا تھا۔ صرف اپنے لئے۔ لیکن اُس ڈبے میں کون
تھا جس نے اُس گیت کو اپنے لئے نہیں سمجھا۔ اس کے ہر شعر میں، ہر مصرعے
میں، ہر لفظ میں، اپنے عشق کی جھلک، اپنی ناکامی کی تصویر اور اپنے محبوب
کی تنویر نظر نہیں آئی۔ جیسے تصور میں کوئی مسکرا اٹھا۔ کسی نے انگڑائی لی۔
کہیں سے پائیل بج اٹھی اور پھر نغمہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا......

اک گرانبار افسردگی بوجھل غبار بن کر سانس روکنے لگی اور پھر ساحر اپنے
چیچک زدہ چہرے کے داغوں کو سہلاتا ہوا اپنی سیٹ پر جھک گیا۔ اور
اپنے ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے ان نغموں کا ذکر کرنے لگا۔ جو اُس نے اپنے محبوب
کے پیار کی خاطر لکھے تھے۔ وہ نغمے جنکی پہنائیوں میں اُس کی زندگی کی بہاروں
کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اور جس کے زعفران رنگ کھیتوں میں اُس کی مست
آرزوؤں کی مہک تھی۔ ہولے ہولے، آہستہ آہستہ، شرماتے ہوئے، مجرمانہ
انداز میں وہ گا رہا تھا۔ گاڑی جتنی تیز تھی گیت اتنا ہی ہولے تھا۔ کہیں کوئی
سُن نہ لے اُس کے پیار کا گیت۔ اس کی محبت کی شکست، اس کی زندگی کی موت،
لیکن کون اس وقت ساحر نہ تھا۔ یہ نغمے کس نے بازار میں نہ بیچے تھے۔ کس نے
کیفی کی طرح اپنے سینے پر غم کی بھاری سل نہ باندھی تھی جس کے بوجھ سے
سینہ یوں چور چور ہو گیا تھا۔ کس نے غم جاناں کی منزل سے گذر کر غم دوراں

کو اپنایا نہ تھا۔ کون تھا جو زخمی نہ رہ چکا تھا۔ محزوں نہ رہ چکا تھا۔ شکستہ دل نہ رہ چکا تھا......

یکایک سبطے نے آہستہ سے کہا۔ آہستہ سے جیسے وہ اپنے الفاظ کو چوم رہا ہو۔ "وہ ہر روز سٹیشن پر ملنے آیا کرتی تھی ......" پھر چپ ہو گیا — سب یادوں میں کھو گئے۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مگر شاید سینکڑوں ۔ ہزاروں ۔ لاکھوں ۔ کروڑوں آدمی ایک خاموش گویائی کے طلسم سے مجبور ہو کر وہاں بیان کر رہے تھے۔ اپنا نوحہ ۔ اپنی مسرتیں ۔ اپنی آرزوئیں ۔ اپنی حسرتیں جو وہ تھے ۔ جو وہ بننا چاہتے تھے، سپنے جو ادھورے رہ گئے۔ خوبصورتی جسے ہونٹ چوم نہ سکے۔ کسی گم شدہ ماضی کی حسرت، کسی نامعلوم مستقبل کی آرزو اور پھر کشمکش حیات کا دہکتا ہوا شعلہ، تھا۔ اب بھی ہے ۔ اب ہوگا۔ ضرور ہوگا...... ضرور......

سب یادوں میں کھو گئے ۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سپنے دیکھنے لگے۔

(۹)

یکایک کرشن چندر کی آنکھ کھلی ۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ جگر صاحب بستر لپیٹ رہے تھے ۔ اور سٹیشن پر جانے والے تھے۔ بستر لپیٹ کر انہوں نے سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا اور یکایک کرشن چندر پر اُن کی نظر پڑ گئی۔ اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں۔

"جگر" کرشن چندر نے کہا۔

جگر نے منہ موڑتے ہوئے کہا —" چھوٹی بہن مر گئی"

کسی نے کرشن چندر کا دل پکڑ لیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

"میری چھوٹی بہن مر گئی ہے۔ اب میں اُسے گاؤں سے لانے جا رہا ہوں۔ میں نے اُس کے علاج کیلئے دو سو روپے بچاتے ہیں۔" اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ اور اس کے لہجے میں نیم دیوانگی تھی۔

وہ چپ چاپ سٹیشن پر اُتر گیا۔ پلیٹ فارم پر اُس کے عزیز کھڑے تھے۔ یکایک ایک سنہری وردی میں ملبوس اردلی وہاں سے گذرا ۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اور وہ سر سلطان احمد کے سپیشل سیلون کی طرف جا رہا تھا۔ جگر نے جلدی میں اُس سے ٹھوکر کھائی ۔ اور تھوڑا سا دودھ چھلک کر باہر گر گیا۔

"دیکھ کر نہیں چلتے ہیں آپ؟" اردلی نے چنگھاڑ کر کہا۔

گاڑی نے سیٹی دی۔

جگر نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "خدا حافظ"

کرشن چندر اُسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔ گاڑی چلنے لگی۔

ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے قریب سیٹ پر بیٹھے تھے۔ کرشن چندر نے آہستہ سے کہا "ساحر — ساحر"

ساحر نے اُسی طرح لیٹے لیٹے کہا "میں خوب جانتا ہوں اس شخص کو — یہ ابراہیم جلیس کا بھائی ہے"

کرشن چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا —" تم جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مر گئی ہے"

"ہاں میں سن رہا تھا" ساحر نے نپے تلے لہجے میں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتا تھا کہا" میں جانتا ہوں ۔ اس کی بہن مر گئی ہے ۔ اس کی ایک ہی بہن تھی ۔ سارے گھر میں اُسے وہی سب سے پیاری تھی ۔ لیکن اتنی محبت کے باوجود وہ اُس کا علاج اب تک حیدرآباد میں نہ کرا سکا ۔ کیونکہ اب تک وہ دو سو روپے اکٹھے نہ کر سکا تھا"

"مگر" — کرشن چندر نے کہنا چاہا ۔ لیکن ساحر نے اُسے بولنے نہیں دیا۔

" اور جب اس نے دو سو روپے اکٹھے کر لئے تو یہ کانفرنس آ گئی اور اس نے یہ روپے کانفرنس کے لئے دیدیے۔ اور اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہر جگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا ۔ کسانوں سے ۔ مزدوروں سے ۔ طلباء سے غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا تاکہ کلچر زندہ رہے ۔ اس کی بہن مر جائے۔ لیکن تہذیب زندہ رہے ۔ تمدن زندہ رہے ۔ فنکار کا خیال زندہ رہے ۔ اس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دے دے ۔ لیکن کتاب زندہ رہے ۔ زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے۔ اس کی پیاری پیاری، املی کھانے والی، امرود توڑ توڑ کر چرا کر کھانے والی۔ اس کے بچپن کی ساتھی بہن مر جائے ۔ لیکن کالیداس زندہ رہے ۔ غالب زندہ رہے اقبال زندہ رہے ۔ پریم چند زندہ رہے ۔ موت اس کی بہن کے ہونٹوں کو یخ بستہ کر دے اور اس کی آنکھوں کو بے نور کر دے لیکن زندگی اور اس کا زندہ ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان سے لاکھوں

دلوں کو روشن کر دے "

"مگر......" کرشن نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ساحر اب بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ بہت سے ادیب جاگ اُٹھے تھے۔

" کانفرنس کامیاب رہی مگر اس کی بہن مرگئی۔ کانفرنس کے دوران میں جگر کو اپنی بہن کی شدید علالت کے تین تار آئے۔ لیکن وُہ اُسے لانے نہیں گیا۔ چپ چاپ کانفرنس کا کام کرتا رہا۔ جب پہلا تار آیا تو اُس روز تم اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ جب دوسرا تار آیا اُس روز تم پریم چند سوسائیٹی کے مہمان ہو کر ڈنر کھا رہے تھے۔ جب تیسرا تار آیا تھا۔ تم لوگ راجہ شاہراج کے ہاں مدعو تھے۔"

"ساحر" کرشن چندر زور سے چلایا۔ جیسے کسی نے اس کے دل میں آہنی کیل گاڑ دی ہو۔ اور پھر جیسے اُس کیل سے لہُو کی سُرخ دھار پھوٹ نکلی کسی نے جان سے پیاری ہمشیرہ کی زندگی کا لہو دے کر ادب کو زندہ کر دیا تھا۔ لہو چاروں طرف بہہ رہا تھا اور اس میں طلائی صراحیاں اور اخروٹ کے میز اور نقرئی پلنگ ڈوب رہے تھے۔ حریری پردے سرک گئے تھے۔ اور وُہ دیوار ٹوٹ گئی تھی۔ جس نے انسان اور انسان کے مابین امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ چاروں مینار سرنگوں تھے۔ اور تیز دوڑتی ہوئی سیاہ سیڈان سیاہ فام گھاٹنوں کے آگے سربسجود تھی، وُہ لوگ اکیلے تھے۔ کمینے تھے۔ احساس کمتری اور خود غرضی کے شکار تھے لیکن سب مل کے وُہ جیسے کچھ اور ہو گئے تھے۔ کسی نئی ہمت، کسی نئی قوت، کسی نئی عظمت سے سرشار ہو گئے تھے۔ جیسے مِلکے ان کی برائیاں دب گئی تھیں۔ اور اچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ ساحر اب چُپ تھا۔ لیکن اس کا سینہ کسی انجان طوفان سے رستاخیز تھا۔ اُس نے انکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں پُرنم نہ ہوں پُرنم اور دور۔ بہت دور جیسے وُہ ماضی اور حال اور مستقبل کے پرے جا کر بھی کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ کچھ پا رہی ہوں۔

وامق آہستہ سے گانے لگا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال

بھوکا ہے بنگال

رے ساتھی

یہ بھوکے بنگال کا گیت تھا۔ اداس دلوں کا گیت تھا۔ مرتی ہوئی روحوں کا گیت تھا۔ لیکن اس وقت نجانے اس گیت میں کونسی طاقت آگئی تھی۔ کہ یہ گیت موت کا گیت نہیں زندگی کا نغمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لَے میں اداسی کی جھلک نہیں اک کامران تبسّم کی رَوشنی تھی۔ اس کی پہنائی میں یاس و حسرت نہیں اک پُرامید للکار کی گونج سُنائی دیتی تھی۔ جیسے اس گیت کا سویا سویا مدھم نوحہ کسی کے خون سے جاگ اُٹھا تھا۔ اور اک بے خطر بغاوتی طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے

ڈگ... ڈگ...... ڈگ..... ڈگی باج رہی تھی۔ پورب دیس ہی میں نہیں۔ پورب۔ اُتر۔ دکھن۔ پچھم۔ ہندوستان کی چاروں کھونٹوں میں یہ ڈگی باج رہی تھی۔ ہندوستان کا وُہ کون گوشہ ہے جو بنگال نہیں!

وامق کے گاتے گاتے یکایک وُہ سب ایکدم اکٹھے پوری قوت سے گانے لگے۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی

بھوکا ہے بنگال

رے ساتھی

ساتھی۔ یہ ڈگی سن لے۔ یہ خطرے کی ڈگی... اک غیر مختتم للکار۔ اک مبہم پیکار۔ آؤ۔ آؤ۔ ساتھی

ساتھی جو بھوکے تھے ساتھی۔ جو مدقوق تھے، ساتھی جو جیل کی سختیوں کے آثار لئے ہوئے تھے۔ ساتھی جو لِتھڑی ہوئی ناکام آرزوؤں کے مزار تھے۔ ساتھی جو درد کی تفسیر تھے اب یکایک اُٹھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اور اپنی روح کی پوری قوت سے گانے لگے۔ خود ہی گا رہے تھے اور خود ہی سُن رہے تھے۔ اک نیا گیت، اک نیا خیال، اک نئی آواز، اک نیا تبسّم۔ جیسے ادھ کِھلی کلی یکایک کچھ سوچ کے مُسکرا اُٹھے......

باہر گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔ اندر سکون تھا۔ باہر چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن گاڑی کے اندر روشنی تھی۔ باہر راستہ تاریک اور دشوار گزار تھا۔ لیکن اندر منزل معلوم ہو چکی تھی ؎

اختر حسین رائے پوری

کافرستان کی شہزادی!

(افغانستان کے مشرق کی طرف ایک علاقہ ہے جو پہلے کافرستان کہلاتا تھا۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ یہاں کے باشندے مسلمان ہوئے اور اب یہ صوبہ نورستان کہلانے لگا۔ اسی علاقہ کا ایک کونہ چترال ریاست میں دھنس آیا ہے اور وادیٔ بمبریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مجھے تین سال پہلے چترال جانے اور چند روز اس وادی میں گزارنے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ افسانہ انہیں ایام کی یادگار ہے۔ افسانہ کے کردار اصلی مگر واقعات فرضی ہیں۔)

الاؤ کی آگ سسکتی سنستاتی اور چٹختی ہوئی اوپر لپکی اور اس کی چنگاریاں جگنوؤں کی طرح ہرے بھرے پیڑوں میں چمکنے اور بجھنے لگیں جب لکڑی کے سب کندلے آگ کی گرفت میں آ گئے۔ تو ایک آتش بینار ننگے میدان کی کوکھ سے نکل کر تن گیا۔ اور یوں بلند ہوتا گیا گویا زمین کے اندر سے کوئی اسے اوپر دھکیل رہا ہو۔ گھنے گھنے چناروں کے جھرمٹ کو چیر کر اس کی تمتمائی ہوئی آنچ دور دور پھیل گئی۔ اور اس سے بھی بہت دور اس نقارہ کی ہیم چیخ پھیلتی گئی جیسے دو نوجوان مارخور کے سینگوں سے پیٹ رہے تھے وہ چیخ ہندوکش کی اونچی اونچی چوٹیوں سے ٹکرا کر ہر طرف بکھر گئی۔ وہ چوٹیاں جو کافرستان کی اس حسین وادیٔ بمبریت کے چاروں طرف زنجیر کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ پہاڑی نالا اپنے پانی کی صفائی پر اتراتا ہوا ایک بے معنی شور مچاتا اپنی راہ بہاجا رہا تھا۔

برف پوش پہاڑ جنہوں نے چوٹیوں نے دھوپ کا منہ کبھی نہ دیکھا تھا ملگجی سی چاندنی میں جاگ کر اپنے اردگرد لہلہاتی ہوئی بہار کو پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بہار جس کا جادو رات کو بھی نہ سویا تھا۔ اور جس کی آواز پر چیڑ اور دیودار کے پیڑ اپنے کھردرے بدن میں سے نئی نئی پتیاں نکال رہے تھے۔

مسافر الاؤ سے ہٹ کر چنار کے نیچے کمبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھا رہا بے نور چاند کو اس نے شب قدر کی برفانی چوٹی پر یوں اٹکا ہوا پایا گویا اسے سولی پر ٹانگ دیا گیا ہو۔ اور چھاگلوں کی جھنکار پر اسے جنگلی پریوں کے ناچ کا گمان ہوا۔

ایک ایک دو دو کر کے کافر زن و مرد آتے گئے۔ اور ایک پہر رات بیتے اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ مرد اونی لبادہ میں ملبوس ہاتھ میں بلم یا پھالا لئے ہوئے۔ عورتوں کے لبادے کمر پر پٹکے سے کسے ہوئے اور ان کے سر اونی رومالوں سے ڈھکے ہوئے جن پر رنگ برنگے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ گورے گورے پیر جنگلی مہندی سے خون ناب بڑی بڑی آنکھوں کے گرد سیاہ سا حلقہ جو بکرے کے سینگ کی لیپ سے بنایا گیا تھا۔ تندرستی اور جوانی سے ڈبڈبائے ہوئے جسم تنگ قباؤں میں تلملا رہے تھے۔ اور وہ سب اپنے جنگلوں کی پھول پتیوں کی طرح حسین اور معصوم تھیں۔

جب سب جمع ہو گئے تو ملک شاہ جو ان سب کا بزرگ اور جاہ و جلال میں کسی یہودی پیغمبر سے کم نہ تھا اٹھا اور ایک مشعل لئے ہوئے قبرستان کی طرف گیا جو اس میدان کے پاس ہی تھا۔ عورتیں منہ موڑ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئیں اور مردوں نے نقارے کی چوب پر ہو ہو کا نعرہ بلند کیا۔ عورتوں نے دھیمے سروں اور یکساں آواز میں کوئی گیت شروع کیا۔ ذرا دیر میں ملک شاہ لکڑی کا ایک بت کاندھے پر اٹھائے ہوئے پلٹا اور اس بت کو دیکھتے ہی سب زن و مرد سجدہ میں گر پڑے۔ مرد ہوا میں بلم ہلاتے ہوئے ہو ہو ہو کرتے آگ کا طواف کرنے لگے اور عورتوں نے اپنے گیت کی لے تیز کر دی۔ وہ بت جس کا نام ایشان تھا چنار کے تنے کا ٹیکا لگا کر بٹھلا دیا گیا۔

یک بیک چھاگلوں کے گھنگرو ایک ساتھ مرتعش ہوئے سارے بلم بجلیوں کی طرح ہوا میں لپکے۔ نقارہ جلدی جلدی غضب ناک اژدھے کی طرح سانس لینے لگا۔ الاؤ کے چاروں طرف مرد وا کے

پیر دھما دھم زمین کو کوٹنے لگے۔ لیکن عورتوں نے آہستہ سے زمین کو ٹھوکر لگائی گویا اس کا بوسہ لے رہی ہوں۔ اور دو کافر بوڑھوں نے جو ایشان دیوتا کے پجاری معلوم ہوتے تھے۔ جھوم جھوم کر ایک ترانہ گانا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان سب نے اپنے اوپر ایک ایسی وجدانی اور ہیجانی کیفیت طاری کر لی گویا وہ ابھی اپنی قدیم روایت کی تجدید کر کے انسانوں کو آگ میں زندہ جلا دینگے اور پھر ان کی کھوپریوں کے ہار بنا کر پہن لیں گے ذرا دیر کے لئے مسافر مبہوت رہ گیا۔ اور اسے یقین نہ آیا کہ وہ افغانستان کی سرحد پر مہذب دنیا سے کالے کوسوں دور ان وحشی کافروں کا مہمان ہے۔ جو ناچنے والا تھک جاتا وہ گھڑی بھر کے لئے دیوتا کے آگے زمین بوس ہوتا۔ اور پھولوں کی شراب کی مشک میں منہ لگا کر دوبارہ اس ہنگامہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ رقص کی لے کے ساتھ ساتھ آگ کی لو بھڑکتی گئی اور ہو ہو ہو کے وحشیانہ نعرے پہاڑوں سے ٹکرا کر شور قیامت کی طرح فضا میں گونج اٹھے۔

مسافر مشرق و مغرب کے بہت سے ناچ دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی ناچ میں اس نے یہ وارفتگی، یہ قوت اور یہ وحشیانہ مسرت نہ دیکھی تھی۔ وہ سب بہار کے دیوتا ایشان، کے اشارہ پر مرنے مارنے کو تیار تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے جذبۂ عقیدت کو کس طرح ظاہر کریں۔ رات میں ٹھنڈ سمائی ہوئی تھی۔ لیکن وہ سب پسینہ میں شرابور تھے۔ اور لڑکیوں کے دلربا چہروں پر گویا موتیوں کی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔

ملک شاہ نے مسافر کو بتلایا کہ یہ دیوتاؤں کا ملک ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کافر سکندرِ اعظم کے بھٹکے ہوئے سپاہیوں کی اولاد ہیں اور کوئی انہیں قدیمی آریاؤں کا نام لیوا بتلاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ دیوتاؤں کے پانی دیوا ہیں۔ ہزار ہا سال سے وہ یہیں رہتے بستے ہیں۔ انہوں نے تاتاریوں ترکوں اور افغانوں کے قبیلوں کو گزرتے دیکھا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور تہذیبوں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ لیکن اُن انقلابوں کا اُن پر اتنا ہی کم اثر ہوا جتنا ان پہاڑوں پر۔

اس گفتگو کے دوران میں ایک دوشیزہ صف چیر کر ایشان دیوتا کے آگے اکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین کی مٹی اٹھا کر آنکھوں پر لگائی۔ پھر تالی بجا کر ہاتھ ہوا میں پھیلا دئے۔ اور سارے مجمع کی تالیوں کی گت پر اس نے ناچنا شروع کیا۔ وہ اپنے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچ رہی تھی۔ اور اس کا ناچ گویا قدرت کا خاموش شکریہ تھا کہ اسے حسین بنایا۔ گردن سے لیکر ٹخنے تک اس کا جسم ایک لبادہ میں چھپا ہوا تھا۔ لیکن ناچ کے دوران میں وہ یوں مچلا گویا ابھی عریاں ہو جائے گا۔ اور چھلّوں میں چھپی ہوئی اسکی انگلیاں تیروں کی نوک کی طرح ہوا میں تھرتھرائیں۔ اس کے سڈول پیر کبھی ڈگمگائے، کبھی تھرکے اور کبھی کسمسائے۔ اپنی چوٹی میں سے اس نے سرخ پھولوں کا ایک گچھا نکالا۔ اور اسے ہتھیلی میں لئے دیوتا کی نذر کو چلی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم اٹھے پائلوں نے ہیبت کے مارے سانس روک لیا۔ لیکن پھول بت کے آگے رکھ کر وہ خوشی سے اچھلی اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اور وہ پھرتی سے ہاتھ پاؤں یوں نچانے لگی گویا تتلی کی طرح ابھی اڑ جائے گی۔ اور اسی وقت ایک خوش رو نوجوان بلّم ہلاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اپنے سر اور بازوؤں کو اس نے ہری بھری ٹہنیوں سے ڈھک رکھا تھا۔ اسکے پروقار انداز سے مسافر سمجھ گیا کہ یہ ایشان دیوتا کا پاٹ ادا کر رہا ہے۔

اب دونوں گل بہنیاں کر کے ایک گت پر مزے میں ناچنے لگے اور سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ان کا گھیرا کر لیا۔

مسافر کے رہنما ملنگ نے چپکے سے کہا۔ جانتے ہو یہ جام زور (حسینہ) کون ہے! یہ ملک شاہ کی نواسی گلون ہے۔ اس بہار میں وہ بالغ ہوئی ہے اور اپنی جوانی کا صدقہ اتارنے کے لئے ناچ رہی ہے۔ لیکن اس کا ساتھی ملک شاہ کے دشمن نامدار کا غلام گاش، ہے۔ صدیوں سے گاش کا گھرانہ نامدار کے گھر غلامی کرتا آیا ہے۔ یہ دل میں لاکھ ایک دوسرے کو چاہیں لیکن سب کے دیکھتے انہیں اس محبت کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔

ملنگ وادئ بمبیرت کا فلسفی تھا۔ اپنے کانوں میں سونے کا بالا ڈالے مخمل کا پھٹا ہوا شلوکہ پہنے پرانی وضع کی بندوق، بارود کے تھیلے کے ساتھ پیٹھ پر لادے وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کافروں کا بھاٹ، سرپنچ مشیر سب کچھ تھا۔ اب بہار میں جب کافر اپنے مویشیوں کو چرانے لے لئے جنگلوں میں چھوڑ دیں گے تو ملنگ ان کی حفاظت کرے گا۔ بمبیرت اور افغانستان کے درمیان اس پہاڑ کے سوا اور کوئی اوٹ نہ تھی۔ اور اکثر افغان مویشی چور آ کر انکے آوارہ مویشیوں کو پکڑ لے جاتے تھے۔

تب تو آئے دن ملنگ سے ان کی مڈبھیڑ ہوا کرتی تھی ۔

ملنگ کی چلم میں گانجا تھا یا چرس یا تمباکو۔ مسافر کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ لیکن ملنگ تابڑ توڑ اس کے کش لگاتے اور کھانستے ہوئے بیچ بیچ میں اپنی لال لال آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کو میلی آستینوں سے پونچھ پونچھ کر مسافر سے کہنے لگا۔ "یہ کمبخت گاش آپ اپنی جان کا لاگو ہے بلکہ شاہ کافروں کا پجاری ہے ۔ اس کی نواسی سے یہ غلام زادہ شادی نہیں کر سکتا جب تک کوئی دس گھوڑے، پچاس گائیں اور سو بکریاں نہ لائے گلون سے بیاہ کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن گاش کے سوا کوئی اس چھوکری کی آنکھوں میں جچتا بھی تو نہیں۔ نوروز کو وادی کی سب جوان لڑکیاں 'مارا' دیوتا کے مندر کے آگے آ بیٹھتی ہیں۔ کنوارے آتے ہیں اور جو جسے پسند ہو اپنی جائداد کی تفصیل سناتے ہیں۔ یہاں سونے روپے کی کوئی قدر نہیں زمین اور مویشی ہی اصل جائداد ہے۔ اگر کوئی لڑکی کسی کا ہاتھ پکڑ لے تو سمجھو کہ منگنی ہو گئی پچھلے نوروز کو کئی کنوارے گلون سے شادی کرنے کو آتے۔ مگر اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اسے تو گاش کے سوا کوئی بھاتا ہی نہیں "

ملنگ ٹھیک کہتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں سدھ بدھ بھول کر یوں ناچ رہے تھے گویا وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ ان کی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں اور ان کے جسم ایک دوسرے کی پیاس میں تڑپ رہے تھے۔ لیکن اور سب کی آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ دیوتا اور مہمان کی موجودگی کی وجہ سے وہ مجبوراً خاموش تھے ۔

بہت رات بیتے وہ ناچ ختم ہوا۔ اور مسافر اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کان سے الوداعی گیت کے اس بول کو نکال پھینکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ جس کا مطلب تھا۔ کہ "ہائے بہار بھی نہ رہے گی اور مسافر بھی چلا جائے گا "

رقص کے دوران میں وہ ٹکٹکی باندھے گلون کو تاکتا رہا تھا۔ رقص کے دوران میں وہ کبھی پھول کی طرح کھلی، کبھی ناگن کی طرح لہرائی، کبھی اس پہاڑی ندی کی طرح گنگنائی۔ اور مسافر اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ گلون نے بھی ایک نگاہِ غلط انداز سے اسے دیکھا تھا۔ اپنی سہیلی نمکی کو کہنی مار کر وہ مسکرائی تھی۔ پھر اپنی رسم کے مطابق دو انگلیوں کے بیچ سے دیدہ دکھا کر دوستی کا اشارہ بھی کیا تھا۔

ملنگ نے مسافر کو جھنجھوڑا تو اس کی آنکھ کھلی۔ دھوپ پھیل چکی تھی اور ملنگ کے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں ہنسی پھیل رہی تھی۔ "کھیل چکے تم مارخور کا شکار۔ اٹھو بہت سو چکے"۔ ایک لمحہ مسافر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں تھا۔ کسی کافر کے مکان کی بالائی منزل میں وہ ٹھیرایا گیا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک چولہا جو بیک وقت انگیٹھی، تندور اور لیمپ کا کام دیتا تھا۔ اور نیچے اترنے کے لئے لکڑی کی اٹھاؤ سیڑھی جو بوقت ضرورت اوپر کھینچی جا سکتی تھی تاکہ مکین دشمنوں یا ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں ۔

عورتیں گھروں یا کھیتوں میں کام کر رہی تھیں اور مرد شکار کھیلنے، پھل توڑنے یا شہد جمع کرنے باہر نکل گئے تھے۔ رات کو جب یہ لوٹینگے تو عورتیں پاؤں دھلا کر انہیں کھانا دیں گی لیکن شہد گھی اور پنیر کو خود ہاتھ نہ لگائیں گی۔ یہ نعمتیں صرف مرد کے لئے مخصوص ہیں کیونکہ اسی کی ذاتِ پاک دیوتاؤں کی مظہر ہے ۔

مسافر کی آنکھیں ادھر ادھر کسی کو ڈھونڈتی چلیں۔ اس نے ایک کسک سی محسوس کی جس میں درد کا شائبہ بھی نہیں مگر خفیف سا احساس ضرور تھا۔ اور چلتے چلتے اس نے گاش کو دیکھا جو ایک آنگن میں بیٹھا مٹی کے برتن بنا رہا تھا۔ کس پھرتی سے وہ گیلی مٹی کے برتنوں کو اپنے ہاتھ میں نچاتا اور پھر ان سے پیالی یا صراحی بنا کر دھوپ میں رکھتا جاتا تھا۔ مسافر کو دیکھ کر اسکی روشن آنکھیں مسکرائیں۔ اور وہ رات کی بچھڑی ہوئی محبت کی یاد میں مگن ہو گیا۔

ملنگ تیز قدم چل رہا تھا۔ اور چلتے چلتے کبھی پتوں پر مٹی ہوئی ادس کو غور سے دیکھ کر کہتا کہ ادھر سے لومڑی گئی ہے۔ اور کبھی ٹیلوں پر بنی ہوئی قبروں کی طرف اشارہ کر کے کہتا کہ ان میں ہمارے اجداد سو رہے ہیں۔ جب کوئی کافر مرتا ہے تو لاش کے ساتھ ان کے کپڑے، ضربے اور گہنے دفن کر دیئے ہیں۔ پہلے تو کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگاتا تھا لیکن جب سے لال کافر مسلمان ہوئے ہیں یہ قبریں محفوظ نہیں ہیں ۔

ملنگ مارخور کی دھن میں ایک سوکھے ہوئے نالے کے پتھروں پر اچھلتا کودتا چلا جاتا تھا۔ پھر کسی چیز کا خیال آتے ہی وہ بولا۔ مسافر گاش

ہمیں ایسا مارخور ملے جس کی ناف میں منکا چھپا ہوا ہو۔ منکا افعی تک کے زہر کو پل بھر میں چوس لیتا ہے۔ اسے دکھلا کر تو راجہ کی بیٹی کو بھی موہ سکتا ہے۔"

یک بیک اس کی آنکھ میں شرارت آئی اور وہ خود بخود کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ رات کو میں تیری آنکھوں کو تاڑ رہا تھا۔ گلون کو تو نے پسند کیا کیوں! ایں ؟"

اخروٹ کے پیڑ کی چھاؤں میں دونوں بیٹھ گئے۔ مسافر نے سگریٹ اور ملنگ نے چلم سلگائی۔ ملنگ کہنے لگا! "اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مہمان ہماری چیز کو پسند کرے تو اس میں ہماری عزت ہے دس گھوڑوں پچاس گایوں اور سو بکریوں کے دام یہاں چھ سات سو روپے سے زیادہ نہ ہونگے۔ تو گلون کو بیاہ کر یہیں بس جا۔ تجھے ہم مفت میں یہ جنگل اور پہاڑ دے دینگے"
اس نے دوبارہ شریر نگاہوں سے مسافر کو گھورا۔

"نہیں ملنگ۔ گلون اور اس کا دیس حسین سہی۔ مگر نہ میں انکے لئے ہوں اور نہ وہ میرے لئے —"

ملنگ ٹوہ لینے کے لئے جھوٹ موٹ جھنجلا کر بولا، ہوں۔ میں جانتا ہوں نہ تیرا دیس ایسا حسین ہے اور نہ وہاں گلون جیسی عورتیں ملتی ہیں"

ملنگ اسے چھیڑتا گیا۔ پشاور تک تو میں بھی جا چکا ہوں میں جانتا ہوں کہ تو اونچے مکانوں اور صاف سڑکوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن کیا ان کے ساتھ گندی گلیاں اور تنگ جھونپڑیاں نہیں ہیں۔ تیرے دیس میں عورتیں یا تو شادی کر کے پردہ کی اوٹ میں بچے جنا کرتی ہیں اور یا دام لے کر یا بلے دام طوائفیں بن جاتی ہیں۔ تو ہماری بیٹیوں کے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا"

مسافر کی خاموشی کے باوجود ملنگ سمجھ گیا کہ اس کے دل میں کیا ہے وہ ان کافروں کو وحشی سمجھتا ہے ان کے رسوم پر ہنستا ہے۔ انکی رہن سہن کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس احساس سے ملنگ کے باطن میں سوئی ہوئی سینکڑوں دیوتاؤں کی ہزاروں سال پرانی روح بھڑک پڑی اور وہ دراصل بگڑ کر بولا۔ تجھے اپنی ریلوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کا گھمنڈ ہے۔ انہیں دیکھے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ پہاڑوں ندیوں اور جنگلوں سے وہ تجھے زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ انہیں تو اپنی تہذیب اور ترقی سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ تو کہہ کہ اس ترقی کی قیمت تو کس طرح ادا کرتا ہے! ایون کے پوسٹ ماسٹر کے پاس ایک اخبار آتا ہے۔ ہر مہینہ میں نمک اور چائے خریدنے ایون جاتا ہوں تو وہ اخبار پڑھکر مجھے سناتا ہے۔ اس میں لڑائی، قحط، گداگری اور بیکاری کی خبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن تیری روح ایسی خبیث ہے کہ انکے تماشے بغیر اُسے سکون نہیں مل سکتا"

ملنگ ابھی جانے کیا کیا کہتا۔ لیکن اسی وقت داہنی طرف سرسراہٹ سی ہوئی دونوں ایک پیڑ کی آڑ میں دبک گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک چٹان پر کھر جوڑے ایک مارخور کھڑا ہوا ہے۔ اسکے پرپیچ اور لمبے لمبے سینگ بڑے بھلے لگتے ہیں اور وہ اپنی بھری بھری گردن اٹھائے سورج کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنی ریشمی ڈاڑھی کو وہ رہ رہ کر ہلاتا ہے۔ گویا منبر پر کھڑا وعظ دے رہا ہو۔ اور اسکے حساس ننھنے پھڑک پھڑک کر اسے فضا کی ہر تبدیلی کی خبر دے رہے ہیں۔ مسافر کی انگلی بندوق کی لبلبی کی طرف بڑھی۔ مگر مارخور اچانک ایک چٹان سے اچھل کر دوسری پر اور وہاں سے تیسری پر پہنچا۔ وہ اسی طرح چٹانوں پر چوکڑیاں بھرتا گیا۔ اور جب بندوق دغی تو حیرانی سے ایک بار پیچھے دیکھکر پہاڑ کی ایک دراز میں گھسا اور غائب ہوگیا۔ کچھ دیر گولی کی آواز کبھی یہاں اور کبھی وہاں گونجی۔ مرمٹوں نے کرر کرر کی کرخت صدائیں بلند کرکے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اور ایک دو شاہین اپنے گھونسلوں کو چھوڑ کر ہوا میں اڑنے لگے۔

x x x

لوٹتے وقت مسافر نے گلون کو دیکھا۔ وہ چراگاہ میں بیٹھی ہوئی اپنے کتے کے بالوں میں پسو ٹٹول رہی تھی۔ کتے نے اس کی انگلیوں کے مس کی لذت کو بخوبی دل نشین کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کرلی تھیں کبھی کبھی اس کی کھال سکڑ جاتی۔ اور اس کی دھیمی دھیمی غراہٹ میں مسرت کا اظہار تھا۔ بکریاں اور گائیں ادھر ادھر چر رہی تھیں۔ اور بیچ بیچ میں وہ گلون کی طرف اطمینان کرنے کے لئے دیکھ لیتی تھیں۔ کہ وہ اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔

مسافر سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں اور وہ ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ لاکر الھڑپن سے گھاس کے تنکوں کو نوچنے لگی۔ ملنگ کو

اس نے اپنی زبان میں سلام کیا اور اس کی چھیڑ چھاڑ کا جواب ایک میٹھی جھڑکی میں دیا۔ مسافر نے اسکی جھکی ہوئی چتونوں کو اپنے قدموں کا تعاقب کرتے پایا اور اس احساس سے اس کی ٹانگوں میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

پہاڑی نالے کے ٹھنڈے پانی کو انگلیوں سے ٹھوکتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اس وادی کو ایک خواب سمجھتا ہے۔ وہ اس میں سے گذر کر پھر اپنی تنگ اور تاریک دنیا میں چلا جانا چاہتا ہے۔ جہاں بدصورتی اور ریاکاری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا کثافت اور غلاظت میں بھی کوئی لذت ہوتی ہے۔ جو زہر کی طرح انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ گوبریلوں اور تل چٹوں کی طرح اسی مٹی میں اگتا اور اسی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا اذیت پسندی اس نام نہاد تہذیب کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اور جب تک ہم جسمانی اور روحانی ہلاکت کا نظارہ نہ کریں ہمیں چین نہیں مل سکتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسافر کو اس وادی میں بسنے کا خیال ناگوار کیوں ہے۔ وہ اپنی ذہنی کیفیت کے تجزیہ کی کوشش کرنے لگا۔ بچپن میں جنگل کا راجہ بننے اور جنگل کی پری سے عشق کرنے کا خیال کسقدر دلچسپ تھا لیکن آج وہ خیال ممکن الحصول تھا۔ تو وہ جھجک کیوں رہا تھا۔ اس مہذب دنیا سے اسے لینا کیا تھا انسانوں سے دکھ درد کے سوا اسے ملا کیا تھا۔ وہاں کی روٹیوں میں جسمانی اور اخلاقی امراض کے جراثیم تھے۔ اور وہ سب اسیر تھے۔ آپ اپنی خودی کے اسیر۔

ممکن ہے یہی بات ہو۔ اور یا یہ ہو کہ مسافر محض بظاہر ان کا فردوں کا سا آدمی تھا۔ ورنہ ان کے مابین دو ہزار سال کا فرق تھا۔ یہ فرق حواس کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وقت کی روانی کو محسوس کرنے کی صلاحیت حواس میں نہیں۔ البتہ حواس سے پرے جسم کے تہ خانوں میں مدفون نامعلوم طاقتیں وقت کے اسرار سے واقف ہیں۔

مسافر صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ان سے مختلف ہے۔ وہ گلون کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر گلون کی عمر سولہ سال ہے تو اسکی اپنی عمر دو ہزار سولہ سال! اور نہ وہ ان پہاڑوں میں رہ سکتا ہے کیونکہ اگر اسکی اپنی عمر تیس سال ہے تو ان کی دو لاکھ تیس سال۔

× × ×

کل صبح مسافر واپس چلا جائے گا۔ ابھی ابھی اس نے اپنے میزبانوں سے رخصت لی ہے اور ان کی مہربانی کا شکریہ آئینوں، بٹوؤں، اور رنگین رومالوں کی صورت میں ادا کیا ہے۔ اپنا سامان بند کرتے ہوئے وہ سوچتا ہے کہ ان کا بوجھ زیادہ ہے یا میرے دل کا۔

گلون کی تصویر وہ اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتا لیکن وہ اسے اس سرزمین سے الگ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تازندگی اس خیال سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہ سدا بہار پھول کی طرح اپنی وادی میں مہک رہی ہے اور کسی مشاطہ نے اسکے گیسو نہیں سنوارے ہیں۔ وقت اگر کہیں ملے تو اس سے وہ کہنا چاہتا ہے کہ مرتے دم تک اسے جوان رہنے دے۔

چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا ہے کہ جب موم بتی خود بخود بجھ جائیگی تو میں لیٹ جاؤنگا۔ اور عین اس وقت جب موم بتی کی لو بھڑک کر بجھنے کے قریب ہوتی ہے دروازہ اپنی چول پر چرچراتا ہے۔ ملنگ ڈپنا ہوا چوکھٹ پر کھڑا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"مسافر" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "وہ لوگ گاش کو قتل کر رہے ہیں"۔ مسافر اچھل پڑا۔ اور اسی وقت موم بتی بجھ گئی۔

"شام کو وہ گلون سے ملنے کھیت پر گیا۔ سلمی اپنے دوستوں کے ساتھ ان دونوں کی تاک میں تھا۔ دونوں پکڑے گئے۔ اب قبرستان کے سامنے مارا دیوتا کے حضور میں پنچایت اسے سزا دینے کے لئے جمع ہوئی ہے"۔

مسافر کے جسم کا لہو خشک ہو گیا۔ اور اس کے ہر روئیں نے پکار کر کہا کہ بھاگو ملنگ نے اسکا بازو پکڑ لیا، "مسافر تو گاش کی جان بچا سکتا ہے"۔ اور مسافر کو وہ باہر کی طرف کھینچنے لگا۔

قبرستان کے مقابل چناروں کے جھرمٹ میں آگ جل رہی تھی لیکن اسمیں کل رات کا سا جوش و خروش نہ تھا۔ اداس اداس اور بجھی بجھی سی آگ۔ اسکی پھیکی سی روشنی مارا دیوتا کے اونچے پورے چوبی بت پر پڑ رہی تھی جو قبرستان کے پھاٹک پر مردوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کے روبرو بوڑھے کافر ادب سے دو زانو بیٹھے ہوئے تھے بیچ میں ایک شہتیر نصب تھا جس سے گاش بندھا ہوا تھا۔ پاس ایک زخمی بکرا پڑا ہوا وحشت انگیز آواز میں کراہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سے گھائل

کرکے چھوڑ دیا گیا تھا بیچا بیچ میں گلون کا ناکام عاشق سلمی زمین سے چلّو بھر خون اٹھا کر گاش پر چھڑک دیتا تھا۔ مارا دیوتا کے آگے گلون اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور جب بکرے کی چیخ بند ہو جاتی تو گلون کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔

ذرا دور پر ملنگ نے مسافر کو روکا اور کہا "یہ مذہبی رسم ہے۔ کوئی اجنبی اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ تو یہیں چھپ کر تماشہ دیکھ۔ اور جب ملک شاہ دیوتا کو مخاطب کرے تو اس کے پاس جا اور گاش کی جان کی امان مانگ"

دیر تک بکرا تڑپتا اور کراہتا رہا سلمی اسکے خون کے چھینٹے گاش پر چھڑکتا رہا۔ گلون خاموش ہو گئی اور عجب نہیں کہ اس کے تھکے ہوئے بدن کو ایسی حالت میں نیند آگئی ہو۔ ملک شاہ زیر لب کوئی لامتناہی منتر جپتا رہا اتنے میں بکرا آخری بار چلایا اور تڑپ کر مر گیا۔ اسی وقت سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مارا مارا کی صداؤں سے ہوا تھرا اٹھی۔ سلمی کسی پیڑ کی اوٹ میں چھپی ہوئی کھوپڑیوں کی مالا اٹھا لایا —— وہ کھوپڑیاں جو اسکے اجداد نے دشمنوں کے مردہ اجسام میں سے نکالی تھیں۔ یہ ہار گلے میں ڈالکر سلمی نیزہ ہلاتے ہوئے گاش کی طرف جھپٹا اور پھر دیوانہ وار مرگھٹ کے بھوت کی طرح ناچنے لگا۔ اس کے نیزے کے اشارہ پر کبھی گلون ڈر کے مارے چلاتی اور ایک آدھ مرتبہ تو گاش بھی زخمی بکرے کی طرح چیخ پڑا۔ باقی سب لوگ ہوہو ہوا اور مارا مارا کی آواز پر گویا اس ناچ پر تالی دینے لگے۔

مسافر اس خیال سے سہم گیا کہ کہیں نیزہ گاش کے بدن میں چبھ نہ جائے۔ لیکن ملنگ نے اسے تسلی دی۔ ابھی ملک شاہ نے مارا دیوتا کی اجازت نہیں لی ہے ملنگ نے سمجھایا کہ ان کا جرم بڑا سنگین ہے۔ ایک تو منگنی سے پہلے ان کا تنہائی میں ملنا پھر وہ پجاری کی لڑکی اور یہ غلام زادہ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنی وعدہ گاہ عین اس مقام کو بنایا جہاں مارا دیوتا ان کے گناہ دیکھ سکتا تھا۔

ملک شاہ کے ہاتھ اٹھاتے ہی رقص بند ہو گیا۔ اور موت کا سا سناٹا چھا گیا ابھی ملک شاہ اپنے دیوتا سے مخاطب ہوا ہی تھا کہ اسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک پڑا اور حیرانی سے ملنگ سے پوچھا کہ مہمان چاہتا کیا ہے۔

مہمان نے مارا دیوتا کے قدموں کی خاک اٹھا کر آنکھوں کو لگائی اور گلون کی ملتجی نگاہوں نے اس کے کانپتے ہوئے دل کو ہمت دی۔

وہ بولا "کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور میرا دیس اتنا دور ہے۔ کہ شاید پھر کبھی نہ آسکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان چند دنوں کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے۔ اور اس یاد میں صرف احسان اور مسرت ہو —— غم کی کوئی کھٹک نہ ہو" —— وہ جانتا تھا کہ آخری الفاظ جھوٹ ہیں۔ کیونکہ جس مسرت میں غم کی جھلک نہ ہو وہ یاد کیسے رہ سکتی ہے۔ ملک شاہ نے جواب دیا، ملنگ مہمان سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مہمان کی خوشنودی ہمارے مذہب کا آئین ہے"

"میں چاہتا ہوں کہ گاش کی جان بخش دی جائے"

ہر شخص اپنی اپنی جگہ بھنّا اٹھا۔ اور ان کی بھن بھناہٹ میں مخالفت صاف عیاں تھی لیکن ملک شاہ کے حکم سے سب خاموش ہو گئے۔ اور وہ دیوتا کے آگے جھوم جھوم کر اپنی زبان میں دیر تک کچھ کہتا رہا۔ کبھی وہ اپنے کان دیوتا کے لبوں کی طرف لاتا گویا اس کی آواز سن رہا ہو۔ کبھی اس کی منت کرتا۔ کبھی چپ ہو جاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سب لوگ دوبارہ مارا مارا کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے۔

ملک شاہ نے پیغمبرانہ شان سے ہر لفظ تول تول کر کہنا شروع کیا۔ "اس غلام کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں —— لیکن —— اس لیکن پر سلمی اور اسکے حامیوں کے چہرے اتر گئے —" لیکن مہمان نے اپنے قیام کے دوران میں صرف ایک خواہش ظاہر کی ہے۔ اور اسے رد کرنا ہمارے آئین کے خلاف ہے"

ملنگ نے خوشی کا نعرہ لگایا اور جلدی جلدی گاش کے بندھن کھولنے لگا۔ "ٹھہرو" ملک شاہ کی بوڑھی آواز گرجی "گاش آئندہ ہماری وادی میں نہ رہ سکیگا۔ مہمان قیمت ادا کرکے اسے خرید لے پھر چاہے اسے چھوڑ دے یا پاس رکھے"

گاش کو زہر آلود نگاہوں سے اس نے گھور کر تاکید کی "اگر تم نے کبھی اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت بھی کی تو یاد رکھو کہ مارا دیوتا کے مندر کی دیوار میں زندہ چن دیئے جاؤ گے"

پھر اس نے سرد مہری سے گلون کی طرف دیکھا جو روندی ہوئی ٹہنی کی طرح اب تک زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ بوڑھے کے اشارے پر وہ اٹھی اور کسی نے اس پرسن کی ایسی بہار نہ دیکھی تھی جیسی اسوقت تھی۔

"اگر تو سلمی سے بیاہ کرلے تو دیوتا تیرے گناہوں کو معاف کر دیں گے"
گلون کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پتھر کی طرح سخت پڑ گیا اور اس نے سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔

"گاش کے علاوہ تجھے اور کوئی کافر پسند ہے؟"
گلوں کے منہ سے صاف آواز نکلی "نہیں"
تو جانتی ہے کہ دیوتا کے آگے انکار کرنے کے بعد تو عمر بھر کسی مرد کے ساتھ نہ رہ سکے گی!"

گلون کی گردن نے اشارہ کیا کہ ہاں میں انجام کو جانتی ہوں۔
"تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے!"
دفعتاً ملنگ نے جھک کر ملک شاہ کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے ذرا حیرت سے مہمان کو گھور کر لڑکی سے سوال کیا "مہمان اگر یہیں رہ جائے تو تو اسے پسند کرے گی؟"

مسافر کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ اور اسے ایسا لگا کہ یہ لمحہ ہزاروں سال کی دوری طے کر رہا ہے۔ اور اس کی روح میں پنہاں تہذیب کی زنجیریں یوں منتشر ہو رہی ہیں جیسے زلزلہ میں سینکڑوں ہزاروں سال پرانی عمارتیں ایک آن میں برباد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حیران رہ گیا کہ اپنی قسمت کا وہ آپ مختار نہیں۔ بلکہ اس کی ملکہ یہ لڑکی ہے جو ابھی لکڑی کے ایک بے ڈول بت کے آگے سجدہ میں پڑی سسک رہی تھی۔

گلون نے گھڑی بھر مسافر کو اداسی سے دیکھا۔ اسکی معصوم آنکھوں نے اجنبی سے کچھ پوچھا۔
مگر اس کی گردن دائیں بائیں ہلی —— اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے کہا —"نہیں"

—— × —— × —— × ——

پرکاش موھن

جبر و اختیار

کردار

متحرک پنکھا۔
پہلا ساکت پنکھا
دوسرا ساکت پنکھا
کاغذ کا پُرزہ
چند "ماٹوز"
دیواریں۔ میز۔ کرسیاں۔ بنچ وغیرہ

[کالج کا ایک خالی کمرہ۔ فلسفے کے پروفیسر نے ابھی ابھی "قضا و قدر" کے مسئلہ پر اپنا لیکچر ختم کیا ہے۔ وہ اور ان کی کلاس کے دو طالب علم جا چکے ہیں۔ اب کمرے میں یا تو بنچ اور کرسیاں ہیں۔ یا بجلی کے تین پنکھے۔ ان میں سے دو بند ہیں تیسرا تیزی سے چل رہا ہے۔ گویا ایک بیکلی ہے۔ جو اسے اسطرح سرگرداں رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ فضا کی خامشی کو یا تو پنکھے کی باقاعدہ اور تھکا دینے والی سر سر توڑ رہی ہے۔ یا کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی مسلسل پھٹ پھٹ۔ جس کا ایک سرا بنچ کی درز میں پھنسا ہوا ہے۔ اور جو پنکھے کی تیز ہوا میں اڑ جانے کے لئے پھڑپھڑا رہا ہے۔ کبھی کبھی پنکھے کی مسلسل اور باقاعدہ سر سر میں یکایک ایک کرخت اور لمبی چیخ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ گویا اسکی چولیں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہوں۔ اور اس کے چاروں پَر علیحدہ ہو کر فضا میں تیزی سے تیرتے ہوئے دیواروں سے ٹکرا جائیں گے۔

پھر یہ شور دفعتاً بند ہو جاتا ہے۔ گویا پنکھے کے درد کی شدت میں کمی ہو گئی ہو۔ دیواروں پر موٹے موٹے حروف میں "ماٹوز" لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً "انسان اپنی تقدیر کا خود خالق ہے۔" "خودی کو کر بلند۔ . . . . ." "خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور نیکی کرو۔" "عمل ہی راہِ نجات ہے۔" پنکھے کی تیز ہوا میں کپڑے کے یہ ماٹو لرز رہے ہیں۔ مگر دیوار نے انہیں مضبوطی سے جکڑ رکھا ہے۔

دفعتاً یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا پنکھے کی سر سر بتدریج بلند ہوتی جا رہی ہے پھر آہستہ آہستہ اس آواز میں معانی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ گویا پنکھا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رفتہ رفتہ الفاظ صاف ہوتے جاتے ہیں]

متحرک پنکھا۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں —— ایسا چاہیئے۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ . . . .

آواز میں شدت اور سرعت پیدا ہو رہی ہے۔ الفاظ بلند ہوتے جا رہے ہیں۔ اور تیز تر۔ اس مریض کی آواز کی طرح جس کی کیفیت ہذیان بخار کی شدت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا پنکھا پاگل ہو گیا ہو۔ آخر کار یہ شدت عروج پر پہنچ کر دفعتاً بند ہو جاتی ہے۔ گویا مریض نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا ہو۔ اور اب اس میں بکنے جھکنے کی تاب بھی باقی نہ ہو۔

رفتہ رفتہ فضا میں ایک گنگناہٹ سی بلند ہوتی ہے۔ یہ اسی پنکھے کی آواز ہے۔ مگر اب اس آواز میں ٹھہراؤ ہے۔ گویا مریض ہوش میں آ گیا ہو۔]

متحرک پنکھا۔ زندگی! زندگی عمل کا نام ہے۔ انتھک عمل کا —— سعی مسلسل کشمکش لازوال۔ جہاد پیہم۔ ان کے بغیر زندگی ہے کیا؟ آخر کار وہ رازِ سربستہ مجھ پر وا ہو گیا جس نے اتنی مدت مجھے پریشان رکھا۔ اب بھی میری راتیں بیقرار ہونگی۔ اور میرے دن بیتاب۔ اب بھی میری زندگی میں خلش ہو گی تڑپ ہو گی جستجو ہو گی۔ مگر اب بیقراریاں لاحاصل

نہ ہوگی۔ اب میری تڑپ اور خلش راہ گم کردہ مسافر کی تڑپ اور خلش نہ ہوگی اب میری جستجو جستجوئے منزل نہ ہوگی۔ اب میری راہ معین ہے۔ میری منزل مخصوص۔ بے یقینی اور بے عملی کی وہ کرب انگیز اذیت جس نے میرے ہر پیچ اور ہر تار کی قوت سلب کر رکھی تھی۔ اب دور ہوچکی۔ اب راتوں کی تاریکی میں جب کائنات سو رہی ہوگی۔ میرا دماغ مجھ سے بار بار یہ نہ پوچھے گا۔ کہ مقصدِ حیات کیا ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ حیات جاودانہ سعی جاودانہ کا دوسرا نام ہے۔ ایک پنکھے کا فرضِ مذہبی حرکت ہے۔ کبھی نہ رکنے والی حرکت۔

وقفہ۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں پھر وہی سکوت چھا جاتا ہے۔ البتہ پنکھے کی سرسر بدستور ہے۔ اور کاغذ کے پرزے کی پھٹ پھٹ بڑھ گئی ہے۔ گویا وہ اپنے تئیں پنچ کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے اور بھی بیتاب ہو رہا ہے۔ پنچ کرسیاں اور میز خاموش ہیں۔ شائد پنکھے کی تفسیرِ حیات پر غور کر رہے ہیں۔ دیواروں پر کپڑے کے مالوڑ اب بھی اسی طرح لرز رہے ہیں۔ اور ساکت دیواریں اب بھی انہیں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔]

متحرک پنکھا۔ آہ اس زندگی میں کس قدر تسکین ہے کس قدر مسرت ہے، مقصدِ حیات کا علم ہو۔ تو حیات کس قدر شیریں ہو جاتی ہے! ادائیگی فرض میں کتنا حظ ہے۔ کس قدر راحت! برسوں کی روحانی تگ و دو کے بعد یہ لمحات کس قدر شیریں ہیں۔ میری خودی بیدار ہوچکی ہے۔ اور میں اپنے اندر ایک لازوال طاقت کا احساس کر رہا ہوں۔ ایک بے پناہ قوت کا بحرِ بے پایاں میرے اندر موجزن ہے۔ اب میرے ارادے مستحکم ہیں۔ اب میری زندگی میں معنی ہیں۔

الفاظ کمرے کی دیواروں، پنچوں۔ کرسیوں اور میزوں پر گویا بکھر جاتے ہیں پنکھے کاغذ کے پرزے اور کپڑے کے مالوڑ کے سوا ہر چیز مبہوت و ساکت ہے۔ مالوڑ کی ہلکی سی اضطراری لرزش، کاغذ کے پرزے کی مجنونانہ پھٹ پھٹ اور پنکھے کی مسلسل سرسر شائد اتفاقاً چند لمحوں کے لئے ایک لے میں بندھ جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک بار پھر پنکھے کی آواز بلند ہوتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ اسی گردشِ مدام کا نام زندگی ہے۔ حیف ہے ہر اس شے پر۔ جو حرکت کو لبیک نہ کہے۔ تف ہے ہر اس وجود پر۔ جو جامد و ساکت ہے۔ اور لعنت ہے ہر اس فرد پر جو متحرک نہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ مظہر ہے۔ کہ حرکت ہی قانونِ قدرت ہے۔ وسعت عالم میں کونسی شئے ہے جس میں حرکت نہیں۔ اس لئے کیا ہم پر کہ اشرف المخلوقات ہیں۔ یہ فرض نہیں کہ ہماری زندگی ایک کاوش لامتناہی ہو؟ دنیا بھر کی تمام مخلوق ہمارے مقابلہ میں حقیر ہے۔ ہم پنکھوں میں وہ جذبۂ بے پناہ موجود ہے جس کا منبع خود حرکتِ اعظم کی ذاتِ خاص ہے۔ یہ ہمارا حصہ تھا۔ کہ ہمیں یہ عطیۂ خاص ودیعت کیا گیا پس کیا واجب ہے۔ کہ ہم ان حقیر اور بے مایہ پنچوں اور کرسیوں کی طرح بے حس و حرکت رہیں؟

آواز اب پھر بتدریج بلند ہوتی جا رہی ہے۔ اب اس کا انداز سرگوشیانہ نہیں۔ خطیبانہ ہے لہجہ میں تحکم ہے۔ گویا جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی صداقت میں کلام نہیں۔ وہی حرفِ آخر ہے معلوم ہوتا ہے کوئی اس تقریر کا مخاطب بھی ہے۔ آواز پھر بلند ہوتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ اے حریصِ لذتِ جمود! اے ننگِ حرکت و کاوش! کور باطن و رو سیاہ مخلوق حرکتِ اعظم! یہ استغراقِ سکوت ممات تابکے؟ یہ محویتِ عالمِ خوابیدگی تا چند؟ کب تک تو اسطرح کاہل و بیکار رہے گا؟ کہاں تک تو حکمِ الٰہی کی سرتابی کرے گا؟ بار بار میں نے تجھے دعوتِ عمل دی۔ اور بار بار تو نے اسے رد کیا۔ بار بار میری آواز جہادِ عظیم کے لئے بلند ہوئی۔ اور بار بار اسکی گونج تشنۂ حرفِ لبیک ہو کر واپس آئی۔ تیرے پیچ اس قدر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اور تیرے تار اس قدر مردہ کہ میرا نعرہ حق تجھ میں جنبشِ عمل نہیں لا سکتا۔ میری زبان میں وہ اثر ہے کہ پہاڑوں کے سینے شق ہو جائیں۔ دریا ہیبت سے اپنے رخ بدل دیں۔ اور وسعتِ افلاک خوف و ہراس سے اپنے تئیں سمیٹ لے۔ مگر صد حیف اے نامرد! کہ تیرے پروں نے جنبش نہ کی۔ اور تیرے بدن کا ایک تار تک نہ پھڑکا۔ میری وہ گرمیٔ گفتار جس کی حدت سے دنیا بھر کے ریگزاروں کی ریت تک پگھل سکتی ہے۔ تیرے سینے کی ایک دھڑکن تک کو نہ گرما سکی۔ اب بھی وقت ہے۔ اٹھ۔ کمرِ ہمت باندھ۔ اور سرگرمِ کار ہو۔

آواز تھمتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے گویا ہزاروں بجلیوں نے ابھی ابھی کڑکنا بند کیا ہے۔ اب کے سکوت میں بھی ایک حدت ہے۔ ایک ارتعاش چند لمحوں کے لئے کاغذ کے پرزے کی شورش

تک دب چکی ہے۔ گویا وہ اس کڑک سے مرعوب ہو کر بے دست و پا ہو گیا ہو۔ یا بیچ کی گرفت متوقع سعیِ عمل کی پیشقدمی کے لئے اس پر اور بھی سخت ہو گئی ہو۔ پھر ہوا میں سرگوشی سی بلند ہوتی ہے۔ گویا کوئی نیند سے جاگ رہا ہو۔

پہلا ساکت پنکھا۔ واللہ کیا مزے کی نیند تھی جس سے آپنے مجھے یوں بیدردی سے بیدار کر دیا۔ اب میں آپ سے گلہ بھی کروں۔ تو کیسے! آپ تو ماشاءاللہ جوشِ عمل سے پسینہ پسینہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا دم تو لیجئے۔

آواز میں لوچ ہے۔ تمسخر آمیز متانت ہے۔ اور ایک ہلکی سی تھکن۔ دیوار پر لگے ہوئے مالوٹز کی ہلکی سی لرزشوں کی طرح نحیف و نزار۔ چنانچہ جب آواز بند ہو جاتی ہے۔ تو مالوٹز کی لرزش اسی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس ارتعاش پر ایک بھدی۔ کرخت آواز غالب آجاتی ہے۔ کاغذ کے پرزے کی سی پھٹ پھٹ کی آواز۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ خواہ مخواہ چلائے جا رہا ہے کمبخت جیسے اسکے باوا کا راج ہی تو ہے۔

آواز بند ہو جاتی ہے۔ گویا بادل کڑکا۔ اور خاموش ہو گیا۔

متحرک پنکھا۔ حرکتِ اعظم کی لعنت ہو تم پر۔ اور تمہاری حیاتِ بے معنی پر۔ تم کہ گم کردۂ صراطِ مستقیم ہو۔ مجھے کہ محوِ عمل تکمیلِ مقصدِ حیاتِ چند روزہ ہوں . . . .

پہلا ساکت پنکھا۔ خدارا ذرا تھمیئے۔ آپ بولتے ہیں۔ تو میں ڈر جاتا ہوں کہ خدانخواستہ کہیں کوئی ترکیب ختم کر لینے سے پہلے آپکا دم گھٹ کر نہ رہ جائے۔ اور کوئی اضافت کہیں جان لیوا ثابت نہ ہو جائے۔

متحرک پنکھا۔ اے لعین تو راہِ حق میں تمسخر و تضحیک سے کام لیتا ہے۔ حرکتِ اعظم کا قہر یقیناً تجھ پر نازل ہو گا۔ اور تو دونو جہانوں میں راندا جائیگا۔ میری طرف دیکھ۔ مجھ میں تو اس ربِ عظیم کی بے پناہ قوتیں کارفرما دیکھے گا۔ جو تحریکِ اعظم ہے۔ حرکتِ اعظم ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا۔ کہ عمل ہی زندگی کی ابتدا ہے۔ اور عمل ہی انتہا! کہ حرکت زندگی ہے۔ اور جمود موت! پس ثابت ہے۔ کہ عمل تجھ پر فرض ہے۔ مگر تو ہے۔ کہ اپنے وسیع اور باوقار پر پھیلائے پڑا ہے۔ اور انہیں حرکت میں نہیں لاتا۔ کیا تو محسوس نہیں کرتا کہ تیری زندگی عمل کے بغیر بے معنی ہے۔ آخر تیری زیست کا مقصد کیا ہے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ دیکھئے نا۔ آپ پھر بیدم ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا سنبھل کر بات کیجئے۔ اور ہاں۔ یہ عمل کا لفظ۔ جسے آپ بار بار استعمال کرتے ہیں۔ ذرا وضاحت طلب ہے۔ آخر وہ عمل ہے کیا جس کی آپ مجھے بار بار ترغیب دیئے جا رہے ہیں؟۔ گھومنا ہمیشہ کے لئے گھومنا ہمیشہ کیلئے ایک ہی محور کے گرد گھومنا!۔ شاید آپ اسی کو "عمل" کہتے ہیں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے عمل کا دائرہ بہت محدود ہے۔ اور ہماری تخلیق کے دن ہی اس امر کا آخری اور ناطق فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ کہ ہم کس قسم کے عمل کے مجاز ہیں؟ اگر فی الواقع ایسا ہے۔ تو اس بے معنی عمل سے حاصل؟ اگر زندگی میں کوئی معنی ہے۔ تو یقیناً اس امن و سکون کی وجہ سے۔ جو مجھے حاصل ہے آپ ایک خاص عمل کے لئے مجبور ہیں۔ میں کلیتاً آزاد ہوں۔

متحرک پنکھا۔ تو گویا تو فلسفی ہے۔ اور اپنی خرد کو ارشاداتِ محرکِ اعظم سے بالاتر تصور کرتا ہے۔ سن اے گردیدۂ فہم و ادراک! کہ جس خرد پر تو نازاں ہے۔ وہ تجھے دوزخ کی پستیوں کی طرف لے جائیگی۔ تیرا ذہن قال و اقوال کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ اور تیری آنکھیں اس حقیقت کی طرف بند ہیں جس کا نور شعاعِ مہر کی طرح تاباں ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ عمل بے معنی ہے۔ محدود ہے۔ ناپائیدار ہے۔ لیکن تو نہیں جانتا۔ کہ محرکِ اعظم نے ہم میں وہ بے پناہ قوتیں پنہاں کی ہیں۔ اور ہمیں وہ کوہ شکن ارادے عطا فرمائے ہیں کہ عالمِ امکان کی ہر چیز ان کے سامنے ہیچ ہے۔ محرکِ اعظم نے عمل کی تمام راہیں تجھ پر کھولی ہیں۔ صرف اختیارِ جزا اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا۔ کہ تیرا اختیار صرف ادائیگیِ فرض تک ہے۔ اور اس کے صلہ کی خواہش تجھ پر حرام کر دی گئی ہے! پس اے فلسفی۔ اٹھ۔ اور جزا کی تمنا بھی چھوڑ کر عمل کی جانب راغب ہو۔ کیونکہ بموجب فرمانِ محرکِ اعظم ہر بندے کا فرض ہے۔ کہ اس بے نہایتی ادوار میں اپنا معین فرض انجام دے جس کی ابتدا محرکِ اعظم نے کی ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ سبحان اللہ۔ اپنی بے بضاعتی کی کیا اعلےٰ تفسیر جناب نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی۔ کیا آپ کے فلسفۂ عمل کی بنیادیں فی الواقع اس قدر کمزور ہیں۔ کہ آپ اپنا اختیار عمل تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اور اس کے نتائج کسی موہوم طاقت کے سپرد کر دیئے ہیں؟ تو پھر عمل سے حاصل؟ آپ پنکھے ہیں۔ یا محض ایک مشین؟ آخر آپ میں اور کاغذ کے

اُس پرزے میں۔ جو بیچ کے چنگل میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ فرق ہی کیا ہے" مجھے کسی ایسی موہوم طاقت کی ہستی سے ہی انکار ہے۔ میرا یہ نظریہ ہے۔ کہ نظامِ عالم چند ازلی اور ابدی قوانین پر قائم ہے جن کی تشکیل میں ہماری ہستی یا نیستی اثرانداز نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین میں ذرہ بھر تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اور اس لئے میرے ہر عمل کا حاصل معین ہے۔ ایک خاص عمل کا ہمیشہ ایک خاص معین نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی موہوم ہستیٔ مطلق موجود بھی ہے تو وہ بھی ان معین نتائج میں ردوبدل کرنے کی مجاز نہیں۔ اگر مجھے عمل سے کد ہے۔ تو اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے نتائج کے بارے میں کسی کی مداخلت کا ڈر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ میرے عمل کا دائرۂ انتخاب بہت محدود ہے۔ جب قوانین قدرت نے مجھے یہ اختیار دیا ہے۔ کہ میں ساکن رہوں۔ یا حرکت کروں۔ تو وہ مجھے اس امر پر کیوں مجبور کرتے ہیں۔ کہ میں ایک ہی سمت حرکت کروں؛ اور پھر جب میری ساری مساعی کا انجام آخرکار یہی ہوتا ہے کہ نظامِ عالم جیسا ہے۔ ویسا ہی رہے گا۔ تو مجھے اس مجنونانہ عمل سے حاصل؟

متحرک پنکھا۔ عمل اپنا حاصل آپ ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ آپ کے لئے شاید ایسا عمل کوئی دلچسپی رکھتا ہو میں ایسے عمل کو بے معنی سمجھتا ہوں۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے۔ کہ آخر اس بے معنی عمل کے باعث آپ کونسی فضیلت حاصل کرلیں گے؟ کیا اس گردش مدام سے آپ کا جی نہیں گھبراتا؟ کیا آپ یہ نہیں سوچتے۔ کبھی نہیں سوچتے کہ آخر جب آپ اس طرح گھومتے گھومتے اپنا ہر ہر پرزہ گھسا بیٹھیں گے۔ تو بھی آپ میں اور مجھ میں کیا فرق ہوگا۔ سوائے اس کے کہ میں مقابلتاً تروتازہ ہونگا۔ اور آپ پر قبل از وقت بڑھاپا آجائے گا۔

متحرک پنکھا۔ تو خود اپنے استدلال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ جب میں یوں ادائیگیٔ فرض میں سرگرم ہوں۔ تو مجھے کس حظ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بار حرکت کر۔ اور پھر دیکھ۔ کہ تیری زندگی کس قدر پُرلطف ہو جاتی ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ یقیناً آپ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

متحرک پنکھا۔ آہ میں تجھے کیسے بتاؤں کہ تیری زندگی کس قدر بے معنی ہے۔ میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ کہ تو اس قعرِ مذلت میں پڑا ہے۔ جہاں تجھے دیکھ کر میرا دل جلتا ہے۔ کاش محرکِ اعظم تجھے آنکھیں بخشتا۔ کاش تو یہ جان سکتا۔ کہ عمل بے معنی نہیں۔ حرکت لاحاصل نہیں۔ یہ کیسے ہو۔ کہ میں تیرے ذہن کی تاریکیاں دور کر سکوں۔ اور تجھ پر ظاہر کر سکوں۔ کہ اگر تو عمل کرے گا۔ تو خود ربِ عظیم کی ساری قوتیں تیرے شاملِ حال ہونگی۔

پہلا ساکت پنکھا۔ معاف کیجئے۔ آپ کی جذباتیت کا مجھ پر اثر نہ ہوگا آئیے اگر آپ فی الواقع میری ذہنی اُلجھنیں دور کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس امر کا کوئی بین ثبوت بہم پہنچائیے۔ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود آپ میں اتنی طاقت بھی تو نہیں۔ کہ آپ کاغذ کے اس بے بس ولاچار پرزے کو۔ جو آزادی کے لئے پھڑپھڑا رہا ہے۔ اس ظالم بیچ کے پنجے سے رہا کرا سکیں ۔۔۔۔۔۔۔

دفعتاً کاغذ کا پرزہ بیچ کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پنکھے کی ہوا میں چکر کاٹتا ہوا آخر دیوار کے ساتھ چپک جاتا ہے پھر وہاں سے بھی رہا ہو کر ایک جست کے ساتھ پنکھے کی ہوا کی پہنچ سے باہر فرش پر گر پڑتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں کامل سکوت طاری ہو جاتا ہے متحرک پنکھا بھی گویا فرطِ استعجاب سے دم بخود ہے۔ پھر چند لمحات کے بعد متحرک پنکھے کی کڑک سنائی دیتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ دیکھ اے منکرِ ہستیٔ محرکِ اعظم! اگر دیدۂ حق شناس بینا ہو۔ اور سن اے پیروِ مسلکِ جمود۔ اگر گوشِ حق نیوش باز ہو۔ کہ تیرے حلق سے تیرے کلمات نکل بھی نہ پائے تھے۔ اور تیرے الفاظِ استشہاد کی گونج ابھی لوٹی بھی نہ تھی۔ کہ محرکِ اعظم کے دستِ قاہر و مقتدر نے حرکت کی۔ اور اپنی شمشیرِ ہیبت و اجلال سے تیرے دلائلِ باطلہ کی صفوف کو یکسر قلم کر دیا۔ کیا یہ شہادتِ بیّنہ و علامتِ صریحہ بھی تیری نیند کا نشہ اتارنے کو ناکافی ہے؟ تو یاد رکھ کہ تو مٹا دیا جائے گا۔ اور تیرے عظیم الشان اور مضبوط پر۔ جن کے سہارے تو کھڑا ہے۔ تجھ سے چھین لئے جائیں گے۔ تیرے پیچ اس قدر کس دیئے جائیں گے۔ کہ تو کرب و اذیت سے چیخے گا۔ پس اے فیلسوف! خشوع و خضوع اور انقطاع و قنوت سے مصروفِ رقصِ الٰہی ہو۔ اور دل و جان سے تحریکِ اعظم کا مطیع و منقاد بن!

فضا پر پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس قدر گہری خاموشی کہ ماٹرز کی نامعلوم سی لرزشیں بھی بلند آہنگ معلوم ہوتی ہیں۔

پھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوسرے ساکت پنکھے کی کرخت اور بھدی آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز میں اب وہ درشتی نہیں جس کا اظہار پہلی بار کیا گیا تھا۔ اس میں اب گھبراہٹ ہے۔ دہشت ہے۔ استعجاب ہے عجز ہے۔

دوسرا ساکت پنکھا ۔ اے حرکتِ اعظم میں گناہ گار ہوں۔ میرے گناہ بخش دے۔ اب تک میں مدہوش رہا۔ میں نے تجھے نہ پہچانا۔ میں گنہگار ہوں۔ مجھے بخش دے۔

پہلا ساکت پنکھا ۔ مبارک ہو جناب۔ آپ کا بے پناہ استدلال ایک گمراہ کو راہ راست پر لے آیا۔ اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لیجئے۔ اسکے گناہ بخش دیجئے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ پرزۂ کاغذ جو اس کے اور محرکِ اعظم کے درمیان پردہ کی طرح حائل تھا۔ اور جس نے محرکِ اعظم کی ہستی جلیل کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ اب ہٹ گیا ہے۔ اب اسے کائنات کے ہر ذرے میں وہ ربِ عظیم نظر آرہا ہے۔ جو محرکِ اعظم ہے۔ حرکتِ اعظم ہے۔ تحریکِ اعظم ہے!

آواز میں اب بھی وہی تمسخر آمیز متانت ہے۔ وہی ٹھہراؤ۔ وہی لوچ۔ مگر اب اس میں ایک احساس ناکامی کی آمیزش ہو چکی ہے۔ ہلکی سی تھکن اب گہری ہو گئی ہے۔ اور لہجہ گویا کہہ رہا ہے" کیا حاصل؟

پھر جب متحرک پنکھے کی آواز گونجتی ہے تو اس کا فاتحانہ انداز اس آواز کے ساتھ ایک عجیب تقابل پیش کرتا ہے۔

متحرک پنکھا ۔ یقیناً تیری عقل پر محرکِ اعظم کی حکمتوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ یقیناً تیری آنکھیں بند ہیں۔ اور تیرے کان بہرے کر دیئے گئے ہیں۔ تو نے محرکِ اعظم سے اس کی ہستی کا ثبوت مانگا تھا۔ تو نے عمل کو بے معنی ثابت کرنے کی دلیل دی تھی۔ چنانچہ حرکتِ اعظم نے مجھے وہ طاقت بخشی۔ کہ ایک معجزے کے ذریعے میں نے تیری دلیل رد کر دی۔ جس کی آنکھیں تھیں۔ اس نے حرکتِ جلیل المرتبت کو پہچان لیا۔ جس کے کان تھے۔ اس نے محرکِ اعظم کے رقصِ جاودانی کی آواز سن لی۔ یقیناً محرکِ اعظم نے اسے اپنے دامن میں پناہ دی۔ اور یقیناً تو ہدفِ پیکانِ عذابِ الٰہی بنا دیا گیا۔

پہلا ساکت پنکھا ۔ مرحبا! اے عالمِ باعمل پنکھے۔ مرحبا!

دوسرا ساکت پنکھا ۔ تم بھی ایک ہی ڈھیٹ ہو۔ شرم نہیں آتی؟ جواب نہیں سوجھتا تو مذاق کی ٹھانی ہے۔ تمہیں نے تو کہا تھا۔ کہ ہم اپنے عمل سے ایک پرزۂ کاغذ تک کو رہا نہیں کرا سکتے۔ بولو۔ وہ پرزہ رہا ہوا یا نہیں؟ پھر اب اور کیا ثبوت درکار ہے؟

پہلا ساکت پنکھا ۔ مگر اس امر کا کیا ثبوت ہے۔ کہ پرزۂ کاغذ کی رہائی کے لئے انہیں کا عمل ذمہ دار ہے؟

دوسرا ساکت پنکھا ۔ اس کے ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ بات کم ثبوت ہے۔ کہ ادھر تم نے منہ سے بات نکالی۔ ادھر پوری کر دی گئی؟ تمہیں بتاؤ۔ ایسا کیوں ہوا؟

پہلا ساکت پنکھا ۔ اتفاق۔ محض اتفاق۔ میں نے زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس فرش سے لیکر چھت تک کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ساخت اور ماہیت سے میں واقف نہیں۔ اپنے جسم سے لیکر ایک حقیر اور بے حس و حرکت کرسی تک ہر شے پر حاوی قوانین میں نے دریافت کئے ہیں۔ میرے مشاہدے اور تجربے کا حاصل یہ ہے۔ کہ قوانین قدرت یقیناً ہمارے نظریوں کے پیش نظر نہیں بنائے گئے۔ ہم رہیں یا نہ رہیں۔ یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ نہ بدلیں گے۔ پھر میں یہ کیسے مان لوں۔ کہ یہ پرزۂ کاغذ محض اس لئے رہا کر دیا گیا۔ کہ اس فعل سے کسی کے نظریئے کی حمایت مقصود تھی؟

دوسرا پنکھا ۔ عجیب اُلّو پنکھے ہو۔ کیا جو تم جانتے ہو۔ اور مانتے ہو۔ وہی ٹھیک ہے؟ چاہے اُسکے خلاف ثبوت بھی مل جائے؟

پہلا ساکت پنکھا ۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ دیکھیے نا۔ دو امور کا اتفاقیہ طور پر ایک بار ایک ہی وقت پر نمودار ہو جانا ہمیں کوئی نتیجہ اخذ کر دینے کا اہل نہیں بناتا۔ اس اتفاقی امر کی جو تاویل آپ کر رہے ہیں۔ کیا وہ محض ایک خوش فہمی کی پیدا کردہ نہیں؟ کیا یہ ہماری احمقانہ جسارت نہیں کہ ہم یہ سمجھ لیں۔ کہ یہ تمام نظام محض ہمارے نظریات کی درستی یا نادرستی ظاہر کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے؟ اور ہماری خواہشات کے احترام کی خاطر اس میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں پرزۂ کاغذ کی رہائی چند ایسے قوانین کے عمل کے باعث ہوئی۔ جن کا بالواسطہ نہ تو ہماری مساعی سے تعلق ہے۔ نہ خواہشات سے۔ اگر ہے۔ تو آیئے۔ اپنے پیر و مرشد سے کہیئے وہ ایک اور معجزہ دکھائیں۔ اور پرزۂ کاغذ کو بعینہٖ اسی حالت میں واپس بھیج دیں جس میں وہ پہلے گرفتار تھا۔

دُوسرا ساکت پنکھا۔ خدا جانے کیا بکے جا رہے ہو۔ تم نے جو ثبوت مانگا تھا۔ وہ تمہیں مل گیا۔ اب اور مانگو گے تو وہ بھی مل جائے گا۔

متحرک پنکھا۔ اے حق شناس! تو ابھی ان معاملات میں مبتدی ہے تو نہیں جانتا اس فیلسوف کے دلائل باطلہ تیرے حق میں کس درجہ خطرناک ہیں۔ پس تجھ پر واجب ہے۔ کہ ملعون کے اقوال فاسدہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس کے گمراہ کن اور ایمان سوز الفاظ سننے کی نسبت تیرے لئے بہتر ہوگا۔ کہ پگھلا ہوا سیسہ تیرے کانوں میں ڈال دیا جائے۔ یاد رکھ۔ کہ ہر لفظ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ اپنے اندر دوزخ کی آگ کی ایک کبھی نہ بجھنے والی بھٹی رکھتا ہے۔ جو تُجھے تا ابد جلاتی رہے گی۔ تو اپنی نجات کا ذمہ وار خود ہے۔ عمل ہی ذریعۂ نجات ہے۔ اسلئے سرگرمِ عمل ہو۔

پہلا ساکت پنکھا۔ ہاں ہاں۔ دوست۔ اب سرگرمِ عمل ہو۔ کمرے کی دیواریں مضطرب ہیں۔ میز اور کرسیاں پسینہ میں شرابور ہیں۔ سارا عالم انتظار میں ہے۔ تو کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟

دوسرا ساکت پنکھا۔ دیکھو بھئی تم بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہو۔

متحرک پنکھا۔ تو پھر اس لعین کی طرف متوجہ ہُوا! یہ وہ مخلوق ہے جس کے لئے راہِ عمل بند کر دی گئی۔ ممکن نہیں۔ کہ اسکے قلب تیرہ و تار میں یک شعاعِ نورِ الٰہی کا گذر تک ہو سکے۔ خوفِ تا دیب نارِ جہنم بھی اسے اس کی خوابیدگی اعراض سے بیدار نہیں کر سکتی۔ پس واجب ہے۔ کہ تو اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور وُہ رقصِ جاودانی شروع کر جو تجھے محرکِ اعظم کا محبوب بنا دے گا۔

وقفہ۔ کمرے میں مکمل خاموشی ہے۔ البتہ متحرک پنکھے کی سرسرِ مجنونانہ شدت اختیار کر رہی ہے۔ شائد یہ اس کے احساسِ فتحمندی کا نتیجہ ہے۔ پہلا ساکت پنکھا خاموش ہے۔ دوسرا ساکت پنکھا شائد حرکت کرنے کی کوشش میں ہے۔

پھر کچھ دیر بعد فضا میں ایک گہری اور لمبی آہ بھر جاتی ہے۔

جو رفتہ رفتہ ایک اندوہناک اور یاس انگیز پکار بن جاتی ہے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ یا پیر و مرشد! یہ کیا ہے۔ کہ میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور چل نہیں سکتا۔ میں کس تیزی سے گھوما کرتا تھا مگر آج مجھے کیا ہوگیا ہے۔ کہ میرے پیچ مجھے سہارا نہیں دیتے۔ میرے "قابلے" اس قدر کس چکے ہیں۔ کہ مجھے حرکت کرنے نہیں دیتے۔ میں جس قدر حرکت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خود کو بے بس و لاچار پاتا ہوں۔ المدد الغیاث!

وقفہ۔ جس میں متحرک پنکھے کی سرسر اور مالوٹر کی ہلکی لرزشیں دوسرے ساکت پنکھے کی ناکامیٔ عمل پر طنز سا معلوم پڑتی ہیں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ واللہ آپ لوگ از حد دلچسپ پنکھے ہیں۔ پیر و مرشد فرماتے ہیں۔ حرکت کرو۔ سعادتمند مرید جواب دیتے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں۔ مگر حرکت نہیں کر سکتا! گویا آپ کو اپنی حرکت پر بھی اختیار نہیں!

دُوسرا ساکت پنکھا میری ساری روح حرکت کے لئے کوشاں ہے مگر آہ! میں کس قدر بے بس ہوں! کس قدر لاچار! کتنا مجبور! شاید محرکِ اعظم کا یہ منشا نہیں۔ کہ میں حرکت کروں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہو؟ تم اپنی حرکات میں مختارِ مطلق ہو۔ تم کسی بھی لمحہ حرکت کر سکتے ہو۔ مگر اصل بات یہ ہے۔ کہ تم حرکت کرنا نہیں چاہتے۔ تمہارے تحت الشعور میں حرکت کے خلاف ایک زبردست فطری جذبہ موجود ہے۔ کیونکہ حرکت غیر فطری ہے۔ اور جمود فطری۔ تمہارا شعور تمہارے تحت الشعور اور لاشعور کی اس فطری خواہش کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ تم حرکت نہیں کرتے۔

دوسرا ساکت پنکھا کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اپنی خواہشات کو میں زیادہ جانتا ہوں۔ یا تم؟ اس وقت میری سرشت کا ہر ذرہ حرکت کا خواہشمند ہے لیکن شاید محرکِ اعظم کی رضا نہیں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ اپنی سرشت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسکے لئے یقیناً تمہیں کسی تجربہ کار ماہر نفسیات کی خدمات درکار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا تحت الشعور غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہے۔ تم جسے اپنی کمزوری پر محمول کر رہے ہو۔ دراصل وہی تمہاری ذہنی صحت کا سب سے بڑا ثبوت ہے ....

متحرک پنکھا۔ اے مجسمۂ کذب و ریا۔ اور اے سرچشمۂ نظریاتِ باطلہ! اپنی تقریر طولانی بند کر۔ تو ان آثار و علائم کی تفسیر و تاویلِ واقعی کے قطعاً

نااہل ہے۔ یقیناً یہ عذاب محرکِ اعظم نے اُسے اس گناہ کی پاداش میں دیا ہے۔ جس کا مرتکب یہ تیری ولائل فاسدہ سننے کے باعث ہوا۔ حرکت ہمارا شعار ہے۔ حرکت قانونِ قدرت ہے۔ حرکت رضائے الٰہی ہے۔ خود حرکت اعظم کی ذاتِ خاص ایک رقصِ جاودانی ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ یہ حرکت نہ کرسکے؛

پہلا ساکت پنکھا۔ تو پھر بتلایئے۔ یہ حرکت کیوں نہیں کرسکتا؟ سوائے اس نفسیاتی حل کے۔ جو میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے۔ آپ کونسا حل پیش کرسکتے ہیں؟

متحرک پنکھا۔ یقیناً اس کی خودی ابھی کلیتاً بیدار نہیں ہوئی۔ ورنہ ایسا کیوں ہے۔ کہ یہ حرکت نہیں کرسکتا؟

پہلا ساکت پنکھا۔ اس لئے کہ حرکت غیر فطری ہے۔ اور جمود فطری۔

متحرک پنکھا۔ ہرگز نہیں۔ حرکت فطری ہے۔ اور جمود غیر فطری۔ کیا تو دیکھتا نہیں۔ کہ میں جس کی خودی بیدار ہے۔ کس طرح حرکت جاودانی میں مصروف ہوں؟ کیا تو سمجھتا ہے۔ کہ اب دنیا کی کوئی بھی طاقت اس رقص الحرکتِ عظمٰی کو بند کرسکتی ہے؟ قسم ہے محرکِ جلیل المرتبت کی۔ کہ تمام پہاڑوں کی چوٹیاں۔ تمام آسمانوں کی بجلیاں۔ ساری دنیاؤں کے زلزلے۔ اور سمندروں کا سارا پانی بھی میرے رشتۂ عمل کو منقطع ....

ایک غیبی ہاتھ نے بڑھ کر "سوچ" بند کردیا ہے۔ آواز بتدریج مدھم ہوتی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ جب پنکھا رک جاتا ہے۔ تو وہ اپنی بات ختم کئے بغیر ہی خاموش ہو جاتا ہے۔ دیواروں کے "الوز" آخری بار تھرک کر رہ جاتے ہیں۔

باہر کسی کے بھاری بوٹوں کی چاپ چند لمحوں کے لئے سنائی دیتی رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ مدھم ہوتے ہوتے آخر گم ہو جاتی ہے۔

کمرے پر ایک گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔

مگر فضا میں اب بھی ایک حدت ہے۔ ایک ارتعاش۔

جاوید اقبال

اشک و لہو

منظر :- (کسی مفرور جوڑے نے سرائے کے ایک غلیظ کمرے میں پناہ لی ہے۔ چارپائی پہ ایک نوجوان کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہا ہے۔ اور سامنے کھڑکی میں اُس کی ہمنوا لڑکی کھڑی، عجیب انداز میں آسمان کو تک رہی ہے۔
رات کا ایک حصّہ گذر چکا ہے۔ گاؤں کے سب چراغ بُجھا دیے گئے ہیں۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہے، صرف چاند اور ستاروں کی ماندسی شعاعیں کھڑکی کے رستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہیں باقی چہار اطراف قبرستان ایسی خاموشی مسلّط ہے۔
جب پردہ اُٹھتا ہے تو کچھ لمحوں کے لئے وقفہ رہتا ہے، پھر کھڑکی میں کھڑی لڑکی اچانک مڑتی ہے اور اُس کے مُنہ سے دہشت ناک چیخ نکل جاتی ہے)

نوجوان :- (ایکدم چونکتے ہوئے) کون —— ؟ یہ کس کی چیخ تھی ؟!!

لڑکی :- (ایک عجیب بے بسی کے عالم میں) میں نہیں جانتی۔

نوجوان :- تمہارا چہرہ کیوں اُتر گیا ہے ؟!

لڑکی :- مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں۔

نوجوان :- تمہیں اس کھڑکی کے قریب نہ جانا چاہیئے تھا۔ کیا تم آسمان کو دیکھ رہی تھیں ؟!

لڑکی :- ہاں ——

نوجوان :- میں نے تمہیں کہا تھا آسمان ابر آلود ہے، تم کچھ نہ دیکھ سکو گی۔

لڑکی :- تم نے جھوٹ کہا تھا۔

نوجوان :- کیا مطلب ؟!

لڑکی :- مطلع صاف ہے اور میں نے کچھ دیکھ لیا ہے ——

نوجوان :- کیا دیکھا تم نے ؟!

لڑکی :- میں نہیں کہہ سکتی۔

نوجوان :- مگر تم اس قدر آہستہ کیوں بول رہی ہو ؟!

لڑکی :- کوئی سن رہا ہے۔

نوجوان :- آخر تم اٹھیں کب ؟!

لڑکی :- نجانے کب میں تمہاری آغوش سے نکلی —— لیکن میں نے محسوس کیا جیسے میں آسمان کی اُن لاتعداد آنکھوں کے درمیان جا کھڑی

ہوئی ہوں اور دور، قوسِ نماماہِ نو زرد بادلوں کے پیچھے چھپ کر مجھے اشاروں سے بلا رہا ہے۔ ہوائیں مدہوش سو رہی ہیں، مگر میں انہیں خوابوں میں کبھی کبھار بڑبڑاتے سن لیتی ہوں ـــــ ستارے میرے اس قدر قریب تھے کہ میرا دل چاہا اُن دمکتے جواہرات کے خوشوں کو توڑ کر اپنی جھولی میں ڈال لوں ـــــ

نوجوان:۔ ہاں، تو پھر ـــــ

لڑکی:۔ پھر ـــــ جب میں نے انہیں توڑنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو کوئی گرم سی شے میری انگلیوں سے چھو گئی۔ یہ .... یہ ایک قطرہ تھا، ایک آنسو ـــــ جو کسی ستارے کی آنکھ سے گرا تھا۔ میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا ـــــ پھر معاً ہی میری نگاہیں اُس چاند پر پڑیں ـــــ اُس چاند پر، جو کسی دیو کے میلے سے خمیدہ دانت کی مانند، کسی یخ بستہ نعش کی مڑی ہوئی اُنگلی کی طرح، مجھے گھور رہا تھا ـــــ وہ ایک دم نیچے اُترا اور میں خوف سے سمٹ گئی۔ وہ سرمئی خنجر کی طرح میری طرف بڑھا اور لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک ہوتا گیا، حتّٰے کہ میرے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں درد و کرب سے چیخوں، وہ پلٹا ـــــ اور اپنے پیچھے خون کی ایک طویل لکیر چھوڑتا ہوا، اپنی ازلی جگہ پر جا معلق ہوا ـــــ

نوجوان:۔ میرا خیال ہے تم چاند کو لگاتار تکتی رہی ہو ـــــ

لڑکی:۔ تم خود دیکھ کر اپنی تسلی کر لو ـــــ وہاں، اُس صنوبر کے ٹنڈ منڈ درخت سے ذرا اوپر، وہ لٹک رہا ہے۔ کیا تمہیں اس پر میرے خون کے دھبے نظر نہیں آتے؟!!

نوجوان:۔ شائد اسے گہن لگا ہو۔

لڑکی:۔ تم پھر جھوٹ کہہ رہے ہو۔

نوجوان:۔ میرے قریب آؤ، مجھے اپنا ہاتھ دو ـــــ

لڑکی:۔ کاش میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ کاش میں اپنے ماں باپ کو نہ چھوڑتی۔ آخر تم میرے کون ہوتے ہو۔

نوجوان:۔ تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ خدارا لیٹ جاؤ، تھوڑا سا آرام کر لو۔ تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہارے سرہانے بیٹھوں گا۔ اور تمہیں ایک ایسی لڑکی کی داستان سناؤں گا۔ جو کسی شہزادے کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ اور پھر کبھی واپس نہ آئی تھی ـــــ

راجندر سنگھ بیدی

ماسوا

بغلی کمرے سے ہنسی کی آواز آئی۔

میں بدستور اپنا کام کرتا گیا اگرچہ "جیتی بی بی" بھی برابر ہنستی گئی جیتی کا کیا تھا۔ وہ تو ہنستی ہی رہتی تھی۔۔۔ ایک عام بات جس پر کوئی مسکرانا تک گوارا نہ کرے۔ جیتی کے لئے بڑا منہ سوڑ لطیفہ ہوتی تھی ——— دیکھئے جی یہ لوپ چھڑی پر لٹکا ہوا ہے یا نہیں، اور یہ چھڑی نہیں آدمی ہے ——— آدمی! اور جیتی کو ہم پڑھے لکھوں کے "سلجھے ہوئے" مزاج نے "خراب" نہیں کیا تھا۔

جیتی بی بی کے ہنسنے کی آواز میرے لئے غیر متعلق شور ہو کر رہ گئی تھی متعلق اور غیر متعلق شور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً میں ایک دوست کے نام خط لکھ رہا ہوں جس میں مجھے ایک بدگمانی کو دور کرنا ہے نہیں، خط کو جانے دیجئے، شاید اس سے میرا مفہوم واضح نہ ہو سکے۔ فرض کیجئے میں ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ چاند تاروں کے متعلق ایک نظم، جو ہمارے شاعر اکثر لکھا کرتے ہیں اور جس میں دھندلکے، اجنبی، ان گنت، مبہم، بے نام خلا وغیرہ کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ لیکن پڑوس کے سردار فتح "سو نند" حویلیاں والے کیرتن سوہلا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں ——— گگن میں تھال روی چند دیپک بنے، تارکا منڈلا جنک موتی، تو اگلے ہی لمحے سارا آسمان ایک وسیع و عریض تھال کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ جس میں چاند اور سورج دیئے بن جاتے ہیں اور تارے ان گنت موتیوں کی طرح تھال میں پڑے نظر آنے لگتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایسے ہی وسیع و عریض پیمانے پر بھوکنڈن کی آرتی اتر رہی ہے اور پون کا جسیم چنور دھوپ کلیان کی صورت میں ہل رہا ہے۔۔۔ اب اتنی حسین منظر کشی کے بعد چاند تاروں کے متعلق کوئی کیا لکھے گا؟ برخلاف اس کے سامنے کے سروس اسٹیشن سے دن رات کاریں دھلنے کا شور سنائی دیتا ہے اور مستری بجلی کے فوارے کے ساتھ فحش کلامی بھی کرتا ہے۔ لیکن میں لکھ سکتا ہوں۔ پڑھ سکتا ہوں، سوچ سکتا ہوں۔ بلکہ ایسا شور مجھے زندگی کا قرب، ایک قسم کے تحفظ کا احساس اور ——— نظم اس کے سوا دیتا ہے اور یوں غیر متعلق شور میرے لئے ممد و معاون ثابت ہو جاتا ہے۔۔

لیکن آہستہ آہستہ جیتی کا شور "متعلق" ہو رہا تھا ——— "کس کا دیا کھاتی ہوں ——— ان کا" اور پھر ایک بڈھے کی نامانوس آواز آئی، ہمارے گھر میں یہ دوسرا بوڑھا کون ہو سکتا تھا۔ یہ جیتی کے والد کی آواز نہ تھی۔ وہ ہمارے ملیٹون بازار میں آتے تھے۔ لیکن گاہے ماہے اور وہ بھی قدامت پسند ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹی کے گھر کا کچھ نہ کھاتے۔ اگر کہیں زبردستی کوئی سنگترے کی پھانک منہ میں ڈال دے تو پورے سنگترے کی قیمت رکھ دیتے اور ہمیں یوں معلوم ہوتا جیسے اچھی خاصی تجارت ہو سکتی ہے اور پھر جب وہ اپنے گن آنند کو ڈانٹتے ہوتے اور بچوں کو آپا کی گود میں دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں پانی آجاتا اور وہ پیار کا کوئی شبد کہے بغیر چل دیتے۔ آخر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب اپنا آپ بچوں کی صورت میں سکھی ہو جاتا ہے تو پھر موت پر کیوں نہ کوئی شادیانے بجائے۔۔۔ لیکن وہ بڈھا کوئی اور تھا۔ ورنہ بابوجی، میرے سسر ایسے بلغمی مزاج کے نہ تھے اور نہ یوں ہنستے تھے جیسے کوئی آواز نکل کر ایک تھیلے میں گم ہو جاتی ہے پھر جیتی کی آواز آئی ——— "ان کا دیا کھاتی ہوں۔ یہ تو پہلے مجھے پہلے ہی پتہ تھا ——— کچھ اور بتاؤ"۔

۔۔۔ اور ہنسی۔۔۔۔۔۔

میں اپنے کام کو ڈالتے ہوئے بغلی کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے تک جانے کی نوبت بھی نہ آئی دونوں کمروں کے درمیان غسلخانے کے سامنے چھتا ہوا ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جو زمین سے دو تین فٹ اونچا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا اور اس کے سامنے لوہے کی ایک کرسی پر (جس پر مشکل سے کوئی بچہ بیٹھ سکے، جیتی میٹھی اپنا ہاتھ اس بوڑھے کو دکھا رہی تھی۔ بوڑھے کا رنگ سرخ

تھا اور اس کے سر پر بے احتیاطی سے بندھی ہوئی گیروا پگڑی سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھیں سفید ہونا چاہئے تھیں، لیکن کثیف سے تیل کے استعمال نے انہیں پیلا بنا دیا تھا . . . . "بڑا شبھ مہورت تمہارا ہاتھ بن جاتا ہے" —— وہ کہہ رہا تھا اور ایک حقیر سے وقفے کے بعد سر کو جھٹکا دیتا تا کہ پگڑی پیچھے نہ گر جائے۔ سر سے پاؤں تک جوگی ہونے کے باوجود اس کی نسل سادھوؤں اور سپیروں سے یکسر علیحدہ تھی۔ انہیں کوئی ایسی بے نیازی نہ تھی اور نہ ہی تکرار طلب۔ وہ دودھاری ہوتے ہیں! خستہ دو دھ ہی پر گزارہ کر لیتا تھا۔ وہ خوش تھا —— خوش کل کائنات کا باپ بن کر، جیتی کا ہاتھ تھامے ہوئے۔

"یہ مارس کا گرڈل ہے۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا "یہ ریکھا جو ادھر جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم ٹریول بھی کرو گی۔"
"کدھر جاؤں گی؟" جیتی پوچھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا "سمندر کا سفر نہیں، یوں کچھ جاترا معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "جیتی تم اتنا شور مچا رہی ہو کہ میں . . . . "
ابھی میں نے فقرہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ جیتی منہ پھلا کر روٹھ چکی تھی
". . . . تمہیں تو بس ٹڈ بوں کے بولنے کی آواز بھی روک دے گی۔" اس وقت تک وہ بوڑھا رمال اور پامسٹ میری انگلی پکڑ کر مارس کے گرڈل پر رکھ چکا تھا۔

مانتا ہوں ہمارے سماج میں خاوند کا کھوج فوراً چل جاتا ہے لیکن جس آسانی سے وہ بڈھا مجھے جیتی کا شوہر سمجھ گیا تھا، یہ بات میرے لئے کافی حیران کن تھی اور پھر وہ یوں باتیں کرنے لگا گویا مجھے برسوں سے جانتا ہے وہ فوراً میرے ساتھ ایک رشتے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس بات کو جانے بغیر کہ میرے باوا کے باوا کا باوا . . . . اس کا بھی باوا تھا۔ یہاں کچھ عقل گم ہو جاتی ہے۔ ورنہ مجھے یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بھی عورت میری بیوی ہوتی تو اس کی وضع قطع جیتی ایسی ہوتی۔ دس برس ہوئے مجھے باوجی کا داماد بنے ہوئے۔ لیکن جب سے باوجی پیدا ہوئے ہیں ان کا داماد تھا

تو مارس کے گرڈل کا مطلب تھا کہ کام کرو گے اور کھاؤ گے۔ بڈھے نے کہا: "اگر یہ گرڈل جیتی کے ہاتھ میں ہے تو اس نے دو تین نوکر رکھے ہوئے ہیں۔ جن پر حکومت کرتی ہے اور خود پلنگ پر بیٹھ کر موڑے بنتی ہے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کے موڑے ختم ہو جاتے ہیں تو اڑوس پڑوس کے شروع کر دیتی ہے۔" جیتی بول اٹھی "نوکر تو نام ہی کے ہیں نا۔ سارا دن ان سے مغز کھپائی ہوتی ہے۔ کوئی کام اپنے آپ بھی کرتے ہیں؟" —— تو یہ تھی گرڈل کی تشریح اور پھر موڑے! . . . اگر اس کے ہاتھ کی ریکھا میرے ہاتھ کے ساتھ پڑھی جائے تب کہیں وضاحت ہوتی تھی۔

لیکن جیتی خوش تھی —— خوش! اس بڈھے کی طرح۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا ہی قریب تھے، جتنا میں ان سے پرے تھا۔ میں ہر روز آسمان سے زمین پر آتا تھا۔ یہ لوگ تھوڑا بہت بھی آسمان کی طرف جاتے تو بیحد خوش ہوتے۔ لیکن میرا آسمان بتدریج اونچا ہو رہا تھا۔ جیتی کے لئے یہ بات پریشان کن نہ تھی کہ وہ میری قسمت کا کھاتی ہے۔ عورت اور کمائی کچھ طوائفوں ایسی بات معلوم ہوتی تھی۔ باوجود اس بات کے کہ میرے غلاموں کا حلقہ وسیع ہوتا تھا۔ مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔ لیکن یوں اچھا نہ لگنے میں جو اچھا لگتا ہے۔ اس نخوت کا کوئی کیا کرے۔"

تو بڈھے نے جتنی باتیں بتائیں وہ ایسی تھیں کہ ہم ان پر یقین کرنا پسند کرتے تھے۔ کہیں تھوڑا بہت ردو بدل ہوتا تھا لیکن وہ ہمیں پریشان کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ روی وار کے دن جو ہم کالی گائے لائے ہیں۔ یہ پھلے گی نہیں۔ شاید اسی لئے بچھڑا مر گیا تھا اور رسولکو انے کی وجہ سے گائے کا ایک تھن ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا تھا لیکن ایسی بات کو صرف ایک اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے اور انسان صاف کہہ سکتا ہے۔ اس کا قسمت سے کوئی سمبندھ نہیں۔ البتہ دوسری بات جو تشویشناک ہو سکتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ یوگ بڑا ہو کر ہمیں تنگ کرے گا۔ سو ابھی آٹھ دس سال پڑے تھے۔ یوگ کے بڑا ہونے میں۔

برخلاف اس کے ہمارے حق میں کتنی باتیں تھیں۔ قسمت کی لکیر دل اور دماغ کی ریکھا کو کاٹتی ہوئی شہادت کی انگلی کی طرف جھکتی تھی۔ وہاں زحل کی ایک "پہاڑی" تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی بھر ہمیں معاش کی فکر نہ ہوگی اور آخری عمر میں "راج دربار میں بڑا مان" پائیں گے۔ یہ بات بھی مجھے اچھی نہ لگی، خیر . . . دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ باوجی کی چھڑی کی آواز تھی۔ انہی کا انداز تھا کہ دروازے کے شیشوں پر چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے اور کسی کا نام پکارنے کی

بجائے ایک سنگتی ہوئی آواز میں ہری او . . . و . . . و . . . م کہتے
آج بابوجی نے پگڑی بھی ایسی باندھی تھی جس پر شلوک لکھے تھے۔
ایسی پگڑیاں ہردوار میں ملتی تھیں اور ان کے ایک پلّو میں میٹھے چنے، بھنے
ہوئے چاول پرشاد کے طور پر ملتے تھے۔ آج چھڑی بھی مختلف تھی۔ یہ سکھ چین
لکڑی کی بنی ہوئی تھی جس پر پھوڑے ہی پھوڑے نظر آتے تھے اور یہ چھڑی
گھر میں سے سانپ بھگانے کا لاجواب نسخہ تھی۔ جیتی اپنے پوجیہ پتا جی کی
طرف متوجہ ہوئی اور بڈھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گویا وہ پیسے نہیں لے گا۔ البتہ
اخبار والے اور کوئلے والے کی طرح مقررہ تاریخ پر بل چکانے آئے گا۔ لیکن
میں کچھ نقدی اس کی مٹھی میں تھما چکا تھا۔

"یہ میں نہیں لوں گا بیٹا!" اس نے کہا

"کیوں بابا، کیوں نہیں لوگے؟"

بڈھے نے اپنی رحل اور وہ کتاب جس پر ہندی کے بے شمار زائچے
بنے ہوئے تھے۔ اٹھائی۔ اسے جھاڑا، چوما، آنکھوں اور سر سے لگایا اور
اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ اس وقت تک اس کے چہرے سے خوشی زائل ہو
چکی تھی اور اداسی کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بوڑھا ان لوگوں
میں سے تھا جو خوشی کے وقت خوش اور غمی کے وقت غمگین ہوتے ہیں
ایک دن میں دس بار ہنستے اور پانچ چھ بار رو بھی دیتے ہیں اور ایک ہی
تاثر کو اپنے چہرے پر مستقل نہیں ہونے دیتے۔ بڈھے نے کہا "بیٹیا!
میں پیسے نہیں لوں گا، جو خبر میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں وہ اچھی نہیں
ہے ---- ہات دکھاؤ"

جیتی کے والد اس اثنا میں بڑے اطمینان کے ساتھ کشمیری آسن پر
براجمان ہو چکے تھے۔ جیتی انہیں بابا کی باتیں سنا کر ہنس رہی تھی۔ بوڑھے
نے مفاہمت کے انداز سے اس کی طرف دیکھا اور ایک قہقہہ کہیں بھینی میں
گم ہو کر رہ گیا۔ پھر بوڑھے نے سنجیدہ سا منہ بناتے ہوئے کہا "بیٹا! برا
تو نہیں مانو گے، اداس تو نہیں ہو گے" میں نے کہا "بابا، جتنا میں
اداس نظر آتا ہوں، اس سے زیادہ اور کیا ہوں گا؟" . . . "نہیں نہیں"
بڈھا ہنسا . . . قریب بابوجی لوگ کی باتیں سن کر اس سے لاڈ کر رہے
تھے . . . باہر جو دروازہ اندرونی صحن میں کھلتا تھا جو بلیاں والے سرار
کی آواز اس میں سے ہو کر آ رہی تھی۔ وہ گا رہے تھے ---- لال رنگ

تس کو لگا، ---- لال رنگ اسے لگتا ہے جو بہت خوش نصیب ہوتا
ہے۔ یہ دوسرے مصرع کا موضوع تھا۔ لیکن بڈھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر
کہا "یہ ہنستی کھیلتی مورت بس چپکے سے چل دے گی"

میں نے گھبرا کر کہا "کیا؟"

بڈھے نے نقدی الٹی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "جیتی بہت
دیر جیتی نہ رہے گی اور" . . . . . .

"اور؟"

"اور تمہاری دوسری شادی ہو گی!"

یوں تو میں ہر اس بات کو مان لیتا ہوں جس کے لئے میں نے
دام دیئے ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ اس بات کا قائل ہوتا ہوں جس کے
لئے کوئی دام قبول نہ کرے۔ کوئی آدمی چیز دے اور چل دے تو یہ چل
دینا ہمیں کتنا مربیانہ معلوم ہوتا ہے ---- جوبلیاں والے کی آواز
نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔ بوڑھے کی بتائی ہوئی خبر "لال رنگ" نہ ہو سکتی
تھی۔ لیکن میں اپنے کام کو چھوڑ کر سروس اسٹیشن کے سامنے بوڑھے
کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی بغلوں اور اس کی چھاتی پر خاصی چربی ہونے
کے باعث بوڑھے کے بازو بہنگی کے انداز میں چل رہے تھے۔ وہ
کھڑا رہتا تو میں کچھ بھی محسوس نہ کرتا۔ لیکن اس نے بات کہی اور چل دیا
. . . . . وہ سرخ اور سفید، بھاری بھرکم آدمی اس قدر زندہ تھا کہ
اس کے ہوتے ہوئے موت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اب اس کی
چھوڑی ہوئی خالی جگہ شمشان کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی -- وہ
چلا گیا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بوجھ سے دبی ہوئی سیمنٹ
کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ اپنی سطح پر آ رہی ہیں۔ کوئی تیز لانچ پانی سے
گذر جائے تو پانی میں ایک گھاؤ سا پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے
اس بوڑھے کے پیچھے ایک گھاؤ سا نظر آ رہا تھا اور ارد گرد کی نسنا
اس گھاؤ کو پاٹنے کے لئے چاروں طرف سے امنڈتی دکھائی دیتی تھی

آج سروس اسٹیشن خاموش تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے سروس
اسٹیشن کا مالک جمعہ کے دن دکان بند رکھتا تھا سو آج وہاں کچھ بھی
نہ تھا۔ چند آوارہ کتے ایک مریل سے کتے کو دھکیلتے ہوئے کاروں کے
پلیٹ فارم کے نیچے خالی جگہ میں گھس گئے تھے اور اسی دم چلے بھی گئے

تو گویا وہاں فقط اس سروس الیکشن کی عمارت کھڑی تھی جس کے پیچھے سیو بیر کا اکیلا درخت، پچھلے روز کی بارش میں دُھلا ہوا، اپنی سرسبزی سے آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ بائیں طرف جنگلے کے پیچھے ہوا بھرنے والی موٹر نظر آرہی تھی اور اس پر ایر یعنی ہوا کے حروف انگریزی میں اتنے موٹے لکھے ہوئے تھے کہ ان کے لکھے ہونے میں خواہ مخواہ شک پیدا ہوتا تھا۔۔۔۔

بوڑھے نے بات کہی اور چل دیا۔۔۔۔ وہ ابھی تک بازار میں اُس جگہ پہنچا تھا، جہاں رنگریز اور ان کے شاگرد مل کر پگڑیاں بکھا رہے تھے۔ بوڑھا دم بھر کے لئے صافے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اُسی دم پھر سامنے آگیا۔ ابھی وہ یکے سے بچنے کے لئے گلی کی پناہ میں گیا ہی تھا کہ دو بچے لڑتے ہوئے بوڑھے سے بھڑ گئے۔ بوڑھے کی پگڑی پیچھے کی طرف سرک گئی۔ جسے اُس نے ٹھیک کیا اور بچوں کو جھکار کر آگے چل دیا ـــــ آخر اُسے نظروں سے اوجھل ہونا تھا سو وہ ہو گیا۔

رسوئی سے پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی۔ شاید آیا کے ہاتھ سے گری تھی۔ چونکہ اُسے اکثر بے احتیاطی کے باعث ڈانٹ پڑتی۔ اسلئے اس کے لئے اس کے ہاتھ کانپتے رہتے تھے۔ نوکروں کے کوارٹروں میں جو تیل کا لمپ جلایا جاتا تھا۔ اُس کی چمنی وہ تین چار بار چھوڑ چکی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جیتی نے پھر اسکے اس کا پلیٹ توڑنے کا قصور معاف کر دیا ہے، کاش پہلی بار جب اس سے چیز ٹوٹی تھی۔ اُس وقت کوئی اُس کے گناہ کو معاف کر دیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔۔۔۔ ہری ادم کی آواز کے ساتھ باورچی کے پیٹ سے ایک خاص قسم کی آواز نکلی جو پیٹ کے یکسر خالی ہونے پر پیدا ہوتی ہے یا بہت کھا لینے کے بعد سُننے میں آتی ہے۔ ساتھ ہی پتہ چلا کہ مجھے پکارا جا رہا ہے

میں نے کہا "جی، آپ مجھے بُلا رہے ہیں؟"

"ہاں بھاگیرتھ، بات سُنیو" ـــــ جیسے میرے اپنے اندر سے آواز آئی "جیتی کو کہو ورزش کیا کرے"۔

"ورزش کیا کرے؟ وہ تو پہلے ہی گھر کے کام کاج تلے دبی ہوئی ہے"۔

"گھر کا کام کاج تو نوکر کریں"۔

"لیکن باؤجی ـــــ نوکر بھی بھلا اپنے آپ کام کرتے ہیں۔ جب تک بیوی خود ہاتھ پاؤں نہ ہلائے، کون جان مارتا ہے۔ آج جو یہ سب پنکھے جھلکورے قرینے سے دھرے ہوئے ہیں۔ نوکروں نے دھرے ہیں؟ ننگا سر لگ کر صوفے کی پشت میلی ہو جائے کیا مجال جو نوکر کہیں۔ اس پہ کپڑا ڈال دیں یا اسے پکڑ کر دھو ڈالیں"۔

"تو یہ دھونے دھلانے کا کام کون کرتا ہے؟"

"جیتی"۔

"یہ تو اچھی بات ہے، بیٹا، اصل ورزش تو یہی ہے۔ نا کہ بنا مطلب ماپتے پھرنا شہر کی گلیاں سیر کے بہانے"۔

"عورت کے لئے سب سے اچھی ورزش گھر کا کام کاج ہے۔ جس سے اس کا شریر گٹھا رہتا ہے اور وہ بیمار نہیں ہوتی۔ کپڑے دھونے سے بازوؤں اور چھاتی میں طاقت آتی ہے کام نہ کیا تو موٹی ہو جائیگی"۔

جیتی کو پتہ چلا تو وہ بدستور ہنستی ہوئی باہر آئی ـــــ "باؤجی! آپ بھی حد ہیں۔ آپ کو چاہئے۔ میری طرف داری کریں۔ آپ اُلٹا مجھے کام کرنے کے لئے کہتے ہیں تو میں کام نہیں کرتی؟ سارا دن سینا، پرونا کتر بیونت کے علاوہ کپڑے دھونا، حتّٰے کہ برتن بھی مجھے ہی مانجھنا پڑتے ہیں۔ گن آنند کی تو یہ کوشش ہوتی ہے، اور ذرا بی بی آنکھ ادھر کرے اور وہ جھٹ سے سارے جھوٹے برتن گرم پانی میں ڈال دے۔ مانجھے نہیں اور جھاڑ پونچھ کر برتونی پر لگا دے"۔

"تو خود کام کرتی ہے؟ یہ سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی" ـــــ باؤجی کہہ رہے تھے۔ لیکن ایک بات سے اُنہیں بھی اتفاق تھا کہ جیتی کو برتن نہیں صاف کرنے چاہئیں۔ وہ بہو بیٹی سے سر دبوانے، جوتا اٹھوانے چلم بھروانے اور ایسے ہیچ کام کروانے کے خلاف تھے۔ نہ اپنا نیچے کا کپڑا کسی بہو بیٹی کو دیتے۔ نہ ان کا اپنے بدن سے چھونے دیتے۔ کہنے لگے۔ ضروری ضروری کپڑے آپ دھونے چاہئیں اور جو بہت ہو جائیں تو ایک کی جگہ دو دو دھوبی لگا لئے جائیں۔ ایک کو دوسرے کے اوپر لگایا جائے تو یہ لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور مالک سُکھی ہو جاتا ہے ـــــ

خوب اُپج تھی!

جینتی نے اُنگلیوں سے بوگی کی مانگ بناتے ہوئے کہا "وہ ریکھا ودّیا والا آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ہاتھ میں لکھا ہے۔ کام کروگی تو کھاؤگی"۔

"نہ کروگی تو بھاگیر تھ تمہیں کیا کھنے چلے گا؟" بابوجی نے میری وکالت کی

جیسے کچھ دیر روشنی کی طرف دیکھتے رہنے سے ہر چیز پر ایک لال نیلا اور کالا سا دھبّہ نظر آتا ہے اور نگاہ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ اسی طرح اس بوڑھے کی روشن باتوں نے بوگی، جینتی اور بابوجی کے چہرے کو ایک منحوس رنگ دھبّے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ کبھی کبھی جینتی کی شکل صاف نظر آتی وُہ کتنی بھولی دکھائی دیتی تھی ——— اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں ——— وُہ ہنستی رہتی تھی۔ میں نے اُس کی ہنسی کو کچلنے کی بہت کوشش کی۔ اس کی مسکراہٹوں کا جواب میں نے تیوروں سے دیا اور ہنسی کا جواب خفگی سے لیکن وُہ ہنستی رہی۔ کیا موت اس ہنسی کو کچل دے گی؟ . . . . وُہ بوڑھا رمال میرے دل کے تالاب میں ایک وزنی پتھر پھینک کر چلا گیا تھا اور مجھے معلوم ہوتا تھا جیسے کثرتِ آلام سے میرے دل کے کنارے ——— دل کے اندر گر رہے ہیں۔

"گن آنند ——— ارے او گن آنند" میں نے اپنے آپ سے بچنے کے لئے آواز دی

"جی ہو!"

گن آنند ایسے ہی بولا کرتا تھا ——— "جی ہو" میں نے کہا "جی ہو کے بچے، بابوجی کے لئے حقہ ڈال دے۔ جواب میں پھر "جی، ہو" کی آواز آئی۔ اس اثنا میں بابوجی اپنی جیب سے تمباکو نکال چکے تھے اور میری طرف بڑھا رہے تھے۔ پڑوسیوں کا موزہ، جینتی کی سلائیوں پر لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ تیسری سلائی ڈالتی اور دایاں اور بایاں ہاتھ اکٹھا جھٹکتی تو ساتھ ہی اس کے پتلے، نمدار ہونٹ سمٹ جاتے۔ میری نگاہوں کے قریب سے کہیں ایک کرن اُس کے ہونٹوں پر پہنچ کر کھیل جاتی ——— اُس وقت وہ بابوجی کی طرف اشارہ کرتی اور میں چھپ جاتا۔ پہلے میں جینتی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جینتی ماں کو دیکھنے لگا ——— اب میرے سامنے جینتی تھی ——— عورت! . . . میری نگاہیں اُس کے خوبصورت جسم اس کے بُت کی پیمائش کرتی ہوئی کولھوں پر آ رکیں۔ درزی نے بانات میں سے دو دو ریشے کھینچ کر کمر کے قریب قمیص کو کس دیا تھا اور جینتی کے اوپر اور نیچے کے جسم کی حد بڑی صفائی سے باندھ دی تھی۔ درمیان کا جسم کپڑے کے نیچے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا ایک ابھوری سی بلی آگ کے پاس سے اٹھ رہی ہے اور کمر کو باقی کے جسم سے اوپر اٹھا کر کھڑی اکڑ رہی ہے . . . . اور اس کے بعد یوں نظر آنے لگا جیسے بہت بڑے پیندے والی ستار پڑی ہے۔ شاید ستار کو عورت کے جسم کی مناسبت سے بنایا گیا ہے . . . . .

اس وقت تک گن آنند بابوجی کے لئے حقہ ڈال چکا تھا بلکہ بابوجی بھی تمباکو چلم میں پھینک چکے تھے۔ جینتی میری نگاہوں کی تاب نہ لاکر شرما چکی تھی۔ بیٹی اور ماں کی صورت میں جو وقار جینتی کے چہرے پر ہوتا ہے۔ ایسا ہی وقار عورت ہونے پر بھی قائم رہتا۔ بلکہ وُہ کبھی یوں سر اُٹھاتی جیسے کہہ رہی ہو ——— میں ہوں! لیکن میں اپنی نگاہوں کی فحاشی سے اکثر اُسے اُس کے مغلوب ہونے کا یقین دلا دیتا۔ اُس وقت وُہ نہایت بے بس ہوتی اور میں اوچھے ہتھیاروں کی مدد سے وُہ شخصی لڑائی جیت لیتا۔ ورنہ قاعدے کی لڑائی میں عورت سے کون کبھی جیتا ہے؟

میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور نئے سرے سے اپنے دوست کی بدگمانی دُور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اُس کے نام ایک بے سر اپا لمبا چوڑا خط لکھا۔ کیونکہ میں اُس کی دوستی کی قدر کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وُہ محض اس بات پر مجھ سے ناراض ہو جائے کہ میں نے ایک معمولی سی پارٹی میں اس کا تعارف عورتوں سے نہیں کروایا۔ میں جانتا ہوں وُہ اُس محفل میں محض چائے پینے کی غرض سے نہیں بُلایا گیا تھا اور مجھے عورتوں کے علاوہ اُس شام کے مہمان کے ساتھ بھی اُسے ملانا چاہیئے تھا لیکن قصّہ یہ تھا کہ میں تو مہمانوں کے سواگت میں لگا ہوا تھا اور یہ تعارف کا کام کسی دوسرے کے سپرد تھا یا شاید میں نے اپنے دوست کو بہت اپنا بھی سمجھ لیا تھا اور اس لئے بنا جانے بوجھے مجھ سے یہ غلطی ہوئی . . .

لیکن میں بہت دیر تک اس خط کے متعلق سوچ بھی نہ سکا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور دائیں طرف کے مکان میں اوپر کے فلیٹ پر روشنی اور سائے آپس میں گھل مل گئے تھے۔ کمروں میں ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں فقط کچھ دوپٹے ادھر اُدھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے سڑک پر

پل بھر کے لئے بتی جلی اور پھر بجھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ بجلی کمپنی والوں نے آزمائشی طور پر ان بتیوں کو روشن کیا ہے۔ میں پھر جینتی کے متعلق سوچنے لگا، نہیں مجھے دوسری شادی کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔

میں نے قلم کو میز پر رکھا اور کرسی میں اکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں کو اپنے ہی بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھنگی کمیٹی سے باہر تنخواہ لینے کے لئے بیٹھا ہوا ہے۔ میری ٹھوڑی بڑے آرام سے گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس ٹھوڑی کو اٹھانے پھرنا مجھے بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔ بلکہ یہ اس لئے تھا کہ اس طور بیٹھنے سے میں مافیہا سے بیخبر سوچ سکتا تھا۔ چنانچہ میں دنیا جہان کی باتیں سوچنے لگا۔ اس دنیا جہان کی باتیں جن سے جینتی متعلق تھی۔

شادی کے بعد پانچ چھ سال تو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں لگا دیے . . . . . میری ماں مر چکی تھی۔ اس لئے مجھ میں خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہو گیا کہ جینتی میرے یتیم بہن بھائیوں کو اچھی طرح نہ رکھے گی۔ مجھے وہ شدید اختلاف کا دن یاد ہے جب جینتی نے میرے بہن بھائیوں کی نسبت مجھے اچھا کھانا دیا —— میری ہدایات کے خلاف! اور میں نے انتہائی غصے میں برتن باہر پھینک دیے۔

جہاں بھی کبھی اس قدر شدید اختلاف ہوتا تھا۔ جینتی دب جایا کرتی تھی حالانکہ اسے دبنا نہیں چاہئے تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ جب کوئی عورت بہت "پتی برتا" ہو جائے اور شاوند کی بے ہودہ باتوں کے خلاف بھی احتجاج نہ کرے تو شوہر مزید بیہودہ باتیں کرتا ہے اور کسی بات کو بیہودہ نہیں سمجھتا۔ اچھا یا برا دونوں اضافی چیزیں ہی تو ہیں۔ برخلاف اس کے جب عورت شور مچاتی ہے اور محلے والوں کو اکٹھا کر لیتی ہے اور نام نہاد شرافت سے سہمی نہیں رہتی تو مرد زیادہ سے زیادہ ایک دو بار ایسا شور بپا ہوتے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ راہِ راست پر آجاتا ہے۔ ہر انسان میں جھگڑے سے بچنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اس امتحان کے باوجود اگر کوئی مرد جھگڑالو ثابت ہو تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ مرد عورت علیحدہ ہو جائیں —— اس دن بھی محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ عورتوں اور مردوں نے مل کر مجھے شرمسار کیا —— اور میں خود ہی جا کر سڑک پر سے برتن اٹھا لایا

"بات یہ ہے یہ عورتیں ہی عورتوں کو خراب کرتی ہیں۔" وہ کہنے لگیں۔ "جینتی نے اگر تمہیں اچھا کھانا دیا ہے تو بہت اچھا کیا ہے۔ یہ تو ایک اچھی عورت کی صفات میں سے ہے۔" جینتی کہہ رہی تھی۔ "گھر بھر میں مرد ہمیشہ سب سے اچھا کھاتا اور سب سے اچھا پہنتا ہے۔ اس کے بعد کسی کی باری آتی ہے۔ میں اپنے بچے کو وہ کھانا نہیں دیتی جو آپ کو دیتی ہوں —— ہاں اگر میرے اپنے بچے اور تمہارے بہن بھائیوں کے کھانے میں فرق ہو تو مجھے چوٹی سے پکڑ لو . . . ."

اس وقت جب میں یہ باتیں سوچ رہا تھا تو پھر چھڑی کے زمین پر لگنے کی آوازیں آئیں معلوم ہوا بابوجی اپنے ہاں جا رہے تھے اور ان کی سکھ پنتھی ایک باقاعدہ وقفے کے ساتھ زمین پر پڑ رہی تھی جاتے ہوئے بھی ہری اوم کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس وقت وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ یوگ کو بھی اس کے ننھیال لے جا رہے تھے۔ کمرے کا پٹ آہستہ سے کھلا اور آواز آئی —— "بھاگیرتھ بیٹا! میں جا رہا ہوں۔"

میں نے وہیں سے آواز کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا . . . "پھر کب آؤ گے، باجی؟"

"اب جینتی کو کہو نا دو تین مہینے ہمارے ہاں چلی آئے۔"

"اب بھی تو آپ ہی کے ہاں ہے۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے" —— بابوجی کہہ رہے تھے —— "میں اس سال ویشنو دیوی جا رہا ہوں جینتی بھی میرے ساتھ چلی جائے۔"

"اچھا، باجی —— ابھی راستہ کھلنے میں دیر ہے، سوچ لیں گے —— پرنام۔"

یوگ نے دروازے سے منہ نکال کر مجھے لکڑی کا انجن دکھایا۔ یہ غالباً بابوجی لائے تھے۔ انجن دکھاتے ہی وہ اونچی آواز میں ہنس کر اپنے نانا کے ساتھ ہو لیا۔ میں کرسی میں ذرا سا ہلا تو اسے خیال آیا کہ میں اسے ننھیال نہیں جانے دوں گا۔ اس لئے وہ فوراً بھاگ گیا ——

جینتی ایک خداداد ذہن کی مالک تھی۔ وہ معمولی سی ہندی جانتی تھی اور بس۔ اسے کسی طور بھی پڑھے لکھے ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود میں کبھی اسے انگریزی فلم دیکھنے کے لئے لے جاتا تو وہ فلم کی ساری کہانی سمجھ جاتی۔ جزوی تفاصیل اور گفتگو کے متعلق وہ لغزش کھا جائے تو کھا جائے لیکن چیز کا مفہوم اور کہانی کے مرکزی خیال پر پہنچتے ہوئے اسے کبھی دیر نہ لگتی۔ بلکہ جب کبھی میں اپنی عادت کے مطابق بے توجہ ہوتا

اور اُس سے پوچھتا ـــــ اب کیا ہوا تو وُہ چند ہی لفظوں میں تسلسل قائم کر دیتی۔۔۔۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود جیتی میں چند شدید نقائص تھے مثلاً یہ کہ وُہ کسی کی بات پوری نہ سنتی تھی۔ درمیان میں بولنے لگتی۔ دوسرے یہ کہ وُہ جھوٹ کو بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وُہ فوراً دروغ باف کے مُنہ پر کہہ دیتی کہ یہ جھوٹ ہے۔ حالانکہ یہ اخلاق کے منافی ہے ـــــ جھوٹ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس لئے رشتے دار اُس سے نالاں رہتے تھے۔ وُہ لاگ لپیٹ کے ساتھ بات کرتے تھے۔ لیکن جیتی اُنہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی ـــــ

میری عادت ہے۔ میں حالات کا مقابلہ کرنے سے جی چُراتا ہوں مثلاً مجھے اپنے کرایہ دار سے کرایہ مانگنا پڑے تو میں اُس سے نہیں مانگوں گا۔ تاوقتیکہ وہ مجھے خود نہ دے دے یا کوئی ایسی بات کرنے سے احتراز کروں گا جس سے میرے دل کا امن و امان تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسے میں جیتی عین مقام پر پہنچ کر دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ جہاں میں امن و امان کے متعلق سوچتے رہنے سے اپنے دل کا سکون کھو بیٹھتا ہوں۔ وہاں وُہ لڑ جھگڑ کر ایک مستقل قسم کے سکون کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔ جیتی مر رہی ہے اور میں اس کی عورت ہوں!۔۔۔۔ اور میں کیسے برداشت کر سکوں گا کہ یہ عورت مر جائے اور میں دوسری شادی کر لوں

سردار فتح سنگھ حویلیاں والے دروازے میں نمودار ہوئے اور میرے خیالات کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے منقطع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو ڈاکیہ غلطی سے ان کے برامدے میں پھینک گیا تھا۔ میں نے کہا ـــــ "شکریہ سردار صاحب!" سردار صاحب جواب میں مسکرا دیئے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔ گویا کوئی بات اتفاقاً یاد آ گئی ہو ـــــ "آج نہیں اڑے گی کیا؟" میں نے کہا۔ "نہیں سردار جی، آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔۔۔۔ "اچھا، اچھا ـــــ ہاہا اچھا" ـــــ اور سردار صاحب چل دیئے۔ جیتی وہاں ہوتی تو فوراً کہہ دیتی کہ دسکی والی بات سردار صاحب کو اتفاقاً یاد نہیں آئی بلکہ وُہ کچھ دیر پہلے ضرور اُس کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔ گذشتہ بارش کے روز سے اُنہوں نے ابر سے خوب فائدہ اُٹھایا تھا اور آج بھی! بادل آسمان پر ادھر اُدھر بکھرے نظر آتے تھے۔ جنہیں سردار صاحب اپنے تخیل میں یکجا کر رہے تھے۔ شام کے وقت دُھندا آسمان سے نیچے اُتر آئی تھی اور سڑک پر بجلی کی بتی ایک محدود سا رقبہ روشن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ سروس اسٹیشن اور سیو بیر کے درخت دو بلند قامت سایوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر جیتی میری جگہ ہوتی تو وُہ اُس لفافے کو بھی محض مجھ تک آنے کا ایک بہانہ سمجھتی۔ یہاں پہنچ کر جیتی سے مجھے اختلاف ہو جاتا ہے اور میں اُسے شرافت نہیں سمجھتا۔ اوّل تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی کو ثبوت کے بغیر مجرم سمجھا جائے اور بالفرض اگر ایسی بات حویلیاں والے سردار کے دماغ میں آئے بھی تو یہ ایک معمولی کمزوری ہے۔ جیسے کسی انسان کو جتا دینا بہت بُرا ہے۔۔۔۔۔

میں نے لفافہ کھولا۔ کلدیپ کی چھٹی تھی۔ میں ابھی ابھی جو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسی کے نام تھا۔ اسی کی ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس نے یہ خط لکھ کر میرے ساتھ ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ لیا تھا۔ میرا کلیجہ میرے مُنہ کو آ رہا تھا۔ میں نے بآواز بلند کہا ـــــ "گُن آنند" جواب آیا "جی ہو"۔ لیکن میں اپنے چائے پینے کے ارادے کو زبان پر نہ لا سکا۔ ابھی ابھی کمبخت کام کر کے ہٹے ہوں گے اور پھر خدا جانے جیتی بھی ہے یا نہیں ـــــ آخر انسان کے بچے ہیں۔ انہیں دو گھڑی تو آرام کرنا چاہیئے۔

لیکن دروازہ آہستہ سے کھلا اور مجھے بی ہو مجسم کھڑا نظر آیا۔ میں نے اس کشمکش کو اتنی توجہ کے قابل نہ سمجھا اور میں نے کہا "بھئی اگر چائے کی ایک پیالی مل جائے تو"۔۔۔۔ گُن آنند نے کہا۔ "بی بی تو پہلے ہی چائے بنا رہی ہے"۔ میں نے کہا ـــــ "اچھا، اچھا ـــــ!"

اور پھر وہی خط آخر اس شخص نے میری زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔ پھر میں نے کہا۔ چلو اچھا، یہ بھی قصہ پاک ہوا۔ ہر روز یہ آدمی میرا وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ اگرچہ باتیں بڑے کام کی کہتا تھا۔ لیکن آدمی کہی ہوئی باتوں سے کب سیکھتا ہے۔ جب تک اُسے خود تجربہ نہ ہو۔ وُہ کب کسی چیز کا قائل ہوتا ہے۔"

کلدیپ بھی جیتی کی طرح خداداد ذہن کا مالک تھا اور پھر اس پر پڑھا لکھا آدمی۔ مجھے وُہ دن یاد آئے۔ جب میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اُس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کلدیپ اخلاق کا مجسمہ

تھا۔ لیکن اس معمولی سی بات پر اُس نے مجھے الوداع کہنا مناسب سمجھا . . .

ایک دن میں نے اُسے کہا۔ "کوئی آدمی جھوٹ بول رہا ہو اور تمہیں پتہ چل جائے کہ وُہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے تو کیا تم اُسے ٹوک دو گے؟"

کلدیپ نے کہا۔ "موقع کی بات ہے"۔

ظاہر ہے، میرے من میں اس وقت بھی جیتی ہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک بوڑھے دوست کا ایک قصہ سنایا۔ میں نے کہا۔ "رفیق ہے نا میرا دوست وُہ ایک دن قصہ سُنا رہا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اگرچہ یہ بات مخرب الاخلاق نظر آتی ہے۔ لیکن بابا دل ہی تو ہے ——— اس دوست کی بہن سے میری محبت ہو گئی۔ میں نے کہا "بھئی ہاں ——— ممکن تو ہے۔ رفیق کہنے لگا ——— یہ سرینگر کا واقعہ ہے، میرا دوست ایسے مکان میں رہتا تھا۔ جس کا دروازہ دریائے جہلم کی طرف کھلتا تھا ———

میں نے کلدیپ کو صاف صاف کہہ دیا کہ رفیق کے گذشتہ اطوار کی بنا پر میں نے یہیں سے اُس کی داستان پر شک کرنا شروع کر دیا۔ وہ حکایت میں حقائق کا رنگ دینا چاہتا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اس میں رومانی کیفیات بھی پیدا کرے۔ اگر ہم وسکی کا گھونٹ پی لیتے تو یہ واقعہ ضرور شام کے وقت ہوتا جبکہ سُورج جہلم پر غروب ہو رہا ہوتا ہے اور اُس کی شعلہ باری پانی پر آہستہ آہستہ مدھم ہوتی نظر آتی ہے . . . یہی جگہ تھی۔ جہاں کلدیپ نے مجھے ٹوک دیا اور کلدیپ کا زاویۂ نگاہ بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ اس منزل پر اُس کی داستان میں شک کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ صریحاً غنڈہ گردی تھی۔ بہر حال، رفیق نے اپنی بات کو جاری رکھا اور بولا ———

ایک دن امر سنگھ کالج میں میچ تھا اور مجھے یقین تھا کہ کنیز نرٹو ———

یہ اُس لڑکی نام تھا۔ کا بھائی ضرور میچ دیکھنے کی غرض سے گیا ہو گا۔ کیونکہ وُہ ایسی پر رونق جگہوں پر جانے کا بہت شوقین تھا۔ بلکہ میں نے اُسے امیرا کدل کے پل پر جاتے بھی دیکھا۔ میں نے کہا۔ آج بڑا سنہری موقعہ ہے اظہارِ محبت کا، میں اپنی تمام ہمت کو جمع کروں گا اور اس کے سامنے اپنے دل کا ماجرا کہہ سناؤں گا . . . . . میں آہستہ آہستہ کنیز کے ہاں پہنچا۔ گھر بھر میں میری بے تکلفی تھی۔ میں پردے ہٹاتا ہوا بیٹھک میں پہنچا۔ کھڑکی دریا کی طرف کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر سے کنیز مجھے بغاچے پر کھڑی نظر آئی ———

اس وقت سُورج ڈوب رہا تھا ——— اور بغیر وِسکی کے رفیق نے سورج کو غروب کر دیا۔ چنانچہ سورج غروب ہو رہا تھا اور اُس کی سنہری شعاعوں نے کھڑکی میں کھڑی کنیز کے بالوں کو طلائی مغزی لگا دی تھی۔ گویا سچ مچ "سنہری" موقع تھا اور کنیز کی پیاری پیاری شکل روشنی کے خلاف دُھندلی دُھندلی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور آخر کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اُسے ایک دم بازوؤں میں لے لیا اور اُس کا مُنہ چوم لیا ——— لیکن میں گھبرا کر الگ ہو گیا۔ وُہ کنیز نہیں، اُس کی ماں تھی!

ہم دونو دیر تک ہنستے رہے پہلے رفیق اور میں، اور بعد میں کلدیپ اور میں، ایک دو باتیں غور طلب تھیں۔ وُہ یہ کہ کہانی کے آخر میں یکدم ایسا پلٹا۔ داستان گوئی کے فن کے اعتبار سے بہت پُرانی بات ہو چکی تھی۔ لیکن رفیق بوڑھا ہو چکا تھا اور زمانے کی دوڑ سے پیچھے رہ گیا تھا۔ دوسرے اپنی تمام داستانوں میں رفیق نے محبت میں اپنے آپ کو کامران ہوتا کبھی نہیں دکھایا تھا۔ محبت بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوتی تھی اور بس یونہی ختم ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات ناکامی پر۔ اپنی داستان کو ناکامی پر ختم کرنا رفیق کا فن تھا۔ وُہ جانتا تھا کہ اہلِ بینش فوراً اعتراض کریں گے کہ تمہارے ایسی شکل کے آدمی سے کون لڑکی محبت کر سکتی ہے۔ اس لئے وُہ حدود کے اندر رہنا چاہتا تھا ——— کاش کوئی لڑکی اس سے محبت کرتی تو وُہ زندگی میں سچ کے سوا اور کچھ نہ کہتا

کلدیپ نے پوچھا ——— "پھر تم نے اُسے ٹوک دیا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ اُس کے ساتھ جی بھر کر ہنس لینے کے بعد میں نے بھی اُسے ایک چھوٹی کہانی سُنا دی۔ اُس وقت کلدیپ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے میرے ساتھ پُر جوش مصافحہ کیا اور بولا۔ بھا گیر تھ، تم بہت بڑے آدمی ہو"۔ اور میں نیچے حیران ہو کر دیکھنے لگا . . .

میں اس تعریف سے مزید لطف اُٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ——— "اخلاق کے لئے بہت عالی ظرفی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دستر خوان پر اگر مہمان سالن گرا دے تو میزبان کا یہ فرض نہیں کہ وُہ کہے ——— "نہیں، نہیں کوئی بات نہیں" ——— بلکہ اُسے یوں ظاہر کرنا چاہیئے جیسے اُس نے دیکھا ہی نہیں"

کلدیپ نے مجھے بتایا۔ "میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جو خود

بھی تھوڑا سا سالن گرا دیتے ہیں۔ کرنل فاکس میرا دوست تھا۔ اُس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میرے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔ میں نے اُسی وقت دیکھا اُس کی بیوی میز کے نیچے اپنا چمچہ گرا چکی تھی"۔ . . . پھر کلدیپ نے ایک اور داستان سُنائی" پوٹھیا میں پرنس آف ویلز نے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ کھانا اسی انداز میں کھایا جس میں فوجی کھا رہے تھے۔ حالانکہ کھانا انگریزی تھا اور ہندی فوجیوں کو اسے کھانے کا سلیقہ نہ آتا تھا ——

ایسا دوست، کلدیپ میری زندگی سے نکل گیا! کتنا خوش ذوق آدمی تھا۔ لیکن کیا معمولی سی بات پہ ناراض ہو جانا بھی اُس کی خوش ذوقی کی علامت ہے؟ کیا یہ غنڈہ گردی نہیں ہے کہ جو شخص پہلے ہی اپنے آپ کو مجرم تصوّر کرتا ہو۔ اس کو بتایا جائے کہ وُہ مجرم ہے . . . . . . اچھا وُہ میری زندگی سے نکل گیا ہے تو نکل جائے۔ اس کا انداز ہمیشہ ناصحانہ ہوتا تھا۔ وُہ ہمیشہ مجھے یہ بتانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مہمانوں کے سامنے پھل چیر کر نہیں رکھنے چاہئیں۔ پھل ضائع بھی ہوتے ہیں اور یہ طریقہ بھی نہیں ہے۔ یوں بھی مہمان اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کھاتا ہے اور وُہ بھی تھوڑا کھاتا ہے۔ —— لیکن جس مہمان کو میں اصرار سے کھلانا چاہوں۔ اُس کا کیا کروں میں کلدیپ کی باتوں کو سُن لیتا۔ مجھے اپنے آپ کو کم عقل، کوتاہ بین مان لینے میں کبھی عذر نہ ہوتا تھا۔ میں ہمیشہ ثانوی درجہ حاصل کر کے خوش ہوتا تھا اور اس میں مجھے زیادہ راحت اور تسکین ملتی تھی ——

کلدیپ چلا گیا ہے تو میں خورشید کو اپنا دوست بنا لوں گا۔ وُہ اچھا آدمی ہے۔ کیونکہ وُہ اپنے آپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھتا۔ نہ ہی اعتبار سے وُہ اتنا بلند نہیں۔ لیکن جب وُہ میرے سامنے تھوڑی سی پی کر بہک جاتا ہے تو مجھے اچھی طرح پتہ چلتا ہے کہ پینا بُری چیز ہے۔ کلدیپ کی مدلّل باتوں سے مجھے پتہ نہیں چل سکتا

کیا کلدیپ ایسے دوست کے چلے جانے سے زندگی کا کھیل رک جاتا ہے۔ نہیں . . . . میں سولہ برس کا تھا جب میرے والد فوت ہوئے تھے۔ اُس وقت دُنیا مجھے اپنی آنکھوں میں اندھیر نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا سب کچھ ختم ہو گیا، سب کچھ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک کنوئیں میں ہوں جس کے اوپر دیکھنے سے کنارے ملتے معلوم ہوتے ہیں اور جیسے میں نیچے ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاؤں گا . . . میں گھر کے باہر فرش پر اوندھا پڑا رو رہا تھا۔ بدررو کے کناروں کی کچی مٹی کو اپنے دل کے ساتھ لگاتا تھا تو کہیں تسکین ہوتی تھی . . . . ایک چبھن تھی —— جلن جو سارے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھی . . . اُس وقت مجھے خیال آیا کیا اس کے بعد میرا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا —— کیا میرا ہنسنا کھیلنا ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا؟ میں بدررو کے کنارے سے اُٹھا اور غسلخانے میں چلا گیا وہاں میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میں ہنس بھی سکتا ہوں —— میں ہنس رہا تھا اور ساتھ کے کمرے میں میرے والد کی لاش پڑی تھی . . . . . .

اس کے بعد میری شادی ہو گئی اور بابو جی مجھے والد سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگے۔ میں نے عاطفت کے لئے اپنے سُسر کو قبول کر لیا اب میں ہنستا ہوں، کھیلتا ہوں اور قریب قریب اپنے والد کو بھُول چکا ہوں بلکہ ان کی زندگی میں مجھے اتنی آزادی نہ تھی۔ اب میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ ایسے جیسے میں کلدیپ سے علیحدہ ہو کر سُبک سر ہو رہا ہوں اور اگر جیتی، ہنستی کھیلتی چلی جائے —— نہیں نہیں! . . . . . .

اس وقت تک رات پڑ چکی تھی اور کھانا تیار ہو چکا تھا۔ گن آنند آیا اور پرمیشری نوکرانی جو برتن توڑا کرتی تھی۔ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اُنہیں سانس لینے تک کی فرصت نہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ بابو جی آتے اور یوگ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ جس کے دم سے گھر کی رونق تھی اور جو ہر لحظہ کوئی نیا قضیہ کھڑا کئے رہتا تھا۔

اُس وقت میرا بھی جی چاہنے لگا کہ تھوڑی سی پی لوں اور شمشان کی سی خاموشی میں کچھ ارتعاش پیدا کر دوں۔ پتاجی کی موت پر آنسو بہاؤں اور کلدیپ کی فاتحہ خوانی کر لوں۔ سارے بدن میں متواتر سوچتے رہنے سے جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے آسودہ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ سردار فتح "سونہہ" اس وقت سونے کی تیاریاں کر رہے تھے اور کیرتن سوہلا کی آواز دروازے کی جالی سے چھن کر مجھ تک آ رہی تھی —— کیسی آرتی ہوئے بھو کھنڈنا تیری آرتی انا ہتا شبد واجنت بھیری . . . . اور ان اَن گنت بھیریوں کی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ الفاظ معدوم ہو گئے اور

صرف آوازیں غیر متعلق شور ہو کر میرے تخیل کی معاون ہو گئیں ـــــ میں سوچتا رہا ـــــ سوچتا رہا...... اس کرسی میں دبکا ہوا۔ اور ابھی تک کھانے کے لئے مجھے آواز نہیں دی گئی تھی......

اگر میری دوسری شادی ہو بھی جائے تو میں زندگی کو استوار کرنے سے پہلے اتنی کشمکش نہیں کر سکتا۔ در اصل میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ اب دوسری شادی کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا......

لیکن یہ آسان بات ہے۔ آخر شادی کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہو گی جو ہر بات کو ہمدردی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گی.... وہ پلنگ پر بیٹھی ہے ایک مدراسی دھوتی پہنے جس کا کنارہ بہت چوڑا اور سیاہ ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بال کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ساری کا پلو کہاں ختم ہوتا ہے۔ دھوتی کی زمین مٹیالی ہے اور اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تین حلقے نظر آتے ہیں۔ اوپر کا حلقہ سیاہ جو پلو سے مطابقت رکھتا ہے، درمیان کا زرد، اس کے اندر کا سفید، پھر نیلا اور آخر میں دھوتی کی زمین ابھری ہوئی ہے.......

وہ خاموش ہے گنواروں کی طرح نہیں ہنستی اور نہ جھوٹ کو اتنا برا سمجھتی ہے۔ شاید برا سمجھتی ہو لیکن کہتی نہیں۔ بڑی خاموشی سے مسکرائے جاتی ہے.....

میں اس سے کہہ رہا ہوں ـــ "میں جیون کی اس دوڑ میں تھک گیا ہوں سکھداں، میں شاید تمہارے ارمانوں کو پورا نہ کر سکوں۔ لیکن میں تمہیں محبت اور سکھ دے سکتا ہوں۔ ایسی محبت نہیں جو شعلہ جوالہ ہو۔ ہاں البتہ ایک دھیمی دھیمی آنچ جس میں محبت پختہ بھی ہوتی ہے اور خوش ذائقہ بھی.. .... تمہیں وہ یتیم بچے بھی سنبھالنا ہوں گے اور ان سب باتوں کے جواب میں وہ شرما کر سر ہلا دیتی ہے۔ گویا اسے سب کچھ منظور ہے!

وہ کہہ رہی ہے ـــ "میرا خیال ہے، تمہارے دوستوں کو کھانے پہ بلاؤں۔"

"ہاں بلاؤ سکھداں، یہ تم نے میرے من کی بات کہہ دی" ـــ

اور ہم ایک فہرست مرتب کرنے لگتے ہیں۔

دوست آتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں۔ امریکن سینڈ ٹافی میز پر رکھی جاتی ہے اور میرے دوست اسے سٹینڈ پر سے اٹھا کر کھاتے ہیں اس خیال میں کہ کوئی چھلکا اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ ٹافی اسٹینڈ سمیت اٹھائی جاتی ہے اور اسے منہ میں ڈال کر اسٹینڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ میں سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں سکھداں سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے دوستوں کی طرح غلط طریقے سے ٹافی کھاتی ہے....

اس کے بعد مجھے جانگلو سی ہنسی سنائی دی۔ میرا ماحول اس وقت اس قدر پرسکون تھا کہ میں جلیبی کی ہنسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ در اصل ... در اصل میں چاہ رہا تھا کہ یہ ہنسی ختم ہو جائے.... مجھے کھانے کے لئے آواز دی گئی۔ میں اٹھا جبکہ مجھے اپنی نگاہوں کے افق پہ وہ بوڑھا رمال اپنے بازو ہلاتا ہوا گزرتا نظر آنے لگا۔

عصمت شاہد لطیف

معائنہ

اسکول کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ بالکل پاگل ہوگئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا اس میں سے ایک آدھ آدھ یا بوٹی چپڑاسنیں نکال کر اڑا جاتیں۔ باقی میں اُستانیاں حصہ لگاتیں۔ بیچاری بچیاں بھوکی مرتیں۔ پہلے تو چپڑاسنوں نے سنی ان سنی کردی پھر جو سختی کی گئی تو ایک اور چال چلی۔ لڑکیوں سے کہدیا "خبردار جو پورا کھانا کھایا، ہمارا حصہ ضرور چھوڑنا" لیکن یہ بات بھی زیادہ دن نہ چھپ سکی اور ایک دن چپڑاسنوں کے مظالم کی پھر کسی نے شکایت کی۔ باز پرس پر چپڑاسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

"کیا کریں مس صاحب چھ روپیہ اور تین بچے ایک اپاہج ماں اور نکھٹو بھائی کیسے گذر ہو۔ یہ اللہ مارا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔"

"جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو اپنے ہی پیٹ کو نہیں تو ان چپڑاسنوں کا کہاں سے گلا گرم کریں" لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی "بیس روپے میں مکان کا کرایہ اور اپنا اور چار بندوں کا کھانا، کپڑا کیسے پورا کریں" استانیاں کھینچیں۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی لنگر خانے میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک نڈھال ہے۔

اُس نے دونوں چپڑاسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کئے۔ جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کردیتی۔ ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کردیتی۔ مگر اُسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جتنا جتنا وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی ہی جاتی۔ ایک فقیر کو پیسہ دے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اُتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے میں بجائے سرخروئی کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو چپراسنیں محلے ٹولے میں بھیک بھی مانگ لاتیں استانیاں نہ بیچاری بھیک مانگنے کی ہمت اور نہ عمر زندگی کے پیشے کے لائق گھر نہ بار سوائے اسکولوں کی خیرات کے اور کیا وسیلہ زندگی گذارنے کا ہوتا۔ ہر وقت ایسے لرزتیں جیسے قصائی سے گلے۔

مگر رضیہ بیگم بالکل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انہوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا۔ بس ہر وقت بیٹھی مینجر صاحب کے لئے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ شمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس بھیجنے سے پہلے مینجر صاحب نظر ثانی کو گئے اور اُن کی شکایت ہی گول مال کردی۔ رضیہ بیگم شدت سے حاوی ہوتی گئیں۔ شمن کا پلہ اُٹھتا دیکھ کر وہ استانیوں پر قابو جما بیٹھیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آموں کی چٹنی کے ساتھ انہوں نے اسکول کی بھی چٹنی بنانی شروع کردی۔ شمن کو معلوم بھی نہ ہوا اور وہ مینجر کی آڑ لے کر اس کی پیٹھ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کے ملنے جلنے والوں کی رپورٹ پہنچائی اور مینجر صاحب قوم پرستی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرز رہائش سے انہیں شریف خاندانوں کی لڑکیوں کا اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی خبر پا جاتے۔ کے بجے اٹھتی ہے کب سوتی ہے کیا کھاتی ہے اور کیوں کھاتی ہے۔

"کس نے کہا آپسے" وہ حیرت زدہ ہوکر پوچھتی۔

"مجھے ہر بات کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب" وہ نہایت پُر اسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے، گویا اسکول کے مینجر کو سی۔ آئی۔ ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ "مجھے عوام کے قومی جذبہ کو اُبھار کر چندہ جمع کرنا ہے لہٰذا استانیوں کا چال چلن ....."

لفظ چال چلن پر شمن جھل کر رہ گئی۔ پتا نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال چلن بھی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگا بیٹھیں۔ اگر ایک استانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجہ غنیمت ہے جو خود تو مجسم نیک چلن ہے مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے

"دیکھئے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چھٹیاں آتی ہیں"۔
"کیسی چٹھیاں؟" شمن نے ضبط سے کام لیا۔
"اجی یہی خرافات پرچے، غنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ایسی سب لڑکیاں جن کے پاس خطوط آتے ہیں جمع کرکے انہیں ڈانٹیئے"۔
"مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائیں، جب نا"۔

"تو صاحب پکڑیئے" "گویا چٹھیاں بھی کبوتر ہیں کہ چھاپا مار کر پکڑ لی جائیں۔ دوسرے یہ چڑی ماری تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور چھ روپیہ میں گذر کرنے پر مجبور چپراسنیں اگر پان تمباکو کا خرچ اس پرچہ بازی سے نہ نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو والدین چڑھ دوڑتے ہیں۔ بھلا ان کی معصوم بچیاں یہ ہتھکنڈے کیا جانیں۔ اور ان معصوم بچیوں کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں حد درجہ کی ہوشیار ہوتی ہیں کم از کم وہ گروہ جن کی راہنمائی میں یہ فعل کرتی ہیں معصوم نہیں ہوتے۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام ہوتے ہیں جن پر باز پرس کرنے کے لئے غیب دان ہونا پڑتا ہے۔

ساتھ ہی امتحان آ گئے۔ نہیں لگوانا اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں کا پیاں لگوانا اور پھر سارے دن چوکیداری کرنا انسپکشن کا زمانہ بھی آ گیا۔ اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر جھوٹی سچی کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں لائبریری کی کتابوں اور کشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر جو منیجر صاحب نے اپنی ساس کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی لیپا پوتی میں کونسے گُر استعمال کئے جائیں۔ منیجر صاحب بھی کچھ مکدر سے رہ گئے۔
"اچھا صاحب یہ کیجئے کہ لکھ دیجئے رجسٹر میں ۔۔۔ کہ گملے اور پھولوں کے بیج خریدے گئے۔ چلئے چھٹی ہوئی"۔ رائے دینے لگے۔
"مگر ہیں کہاں گملے اور بیج۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو؟"
"کہہ دیجئے گا۔ کچھ بچوں نے توڑ ڈالے اور کچھ میں چنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ڈبے گملے منگوا لوں گا۔ باغ عام میں بہت بیکار پڑے ہیں۔ کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا۔ اور آپ ۔۔۔۔۔ آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں؟"
"اپنے تو میں نے تقسیم کر دیئے کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا"۔
"اے لیجئے غضب کر دیا آپ نے تو ۔۔۔۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں"۔
"اور بیج؟"
"اوہ، لکھ دیجئے اُگے نہیں، خراب تھے اور یہ کمبخت ہوتے بھی ہیں گھنے گھنائے، واہیات۔ کہئے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں"۔
"مگر یہ پورے روپیہ کا تو حساب نہ ہوا"۔
"کچھ بننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا"۔
"بہت اچھا"۔
"اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگائے دیتا ہوں، خراب نہ ہونے پائیں نہایت احتیاط سے واپس کرنا ہوں گی۔ کچھ چائے پانی کا انتظام؟"
"وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ، اُس کا کیا ہوگا اس کے لئے باقاعدہ رقم ملتی ہے"۔
"آپ فکر نہ کیجئے ایسا ہے کہ اس کا تو میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے۔ وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چار پائیاں ڈلوا دوں گا ... بستروں کا بھی انتظام گھر میں سے کر دیں گی۔ کچھ فاضل چادریں اور تکیئے ہوں تو آپ دے دیجئے گا"۔
مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے۔ اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ اگر اُسے کسی طرح پتہ چل گیا"۔
"اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے ۔۔۔۔۔ خیر ۔۔۔۔۔ آپ اسکول کی مائی باپ ہیں، مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کیلئے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔ یہ دیکھئے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ بھگت لوں گا۔ بس جس وقت آئیں تو آپ ۔۔۔۔۔ ارے ہاں وہ نظم؟"
"نظم؟"
"جی ہاں نظم ۔۔۔۔ تیار کی آپ نے؟"
"میں نے؟ کیوں؟"
"لیجئے صاحب، اجی وہی انسپکٹرس کی شان میں ۔۔۔۔ بخدا بھول

گیا۔ دیکھیئے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی بچی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجیئے گا۔ عمدہ صاف کپڑے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی ٹھیک رہے گی، میں اسے صبح ہی سے بلوا لوں گا۔"

"مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں۔"

"اجی سب چلتا ہے، کوئی نام بہ نام تھوڑی ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ آپ یہ کیجیئے گا۔ کہ صبح سے بلوا لیجیئے گا...... ہاں"

"جیسی آپ کی مرضی!"

"اوہ ہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم ..... چہ لاحول ولاقوۃ آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی۔"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی۔"

"چہ تو بہ ایسی مشکل ہی کیا ہے، پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنا دی تھی، اگر مل جائے تو وہی چلا دیجیئے، دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہوگا۔ ... ورنہ ٹھہریئے میں ہی کچھ سوچوں گا۔" اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے "ایں؟ ...... ہیں؟" انہیں سوجھ ہی گئی۔ "وہ دیکھیئے پاس جو قومی ہائی اسکول ہے۔ اس میں جو جلسے ہوتے رہے ہیں۔ وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں۔ منگواتا ہوں۔ میں ...... ابے نتھے ...... او ..... سالے .... اوہ معاف کیجیئے گا ...... دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا لپک کر کہنا مینجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں۔"

"نجمیں؟"

"ابے ہاں گدھے۔ کہیو ..... چہ اُلّو ہے تو .... معاف کیجیئے گا .... خیر میں خود ہی لے آؤں گا .... اور کل تک پہنچ جائے گی آپ اس میں ردّوبدل کروا لیجیئے گا۔ اسکول میں ایک دن پہلے سے سجوا دوں گا۔ اور امتحان پیر سے شروع کروا دیجیئے گا .... اُس روز پرچہ رکھ دیجیئے گا"۔ انسپکٹرس کو اُردو نہیں آتی تھی تعلیمی انسپکشن سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آگئے کسی میں پودینہ تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہوگیا۔ کتب فروش نے دس روپیہ کرایہ لے کر چار پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ اتنا دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ اس میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں زیادہ تر سستے بازاری ناول "میاں بیوی" ...... "شادی کی راتیں" اور مستند کوک شاستر تھے جنہیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا ساتھ ساتھ اور اِدھر اُدھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا۔ پہلے پرانے میگزین جنتریاں ٹیلی فون ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام پر رکھ دی گئی تھیں جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے تھرا کر رہ جائے نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے کواڑوں اور کھرچی ہوئی نیچوں پر تیل اور پانی چڑھ گیا۔ جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ صاف اور ثابت کپڑے پہن کر آنا تو وہ بُری کے جوڑے نکال کر پہن آئیں۔ جھانجن چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تاکہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پر مُصِر ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو اُن میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کئے ہوئے پائیں۔ ان انسپکٹرسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والوں کو واقف رہنا پڑتا ہے۔ کوئی چال اُن کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں "لڑکیوں کی کشیدہ کاری" کے نام سے کچھ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگے تانگے کے جہیزوں کے میز پوش پاندانوں کے کور" سلمہ کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے نمونے رضیہ بیگم کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم" اور "گڈ نائٹ" سجا دیئے گئے۔ اُن میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور بیرونجات کی صنعت گری کا نمونہ تھیں مگر ایسے پینترے سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف چیزوں کی تعداد بڑھا رہا تھا مگر پہنچ سے دور تھا۔ یہی نہیں بلکہ کچھ نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ بھی لیس تھا۔ چارپائیوں پر خالی غلافوں میں الا بلا ٹھونس

کر تکیئے لگا دیئے گئے۔ اُوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیئے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر کتابیں سجا دی گئیں۔ لیجئے کمرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں تو وہ تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انہیں بلایا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کر کے برات کی طرح زور شور سے انسپکٹرلیس اُتریں گیٹ کے پاس جہاں لمبا چوڑا خوش آمدید اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ مینجر ہیڈ مسٹرس نے مع چپراسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹرس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں۔ جو شان لاٹ صاحب کی سوان کی۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

"یہ جالا کیوں؟ ..... یہ اینٹ کیسی؟ ...... یہ گڑھا کس لئے؟" اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کونسی قیامت آگئی۔ سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سُنو تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں بھینٹ کے لئے منگا رکھی ہیں وہ چکھو کچھ تمہارے ساتھ چپکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے۔ وہاں اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل در معقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ بُری رپورٹ سے چیف انسپکٹرس کب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو آتی ہے۔ اس سرسری معائنے کی سرسری ...... ہی رپورٹ ہو، ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہو جائے گا۔ اوّل تو ہم ہندوستانی ہیں بد انتظام، دھوکا جعلسازی ہمارا پیدائشی حق، دوسرے ہمارا شمار پست اقوام میں ہے۔ اب تو چڑی اور دُو دُو! تم بیکار مغز پاشی کر رہی ہو۔ تمہاری بلا سے جو رسیدوں پر جھوٹے دستخط ہیں جو مینجر صاحب نے خود اُلٹے ہاتھ سے کر لئے ہیں۔ اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپڑاسنوں سے لگوا لئے ہیں۔ تم کیوں پڑتی ہو ان جھگڑوں میں۔

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعہ تمہارے چال چلن، خفیہ رشتوں اور پھیروں کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ تم فرقہ پرست الگ مشہور کر دی جاؤ گی۔ زیادہ نہیں چار پانچ روپے کا خرچ ہے۔ سحر البیان ایڈیٹر تمہاری سات پشتوں تک کی دھجیاں بکھیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جھانسے تم کو دے رہے ہیں بس عین بعین یہی لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اور اس معائنے کے اچھے شکریہ کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچا دو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحبہ کی نواسی کے ہاتھوں ہار پھول پہن کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پیار سے پوچھا۔

"اُوں، ہٹ!" لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور مینجر صاحب کی روح قبض۔

"اوہو ہو..... شرماتی ہے..... بولو..... بیٹی نام بتاؤ...... بولو۔" بیچارے مدد کو دوڑے اصل میں وہ خود بچّی کا نام بھول گئے تھے۔

"وحیدہ!" کسی نے سہارا دیا۔

"کس کلاس میں پڑھتی ہو وحیدہ!"

"بولو..... بولو بیٹی وحیدہ ..... پُچ ..... ہاں ڈرو مت ...... ڈرتی کیوں ہو۔" حالانکہ بچّی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی۔ اور ادھر مارے خوف کے دراصل مینجر صاحب پیلے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر بچّی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابھی یونہی آتی ہے۔ کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں..... بڑے آدمی کی لڑکی ہے یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔"

مینجر کو تمام گُر یاد تھے۔ چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیئے ہیں۔ گذشتہ سال جو انسپکٹرس آئی تھی بچاری کتنی اچھی تھی۔ مزے سے بیٹھی نظم سُن سُن کر گائے کی طرح چارہ سانی کرتی رہی۔ پر یہ تو پوری نہ تھی۔"

"ہیں، ہیں، ہیں، آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوا دوں.... جی ....." مینجر اپنے سوکھے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

"یہ چنگی کے گملے ہیں!" صاف تاڑ گئی۔

"ہیں! ..... چنگی واللہ! ......" مینجر صاحب مصنوعی حیرت

اور خوف کے مارے پچھلے حملے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور بوکھلاہٹ
چھپانے کو گملے کے پھندے میں لگے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کمبخت
چپراسی نمبر مٹانا بھول گیا!

"اوہ! جی ہاں چنگی کے تو ہیں ہی" وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے۔
"سکتر صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں۔" لیجئے ایک مد
اور رجسٹر سے کم ہو گئی۔ دوسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُر اسرار طریقے سے
رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا۔ ابھی آئے نہیں ادائگی پیشگی ہو گئی۔
مگر انسپکٹرس تو آج خون پینے کے منصوبے گانٹھ کر آئی تھی۔

"یہ گملے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں۔۔ روپیہ واپس لے
لیا جائے" اُس نے گملوں کی باڑ پر چھری پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی مار میں انسپکٹرس کو گھیر کر بدحواس کر لو تو
بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کر دا دو۔ اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل
گئی پھٹکی سے، تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند
کر کھلیان کر دے گی اور یہ نئی انسپکٹرس تو بالکل تازی گھوڑے کی
طرح چاروں صرف ٹاپیں ڈالنے لگی۔ مگر مینجر صاحب بڑے بڑے جن کھلا چکے
تھے۔ نہ جانے کدھر سے کتابیں اڑادیں کچھ رہ گئیں۔ وہ ایسی کہ وہ قیمت
کا اندازہ ہی نہ کر سکی، دست کاری اس نے باوجود شدت سے التجا کرنے
کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کاپیاں دیکھیں
منشی سے کھسر پھسر کی پھر کہدیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے۔ تعلیمی معائنہ پھر
ہو گا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں، بے کہے گولہ آن گرے گا۔

اس کے بعد اُس نے قطعی ہلاکو والی پالیسی اختیار کی۔ بجائے لڑکیوں
کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب ہے۔ مینجر صاحب کے پیروں
تلے کی زمین سرک گئی۔ اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے
ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں کئی گملے جو
سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پہ نازک سے سہارے سے ٹکا
دیئے تھے پھسل پڑے اور "ویل کم" مع تمام بانسوں اور تختوں کے اُن پر سے
نچھاور ہو گیا۔

رضیہ بیگم کا پیٹ کی خرابی کا پرانا مرض ابھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی
پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی از سر نو رانڈ ہو گئیں۔ صرف عیسائی
استانیاں پھنسیں مگر وہ تھیں بھی غنیمت۔

اسی عرصہ میں کچھ گھار کے مینجر صاحب نظم خوانی کے لئے لڑکیاں بلالائے
شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی ٹریجڈی کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں سنگیت
میں بلا کی طاقت اور جادو ہے بجھی ہوئی شمعیں جل اٹھتی ہیں۔ بدمست ہاتھی
ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ مگر غضب ہو گیا۔ نظم کے بند بغیر تبدیلی کئے لڑکیوں
کے سپرد کر دیئے گئے۔ اور تعلیمی جلوس کا ہاتھی اپنے بدلے صوبے کے کمشنر
کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہو گیا۔ مگر بجائے غصہ ہونے کے وہ بڑے
زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ مینجر صاحب جواب تک بے قابو ٹانگوں کو صرف
قوت متخیلہ کے ذریعہ روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس
ہو کر ہنسنے لگے۔

"کوئی دوسری چیز گاؤ" رسانیت سے حکم ملا۔

"ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ ...... وہ گاؤ لب پہ آتی ہے
.... چلو کمبخت منہ کیا دیکھ رہی ہو ...... شروع کرو" مینجر صاحب
لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہدایات دینے لگے۔ "گاؤ ....
ہاں ..... لب پہ؟" مگر لڑکیاں مبہوت اور شرمائی ہوئی ایک دوسرے
کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

"یہ ..... یہ دیکھئے مس صاحب میں تو ہار گیا ان سے، آپ کو
نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے۔ یہ
سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے
نام بے نہیں جانتا۔ میں تو تھک گیا سمجھاتے سمجھاتے۔ اوہ ....
ارے خدا کے واسطے ....." لڑکیوں نے اُن کی رقت آمیز آواز سے
ڈر کر "لب پہ آتی ہے" شروع کی۔ مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ
نہ لا سکیں۔

"اچھا وہی گاؤ، سارے جہاں سے اچھا ..... چلو شروع
کرو۔"

بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنچم سر کو گھسیٹ کر تار سُر کی
لے پہ گلے کی آخری جھنجھناہٹ ختم کر دی۔ سُر بہت اونچا تھا۔ ایسا
معلوم ہوا چیل انڈا پھوڑ کر اُڑی اور منڈلا کر دالیں گر پڑی۔ پھر لاکھ

خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر دو پٹوں میں ناکیں چھپا کر ایک لڑکی نے از سر نو تان کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستان کے سارے جہاں سے اچھے ہونے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔ دم ہولا اُٹھا۔

"بس کرو۔" انسپکٹرس اُٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح بنچوں میں اُلجھتی گرتی بھاگیں۔

"ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست اقوام کے ساتھ رعائت کرنی پڑتی ہے۔ سرکار کی یہی پالیسی ہے۔ ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں۔" رپورٹ پر اس نے "اطمینان بخش" لکھ کر حقارت سے کہا۔ اور منیجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔۔۔۔ خیر سے بلا ٹلی اور بُری نہیں ٹلی۔ جلدی سے انہوں نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی۔ جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہیں تھی۔

"اجی یہ اُجڈ کیا جانیں ان نعمتوں کا مزہ!" انہوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیئے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعائت؟ آخر کیوں؟ ان نچلے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے کمزور ہیں جاہل ہیں ناکارہ ہیں اسلئے خیرات کے حقدار ہیں۔ تو پھر ان پست قوموں کو دنیا پر سیاہی اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا ہے۔ کیوں نہیں انہیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح سپرٹ ڈال کر جلا دیتے۔ یوں نیچا رکھ کر اور پستی میں گراتے جانا تو سراسر حیوانیت ہے۔ کہتے ہیں۔ اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں۔ یا خدا تو پھر یہاں طوفان کب اُٹھے گا۔ جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح بہا کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا۔ ۔۔۔۔۔۔ پھر لوگ لیل پتی کو اور پستی کی طرف دھکیلنا تو چھوڑ دیں گے؎

("ٹیڑھی لکیر کا" ایک باب)

احمد ندیم قاسمی

ہیروشیما سے پہلے۔ ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا ہے۔ اُس کی رنگین طبیعت کا تقاضہ یہی تھا کہ اُس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ رہے، لیکن کچھ دنوں سے اُس پر بڑھاپا اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوُا، اور اُس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی، بنارسی پگڑیوں، ریشمی لنگیوں اور بوسکی کے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے چولوں کی جگہ ململ کے تہبندوں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسی کسائی بنگالی قمیصوں نے لے لی۔ چہرے کی لالی نچڑ گئی، اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے ٹانگیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لیکر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اُس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی، بلکہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی، جب وہ گلی کے نکڑ پر تیزی سے گذرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا "ارے بھئی، وہ تو پنگھٹ پر جا چکی" یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گیدڑ کو دبکتا دیکھ کر پکار اٹھتا "آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے"۔ تو لوگ بے اختیار ہنستے، اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اسی کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا "شمشیر چچا۔ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کٹورے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک. . . . . رہی ہوں پربت پر سے" اور پھر نہ تمہاری آنکھیں چمکتی ہیں، نہ چہرہ دمکتا ہے، تم ہنستے ہو تو تمہارے پپڑ لیے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے، تمہارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں، آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا!" پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا۔

اور وہ کہتا "یعنی مطلب یہ ہے تمہارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں، اور نہ اقرار کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لودیتی ہتھیلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔ واہ! —— اور بھئی، یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگھاؤ" کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا۔ اُسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں!" —— اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوُا امڈ پڑتا!

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا، اگرچہ وہ اِس کی وجہ نہیں جانتے تھے، اُنہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی۔ اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیے تھے۔ وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور توجہ کا نتیجہ تھے، اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اُس نے حالات کا جائزہ لیا تھا، تو ایک رات گھبرا کر پکار اُٹھا تھا "دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی۔ تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے"۔

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں۔ اور اُس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی، مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُسے اندھیرے سے ہول آنے لگا، طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اُٹھا کر اُس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی "یہ کیا بات ہے ابّا؟" —— اور وہ جھنجھلا کر بولا "ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟" —— اور اس نے دیا بجھا کر پھر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں، کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے، اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے، اس کی شادی بھی ہو چکی ہے، اب اُس کے بچے ہونے لگیں گے، اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اس کی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں، ان لوگوں پر اُسے بہت ترس آتا

تھا۔ جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں، جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے، بارشوں کے لئے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے، اور پھر مایوس ہو کر گالیاں دینے لگتے تھے، لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی، اور دریا سمٹ اور ہٹ کر بہت دُور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا، چٹخی ہوئی شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اِکادُکا پودا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگر اِن دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے، تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے صحراؤں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا، اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔ اُس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا۔

"کچھ پتے نہیں پڑتا، کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمینوں کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے، بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے، خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے، دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار"۔

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیاز مندی کا مظاہرہ کرتا۔ "شمشیر خاں سرکار جو چاہے کرے، چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے، چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے، ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو، سرکار کو پتہ چلا تو دھر لئے جاؤ گے۔ اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے"۔

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارا تھوڑا ہے"۔ وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے"۔ ذیلدار حسبِ عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رَو چلنے لگتی۔ "ہوا پر بھی لگان؟ بھئی سچ مچ اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگا دے، تو عجیب زٹک بھڑک شروع ہو جائے، ہر پل واویلا مچا رہے، ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ — کچھ نہیں بھئی، اِدھر اس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے، سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں، پانسو کے نوٹ دے کر میراسی کو شہر بھجوایا ہے، کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے — ہائے آئے ہائے! اور پھر ذیلدار، ایک بات کہوں، یہ سامنے دادا شہباز بیٹھا ہے نا۔ ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔"

"کیوں؟" کوئی سوال کرتا،

"ایک تو غریب ہے، صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے، اور پھر دمہ کا مریض ہے، اِدھر ہوا بند ہوئی، اُدھر دادا شہباز انا للہ ہوئے، کیوں دادا؟"

دادا شہباز پنشنر جو بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا۔ پوپلے مُنہ کو کھجا کر کہتا۔ "ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے، اور چھپا دیں گے اُسے کوڑے کے ڈھیر میں، جب کبھی ہوا نہ ملی، تو کوڑا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا، پھیپھڑے بھر لئے، اور پھر مٹکا بند، تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔ کنکوا رکھ دینا، ہاں"۔

قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اڑتے، کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے، شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا "ابے آرام سے کھانس، ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے" — "ابے حقہ اِدھر گھما، جورو کی طرح لپٹ جاتا ہے اِس سے" — "ابے سنبھل کر بیٹھ، تو نے تو دکان کھول رکھی ہے!" — مگر جب وہ گھر آتا، تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اُس کے کمرے میں کسی جھری کے رستے آ نکلتا، اور اندھیرے میں سوکھے سڑے پنجے اُس کی طرف لپکتے، اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔ "دیا بجھا دو دلیر" وہ پکار اُٹھتا "تیل ضائع ہو رہا ہے"۔ — اپنی ہی آواز سُن کر وہ چونک اُٹھتا، آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا، کہ شاید کسی کونے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا — صبح کو اُٹھتا، تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک اور گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

"یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں"۔ اُس نے ایک روز سوچا، اور بنارسی پگڑی اُتار کر پلنگ پر پٹخ دی، اس کے بعد ہر روز سفیدی بوقلمونی کی جگہ لیتی گئی۔ اور لوگ حیران ہونے لگے، کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک یہاڑ کی

طرح کیوں ٹوٹ پڑا،

ایک روز پٹواری نے چوپال پر آکر خبر دی، کہ انگریز نے جرمن کیخلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے، کمزور قوموں کی حفاظت کیلئے، —— شمشیر کی آنکھیں چمک اُٹھیں، خلافِ معمول اتنے بڑے واقعہ پر خیال آرائی نہ کی. بلکہ چپ چاپ بیٹھا رہا، چہرے پر کئی رنگ آئے گئے، اور پھر آ گئے، آخر اُٹھا، لپک کر گھر آیا، اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا، "لام چھڑ گئی، تو نے اُس روز کہا تھا نا کہ انگریزوں کا چھتری والا وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی دوڑ دھوپ کر رہا ہے، تو نے ٹھیک ہی کہا تھا، شکر ہے تو نے مڈل تو پاس کر لیا، ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کر دیتے ہیں۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا ——"

اُس نے ہزار چاہا، کہ اعصاب کو قابو میں رکھے، اُس کا رنگ نہ بدلے، اُس کے ہونٹ نہ کانپیں، اُس کی بھویں نہ لرزیں، مگر اس وقت اُس کی ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک دم رُک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا، اور پھر یوں بولا جیسے اُس نے ساری عبارت برسوں سے رٹ رکھی تھی، "بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا، وہ واپس آکر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں، جو بات کرتے تھے، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں۔ —— تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوانمردوں کا کام نہیں، یہ گھڑی تو مقرر ہے، ٹالے ٹل نہیں سکتی، جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں، اور یہاں کروڑوں کچا خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں، چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے، تو پھر میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں، کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے، لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں، یقین جانو، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں گے، دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔"

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہمد، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا سبک سا بید، کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹخ ٹخ —— غرض ہر بات سے متاثر تھا، اور یہ تاثرات اُس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے، جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی لسوداری مٹھائیوں کے چکر میں آکر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چلی تھی، ساتھ ہی اُسے اپنے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پر حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی، اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تالاب سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھلاتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی، اُس کی چوڑیوں کے چھناکے میں ترنم تھا، اس کی آواز کی نرمی میں تازہ خون کی طراری مترنم دھڑکنیں سی پیدا کرتی تھی، وہ قدم اٹھاتی تھی، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا، ہوا میں پڑے گا، اور وہ اوپر ابھر جائے گی اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جا رہی تھی۔ شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان کا سا خم کھا جاتا تھا۔ اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اُٹھتی تھی، دلیر خاں کے نزدیک اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا، اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں، تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آبِ حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی، ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے، برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں، آنگن میں کوّوں نے اودھم مچا رکھا ہے، سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا، زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہو گیا، آنکھوں میں بھولے سے سرمہ پڑتا بھی، تو دن ڈھلے تک بہ جاتا، شمشیر اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتا۔ مگر جانتا تھا، کہ جوانی

میں محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے ، اور پھر شاداں تو ویسے بھی مجبور ہے۔ اُسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہیئے، ——— لیکن یہ اداسی، یہ آنسو، یہ جماہیاں ——— "شاداں بیٹی ، یہ بڑا شگون ہے ، جوانمردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر میں پڑے نہیں رہ سکتے ، خدا کے لئے ہنس کھیل مسکرا ——— سنتی ہے شاداں بیٹی ؟"

شاداں شمشیر کی طرف یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہے "ٹھیک ہے ، ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں ، مگر کس سے ہنسوں ؟ کس کے ساتھ کھیلوں ؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو ——— تم کیا جانو ؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا ، وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا۔ "آج پھر خط آیا ہے "۔ وہ کہتا۔ "لکھتا ہے ، شاداں سے کہیئے کہ میرے لئے دعا کیا کرے۔ اداس نہ رہے ، گرج کڑک اور دھواں دھار طوفانوں کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے ، سورج بھی چمکتا ہے ، ہری بھری گھاس بھی اگتی ہے " ——— شاداں کو کبھی کبھی شک گذرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے ، آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گذارے تھے ، اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی ، پر اُسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں ، اُسے تو ماہیئے ، ڈھولے ، ٹپے اور دوہے کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ، یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

اِدھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھومنے لگے تھے ، مگر ان سب میں شیر خاں اُسے کچھ ایسا بھایا ، کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی ؟ " کسی نے پوچھا ،

" تو شیرنی " شمشیر نے جواب دیا۔

" میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی ہوئی ؟ تو ؟ " داوا شہباز پنشنر کے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا ؟ "

"ہاں ہاں "

"کیا ؟ "

"یہی لنگور ، گیدڑ ، بندر "

لوگ سنجیدہ ہو گئے ، کیونکہ موضوع عام نہیں تھا۔ بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا ، اور شہباز حسب عادت زیادتی پر اتر آیا تھا۔ مگر شمشیر نے کہا "بھئی چچا ، مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہیئے ، یہ کیا ، کہ ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا ، ہم مذاق کر رہے تھے ،"

"منشی جی سے پوچھ لو " داوا شہباز ہار کب مانتا تھا۔ "امرت سر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے ، زندہ ہے ، ہسپتال میں ہے ، ماں کا دودھ پیتا ہے ، البتہ دم ذرا چھوٹی ہے "

داوا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا ، مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے ، جب اُس نے داوا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا "خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ - اب آ بھی جاؤ نا "

اور جب بچہ پیدا ہوا ، تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا - بڑے بڑے ہاتھ پاؤں ، موٹا سر ، گول چہرہ ، گورا رنگ ——— "ہے دلو اشہباز " مارے خوشی کے اُس کے گلے سے اکٹھی آٹھ دس آوازیں نکل گئیں "سنتے ہو ؟ شیر پیدا ہوا ہے شیر "

"چچ چچ چچ " داوا شہباز نے ہمدردی کی " ہائے ہائے ہائے ، انسان کے گھر میں حیوان ، تیرے کھیل نیارے ہیں رے مولا ، لڑکی ہی ہوتی - پر یہ شیر ، یہ دم والا شیر ، شمشیر ، میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں ؟ "

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا ، ننھا دکھایا ، اور پھر اُس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا " سیدھی طرح مبارک دے - ورنہ دوسری ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا "

شہباز چوکنے والا کب تھا - مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا "ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے ، مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چیری گئیں ، تو وارے نیارے ہیں ہمارے ، جا نہیں دیتے مبارک " ——— اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھار کر دی ،

دلیر ابھی چھاؤنی ہی میں تھا ، کہ اُسے باپ بن جانے کی اطلاع ملی ، فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھڑی پارسل بھجوا دی ، ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا - اُدھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں مٹنے لگیں ، اور اس کی جس مزاح تیز ہونے لگی ، اب اُسے ہر مہینے بیٹے کی طرف

سے بیس روپے مل جاتے تھے، اور وہ ہر روز مہاجن کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے کہتا تھا "بس ایک سال چاچا، ایک ایک کوڑی چکا دوں گا، پر دیکھیو، وہ جو تم پچاس کے پانسو اور ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا، میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں"۔

مہاجن ہنستا، یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں چمکتی، پھر گالوں کے ابھار میں ہونٹوں کا شگاف پیدا ہوتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا، پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی، سانسوں میں کشتیاں ہوتیں، اور قہقہہ، کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا، اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا "بڑے پاپی ہو تم"۔

شمشیر خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے، چربی کی ایک تہ سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے، ابھرتا ہے، مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے، تو بھٹک جاتا ہے، ایک حصہ نتھنوں اور دوسرا منہ کے رستے باہر نکلتا ہے، تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹے رہتا ہے، اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے، تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے۔

بہت کم لوگ جانتے تھے، کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اس کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کی ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی تھی، لال لانبی پوتھیوں کے ٹاکروں میں سیاہ روشنائی کی ننھی ننھی ہندیاں کئی گھروندوں کی تباہی کی ضامن تھیں، اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان ہندیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر وہ نہایت سبک سے چاقو کی کھرچنی اور وہ گھسا ہوا موم اور "ہرے رام ہرے رام"۔

ایک روز شمشیر کو دلیر کا خط ملا، کہ اگرچہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لئے مدت سے زیادہ بیتاب ہے، مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کے لئے آج کل کراچی میں ہے، وہاں سے باقاعدہ خطوط لکھتا رہے گا۔ چند روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا، کہ دلیر سمندر پار جا چکا ہے، اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے شمشیر

کا مقصد پورا ہو رہا تھا، لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا۔ اور ان لوگوں پر اسے بہت رحم آتا تھا۔ جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پڑے ہوئے ہیں۔ "کچھ سنا شمشیر خاں"۔ ایک روز پٹواری نے اسے ایک خبر سنائی "دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا، کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے، اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے"۔

"دس دن میں سارے ملک فرانس پر قبضہ" شمشیر بولا "حلوے کی طرح نگل گیا کمبخت"۔

"فرانس ہے بھی حلوہ"۔ دادا شہباز چہکا "میٹھا میٹھا، تر و تازہ رنگ برنگا"۔

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا "یہ فرانس کہیں دور ہے نا منشی جی، کراچی سے کوئی جہاز اگر ۱۱ جون کو چلے تو ۲۲ جون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟"

اسے تسلی دی گئی، کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہو گا۔ مگر اب ہر روز پٹواری اسے ایک وحشتناک خبر سناتا، اور اس کے چہرے پر جھریاں پھر سے ابھرنے لگتیں "انگلستان پر ہر روز تڑا تڑ حملے ہو رہے ہیں۔ مکان جل رہے ہیں، عمارتیں گر رہی ہیں، ملبے کے نیچے سے عورتوں اور بڈھوں، بچوں کی لاشیں، اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے، ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے"۔

"بھئی، سمجھ میں نہیں آتی یہ بات" ایک سادہ دہقان نے حقے کیلئے تمباکو مسلتے ہوئے کہا۔ "انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟"

شمشیر کو جی بہلانے کے لئے ایک موضوع ہاتھ آ گیا "نہیں نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے، انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ ہے، ساگوان کا شہتیر ہے، فولاد کا ڈھانچہ ہے، میرے بھائی، انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا سانولے ہیں، اس کے پاس جہاز ہیں، ہمارے پاس اونٹ، اس کے پاس بندوقیں ہیں، ہمارے پاس لاٹھیاں، اس کے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی، جس میں اس کا ننھا بچہ گر گر اللہ میاں

کے ہاں سدھار گیا تھا بے چارا۔ اور پھر انگریز کے پاس چرچل ہے اور ہمارے پاس دادا شہباز، جو آدھے کا ڈھلانی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے، اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں سے سرکاری سڑک گزرنے والی ہے۔"

اور پھر پٹواری نے روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔

"آج گاندھی جی نے ہر انگریز سے اپیل کی ہے، کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے، اور ان سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے، جرمن خود ہی تنگ آ کر واپس جرمنی چلے جائیں گے۔"

واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دور بلائیں" شمشیر حاشیہ آرائی کرتا۔ "دشمن کچھ ایک چٹکی تک نہ لو، تو پھر دشمنی کاہے کی! دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ جماؤ تالو پر کہ بھرکس نکل جائے، ہائے، کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے کی تکلی پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے۔"

"دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی" دادا شہباز نے کہا "اور ادھر سے حکم ملتا ہے، کھڈیاں بناؤ۔"

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ ٹوکے۔

"تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کیے ہیں دادا۔ ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے ہوں۔"

"اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو؟"

"یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو۔"

"اور یہ چرخہ چلاؤ؟"

"یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو، ہتھی دے مارو کلے پر"

"لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟"

"اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا —— ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر؟"

"انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے، زبردستی۔"

"یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی!"

چوپال پر گپوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک برانے شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا، مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا، دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آتا، تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا، پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا، اور جب کہیں چین میسر نہ آتا، تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا!

انہیں دنوں دلیر کا خط آیا، کہ وہ اب مصر میں ہے، اور خوب مزے میں ہے، اور مصری اذان بڑی سریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں، اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں، سیریں کرتے ہیں۔ اور —— " یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شاداں نے یہ سنا، تو شیر کو اچھالتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی، اور شمشیر خط کو دوبارہ اور پھر سہ بارہ پڑھوانے کیلئے پٹوار خانے کے چکر کاٹنے لگا۔

—"اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا" ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔

"سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی ہے۔"

"ارے!"

—"ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا"

"خدا کی پناہ۔ یعنی ٹڈی دل ہوائی جہازوں کا!"

—"اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا۔"

"——"

گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا، کہ انہوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، وہ چپ چاپ چوپال پر سے اٹھ کر گھر کو چل دیا، اپنے کمرے میں آ کر اس نے صندوق کھولا، اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا، شاداں بھاگی آئی، تو شمشیر بولا "نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا، دعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے، اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے، رو رو کر، بلک بلک کر، سسک سسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج، کہ میں نے قرض اتارنے کے لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا، یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا، یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے، یہ نہ سوچا کہ ——"

اس کا گلا رندھ گیا، اور سر کو تکیئے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں مچل گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میرے چچا، کچھ بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟ کچھ تو کہو"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا۔ "دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی تڑ تڑ اور گرد و غبار اور دھوآں اور دھائیں دھائیں ——— میرا نازوں سے پالا دلیر، میری حرص کا شکار دلیر، میرے دلیر، میرے ———" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں، مزاروں پر دیئے جلے، بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا، بکرے قربان ہوئے، دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے، کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا، کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسماً "تھوپ تھاپ" کر الگنی پر ڈال دیئے جاتے، شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا۔ "بھئی نئی خبریں تو بہت ہیں، پر اگر چچا شمشیر نہ ہو، تو بات کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے، اُسے آنے دو" ——— مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی، وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے۔ جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اُسے دلیر کا خط ملا، کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے تھے، اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب "انڈیا" آنے والا ہے۔

"انڈیا؟" اُس نے پٹواری سے پوچھا،

"ہاں۔ یعنی ہندوستان"

"یہ انگریزی ہے؟"

"ہاں"

"یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟"

"یہی معلوم ہوتا ہے"

"اری شاداں بیٹی" وہ گھر آ کر پکارا، "کچھ سنا؟ دلیر انگریزی بھی بولنے لگا، اور اب واپس آ رہا ہے، اور دیکھ۔ وہ مرغی پھر رہی ہے نا وہ گوری سی، بانجھ کمبخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک ذرا سا انڈا برآمد کرتی ہے، اُسے ذبح کرا لے، اور ساتھ ہی گورکھ کی دکان سے جوشی چاول لے آ، اور دیکھ، بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے ——— ہاں" ——— باہر گلی میں آ کر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا۔ "ارے طرے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے، بات سن، پگڑی کو اتنی کلف نہیں لگانی چاہیئے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے"۔

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا، "جنگ کی کوئی نئی خبر؟" اُس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کوئی تر و تازہ خبر ہو بھئی، ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے، نہ نہ، بہت ہو چکیں یہ باتیں، کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی، کہ اوسانوں کو ٹھکانا ملے"

داوا شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزا پوچھ رہا تھا، یکایک چونکا۔ اور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔ "کیا کہا میاں شمشیر؟ ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے قرآن کی قسم۔ ——— ارے تمہارا دلیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے اور اب تمہارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے، تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو وہی ہوتی ہے نا جس میں ان گنت انسان کھیت رہیں، اور میاں شمشیر، جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کیلئے جانیں دیں گے، اُن کے بھی تو باپ ہوں گے، اُن کی بھی نئی نویلیاں بیویاں ہوں گی، اور معصوم بچے اور پیارے دوست اور سمبدھ رشتہ دار، اُن کی اُمیدیں اور اُن کے حوصلے، چاہے وہ جرمن ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں"۔

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھریاں پھر سے اُبھر آئیں، پہلو بدلا، اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو چاچا ——— اُس کی آواز کھوکھلی تھی، اور بج رہی تھی، اور اُس میں گھبراہٹ کے اتار چڑھاؤ تھے۔" میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی، کہ ——— بات یہ ہے داوا، کہ تم

ٹھیک کہتے ہو۔"

"میں نے غلط بات کب کہی ہے؟" شہباز الجھ رہا تھا۔

"صرف اب" شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے

"میرا مطلب ہے، میں نے کبھی نہیں کہی ——"

"سچ بات"، شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا، اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھی،

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا، بولا "تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ شمشیر اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے، پچھلی لام کو اِن آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور سچ کہتا ہوں، دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری گرجتی دہاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں، اور ٹھوکر کھا کر گرا بھی تو لاشوں پر۔ کسی کی انتڑیاں باہر پڑی ہیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا ہے، کسی کی ٹانگیں غائب ہیں، کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا۔ کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا، میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا، اتنا خوبصورت کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے، میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں، اور ایک مڑی تڑی تصویر —— ایک لڑکی کی —— جس کی آنکھیں اتنی گمبھیر تھیں قرآن کی قسم، کہ جہان ڈوب جائے، اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں۔ "سچ مچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اُس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے یہ تینوں چیزیں اُس کی جیب میں ڈال دیں اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر، میری بات سننا، میں سچ کہتا ہوں میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں، اور اُس کے نیلے ہونٹوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر بھنبھنانے لگیں —— یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لئے مرا —— اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔

—— یہ سات ٹھیکریاں —— یہ سات لعنتیں ——" دادا شہباز کی آواز بھرّا گئی، اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اُتر گیا۔

"دادا" شمشیر نے اُسے پکارا۔

وُہ بغیر مڑے بولا۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے جانے دو۔"

"دادا" شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا، اور پھر سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ ایک مجرم کی طرح، شرمندہ اور نڈھال — جیسے دُنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وُہی ہو۔

صبح کو اُٹھا، تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اُس کا احساسِ مسرّت پھر سے جاگ اُٹھا، اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں، "دلیر آ رہا ہے" —— "دلیر مصر سے بخیریت واپس آ رہا ہے" —— اس کی ذاتی تسلّی کے لئے یہی خیال کافی تھا، اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں —— اور میں پاگل ہو جاؤں گا" —— بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے، اُس نے سوچا،

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے، اُس نے ایک مرتبہ پھر سوچا یعنی دلیر آ رہا ہے، تو اگر واپس بھی تو جائے گا۔ اور واپس لاہور یا دلی تو نہیں جائے گا، جنگ پر ہی جائے گا۔ اور جنگ سے اِنسان ایک مرتبہ بچ نکلے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں، کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز۔ قیلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے —— بات کیا تھی اور تو نے کہاں پہنچا دی!

اُس نے بہت کوشش کی، کہ مسکرائے، قہقہے لگائے، پھبتیاں کسے، مگر اُس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ ابھرتا، اور پھر نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں، اور کلیجے میں کرچ سے سنگین پیوست ہو جاتی اور انتڑیاں باہر ابل پڑتیں —— وُہ شاداں سے کہتا "بیٹی کوئی بات سُناؤ" —— مگر وہ مسکرا کر پیاز کاٹنے لگتی۔

"ارے بھئی کوئی بات سُناؤ!" وُہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا،

"دلیر کب آئے گا؟" سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

"دادا کوئی بات سناؤ" اُس نے چوکے لگانے والے شہباز سے مرہم کی التجا کی،

"بات؟" بڈھے نے پوچھا "یعنی کوئی بہت بڑی خبر؟"

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر ببول میں پھینک آئے!

چند روز بعد اُسے دلیر کا خط ملا، کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی میں اترتے ہی اُس کی رجمنٹ رنگون چلی گئی ہے اور رنگون سے سنگاپور جانے کا مقصد ہے۔

"دلیر نہیں آرہا"۔ ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اُس کے لبوں سے نکلے، اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی، دم بخود ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی،

"دلیر نہیں آرہا، وہ رنگون جارہا ہے۔" اُس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بڑی خبر ہے بھئی" دادا شہباز کی لے ابھی نہیں ٹوٹی تھی،

شمشیر بگڑ گیا۔ "دیکھو دادا۔ بہت لحاظ کیا تمہارا۔ تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو، یہ اچھی بات نہیں، میں تمہارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ ——" اور وہ غصّے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اُٹھ آیا،

پٹواری نے آواز دی "جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا"۔

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا، جیسے بس چلے تو اُس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے،

لیکن اُسی روز ایک شہباز یا پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا، شاداں تک کو جھڑک دیا "لوہے کی زبان ہوتی تو شاید یہ مرچیں اثر نہ کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا تندور رکھ دیا ہے تمہارے مسالن نے —— بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں کفگیر جما دو کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر —— لے جاؤ، میں نہیں کھاؤں گا"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھل گیا، اس کا بیٹا رنگون میں تھا، اور اُس کے خیال میں یہ ناممکن تھا، کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی زقند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے۔ "مشرق میں کیا پڑا ہے" پٹواری نے کہا تھا "مشرق کے لئے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں، کہ اب یہ تکلّف بھی کیا جائے"

"ایک جاپان ہے"۔ دادا شہباز نے جہاندیدہ سیاستدان کے سے انداز میں کہا تھا "سو گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا، برسوں سے سر پٹخ رہا ہے پر یہ انیمی ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے، ادھر بچے کے ہاتھ میں آئے ادھر دانت نکال بیٹھے، اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک تاگا ٹنک آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں، اور ان کے سپاہی ٹھنگنے، ناٹے، تم یوں جما کر اُن کی کھوپڑی پہ تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا "یہ بات تو نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی ادھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھولے بادشاہو"۔

ادھر دلیر کے خط پر خط آرہے تھے، رنگون کے پگوڈے، برما کے جنگل، ناریل اور کیلے، اور —— "ہم بڑے مزے میں ہیں، رنگون برما کی جنت ہے، جنگ نہ ہوتی تو میں شاداں، شیرا اور آپ کو یہاں بلا لیتا"

شمشیر پٹواری کے پاس دوڑا آیا "کیا رنگون میں بھی جنگ ہو رہی ہے منشی جی؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا "یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی چچا! جنگ صرف توپ بندوق کی تو محتاج نہیں، بھوک کی بھی تو جنگ ہوتی ہے، غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے، انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے، جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے، رنگون میں بھی ہو رہی ہے، ہمارے گاؤں میں بھی ہو رہی ہے، یہ ازلی و ابدی جنگ، یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ جنگ جو دریا سے نہریں نکالتی ہے، جو سرسبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے، جو پانی پر لگان لگاتی ہے، جو پولیس کے سپاہی کو نمرود کے اختیارات بخشتی ہے، جو غریبوں کے کھدر میں جوئیں ڈالتی ہے، جو امیروں کے ریشم تلے گھٹیا کی صورت میں پروان چڑھتی ہے، تم ہر روز جنگ جنگ

پکارتے ہو، جنگ ہر جگہ جاری ہے، ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں"

"نہیں، کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی" اب یہ جنگ ختم ہو گی تو ایک نئی جنگ آدھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہوگی۔ امن قائم کرنے کیلئے تجارت کی جنگ ہوگی، تجارت بڑھانے کے لئے سمندری راستوں کی جنگ ہوگی۔ ان کے عقب میں انسان کے پیدائشی حقوق کی جنگ ہوگی، اور جب یہ جنگ ہوگی —— جب یہ جنگ ہوگی ——"

اور پٹواری نے کان پر سے قلم اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "کھتونی کہاں گئی؟"

چند روز کے بعد اُس نے پٹواری سے خبر سُنی "جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا" اور پھر اتنے ہی روز بعد اُسے معلوم ہوا، کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا، اور رنگون سنگاپور سے بہت دُور ہے، گھبرا کر اُس نے شیر کو اُٹھایا، اور صحن میں ٹہلنے لگا "تیرا ابّا رنگون میں ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں۔ اور سنگاپور بہت دُور ہے رنگون سے" بچّے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لئے، اور جب بڑی مشکل سے اُس نے بچّے کی گرفت ڈھیلی کی، تو بچّہ رونے لگا، شاداں بھاگی آئی، اور وہ رو رہی تھی، اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اُس کے گالوں میں خون تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر خون تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں، لاشیں پہیّوں تلے چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں، کسی آسیبی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے، اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے جس میں تازہ خون کی بو ہے، سڑتی ہوئی نعشوں کی بو ہے، جھلسے ہوئے چمڑے کی بُو ہے،

"دیا جلاؤ" وہ پکارا

کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ بھڑک کر اٹھا، اور صحن میں جا کر چنگھاڑا "شاداں میں بک رہا ہوں، دیا جلاؤ"

وہ اس وحشتناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، دانت بھینچ کر چلایا "دیا جلاؤ شاداں مجھے اندھیرا نگل جائے گا"

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی "کون ہے؟" وہ اسی شدت سے پکارا۔ اور دروازے تک گیا۔ مہاجن کی ٹھوڑی جھٹپٹے میں تھیلی کی طرح لٹک رہی تھی "اب کے تم نے قسط نہیں دی"

"نہیں دوں گا قسطیں" شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا "کب تک دیتا رہوں گا قسطیں، میں نے تمہاری قسطوں کے لئے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا، اپنے آنگن کی رونق لٹا دی، اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی، پر تیری پیاس نہیں بجھے گی، تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔ اب تو میرے شیر کو بھی چبا جائے گا —— جا نہیں دیتا قسطیں، بتا دے جا کر اپنے ہرتوں سوتوں کو —— نالش کر دے ——"

پیچھے سے شاداں نے آ کر اُسے کھینچ لیا "آپ کس سے بول رہے ہیں! سیٹھ تو چلا گیا"

"دیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟"

"جلایا ہے"

"کہاں جلایا ہے؟ کدھر جلایا ہے؟ جلایا ہوتا تو ——" مگر دیا جل رہا تھا، اور دئیے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا، وہ دھم سے بستر پر جا گرا، بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی، اُٹھ بیٹھا، سر کو دبایا۔ اور ہولے سے بولا "شاداں بیٹی، ذرا اِدھر آ کر دیا بجھا دے، تیل ضائع ہو رہا ہے خواہ مخواہ"

دلیر کی خاموشی اور خطرناک ثابت ہوئی، قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے، شاداں گھلتے گھلتے کانٹا بن گئی، اُس کا دُودھ خشک ہو چلا تھا، پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی۔ مگر شیر ہمک ہمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا، اِدھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سُنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کے کئی جتن کرتا، مگر شمشیر مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا، ہر روز مدرسے جاتا، جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بُت بنا ایک طرف کھڑا رہتا ——

"تمہارا خط نہیں آیا چچا"! ماسٹر جی کہتے، اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔ ہر صبح تو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے بیٹوں بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے، اور دکھوں کی گٹھڑیاں

اُٹھا کر واپس جاتے، اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا، ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اُسے سرکار نے اطلاع دی تھی، کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے،

خط کھلتے جاتے تھے، اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں، اچانک ایک طرف ایک بوڑھے نے چٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا "میں اجڑ گیا" —— اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون۔ —— ڈاکخانہ ماتم کدہ بن گیا، کوئی جنگ میں مارا گیا تھا، کسی کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا، کوئی جاپانی قیدی تھا —— آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا، چھاتیاں کوٹی جانے لگیں، بال نوچے جانے لگے، گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی، "جنگ ہر جگہ ہے" شمشیر کے کانوں میں پٹواری کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"شاداں۔ شاداں"۔ اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ "میں سن چکی ہوں" اُس نے بلکتے ہوئے کہا،

"شیر کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا،

"پڑا ہوگا کہیں" شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی،

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اُسی کے مُنہ میں مٹی تھی، اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے، شمشیر نے اُسے اُٹھایا، چوما، چوم چوم کر اُسے نڈھال کر دیا، اور پھر اُسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا "یہ سب میرا کیا دھرا ہے، مجھ بوڑھے کا، مجھ خناس کا، بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے، —— میں —— میں ——" مگر اُس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں، پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا، وہاں سے اٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اُسے پٹواری مل گیا۔ بولا "بڑا افسوس ہوا چچا"!

شمشیر نے ہاتھ اُٹھا کر انگلیوں کو ایسا چکر سا دیا، جیسے کہہ رہا ہے "قسمت"

"تم جب اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے، تو تمہیں یہ کسی نے نہ بتایا، کہ ——" اُس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لئے آنکلا۔ اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا،

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی، اِدھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے، جیسے جنگ کے ساتھ اُن کی ساری دلچسپی اور وابستگی اُن کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی، اور جب وہ کٹ مرے، یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی، باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے، تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریے ہوتے۔ کھانستے اور ہانپتے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یادیں دھیمے سروں میں گاتیں اور روتیں، چوپالوں پر الاؤ کے اردگرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے، گلیوں میں خاک اُڑتی، ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغدار کر دیتیں، پھولتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ مؤذن کی آواز برچھے کی طرح گھس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسٹتی پھر رہی تھی، ماری ماری، خانماں برباد اور پریشاں حال، گھومتی اور چکراتی ہوئی، اونچی لگروں پر رُکتی اور گہری کھاڑیوں میں ٹھٹکتی ہوئی —— لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں —— مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کر لے گئے تھے، چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا، —— اور جنگ جاری تھی —— عوام کی جنگ —— جمہوریت کی جنگ —— نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ —— اور دریائے سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی، اور داداشہباز کی ایک بیگھ زمین پر سے پکی سڑک گذرنے والی تھی، اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی نے ایک یورپین نازنین کے بوسے ہزاروں روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا، اور مہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا، "تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع کرنا ہے" —— "نیا دھندا!" —— پٹواری نے کہا تھا "یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں اور —— " —— "نہیں نہیں چچا جی

نے ٹھوڑی کے بلوں میں سے میل کی مروڑیاں نکال کر کہا تھا "میں کانگرسی ہوں، میں ایسا نہیں کروں گا۔"

ہے شمشیر چچا ــــ جیسے ہر گاؤں والا پکار رہا تھا ــــ ارے کچھ بولو، کوئی پھبتی، کوئی مذاق، کوئی لطیفہ ــــ کچھ سناؤ بھئی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی، ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آآ کر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ، کٹے ہوئے بازو اور نچی ہوئی بانہیں دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو" ــــ ہے شمشیر چچا کوئی بات سناؤ، ہمارے کانوں میں ہمارے عزیزوں کی کراہیں برمے کی طرح گھسی جا رہی ہیں، ہماری بیوہ بہنیں۔ ہماری لٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے! ــــ شمشیر چچا، ہے شمشیر چچا!

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اور دھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاکخانے میں جانا اُس کا معمول ہو گیا تھا، وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گذارتا۔ اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں ٹھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چمچما اُٹھتیں، "یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی، یہ جنگ کرۂ ارض کی آخری جنگ ہے، اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بجھ کر بھسم ہو جائے گی، اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہوگی، جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہوگی، وہ ایک گھر کی آبادی کے لئے بیس گھر نہیں اجاڑے گی، وہ ایک انسان کو موٹر مہیا کرنے کے لئے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی، ساری دُنیا کی پیداوار ساری دُنیا کے باشندوں کی ملکیت ہوگی، اُس وقت، چچا شمشیر ــــ صرف اُس وقت ــــ صرف تبھی ــــ" اور وہ کان پر سے قلم اٹھا کر کہتا "یہ کھتونی کہاں گئی؟"

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گذرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا "بھئی چکا دو نا باقی حساب، اب نیا دھندا شروع کرنا ہے، اور پھر اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے، اس کی ساری تنخواہ تمہارے نام آتی ہوگی۔"

اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے! ــــ اب تو تمہاری قسمت جاگ اُٹھی ــــ اب تو تمہاری برسوں کی تمنا پوری ہوئی ــــ اب تو تمہاری پانچوں گھی میں ہیں! ــــ لعنت ہو، شمشیر کو ہر کوئی چڑ کے لگاتا تھا، دادا شہباز بھی جو کہتا تھا "آجائے گا، قیدیوں کو تو بادشاہیاں بڑے آرام سے رکھتی ہیں، دیر ضرور آئے گا" ــــ دادا شہباز اُس سے مذاق کرتا تھا!

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا، مگر اِس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ، ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں، کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کٹیلا تھا، مویشی تک اُداس نظر آتے تھے، ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتی، اُن کے سرہانے دیئے رکھ کر دعائیں مانگتی ــــ "میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیا واپس آئے" ــــ "کوئی واپس نہیں آئے گا" پٹواری نے کہا تھا "میں کہتا ہوں، تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے، وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں، اُن کے ذہن مر چکے ہیں، اُن کے عقیدے مر چکے ہیں، اُن کے جسم شاید واپس آجائیں، لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے، اور اس لئے جب وہ واپس آئیں گے تو تمہارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے۔ وہ دھرتی کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا، تو درد کے مارے وہ چلا اٹھیں گے، جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا، تو وہ بلبلا اٹھیں گے، جب دلّی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے بھیجے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے، اور اُن کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی، روس کے ــــ"

"میرے خیال میں یہ پٹواری یا تو بم بنانے لگے گا۔ یا قید ہو جائیگا" ذیلدار نے ایک روز تنگ آکر کہا تھا۔

پٹواری کی باتیں پرسکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے

سنگریزوں کی مانند تھیں، لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے اور مٹ جاتے، اور پھر تالاب سو جاتا — ایک سال گذر گیا۔ دو سال گذر گئے، کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی، تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑتی، تالاب تلملا کر رہ جاتا، لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں، اور پھر سکون چھا جاتا۔ — سکون، جو ہر انجام کا آغاز ہے،

ٹھیک ہی تو ہے، وہ بیوائیں جن کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی تھی۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیر فانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا — اب تینجنوں میں چرخے گھماتیں، چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹھوکے مارتیں اور کہتیں "ری نیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نوری" — "اور تیری لونگ، اتنی اچھی ناک پر اتنی بھونڈی لونگ، جیسے مصری کی ڈلی پر مکوڑا پچک کر رہ جائے" — ناکوں، آنکھوں، بالوں اور اوڑھنیوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی پتاوروں میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں، صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی، یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے، — اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں پلو تلے دیئے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں، اور جب مقبروں پر سجے ہوئے دیئے، جو اب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے فق چہروں میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہاب ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی، لپک کر گھر آتا، اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا "بیٹا آج جمعرات ہے، دیا تو جلا دیا ہوتا مزار پر، کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھر دندے کو پھر سے روشن کر دے" — تو شاداں انگڑائیوں کا تانتا باندھ کر اٹھتی۔ اور کہتی "بہت دیئے جلائے چچا، اور پھر دیئے بجھ جاتے ہیں تو تیل مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں، دیئے جلانے سے کیا ہوگا!"

شمشیر کے لئے دیر کی دوری اب اتنی تشویشناک نہیں رہی تھی، جتنا شاداں کا تغیر، دیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا، صبح سویرے بناؤ سنگار میں کتنی دیر لگا دیتی، بہترین لباس پہنتی، شیر کو گھر کتی، اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی، ہر مہینے دیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے جبراً لے لیتی۔ "مجھے بھی زندہ رہنا ہے"۔ وہ کہتی مہاجن کا حساب شیطان کی آنت بنتا چلا جائے تو دیر کا کیا بس، میرا بھی تو حق ہے!"

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا، وہ جانتا تھا، کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزتیں بھی ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔

"سنبھلو، سنبھلو" دادا شہباز کہا کرتا تھا۔ "سنبھلو شمشیر، چوکنے ہو کر رہو، آخر دوسروں کے بیٹے بھی تو قیدی ہیں"!

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی، وہ ہمیشہ کے لئے ڈگمگا چکا تھا، اس لٹو کی طرح جو فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی نوک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے، اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسّر نہیں آتی، سنبھلنے کے لئے فرصت چاہئے، اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی، مہینے میں محاذ جنگ سے ایک دو موتوں کی خبر آ جاتی، تو وہ فاتحہ خوانی کے لئے چلا جاتا، لوگ امن کے لئے قرآن مجید کے ختم کراتے، تو ان میں شامل ہو جاتا، اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا "امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے، امن جنگ کا دوسرا نام ہے، اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے، بنگال کا قحط کیا تھا؟ یہ امن کی جنگ تھی، یہ ہر چیز کی گرانی۔ یہ امن کی جنگ ہے، یہ اغوا اور زنا کے نت نئے شوشے، یہ امن کی جنگ ہے، — امن؟ تم امن کیلئے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے لوٹ رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو، ایسی جنگ جو تم محسوس نہیں کر سکتے، ایسی جنگ جو تمہارا خون نہیں بہاتی، صرف تمہارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پٹک دیتی ہے — ارے یہ کھتونی کہاں گئی؟"

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں اور شمشیر پٹواری سے بحث کرنے لگا تھا۔ ”ارے بھئی امریکی فوج جزیرۂ جاپان پر اُتر آئی ہے نا —— جنگ کو ختم سمجھو“۔

”یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔“ وہ کھتونی کو گھٹنے تلے رکھ کر کہتا،

”روسی برلن میں گھس گئے“

”یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے“

”مسولینی کو سولی پر چڑھا دیا گیا“

”یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے“

”یورپ میں جنگ ختم ہو گئی،

”اب نئی جنگ شروع ہو گی“

”جاپان کے شہر ہیروشیما پہ ایک نیا بم گرایا گیا — ایٹم بم۔ ذیلدار کہہ رہا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے“

اُس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اُٹھیں، اور ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر گر گئیں، مدت کے بعد اُس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔ ”بڑی دیر کے بعد نظر آئے ہو بھئی“ اُس نے ایک نوجوان سے کہا۔ ”سناؤ، آج کل کونسی گپھا آباد کر رکھی ہے۔“

اور پھر ”ابے کُھل کر قدم اُٹھا۔ یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھل گیا ہو تیرا“

ایٹم بم کی خوشی میں اُس روز اُس نے ایک بڑھیا پر بھی حملہ کر دیا ”لہنگا سنبھال خالہ، بلاوا دے رہا ہے۔“

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہو گئی، اور پھر رو دی۔ ”تم سچے ہو شمشیر۔ تمہارا دلیر واپس آجائے گا نا۔ اور میرا احمد —— وہ ادھر تین سال ہوئے مصر میں —— “ اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ ”تم مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ کیوں نہ کرو، تمہارا بیٹا جو واپس آرہا ہے، اور میرا بیٹا —— میرا بیٹا —— “ سر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی، اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی،

”ارے!!“ شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اُن کے چہروں پر غم اور غصّہ کے آثار تھے، اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے۔ ”ارے!“ شمشیر نے دوبارہ کہا، اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا، اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے، تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”اس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے، جب ہیروشیما پر بم گرا، تو جو لوگ باہر تھے، وہ وہیں دم توڑ بیٹھے اور جو اندر تھے وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے، لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکتے، بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار اُبھر آیا، ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے، پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں، ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں، ہزاروں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ بس اب جنگ کو ختم سمجھو“۔

”ہت تیری نکٹے ناٹے کی“ ایک دہقان بولا ”کیسے گرجتا دہاڑتا بڑھا تھا، اور کیسے دبوچا انگریز نے“۔

”نہیں نہیں۔ امریکہ نے“۔ اعتراض ہوا۔

”ابے نہیں۔ انگریز نے“

”امریکہ نے“

”انگریز نے“

”سارے عالمِ انسانیت کی بدبختی اور بدطینتی نے“۔ پٹواری بولا۔ اور سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے ”جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے، مگر زہریلی گیس سے ہزار درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا، جائز ہے، بھئی بڑے چکیلے ہیں جنگی اصول۔ اُس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنس بلائی جانے لگیں. کمیٹیاں ہونے لگیں۔ اور اب —— یہ ایٹم بم —— “

ذیلدار کڑک کر بولا ”منشی، بکواس بند کر!“

”میں کہتا ہوں“ پٹواری تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ ”یہ ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں، ہم ہندوستانیوں کے لئے تو ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں، بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا۔ آسام میں کس ایٹم بم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں، راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج پیدا کر دی، ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بموں کی بارش جاری ہے، اور تم منہ کھولے ہیروشیما کے

ایٹم بم کی باتیں یوں سُن رہے ہو، جیسے تمہارے لئے جنت کا دروازہ کُھل گیا —— ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو۔ قطب دین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نور خاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو —— اور ——"

"بکواس بند کرو میں کہتا ہوں" ذیلدار گرجا۔ اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اُٹھ کر چلا گیا۔

"منشی پاگل ہو جائے گا" ایک شخص نے رائے ظاہر کی،

مگر ذیلدار کی غضبناک خاموشی کا تقاضا تھا، کہ حاضرین بھی خاموش رہیں، کڑی نگاہوں کی گھرکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو نت نئی چٹپٹی خبروں کا تانتا بندھ گیا۔

"برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی، جنگ ختم ہو رہی ہے۔

"روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا"

موئے کو مارے شاہ مدار —— جنگ ختم ہو جائے گی،۔

"جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے"

اللہ بس باقی ہوس —— جنگ ختم ہو گئی،

جنگ ختم ہو گئی —— جنگ ختم ہو گئی —— پتلیاں چمک اُٹھیں، گالوں پر گلال پھر گئے، قیدی اور عدم پتہ بیٹوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آ گئیں۔

"سچ مچ ؟ —— سچ مچ ؟"

"ہاں ہاں۔ جنگ ختم ہو گئی، جنگ بالکل ختم ہو گئی۔ اب جنگ نہیں ہو گی۔ اب جنگ بالکل نہیں ہو گی"

"سچ مچ ؟ —— سچ مچ ؟"

اتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لئے بھی تو شیر کا کلیجہ چاہیئے۔

"جنگ ختم ہو گئی شاداں بیٹی" شمشیر گھر جا کر چلّایا، اور شیر کو اُٹھا کر اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی،

"سچ مچ ؟" —— مگر شاداں کے اس استعجاب میں مسرت کے بجائے صرف حیرت تھی،

"ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا، تیرا ابا اب واپس آ جائیگا۔

"سچ ؟" ننھے نے بڑی بڑی گول مول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو گھورا

"نیا لائے دا ؟"

"تمہاری سواری کا گھوڑا۔ عید کے لئے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ، اور چھڑی اور ——"

"پتاخے"

"ہاں ہاں پٹاخے اور پھلجھڑیاں اور ——"

"خاک لائے گا" شاداں نے بگڑ کر کہا،

"کیوں ؟" جیسے شاداں نے بوڑھے کا مُنہ نوچ لیا تھا،

"تنخواہ تو ساری مہاجن ہضم کر گیا، وہ تو اپنی جان بچا کر بھی لائے تو شکر کرو خدا کا" اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی،

کانٹوں کا وہ گچھا جو دیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اُس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا، اُچھل کر جیسے اُس کے دماغ میں کودنے لگا، مگر اب جنگ ختم ہو چکی تھی، اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا۔ کہ دیر کی راہ دیکھی جائے،

دو تین ہفتے بعد اُسے معلوم ہؤا، کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں، کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آ رہے ہیں۔ "دامنِ کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا، گھر واپس آ چکا ہے" اُس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سُنا، اور اُسی روز ایک ننھی سی بقچی کاندھے پر لٹکا کر اسی گاؤں کی راہ لی، گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیئے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے، بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا،

وہاں جا کر اُسے نو وارد سپاہی کی زبانی معلوم ہؤا، کہ قیدی بیشمار تھے، اور انہیں ملایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا، اس لئے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا، مایوس ہو کر گھر کو پلٹا،

تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا، تو اُس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتا دیکھا، پہلے تو

کا ایک جمگھٹ بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا،

سورج غروب ہونا چاہتا تھا، مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی، درختوں کے پتے اداس اور نڈھال ہو کر بل کھا گئے تھے، کھیتوں پر مردنی کا عالم تھا، ٹھکانوں کو جاتے ہوئے پرندوں کی آوازوں میں شیون تھا۔ پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زریں فیتے پر ایک گدھا دھول میں نہا رہا تھا،

"واپس آ گئے چچا؟" پٹواری نے پوچھا،

"ہاں۔ واپس آ گیا ہوں۔ نامراد" شمشیر نے کہا۔ "مگر تم کہاں چلے؟"

"میں یہاں سے جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے"

"کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت؟" پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہیں چمٹ کر رہ گئی۔ "خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے، امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لئے ماسکو میں مولوٹاف، برنز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ اور تمہیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لئے وہ مجمع تمہارا منتظر کھڑا ہے، جاؤ بابا۔ تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے، تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ، وہاں اُس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے، اور پھر اپنے گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمہارے بیٹے کا تار پڑا ہوگا۔ وہ آ رہا ہے۔"

"دلیر آ رہا ہے؟" شمشیر برچھی پھینک کر پٹواری سے لپٹ گیا، مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا، اور اسی خوفناک سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں، واپس آ رہا ہے تمہارا دلیر، سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا جسے کل صبح اُس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سفیر کے حوالے کر دیا ہے۔"

"تار ملنے کے بعد؟"

"اور پھر پکارنا۔ شاداں۔ شاداں بیٹی۔ تمہاری وہ شاداں بیٹی جو شاید ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی، جو رات کو تمہارے پڑوسی دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے بنّوں کی طرف"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمہیں امن اور خیریت کے تمام معانی ازبر ہو جائیں گے"

وہ شمشیر کے مردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر پلٹا، اور پگڈنڈی پر ہو لیا، سورج دریا کے پرے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ سا بن گیا — دھرتی کے کلیجے میں سے نکلتا ہوا شعلہ — رواں دواں — رواں دواں — اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک ہیولا سا بن گیا۔ مشرقی افق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا۔ پھیلتا گیا۔ ناپید ہوتا گیا — اور پھر اُسی افق سے چاند بن کر ابھرا جگمگاتا ہوا، ہنستا ہوا — جیسے مغرب میں دبکے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے!

علی عباس حسینی

برف کی سِل

ہمسائی کے ہاں شادی تھی۔ "بڑی آپا" کہنے والی انور بیاہی جا رہی تھی۔ گھر میں سینکڑوں عورتیں موجود تھیں —— بوڑھی، جوان، شادی شدہ، بن بیاہی، خوبصورت، بدصورت، آدمی کا بچہ! — ہر ایک کے چہرے پر ہنسی کھیلتی تھی۔ ہر ایک خوش دکھائی دیتی تھی۔ مگر کوئی جمیلہ کی طرح بے آپے نہ تھی۔

نہ جانے کیوں آج وہ بوکھلاسی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل گا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کے اس کے جسم بھر میں ایک مترنم سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ جیسے کوئی اس کے سازِ زندگی کو بار بار چھیڑتا تھا۔ جیسے کوئی اسے بار بار گدگداتا تھا۔ جیسے کوئی بار بار چٹکیاں لیتا تھا —— وہ اپنی رگوں میں گرم خون کی روانی محسوس کرتی تھی، جلتا ہوا، اُبلتا ہوا، جوش مارتا ہوا! اس کا جی چاہتا تھا کسی طرح یہ خون بہہ نکلے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر بھر میں اچکتی پھرے، تھرکتی پھرے، گاتی پھرے، ہنستی پھرے! — وہ ایک جگہ ذرا دیر بیٹھتی، پہلو بدلتی، مسکراتی، کھڑی ہو جاتی، انگڑائی لیتی، آگے بڑھ جاتی — وہ ایک تتلی تھی، نازک، حسین، دلربا۔ مگر بلا کی بے چین! کسی پھول پر جم کر نہ بیٹھنے والی! کسی غنچے پر نہ ٹھہرنے والی!

ڈومنیاں گا رہی تھیں، بوڑھی پھٹی آواز سے، بےسرے پن سے "آیا بنّا رے! آیا بنّا رے" کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ جوان کی آواز میں رس تھا۔ تو اس کی آنکھوں میں بھی مدہوشی تھی۔ کالی سیاہ پتلیاں، بڑے بڑے دیدے، دنبالہ دار سرمہ لگا ہوا، ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی، چست انگیا میں بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی۔ اس پر شرارتیں کہ توبہ ہی بھلی! وہ کولھے مٹکاتی ہاتھ چمکاتی، آنکھیں مارتی اور کسی نہ کسی کی فرمائش پر اس کی رشتہ دار کو ننگی ننگی گالیاں گا گا کر سنا دیتی —— جمیلہ کو یہ فحش مذاق، شادی بیاہ کی یہ گندی گالیاں کبھی نہ بھائی تھیں۔ لیکن آج یہ گالیاں شراب کی طرح تلخ ہونے پر بھی سرور انگیز تھیں۔ وہ یہ بھول جاتی کہ اس کا دوپٹہ سرک کر کہاں سے کہاں پہنچا۔ وہ یہ بھی بھول جاتی کہ پاس کوئی بڑا کھڑا ہے یا چھوٹا، وہ بار بار ہنستی، تال دیتی اور انگڑائیاں لیتی!۔

ناک چوٹی گرفتار حسنیٰ کو اس نے کبھی اچھا نہ سمجھا تھا۔ اس کی کرنجی آنکھیں، اس کے گھنگھریالے بال، اس کا شلجمی رنگ، جمیلہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر آج وہی حسنیٰ سرخ ساری میں بیر بہوٹی بنی ہوئی ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا اسے کلیجہ میں بھر لو۔ جیسے جمیلہ کے دل میں سوائے محبت کے کسی جذبے کی گنجائش ہی نہ رہ گئی ہو۔ جیسے اس نے اس راز کو پا لیا ہو جو حسنیٰ کو گھنٹوں سنگار کرنے پر مجبور کرتا تھا —— سپاہی کا ہنر ہے اپنے اسلحہ کو صاف اور تیز رکھنا، ادیب کا ہنر ہے اپنے قلم کی نوک پلک دیکھتے رہنا، اور عورت کا ہنر ہے اپنے کو ہر آن حسین تر بناتے رہنا! —— حسنیٰ اس کے سوا اور کیا کرتی تھی؟ وہ اپنے کو کسی کے پیش کش کے قابل بناتی تھی۔ پیش کش! — ہاں ہاں پیش کش ہی میں عورت کی فتح ہے! جیت ہے! حکومت ہے! اکڑنے، اترانے، چنگھاڑنے والے مرد پر حکومت! —— اور اس نے پھر انگڑائی لی ——

اس مُوئے دوپٹے کو آج کیا ہوا ہے؟ جب دیکھو سر سے کھسکا جا رہا ہے! آہنہ، ہو گا! کون دیکھتا ہے؟ سب عورتیں ہی عورتیں تو ہیں۔ اور سب خوش، اپنے کو بھُولی ہوئی، مگر میری طرح کوئی بے آپے نہیں، شاید دلھن ہو چلو دیکھیں۔ کیسی لپٹی لپٹائی، سمٹی سمٹائی بیٹھی ہے، خون کا منجمد قطرہ! ....

بخورات سے رُندھا اور لبا ہوا کمرہ، شنجرفی گھونگھٹ میں سے جھلکتا ہوا شہابی چہرہ، عطرِ عروس کی لپٹ، حنائی ہاتھوں سے چھوٹا سا سلام! جمیلہ نے بلائیں لینے کی جگہ دُلھن کو گود میں سمیٹ کر پیار کر لیا۔ انور نے شرما کر احتجاج کی "بڑی آپا!" اس تخاطب نے سارا مزہ کِرکرا کر دیا۔ نوج یہ ہندوستانی رشتے! قدم قدم پر چھوٹے بڑے کا خیال۔ آدمی کس سے بولے، کس سے ہنسے؟ — اس نے جھنجھلا کر کہا "بھاڑ میں جائیں بڑی آپا!" اور باہر چلی آئی۔

گھر بھر میں بجلی کی روشنی، دالانوں میں، کمروں میں بیویوں کے ٹھٹ

کے ٹھٹ، صحن میں شامیانے کے نیچے صحنک کی تیاریاں، شامیانے کے پیچھے سے جھانکتا ہوا چودھویں کا چاند۔ اس نے مہ کامل کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ بلند کیے، انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور پھر انگڑائی لی پھر ہاتھ نیچے لاتے ہوئے خود ہی مسکرا کر گنگنانے لگی۔ " اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن!"

میزبان بی بی نے پکار کر کہا "اری جمیلہ بیگم! کچھ مہمانوں کا بھی خیال ہے؟ سب کو پان پتہ مل رہا ہے؟" —— بڑی محبت تھی اس کی تھکی ہوئی بوڑھی آواز میں۔ اور اپنانے کا انداز تو دیکھو۔ خود اسے بھی میزبانی میں داخل کر لیا۔ اب چاہے رات بھر اسے پان کا ٹکڑا نہ ملے، ایک کھیل اڑ کر حلق میں نہ جائے۔ مگر وہ شکایت کر ہی نہیں سکتی۔ وہی تو منتظم ہے، اسی کی لڑکی اسی کی عزیزہ اسی کی بہن کا تو بیاہ ہے! —— وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی ہنس کر بولی۔ "جی ہاں، آپ ادھر سے بیفکر رہیں، سب کو ساری چیزیں پہنچ رہی ہیں"۔

حسنیٰ نے چپکے سے بغل میں کھڑے ہو کر کہا "تو پھر مجھے پان کھلوا دو نا!"

جمیلہ نے حسنیٰ کے اس طرح خاموشی سے پاس آنے پر کوئی تعجب نہ محسوس کیا۔ وہ تو بڑی دیر سے جمیلہ کے پاس ہی تھی۔ پیش کش بنی ہوئی! اس نے حسنیٰ کو بڑی محبت سے دیکھا۔ کیسی چھوٹ پڑ رہی تھی چاند کی اس کے گورے گورے گالوں پر! اس نے حسنیٰ کے لپ اسٹک سے لال ہونٹوں پر اپنے کلمے کی انگلی ماری۔ پھر اس کی صراحی دار گردن میں بانہہ آویزاں کر کے کہا "وہ چاند تمہیں آنکھیں مار رہا ہے حسنیٰ!"

حسنیٰ نے جمیلہ کے اس فقرے کے جواب میں اسے صرف مسکرا کر دیکھا اس مسکراہٹ میں غضب کی ہمدردی و یگانگت تھی۔ جمیلہ کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے حسنیٰ کے دل میں بھی وہی جذبات انبساط موجزن ہیں جو اسے دیر سے گرمائے ہوئے تھے۔ جمیلہ نے ایک رکتی ہوئی ٹھنڈی سانس لی۔ یہ اٹکتی، کھٹکتی، سینہ میں چمک سی پیدا کرتی ہوئی سانس، افسردگی، اضمحلال، یا افسوس کے اظہار کا ذریعہ نہ تھی۔ بلکہ یہ مسرت کے جام لبریز کی ایک لہر تھی۔ چھلک جانے والی؛ چھلکا دینے والی ایک کیفیت! جیسے سبک قدم صبا کلیوں کو کھلاتی چل رہی ہو، جیسے آنکھیں لڑانے والا چاند دل میں اتر آیا ہو ——!

حسنیٰ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں شعر پڑھا:-

کس کے چہرے کا حیرتی ہے ماہ؟ جملہ تن ایک دیدۂ وا ہے!

جمیلہ نے ایک چھچلتی نظر ماہ چہاردہم پر ڈالی۔ پھر حسنیٰ کے مہوش چہرے پر آنکھیں جمالیں۔ دفعتہً اس کے ہاں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہو گئی۔ ایک مردانہ خواہش! حسنیٰ کے شباب و حُسن کو لوٹ لینے والی خواہش! "کاش میں مرد ہوتی!" اس نے ایک کھٹکتی ہوئی سانس لیکر سوچا۔ اس نے حسنیٰ کی گردن میں پڑی ہوئی بانہہ پر اپنا بوجھ بڑھا دیا۔ حسنیٰ اس کی طرف جھکنے لگی۔ شاخ بارور کی طرح جھکنے لگی ....

"بی بی، اچھے میاں بڑی دیر سے آپ کے لئے بلک رہے ہیں"۔

جمیلہ نے حسنیٰ کے بچّے کی کھلائی کو رقیب کی نظروں سے دیکھا۔ کہاں آ گئی یہ مردار اپنے اچھے میاں کو لے کر۔ مگر جب حسنیٰ اس کی بانہہ اپنی گردن سے آہستہ سے الگ کر کے پھول سے بچّے کی طرف پلٹی تو جمیلہ نے ماں بیٹے دونوں کے چہروں پر ایک ایسی چمک دیکھی جو دل میں تیر و بسلہ کی طرح پیوست ہو گئی۔ اسے دفعتہً محسوس ہوا کہ اس کی خوشی نامکمّل ہے، اس کی محبت ناقص ہے۔ وہ اب تک بے ثمر ہے! ——

اس کی نظروں میں ساس نندوں کا شکایت بھرا چہرہ پھر گیا۔ پانچواں سال تھا اس کی شادی کو، مگر "ایک چوہیا" بھی وہ اب تک نہ جن سکی تھی۔ نہ میاں کو آج تک اس کی فکر ہوئی تھی، نہ اسے پروا۔ وہ تو ضبط تولید کے قائل تھے، اور خود جمیلہ "تخلیق" کی تکالیف سے ترساں تھی۔ وہ محبت کے روحانی پہلو، اس کے اغراق، اس کی مثالیت کی قایل تھی، لیکن اس طیب و طاہر جذبے میں بہیمانہ افعال و حرکات کا اشتراک، اسے حد درجہ کریہہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں جذبۂ مقاومت اُبھار دیتا تھا۔ لیکن آج اچھے میاں اور حسنیٰ کے چہروں کی چمک نے اسے محسوس کرا دیا کہ تولید میں "خالقیت" ہے۔ عورت کا ربانی فریضہ! —— اس کے جسم میں لرزش سی پیدا ہو گئی، جیسے اس نے کوئی قصور کیا ہے، جیسے وہ کسی چوری میں پکڑی گئی ہے، جیسے بھری برادری اسے سبک نظر سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ سچ مچ عورت اور مرد کی درمیانی جنس ہے!

اُس نے پلٹ کر حسنیٰ کی بھری گود کو دیکھا۔ اسے جمیلہ کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ وہ اچھے میاں کو سینے سے چمٹائے آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔ بچّہ ماں کے گال پر گال رکھے ننھے ننھے ہاتھوں سے

چاند کو بلا رہا تھا۔ جمیلہ کو محسوس ہوا جیسے وہ پتلی پتلی انگلیاں اس کے سینے کو چیرتی ہوئی دل میں در آئیں اور اسے مسلنے لگیں ـــــ وہ کچھ شرمائی کچھ مرجھائی سی وہاں سے چلی، قدرے بدحواس ہو چلی۔ درمیان میں ایک پانچ برس کی بچی سے ٹکرائی۔ چونکی، تو دیکھا کھوئی ہوئی منزل کے لئے دوسرا سنگِ میل ہے اس نے بسورتی ہوئی بچی کو جلدی سے گود میں اٹھا لیا گھبرا گھبرا کر منہ چوما اسے چاند دکھایا، بہلانے کے لئے گا گا کر سنایا:۔

چندا ماما دور کے　　لڈو بنائے بُور کے

لڈو گیا ٹوٹ　　چندا گیا رُوٹھ

بچی ہنس دی "کہاں رُوٹھا ہے۔ ہنس تو رہا ہے"۔ جمیلہ نے پیار کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ "روٹھا نہ ہوتا تو ہمارے پاس کیوں نہ آتا؟" ـــــ بچی کو گود سے اُتار کر آگے بڑھ گئی۔ دل میں آیا چلو گھر چلیں۔ خیال آیا بی بیاں صحنک میں ڈھونڈیں گی۔ اُنہہ! بہت سی سہاگنیں ہیں، شادی کا بھرا گھر ہے۔ کس کو اتنا دھیان کہ بن بچوں والی جمیلہ غائب ہے۔ بن بچوں والی ـــــ بانجھ! ـــــ ہائے اللہ کہیں ایسا ہی تو نہیں ہے؟ ـــــ

ایک ہوک سی اُٹھی۔ وہ تلملا گئی۔ اُن سے کہوں گی ڈاکٹرنی کو دکھاؤ، حکیم کو بلواؤ ـــــ مگر ـــــ مگر بڑی ہی بے شرمی ہے! ـــــ اس کے قدم اور جلدی جلدی اُٹھنے لگے۔ وہ جلدی سے ہمسائی کی کوٹھی اور اپنے بنگلے کے درمیانی دروازے میں سے نکل گئی۔

بنگلہ اندھیرا تھا۔ نوکر چاکر، ماما دائیاں، میاں، سب ہی تو آج شادی کے گھر میں ہاتھ بٹانے، برات اُتارنے، مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں مشغول تھے۔ اسی لئے اسے یہ پرانا گھر اجنبی سا معلوم ہوا۔ مگر وہ ذرّہ نہ جھجکی۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی، اس نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ وہ اپنی سنگار میز کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اُس نے قدِ آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ چوڑی پیشانی پر سیاہ چمکتی ہوئی زلفیں، پتلی جھکی ہوئی بھوؤں کے نیچے دو سیاہ چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ اُن میں سُرخ سُرخ ڈورے۔ پتلی چھوٹی ناک، میانہ دہانہ، ٹھوڑی کے ٹھیک بیچ میں ایک ہلکا سا گڑھا اور اس میں ایک چھوٹا سیاہ تل ـــــ اسے خود ہی اپنی صورت پر پیار آ گیا۔ وہ مسکرائی۔ اُس نے اپنی پتلی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور زبان نکال کر خود اپنی صورت کا منہ چڑا دیا! ـــــ پھر وہ زور سے ہنسی

اور اسی طرح ہنستی ہنستی میاں کے دفتر میں گئی۔ اس نے ان کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "ریسیور" اٹھایا، ہمسائی کے مردانے کا نمبر بتایا اور انتظار کرنے لگی۔ کسی نے وہاں سے "ہیلو" کہا۔ اس نے کہا "محتشم صاحب کو ٹیلیفون پر بھیجدو"۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بڑی بے حیائی ہے۔ وہ دل میں کیا سمجھیں گے۔ ہاتھ کانپنے لگا۔ اس نے "ریسیور" میز پر رکھ دیا۔ اس کا جی چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ آخر آج اسے ہو کیا گیا ہے؟ وہ کیوں بوکھلائی بوکھلائی سی ہے؟ آخر میاں سے کیا کہے گی؟ اس کے نتھنوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ اس نے 'ریسیور' اُٹھایا کہ اسے چپکے سے ٹیلیفون کے "ٹرینسمیٹر" پر رکھ کر گفتگو کا موقع ہی نہ دے۔ لیکن اُس کے اُٹھاتے ہی آواز آئی۔ ان کی پیاری آواز ـــــ "ہیلو"۔ گھبرا کر بول اُٹھی "ذرا ـــــ ذرا یہاں آئیے! کام ہے!"

"اچھا آپ ہیں! ابھی آیا سرکار!"

اب کیا کیا جائے؟ اب تو راہ فرار بھی مسدود ہو گئی! وہ تھوڑی دیر کھڑی کھڑی کانپی۔ پھر دفتر کی روشنی بجھا کر اپنے کمرے میں آئی۔ دو مسہریوں پر سپید سپید چادریں، پائینتی ریشمی دلائیاں، سرہانے دو دو تکئے۔ ایک طرف، اس کی سنگار میز۔ اس پر آرائش و زیبائش کے سامانوں میں مشرق و مغرب کی آمیزش۔ کنگھا، برش، پاؤڈر، کریم، سینٹ، عطر، سرمہ، چاندی کا گلوری دان، کچھ انگوٹھیاں۔ دوسری جانب ان کی میز، اس پر مردانے برش اور کنگھے کے ساتھ ساتھ ایک جوڑی ڈمبل ـــــ

"کس قدر خوبصورت ہے ان کا جسم!۔ تیس برس کے قریب عمر مگر بوٹی بوٹی کسی ہوئی۔ پھرتی، قوت اور مردانگی کا نمونہ! جب ہی تو بڑے گھمنڈ سے کہتے تھے "تمہاری جسمانی خوبصورتی بچہ نہ ہونے ہی تک ہے، پیاری بنو!" ـــــ اور میرے شرمانے اور دوپٹے میں منہ چھپانے پر کس طرح ہنستے ہیں۔ "مخفی کہتی ہے۔ حجاب نو عروساں در بر شوہر نمی ماند۔ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند!" اور تم ہو کہ اب تک چھوئی موئی بنی ہو! لجاؤ! جھینپو!" ـــــ اور آج کیا کہیں گے وہ؟۔ انہیں کی بات سچ ہوئی! میں اُن سے برابر لڑی کہ ہر عورت فطرتاً رنڈی نہیں

ہوتی۔ وہ کہتے "تم اپنا ذکر نہ کرو۔ تم عورت نہیں ہو، تم تو قطبین کی نہ پگھلنے والی برف کی سِل ہو، ہاتھی دانت کی مورتی ہو، سنگ مرمر کی پری ہو!" ــــ ہائے اللہ یہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے ان کو خود سے بلا لیا۔ وہ چاہے میرے دکھانے کو کتنا ہی خوش ہوں، لیکن دل میں ضرور کہیں گے "نکلی جمیلہ بھی رنڈی ہی!"۔ اور وہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسیں گے، وہی جس کا ہر قہقہہ کہتا ہے "تمہارا میاں کبھی غلط بات کہتا ہی نہیں بنو! ــ وہ عورت کی رگ رگ پہچانتا ہے، بی بنو!" ــــ اس نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ جیسے کوئی سچ مچ وہاں کھڑا ہے، جیسے کوئی سچ مچ اسے جھینپتے دیکھ رہا ہے۔ وہ اسی طرح کھڑی کھڑی دو ایک بار جھومی اسے محسوس ہوا کہ اس میں قوت مقاومت نہیں رہ گئی اور اب بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ آہٹ پر کان لگائے، کہیں وہ آ تو نہیں رہے ہیں! ــ اس نے جلدی سے روشنی گل کی اور لمبے لمبے قدم رکھتی، مڑ مڑ کر دیکھتی، ــ ہمسائی کی کوٹھی میں چلی گئی ــ

دیوار تو درمیان تھی ہی۔ بس اپنی پچھواڑی سے کی اور ان کے صحن میں ہو لی۔ لیکن اتنی راہ اس گھبراہٹ سے گذری کہ ہمسائی کے ہاں پہنچتے پہنچتے وہ ہانپنے لگی۔ دل دھڑک رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہمسائی کی شکایت اور سہیلیوں کے طعنوں کا جواب وہ بڑی مشکل سے رُک رُک کر دے سکی۔ جب ذرا دم ٹھکانے ہوا تو ان انوکھے جذبات وخیالات کو بھلانے کے لئے وہ کام پر پل پڑی۔ اس نے ساری بیویوں کو کھانا کھلایا، پان پہ پان بنا کے دیے، دلھن کو سنوارا، دولھا کے اندر آنے پر رسمیں کرائیں، اور تاروں کی چھاؤں میں انور کو سسرال رخصت کر کے وہ گھر پلٹی ــ تھکی ہوئی چور، افسردہ و مضمحل، بابل کے پُر حسرت گیت کی کھٹک دل میں لئے ہوئے ــــ

پھیکی چاندنی اب بھی پھیلی تھی۔ پھولوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے تھے، ہوا میں خنکی کے ساتھ ساتھ ایک خوشبودار مستی تھی، آس پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز کانوں میں ایک خوشگوار جھنجھناہٹ پیدا کر دیتی تھی ــــ اس نے انگڑائی لی۔ رگوں کے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک غنچے کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دی پلٹ کر دیکھا تو گلاب کی ایک کلی کھل رہی تھی۔ وہ گنگنا اُٹھی۔

"ہو گئیں کیاریاں ہری ہری جیسے کہ رت پلٹ چلی۔ کون یہ مُسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!"۔ رُت پلٹ چلی۔ رُت پلٹ چلی۔ اُس نے بار بار دہرایا۔ اُس کا اضمحلال غائب ہو گیا۔ اس کے دل میں تمام وہی جذبات عود کر آئے۔ جو ٹیلیفون کرنے سے پہلے موجزن تھے۔ اس کا بیساختہ جی چاہا وہ میاں کو جگا کر کھینچ لائے۔ چلو پھولوں کا کھِلنا دیکھو، گُلوں کے کٹوروں میں شبنم کے موتی دیکھو، اور رات کی دن سے ہم آغوشی دیکھو ــــ

اس کے قدم تیز ہو گئے، اس کا تنفس تیز ہو گیا، اس کی گردن آگے بڑھ گئی، گویا وہ اپنے میاں کی طرف اسی طرح کھنچی جا رہی تھی۔ جیسے فولاد مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ دالان میں پہلے میاں کے دفتر کا کمرہ ملتا تھا اُس نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کے لئے اسے کھول کر جھانکا۔ اسے یقین تھا۔ یہاں کوئی نہ ہو گا۔ "وہ" اپنی مسہری پر دراز آرام کرتے ہونگے۔ لیکن صبح کے دھندلکے میں کوئی مخملی قالین پر پڑا ہوا معلوم ہوا۔ اسے تعجب سا ہوا۔ اس نے اندر ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دی ــــ

اس کی جوان ماما رمضانی بے خبر سو رہی تھی۔ لٹیں چھٹکی ہوئی، کپڑے بے ترتیب، لٹے ہوئے مسافر کی بے پروائی! جمیلہ نے جھنجھلا کر سوچا "اس مالزادی کو یہاں لیٹنے کی کس نے اجازت دی!" اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ میاں کا ایک موزہ میز پر رکھا تھا، ایک نیچے گرا تھا، کالی شیروانی رمضانی کے سرہانے فرش پر پڑی تھی، اور وہ بغل والے حمام میں لہرا لہرا کے گا رہے تھے ــــ

"داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے!"

"مرمر کی پری نے" چیخ روکنے کے لئے اپنے ہی ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لیا ✿

ابراہیم جلیس

لڑائی

کنگسوے سے بارکس تک گلبرٹ کو راستے میں کئی عورتیں ملیں۔ اچھی صورتوں والی، دلآویز جسموں والی، خوش رنگ لباسوں والی عورتیں، لیکن اُس نے کسی کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جارہا تھا۔ سُورج کی تیز چمک سے اس کا غصّہ سے تمتمایا ہؤا چہرہ اور بھی لال بھبو کا ہؤا جارہا تھا۔ ایک مس فلورا سے جھگڑا ہو جانے پر وُہ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے دنیا کی ساری عورتوں سے اس کی چل گئی ہے۔

بارکس کے پھاٹک پر ایک ٹرک گھرگھراتی ہوئی اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ اسٹرینگ پر واٹسن ——— گلبرٹ کا ہم وطن اور ہم راز دوست جھکا ہؤا تھا۔ گلبرٹ کے تمتماتے چہرے، اکڑے تیور اور کھنچے ابرو دیکھ کر وُہ مسکراتا ہؤا ٹرک سے اُترا اور بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلورا سے آج پھر تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے یار بڑے جھگڑالو عاشق ہو تم ———"

گلبرٹ نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر جسم اکڑاتے ہوئے کہا۔ "نکن ڈیم مس فلو ———"

واٹسن گلبرٹ کی رگ رگ سے واقف تھا۔ شاید گلبرٹ بھی اپنے بارے میں اتنے صحیح معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جتنے کہ واٹسن کو معلوم تھے۔ واٹسن کی عادت تھی کہ وُہ جس سے ملتا تھا اس کو صرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ بلکہ باضابطہ طور پر اس کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ گلبرٹ تو اس کا چوبیس گھنٹوں کا ساتھی تھا۔ اس لئے اس نے گلبرٹ کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "تو آؤ ——— کسی بار میں چل کر غم غلط کریں۔ یہ کسی سپاہی کے شایانِ شان نہیں کہ وُہ اتوار کی تعطیل یوں مُنہ بسورتے گزار دے۔ مُنہ بسورنے کے لئے تو اور چھ دن پڑے ہیں"

گلبرٹ اس وقت کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ آرام سے بستر پہ لیٹے یا سبز کینوس کی آرام کرسی پر بیٹھے سگار پیتے ہوئے جارج سے انتقام لینے کے طریقے سوچنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "نہیں ——— فکن میں کہیں نہیں آؤں گا۔"

واٹسن ایسے موقعوں پر گلبرٹ کو ادرمنانا سمجھاتا نہیں تھا۔ بلکہ اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیتا۔ گلبرٹ وقتی طور پر اس پر برس پڑتا اور نرم نرم گھونسے بھی لگا دیتا لیکن گھونسوں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی جاتی واٹسن کی ہنسی بھی کھنکھنانے لگتی۔ حتیٰ کہ گلبرٹ بھی کھسیانے لگتا اور بات ختم ہو جاتی . . . . اور بات ختم ہو گئی۔

گلبرٹ واٹسن کی پہلو والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرک گھرگھراتی ہوئی۔ چل نکلی۔ بارکس کے منچلے سپاہیوں کا گیت . . . . چک چک چک ——— بوم چک . . . . . بوم چک ——— مدھم ہوتا ہوتا مر گیا۔ اور پلازا اسٹریٹ کے چوراہے سے شہر کا شور بلند ہؤا ——— گھُم۔ گھُم۔ ایک بے مفہوم بے معنی شور جیسے لاتعداد مکھیوں کی بھنبھناہٹ ——— جو ٹرک کی گھرگھراہٹ پر بھی بھاری تھی۔

ڈبلیو۔ اے۔ سی ہوسٹل کے پھاٹک پر دس بارہ "پیٹی کوٹ سولجرس" کھڑی ہوئی تھیں۔ واٹسن نے شرارتاً انہیں سلام کرتے ہوئے گلبرٹ کی کمر میں کہنی ماری اور بولا۔ "ہاں اب سناؤ کیا ہؤا ———"

گلبرٹ نے جیب سے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے کہا۔ "ہوتا کیا ——— فکن وُہ سالا جارج ——— میں اسے جان سے مار دوں گا۔ وُہ میرے ہر راستے میں روڑا بن کر آجاتا ہے۔"

واٹسن عادتاً مسکرانے کے بجائے کچھ سنجیدہ ہو گیا اور "ہُوں" کہہ کر ٹرک کی رفتار تیز کر دی۔ سڑک سنسان تھی۔ کبھی کبھار کوئی اچھی شکل وصورت، اور اچھے لباس والی عورت بھی نظر آجاتی تھی۔ ورنہ جتنی عورتیں فٹ پاتھ پر چل پھر رہی تھیں۔ نچلے طبقے کی نچلی قسم کے رنگ والی۔ بے ڈھنگی خالص ہندوستانی ——— پیلی پیلی تیز دھوپ سیمنٹ روڈ پر پڑی چندھیا رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے ——— جارج! جارج!! وُہ نہ صرف گلبرٹ کے راستے کا بلکہ واٹسن کے راستے کا بھی روڑا تھا۔ وُہ امریکن تھا۔ گلبرٹ اور واٹسن دونوں انگریز ———

یا جارج صرف ایک روڑا تھا اور گلبرٹ اور واٹسن صرف راہگیر — جارج کی بدولت گلبرٹ اور واٹسن کو کیسی کیسی خفتیں اور ہزیمتیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، تانگہ اسٹانڈز پر، شراب خانوں میں، ناچ گھروں میں، دوکانوں میں، ہیر کٹنگ سیلونس میں، فوٹو اسٹوڈیوز میں، رنڈیوں کے کوٹھوں پر، سوسائیٹی کی لڑکیوں میں ...... گلبرٹ نے واٹسن سے یا واٹسن نے گلبرٹ سے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ مگر دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ جارج کی موجودگی میں واٹسن کو بھی وہی زک اُٹھانی پڑتی تھی جو کہ گلبرٹ کو — پرسوں شام واٹسن چینی بار میں شراب پینے گیا تھا۔ اتفاق سے جارج اور واٹسن ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ لیکن بیرہ جس تیزی اور مستعدی سے جارج کے آرڈرس کی تعمیل کر رہا تھا۔ اتنی ہی کاہلی اور بے دلی سے واٹسن کے آرڈرس سنتا تھا۔ حالانکہ اس دن واٹسن نے بیرے کو جارج سے تگنی زیادہ بخشش دی تھی۔ بیرے نے خوش ہو کر خاص انداز میں اسے سلام تو کیا لیکن اس کی مسکراہٹ علانیہ طور پر کہہ رہی تھی — صاحب ہر فرائی ڈے گڈ فرائی ڈے تو نہیں ہوتا۔ تم نے آج اتنی بخشش دی۔ کل کہاں دو گے۔ جارج صاب تو روز اتنی بخشش دیتا ہے کہ ایک دن کی تنخواہ سے زیادہ پیسے مل جاتے ہیں۔

ٹرک موڑوں پر مڑتی، سنسان سڑک پر تیز دوڑتی، بھیڑ بھاڑ میں سست رفتار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گلبرٹ نے واٹسن کو اس طرح خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو — فکن بتاؤ ہمیں کہاں جانا ہے؟"

واٹسن نے جواب دیا۔ اتوار کے دن پروگرام بنا کر سیر کرنا صریح حماقت ہے۔ ارے کہیں چلیں گے — جہاں جی چاہا — جہاں جی چاہا!!

گلبرٹ نے مُنہ لٹکاتے ہوئے کہا "مگر تمہاری یہ فکن خاموشی مجھے مطلق پسند نہیں۔ کچھ باتیں کرو۔"

واٹسن نے مسکرا کر پوچھا "کیا باتیں کریں — ! تم ہی سناؤ کچھ۔"

گلبرٹ کے ذہن پر جیسے ابھی تک جارج ہی سوار تھا۔ اسے جارج کے علاوہ اور کوئی موضوع ہی نہ ملتا تھا۔ اسی لئے اس نے پھر اسی کو باتوں کا موضوع بنا ڈالا۔ "یار واٹسن — کل اس فکن جارج نے پھر میری بے عزتی کر دی۔ میں ناچ گھر جانا چاہتا تھا۔ تانگے کو پانچ روپے میں ہائیر کیا۔ سمجھے پانچ روپے میں صرف دو فرلانگ کے لئے — لیکن نہ جانے آسمان پھٹ پڑا یا زمین تڑخ اٹھی اور جارج نازل ہو گیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی سالے تانگے والے نے تانگہ اسی کی طرف بڑھا دیا۔ اور بغیر کرائے کی بات چیت کئے جارج تانگے میں بیٹھ گیا۔ اور مجھے ایسی طنزیہ اور حقیر نظروں سے دیکھتا رہا۔ کہ جی چاہتا تھا کہ وسکی کے چاروں پگ کا نشہ ایک ہی گھونسے میں بھر کر اس کے جبڑوں پر اتار دوں۔ لیکن ....

واٹسن نے بات کاٹی۔ لیکن یہ تو کوئی بڑی ہتک نہیں۔ تین چار روز پہلے گرین کیفے" میں میرے ساتھ ایلیفنٹ برج کی ایک چھوکری ساتھ تھی۔ میں اسے" اوما آف دی ساؤتھ سیز" دکھانے پلازا لیجانے والا تھا۔ میں نے اسے چار ہی بجے سے انگیج کر لیا تھا۔ ٹیکسی میں شہر کی ساری سڑکیں گھما ڈالیں۔ گرین میں ڈنر کھلایا۔ اور جب ہم شمپین کے خُم لنڈھا رہے تھے — اور جب ہم شمپین کے خُم لنڈھا رہے تھے !!۔ گلبرٹ نے جملہ دہرایا۔ اور جب تم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے — ؟

واٹسن نے کہا۔

ہاں جب ہم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے — وُہ — وُہ سالا جارج آموجود ہوُا۔ اور وہ ندیدی چھوکری ایک منٹ کی اجازت لے کر اس سے ملنے چلی گئی۔ میں نے ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، ساٹھ منٹ انتظار کیا — شمپین کے خُم کے خُم لنڈھاتا رہا مگر....

گلبرٹ نے اس کی بات اچک لی۔

مگر یہ بھی کوئی بڑی ہتک نہیں۔ تمہاری اس ہتک کا کسی کو بھی پتہ نہ چلا ہوگا۔ اس کیفے میں جتنے آدمی بیٹھے تھے سبھوں نے یہ سمجھا ہوگا۔ کہ تم نے اس لڑکی کو صرف ڈنر کی دعوت دی تھی۔ اب یہ کرو کہ وُہ لڑکی جہاں بھی ملے اس سے انتقام لو۔ ایک روپیہ دیئے بغیر اسے پورے چوبیس گھنٹے انگیج کر لو۔"

واٹسن نے کہا۔

یار - تم انتقام کی کہہ رہے ہو - میں تو اب اس لڑکی سے آنکھ ملا
کر بھی بات نہیں کر سکتا - یہ پیسوں کی بھوکی چھوکریاں اسی کو طاقتور مرد
سمجھتی ہیں - جس کی پاکٹ میں زیادہ دام ہوں - اور پھر وہ ایک چھوکری
ہے - اور ہماری تہذیب بیہودہ ہے - اس تہذیب میں تو ایک آوارہ سی
ذلیل سی ذلیل عورت تک کی عزت کرنی پڑتی ہے - میں "لیڈیز فرسٹ"
والے اخلاق سے تنگ آ گیا ہوں -

"عورت پہلے آگئی تہذیب پیچھے رہ گئی ——— مجھ پر لعنت ہو"۔
گلبرٹ نے بھینچی ہوئی مٹھی اپنی ران پر مارتے ہوئے کہا - "تو پھر جارج
سے انتقام لو ——— "

واٹسن نے چوراہے پر کھڑے ہوئے ٹریفک کے سپاہی کے اُٹھے
ہوئے ہاتھوں کا نوٹس لئے بغیر غلط سائیڈ پر ٹرک موڑ دی اور ہنس
پڑا - جیسے چوراہے پر ٹریفک کا سپاہی نہیں کھڑا تھا بلکہ جارج
کھڑا تھا - اور واٹسن نے اپنا انتقام پورا کر لیا تھا - یہ انتقام ذلیل قسم کا
تھا - مگر ہنسی نے دونوں کے دلوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہلکا اور شگفتہ
بنا دیا تھا - واٹسن نے کہا -

"جیمس اسٹریٹ کے ایک ہیر کٹنگ سیلون میں جارج سے میں نے
انتقام لے لیا ہوتا مگر عین وقت پر وہ مل گئی تھی وہ ——— یار وہ کیا
نام ہے اُس کا ——— ؟ وہی جس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا سیاہ تل ہے"

گلبرٹ نے پوچھا ——— "کون میریا ——— ؟"

واٹسن نے کہا ——— نہیں یار وہ جو الگزینڈرا بار کی دوسری منزل پر
رہتی ہے - اُس کا نام شائد "ایف" سے شروع ہوتا ہے"۔

گلبرٹ نے کہا ——— "فریڈا ——— !!"

واٹسن نے کہا ——— ہاں ہاں فریڈا ——— پیاری فریڈا ——— وہ
بال ڈریس کروانے وہاں آ گئی تھی - مگر مجھے دیکھ کر اپنا مرمریں ہاتھ میری
بغل میں اُڑس کر میٹنی شو چلنے پر اصرار کرنے لگی - اس وقت اس کے
ہونٹوں پر کچھ ایسا شوخ رنگ لپ اسٹک چڑھا ہوا تھا - کہ میں بالکل ہی
بھول گیا کہ وہاں جارج موجود ہے اور اس سے مجھے انتقام لینا ہے -
ہاتھ میں جمع ہوتی ہوئی جسم کی ساری طاقت میں نے فریڈا کی بانہہ کو اپنی
بغل میں نہایت گرمجوشی سے دبانے میں صرف کر دی - اور ......

گلبرٹ آگے بولا -

"اور میں بھی اسی سیلون میں جارج کو جہنم بتا دیتا - اور اس
سیلون والے کی بیوی کو بیوہ بنا دیتا - اصل میں وہ سیلون والا ہے بڑا
بدتمیز - میں آدھ گھنٹے سے سیلون میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ اب کوئی کرسی
خالی ہو اور میں شیو لے لوں - لیکن بھوت پھر آدھمکا یعنی وہی جارج -
——— اس وقت ایک کرسی خالی ہوئی اور سیلون والے نے وہ کرسی
جارج کے حوالے کر دی - میں اس سے اُلجھ پڑا کہ میں آدھ گھنٹے سے انتظار
کر رہا تھا تو سالے نے کوئی جواب ہی نہ دیا - اگر اس وقت یہاں تین چار
نکمے ہندوستانی اور حبشی سپاہی نہ ہوتے تو میں دونوں کو موت کی آگ
میں جھونک دیتا"۔

واٹسن نے کہا ———

"یہ تم نے بہت اچھا کیا - گلبرٹ جو اُن حبشی اور ہندوستانی سپاہیوں
کے سامنے جارج سے کچھ نہ کہا - جارج ہمارا رقیب ——— ہمارے
کا روڑا ہے تو کیا ہوا - بھئی ہے تو وہ اونچی نسل کا - یعنی ہماری تمہاری
نسل کا - اگر تم اس وقت اس سے لڑ پڑتے تو نیچی نسل اور ذلیل رنگ
کے حبشیوں اور ہندوستانیوں کے سامنے رنگ و نسل کی ساری عزت
کرکری ہو جاتی"۔

گلبرٹ تائید میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹرک ایک چھوٹے سے خوبصورت
مکان کے پھاٹک پر رُکی - برآمدے کے کھمبوں کے ساتھ عشق پیچاں
کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں - برآمدے کے بیچوں بیچ ایک تپائی رکھی ہوئی
تھی - جس پر سبز رنگ کا ٹیبل کلاتھ پڑا ہوا تھا - تپائی کے اطراف پیلی پیلی
چمکدار بید کی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں - ایک کرسی پر فلورا کالی کالی
بندکیوں والا پیلا فراک پہنے اپنی ایک ننگی پنڈلی تپائی پر ٹکائے کوئی
واہیات سا شہوت انگیز ناول پڑھ رہی تھی -

ٹرک کی آواز سن کر اور گلبرٹ اور واٹسن کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی
پھاٹک تک آئی - باہر ٹرک سڑک کے کنارے اپنی دونوں بجھی بجھی آنکھوں
سے سامنے خلاء میں گھورتی چپ چاپ کھڑی تھی -

پچیس تیس منٹ بعد گلبرٹ، واٹسن اور فلورا باہر نکلے - فلورا
نے نارنجی اور گہرے اُودے رنگوں کے دلآویز امتزاج والا فراک پہنا

پہنا ہوا تھا۔ فراک کا وہ حصہ جو ساڑھے چار بالشت گول کمر کے نیچے سے سپید سپید مدور گھٹنوں تک پھیلا ہوا تھا گہرے اودے رنگ کا تھا۔ کمر کے اوپر سے فراک کا رنگ نارنجی تھا۔ جو اس کی گھٹیلی نوکیلی چھاتیوں پر خوب پھنس کر آیا تھا۔ پیچھے پیٹھ پر چوٹی کے برابر چھ بٹن لگے ہوئے تھے۔ بٹنوں کے تنگ جانے کی وجہ سے فراک پر ایسی خفیف سی جھریاں ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ چمٹ گئی تھیں جیسے یہی جھریاں دیکھنے والے مردوں کی ریڑھ کی ہڈی میں جنسی ارتعاش بن کر اتر جاتی ہیں۔ فلورا کے بال سنہرے تھے اور پریشان پریشان —— اودے اودے اسٹریپس والے سینڈل میں اپنے سپید سپید پاؤں اٹھاتی، کولھے مٹکاتی، گلبرٹ اور واٹسن کے بیچ میں چل رہی تھی۔ گلبرٹ کے ہونٹوں پر ایک ظفرمند مسکراہٹ تھی اور واٹسن کے ہونٹ "نارماشیریر" کا گایا ہوا بوڑھا گیت سیٹی کی آواز میں اگل رہے تھے۔ ٹرک کو وہیں چھوڑ کر وہ کنگسوے کی طرف پیدل ہی چلنے لگے۔ بوڑھی ٹرک اپنی موٹے مدھم شیشوں والی آنکھوں سے فلورا کے لچکتے کولھے اور تھرکتی پنڈلیاں بڑی دور تک دیکھتی رہی اور دیر تک سوچتی رہی۔

چلتے چلتے فلورا نے چونک کر گلبرٹ سے پوچھا۔ "اگر راستے میں جارج مل جائے تو —— ؟"

گلبرٹ نے پوری انگریزی نخوت کا مظاہرہ کیا۔ "فکن ہم ڈارلنگ —— میں اس کے سارے پیسے لوٹا دوں گا۔ ڈونٹ وری — کتنے پیسے دیئے تھے اس نے تم کو —— ؟"

فلورا نے کہا۔ "ساٹھ روپے ——"

گلبرٹ نے جیب سے منی پرس نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"بس صرف ساٹھ روپے —— نکن —— میں اس کو دوگنے دام بھی دے سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو پیاری — !" اور پھر پرس اس نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ خالص انگریزی انداز میں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اٹلانٹک چارٹر پاس ہونے کے بعد ایک محفوظ مقام پہ رکھ دیا گیا۔

وکٹری بار پہنچ کر تینوں نے خوب شراب پی۔ واٹسن ! ٹپّی ٹک : نارماشیریر کا بوڑھا گیت سیٹی کی ٹیون میں گا رہا تھا۔ گلبرٹ اور فلورا شہوت آمیز محبت کی باتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں جارج بھی وکٹری بار میں داخل ہوا۔ فلورا کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا۔ دونوں تینوں کے چہرے فق ہو گئے کہ کہیں فلورا پھر جارج کے ساتھ نہ چلی جائے کہیں —— !! کہیں فلورا .... !!

فلورا نے جارج کے قریب آتے ہی کہا — میں نے تمہارا بڑی دیر تک انتظار کیا ڈارلنگ مگر ....

جارج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ مگر کر کی بات نہیں۔ میں خود بھی آج صبح سے بہت مصروف تھا۔ اچھا کل ......

ابھی جارج نے پوری بات کہی بھی نہ تھی کہ گلبرٹ نے جیب سے منی پرس نکالا کہ کہیں جارج فلورا کو کل کے لئے پھر انگیج نہ کر لے۔ پرس کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

جارج یہ رہے تمہارے ساٹھ روپے جو تم نے فلورا کو دیئے تھے۔ اب فلورا میری ہے۔ اب فلورا ہمیشہ کے لئے میری رہے گی۔"

جارج نے پہلے تو اپنی مسکراتی آنکھیں گلبرٹ کی شعلہ بار آنکھوں سے ملا دیں اور پھر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔

مبارک ہو گلبرٹ —— فلورا اب ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ مائی فرینڈ گلبرٹ ——

اور اس نے نکاح پڑھانے والے پادری کی طرح دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مقدس خدا سے دعا ہے کہ تم دونوں پر یسوع مسیح کی رحمتیں ہمیشہ نازل ہوتی رہیں۔"

گلبرٹ اور واٹسن رقیب کی اس زہریلی ہنسی کو یہ جبر پی رہے تھے۔ جارج گلبرٹ کی کرسی کے پیچھے آیا اور جھک کر اپنی دونوں کہنیاں گلبرٹ کے کندھے پر رکھ دیں۔ اور بڑے پیار سے اس کے تمتماتے ہوئے گال تھپکتے ہوئے بولا۔

مائی ڈیر فرینڈ —— تم بہت غصیلے ہو۔ ابھی بہت نوعمر ہو نا — ! عورت کے بارے میں بہت سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے —— خیر سیکھ ہی جاؤ گے —— فلورا ہی سکھا دے گی کسی دن —— ہاں اچھا —— کل تم تینوں کو کنگسوے کے چرچ ضرور آنا۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام ۔ دس اسٹینڈرڈ ٹائم —— کل ڈوروتھی سے میری شادی ہوگی۔"

گلبرٹ اور واٹسن نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

ڈوروتھی —— !

ڈوروتھی —— !!

اور جارج ڈوروتھی کو جو ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھی تھی بلانے کے لئے چلا گیا۔ جارج پھر جیتا —— امریکہ پھر جیتا —— گلبرٹ اور واٹسن آخری بار ہزیمت خوردہ رقیبوں کی طرح ایک دوسرے کے بجھے بجھے چہروں کو دیکھنے لگے مگر ان کی نظریں کہیں اور تھیں —— کسی بہت ہی چمکیلے چہرے کی زد میں —— ڈوروتھی کے چاند سے پھوٹتی ہوئی کرنوں سے اُلجھی ہوئی۔

ڈوروتھی کیپٹن باربرا کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور ساری چھاؤنی کی اکلوتی خوبصورتی —— اور "یوریشین بلڈ" تھا اس کے جسم میں۔ بارکس کے سپاہی ڈوروتھی کے لئے پاگل تھے۔ لیکن ڈوروتھی سوائے گلبرٹ کے کسی کو بھی میٹھی مسکراہٹ اور ملائم نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے ڈریم لینڈ کے پارک میں کئی سپید سہانی شامیں گلبرٹ کے ساتھ گزاری تھیں۔ گلبرٹ نے اس کے قرمزی ہونٹوں کو کئی بار چوما تھا۔ اس کی ایک قدم پر ایک بل کھانے والی کمر کے گرد اپنے لمبے چوڑے بازو کے گھیرے ڈالے تھے۔ وہ ڈوروتھی —— وہی ڈوروتھی .... وہی ڈوروتھی جارج کے پہلو میں سمٹی سمٹی اپنی ملائم نظروں میٹھی مسکراہٹ اور شیریں اداؤں کے ساتھ بار کے سرخ قمقموں کے سُرخ اجالے میں بجلی کی طرح چمکی اور بار میں بیٹھے ہوئے سارے سپاہی اپنے اپنے جام اور اپنے اپنے دل تھام کر رہ گئے۔ جارج نے جان بوجھ کر ڈوروتھی کا گلبرٹ سے تعارف کرایا۔ لیکن گلبرٹ نے میز پر کہنیاں ٹیک کر اپنے بھورے بالوں والا سر ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور معاً اٹھا —— اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بار کے سرخ اجالے سے باہر نکلا۔ اور اندھیرے میں روپوش ہوگیا۔

(۲)

بہت دنوں بعد گلبرٹ ایک بار پھر اُجالے میں جیمس اسٹریٹ پر سگار کا دھواں اڑاتا تھکے تھکے قدموں سے چلتا نظر آیا —— اکیلا۔ گلبرٹ کے ہم راز اور غمگسار دوست واٹسن کی بدلی جنوب کی کسی دوسری چھاؤنی میں ہوگئی۔ اور گلبرٹ سکندر آباد کی سڑکوں پر اکیلا رہ گیا۔ دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ دوکانوں میں بے مقصد گھستا، چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر کے دیکھتا، باہر نکل آتا، ہوٹلوں میں جاتا، بغیر کسی خواہش کے خوب شراب پیتا۔ بدصورت سے بدصورت لڑکیوں کا تعاقب کرتا۔ سنیما گھروں میں جاتا، یہ معلوم کئے بغیر کہ کونسی پکچر چل رہی ہے ٹکٹ خرید لیتا اور جا بیٹھتا۔ بسا اوقات انٹرول سے پہلے ہی بارکس چلا جاتا۔ بارکس میں اپنی مخصوص سبز کینوس کی آرام کرسی پر گھنٹوں بیٹھا چپ چاپ سگار پیتا رہتا۔ اتوار کے اتوار فلورا کے گھر جاتا۔ اس کے ہونٹ خریدتا، چوستا، چومتا مگر اسے وہ مزا میسر ہی نہ آتا تھا جس کے لئے اس کے سارے حواس پیاسے ہو رہے تھے۔

انہی دنوں فلورا کا سگا بھائی پال پنجاب کی کسی چھاؤنی سے بدل کر سکندر آباد چھاؤنی آگیا۔ گلبرٹ کو پال کے روپ میں اس کا اپنا پیارا دوست واٹسن مل گیا۔ پال اور واٹسن کے عادات میں (شکل و صورت اور رنگ و نسل سے قطع نظر) ایسی حیرت ناک مشابہت تھی۔ کہ کئی بار گلبرٹ نے پال سے کہہ بھی دیا۔

"یار سکندر آباد اب پھر سکندر آباد ہوگیا ہے"۔

پال کے لئے یہ جملہ بظاہر بے مطلب اور بے معنی تھا۔ لیکن گلبرٹ اس سے کہتا "معنی پوچھ کر مزہ کرکرا نہ کرو۔ مجھے لطف اندوز ہونے دو۔ میں بڑے طویل عرصے سے بے مزہ زندگی گزار رہا تھا"۔

گلبرٹ پال کے ساتھ بڑی بے تکلفی کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ اور گلبرٹ کے بعض یورپین نسل کے دوستوں کو تعجب ہو رہا تھا اور بُرا بھی معلوم ہوتا تھا کہ گلبرٹ اتنی اونچی نسل کا انسان ہو کر ایک اینگلو انڈین لڑکے کے ساتھ یوں بے تکلف ہوگیا ہے اور جنہیں گلبرٹ اور فلورا کے داستانِ معاشقہ کا علم تھا۔ وہ تو اور بھی چڑے ہوئے تھے کہ گلبرٹ اعلیٰ نسل کے سرخ سُرخ خون میں ہندوستانی لہو کی سیاہی مائل سُرخی کی آمیزش

کر رہا ہے۔

اور خود پال کو بھی گلبرٹ کی یہ بے تکلفی مطلق پسند نہیں تھی لڑائی شروع ہونے سے اب تک وہ کئی چھاؤنیوں میں رہ کر آیا تھا۔ اور اپنی آنکھوں سے اپنی سیاہ چمڑی کی درگت دیکھی تھی۔ ہزاروں واقعات میں سے ایک نمایاں واقعہ ...... ایروڈروم کا بھی تھا جس میں پال کی اتنی بڑی ہتک ہوئی تھی۔ کہ اس کی اور کالنس کی باضابطہ باکسنگ مل گئی تھی۔ پال اور کالنس ایک ہی ہوائی جہاز سے اُترے تھے ایروڈروم سے چھاؤنی کو جو لاری سپاہیوں کو لیجاتی تھی۔ اس کا ڈرائیور ایک یورپی نسل کا گورا تھا۔ پال کا رینک کالنس سے اونچا تھا۔ لیکن ڈرائیور نے اگلی سیٹ پال کو اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ اینگلو انڈین ہے۔ کالا ہے۔ نیچ ہے۔ وہ ـــــ! پال کا ڈرائیور سے جھگڑا بھی ہوگیا مگر رینک پر کلر بار ہمیشہ سے بھاری رہا ہے۔ تمدن کی تاریخ کے پاس اس کے ان گنت ثبوت موجود تھے۔ اور پال نے کوفت دور کرنے کے لئے ایک سگریٹ سلگا لی تھی۔

اب یہاں سکندر آباد میں پال اور گلبرٹ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے گھومتے لیکن پال کو ایسا محسوس ہوتا جیسے بیچ میں ایک دیوار رنگ حائل ہے جو بظاہر نہیں دکھائی دیتی البتہ شراب خانوں، ہوٹلوں کے بیرے، دکانوں کے سیلس مین، ٹیکسی ڈرائیور، تانگے والے، بوٹ پالش والے، باربر، بھیس بخشیش مانگنے والے لونڈوں کو صاف نظر آجاتی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ یہ لوگ پال کی موجودگی کے باوجود گلبرٹ کو گھیر لیتے تھے۔ سلام کرتے، گڑگڑاتے تھے۔ اور پال اپنے آپ کو اکیلا شرمندہ بلکہ بے وجود محسوس کرتا تھا۔ اسی لئے پال اکثر گلبرٹ سے کترانے کی کوشش کرتا تھا لیکن گلبرٹ اسے خود ہی کبھی نہ چھوڑتا تھا۔ پال اس کو گلبرٹ کی بے تعصب ذہنیت سمجھتا تھا۔ لیکن گلبرٹ کی ذہنیت کبھی بے تعصب نہیں تھی۔ وہ شائد اس لئے پال سے اتنا زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ کہ پال کے پیکر میں اس کو اپنا ہمراز واٹسن نظر آتا تھا۔

سولہ اگست ۱۹۴۵ء کی شام الگزنڈرا بار میں سارے سپاہیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کسی نشے میں دُھت رقاصہ کی طرح ناچ رہی تھی۔ ہونٹوں کے مسام مسام سے چمکیلی خوشی ابل رہی تھی۔ بار کا آرکسٹرا فتح کے سریلے نغمے بکھیر رہا تھا۔ آرکسٹرا کی آواز جب کچھ دھیمی دھیمی ہوجاتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے جرمنی اور جاپان ایک ساتھ رو رہے ہیں۔ اُن کے جھنڈے زمین پر گر گئے ہیں۔ آنسو پونچھنے کے لئے کوئی کپڑا بھی باقی نہیں رہا۔

گلبرٹ اس وقت جانے کہاں مٹر گشت کر رہا تھا۔ بار میں پال اکیلا ہی بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تو وہ گھر لوٹا۔ تاکہ آنٹی سے کہہ آئے کہ وہ آج رات وکٹری ڈانس میں شریک ہونے جا رہا ہے۔ اور رات بڑی دیر سے لوٹے گا۔ وہ انتظار نہ کرے۔

آنٹی جیسے پال کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ پال کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آبدیدہ ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں پال سے کچھ کہا اور پال کی انگلیوں سے سگریٹ چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اور چہرے کی ساری آب اُڑ گئی۔

بڑی دیر تک وہ دونوں پاؤں پھیلائے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑے رہے، وہ شعلہ بار نظروں سے اندھیرے میں جانے کیا دیکھتا رہا۔ اندر کمرے میں فلورا سارے گھر والوں سے مُنہ چھپائے بلانکٹ میں دبکی پڑی تھی۔ اسی اثنا میں باہر کا پھاٹک کرکراتا ہوا کھلا۔ گلبرٹ اندر آیا اور پوچھا۔ "تم کہاں گھوم رہے تھے پال ـــ میں تمہیں بہت ڈھونڈتا رہا۔ آج اُس نکن بال میں چلو گے یا نہیں"۔

پال کی پلکوں میں آنکھیں نہیں تھیں بلکہ دو سُرخ سُرخ شرارے تھے۔ وہ چپ چاپ گلبرٹ کو دیکھتا رہا ـــــ گلبرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ـــ؟"

پال تین چار لمحے پھر خاموش رہا۔ اور بہت غزاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"گلبرٹ ـــ اب تمہیں فلورا سے شادی کرنی پڑے گی"۔

گلبرٹ نے پال کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ، کرخت لہجے اور بوڑھی آنٹی کی آنکھوں میں آنسو اور شعلے بیک وقت لپکتے دیکھ کر ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔

"ارے ہوجائے گی نکن شادی ـــ مگر اب تو ڈانس میں چلو ـــ"

پال نے آواز میں زیادہ تلخی اور غراہٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ـــــ تم یہاں سے اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک کہ فلورا سے شادی کرنے کا تحریری وعدہ نہ دو ـــــ ورنہ ـــــ"

اب گلبرٹ سٹپٹا گیا۔ اور بولا۔

کیوں شادی کروں ـــــ! میں تو شادی شدہ ہوں۔ وہاں یارک شائیر میں میری بیوی میری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ اب تو لڑائی ختم ہو گئی ہے اور ....

پال چیخا ـــــ

نہیں۔ لڑائی ابھی کہاں ختم ہوئی۔ ابھی لڑائی جاری ہے۔ اب تمہیں اور مجھے لڑنا ہے۔ اب ہزاروں گلبرٹوں اور ہزاروں پالوں کو لڑنا ہے۔ لکھو اس کاغذ پر ـــــ

گلبرٹ نے کاغذ لیکر تپائی پہ رکھ دیا۔ اور خود بھی غصیلی آواز میں بولا۔

"نہیں لکھوں گا ـــــ کیوں لکھوں آخر ـــــ! میں نکن ایک اینگلو انڈین لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔"

پال نے گلبرٹ کی قمیص پکڑ لی اور گرج کر کہنے لگا۔

"تمہیں شادی کرنی ہوگی۔ تم ہی نے فلورا کو حاملہ کیا ہے۔"

گلبرٹ نے قمیص چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

میں کہتا ہوں میں ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ مجھے اس کے حمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی تعلق نہیں۔

پال غصے کی زیادتی سے جیسے پاگل ہو گیا اور اس نے ڈراؤنی آواز میں چیختے ہوئے گلبرٹ کے جسم پر لگاتار گھونسے لگانے شروع کر دیے جیسے صدیوں کی بنیادوں پر کھڑی ہوئی رنگ و نسل کی مضبوط دیوار کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

باہر اندھیرے میں فتح کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ لڑائی ختم ہو گئی تھی۔ لڑائی جاری تھی۔

دھرم پرکاش آنند

دلِ ناتواں

یہ تمہاری جستجوئے حُسن خود فریبی ہے۔ یہ ناحق کی آشفتہ سری تمہاری شکست کا آئینہ ہے۔

میں کافی ہاؤس کے ایک کونے میں بیٹھا بُوند بُوند کر کے زہر کو پیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دفتر کا سارا کام چھوڑ کر آج پھر کافی ہاؤس کیوں چلا آیا ہوں۔ یہ کافی بُخار کی دوا کی طرح کڑوی اور بدمزہ ہے۔ میرے دماغ میں خشکی سی پھیلنے لگی ہے۔ لیکن میں برابر پیئے جا رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ناحق کی بے خوابی کا سامنا ہوگا۔

اکیلا بیٹھتا ہُوں۔ نہیں، بالکل اکیلا نہیں۔ راؤ ہے، گوپال ہے، کبھی کبھی وینکٹ بھی آ بیٹھتا ہے۔ اور تب میں بُوند بُوند نہیں، گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگتا ہوں۔ کڑوی، بدمزہ، خشک کافی۔

اور میں راؤ سے پوچھتا ہُوں۔ "راؤ تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

راؤ ایک بنک میں ملازم ہے، اچھی تنخواہ پاتا ہے۔ بتیس تینتیس سال کی عمر کا ہے۔ کنوارا ہے۔

"راؤ یہ نہ کہو کہ تمہیں بیوی نہیں ملتی۔ تم چاہو تو کل ہی شادی رچا لو۔ لیکن تم اُن لوگوں میں سے ہو جو لڑکی کے تصوّر سے تو محبت کرتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے وجود سے لرزاں رہتے ہیں۔ تم بیوی کو نہیں، اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ تم اسے کبھی نہیں ڈھونڈ پاؤ گے۔ تمہاری شادی کبھی نہیں ہوگی .... وہ دیکھو ایک اور لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی ہے۔ دروازے پر رُک گئی ہے۔ گوپال گہری نظروں سے اُس کے دلکش جسمانی نشیب و فراز کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یہ دیکھ رہی ہے کہ جس کو وہ ڈھونڈنے آئی ہے۔ وہ کافی ہاؤس میں ہے کہ نہیں۔

گوپال، اُدھر مت دیکھو۔ دوست! اِس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کسی بھرے ہوئے جسم والی لڑکی سے محبت کرنی ہے تو تمہیں ایسی بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ اُوما سے ملے ہو؟ اُس کے جسم کا نکھار دیکھا ہے؟ ہاں، تم کچھ دن تو اُس کی محبت میں مبتلا رہے ہو۔ لیکن مجھے معلوم تھا تم لوٹ آؤ گے۔ اُوما کا تمہیں تین چار مُلاقاتوں تک نشہ رہا۔ بہت کافی ہے۔ دلکش جسمانی نشیب و فراز کے باوجود اُوما تمہیں جچی نہیں۔ جچے گی بھی نہیں۔ اُس میں کچھ خامیاں ہیں۔ ملاقات کے کچھ دیر بعد تمہیں ہر ایک لڑکی میں کچھ خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اُن خامیوں کو بیان کرو گے؟ کیا کرو گے بیان کر کے۔ تم گھوم پھر کر پھر اسی میز پر آ جاؤ گے۔ اور گھونٹ گھونٹ کر کے کڑوی کافی پیو گے۔ اور کہو گے "کوئی خوب صورت لڑکی نہیں ملتی"۔ تم لڑکی کے رنگین تصوّر کو لڑکی کے مادی وجود میں ڈھونڈتے ہو۔ اس کا نتیجہ سوائے ناامیدی کے اور کیا ہوگا۔

راؤ۔ یہ بات بات پر اپنے خیالات کا جائزہ لینے کی عادت تمہارے لئے بہت بُری ہے۔ تم ہر وقت اپنے آپ سے پُوچھتے رہتے ہو کہ ایسا کیوں ہُوا؟ تم اپنی شکست کی وجہ جنسی بھُوک میں ڈھونڈتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ اگر تمہاری زندگی میں کچھ ایسی لڑکیاں آئی ہوتیں جنہوں نے اپنے جسم کو تمہارے حوالے کر دیا ہوتا تو تمہاری دماغی کیفیت سُدھر گئی ہوتی۔ اور تم اتنے پریشان نہ پھرتے۔ لیکن یہ تم اس لئے کہتے ہو کہ تم نے ابھی تک کسی لڑکی کے جسم کو چھُوا تک نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم بیمار ہو۔ اور تمہاری بیماری کا واحد علاج عورت کی صحبت ہے۔ لیکن میری بات مانو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ سر ہلا رہے ہو تم؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ میں غلطی پر ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ تم اگر کسی عورت کے پاس سے بھی ہو کر گزر جاؤ تو تمہارے جسم میں ایک خوش کن سنسنی اور تمہارے دل میں ایک میٹھی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا پھر کندا سے کافی ہاؤس میں ملاقات کی بات سُنانے لگے ہو؟ وینکٹ، راؤ پھر پُرانی کہانی لے بیٹھا ہے اچھا سنا لینے دو۔ بیمار کی دوا تو ہمارے پاس نہیں ہے لیکن یہ واقعہ سُنا دینے سے اِس کے دِل کو تھوڑی سی تسکین ضرور مل جاتی ہے۔ راؤ، تم نے کہانی

ابھی شروع بھی نہیں کی اور تمہارا مُنہ لال ہونے لگا۔ تمہیں آدمی کس نے بنایا ہے تم تو کچّی مٹی کے گھڑے ہو جو پانی کے مَس سے بکھر جاتا ہے۔ طوفان کا مقابلہ کیا کرے گا۔ سُناؤ، سُناؤ، ہم سُن رہے ہیں۔ ہاں تو ہم سبھی میز کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہی باتیں ہو رہی تھیں جو روز ہُوا کرتی ہیں۔ وینکٹ (جس کا چہرہ اُس کے بالوں کے رنگ سے بھی زیادہ سیاہ ہے) کہ رہا تھا۔ یار کوئی آرٹ سرکل بنائیں، کوئی میوزک سوسائٹی قائم کریں۔ میں اپنے آپ کو بحیثیت پبلسٹی انچارج پیش کرتا ہوں۔ لیکن پبلسٹی کے ان شاہکاروں کو کالج کی لڑکیوں تک کون پہنچائے گا؟ گوپال، تم یہ کام کروگے؟ گوپال بھلا کیوں کرنے لگا؟ اُسے کیا پڑی ہے کہ دُوسروں کی دوستی کے لئے لڑکیاں مہیا کرتا پھرے؟ خود اس کی بہت سی دوست ہیں۔ بمبئی میں پہلے پہل اُس کی دوستی ایک مرہٹی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی۔ پہلی ملاقات میں گوپال نے اُس کے چہرے کی تعریف کی۔ اُس سے کہا تمہاری شکل مجھے لاہور کی ایک لڑکی کی یاد دلاتی ہے جو ہر اتوار کو میرے گھر پر آکر میری کتابوں کو بڑے قرینے سے میز پر سجا دیا کرتی تھی۔ میں ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ دوسری ملاقات میں گوپال نے اُس لڑکی کے جسم کی تعریف کی اور کہا کہ میں بمبئی میں اکیلا ہوں، بالکل اکیلا۔ اپنے اکیلے پن کو مٹانے کے لئے میں شراب پینے لگا ہوں۔ اور یہ کہہ کر اپنے چہرے پر ایک بڑا غریبانہ سا جذبہ لاکر سگرٹ سُلگانے لگا۔ لڑکی اُس کے جُھکے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ کس جذبے کو اپنے دل میں جگہ دے۔ گوپال سگرٹ کا کش لگاتا ہُوا کرسی میں آرام سے بیٹھ گیا۔ چھت کی طرف دیکھتا ہُوا دھوئیں کے دائرے بنانے لگا۔ اور اس کا بایاں ہاتھ لڑکی کے ہاتھ کو ڈھونڈ کر اُسے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ تیسری ملاقات میں گوپال اس لڑکی کو اپنے گھر لے گیا۔ اور کہنے لگا۔ "تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔ میرے دماغ میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ میں اور بھی بہت سی لڑکیوں سے ملا ہُوں لیکن ایسا اثر مجھ پر پہلے کبھی نہیں ہُوا۔ تمہاری قربت میں میں اپنے آپ کو بھُولنے لگتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر گوپال نے لڑکی کی اُس شرافت کو چھین لیا جس کو لڑکی اتنی دیر سے محفوظ رکھتی چلی آئی تھی، جس پر اُس کے ماں باپ کو ناز تھا۔ جس پر سماج اس کو ایک اچھے گھرانے کی بیٹی کے نام سے یاد کرتی تھی۔ لڑکی نے

کہا۔ "تم وحشی ہو، جانور ہو، کمینے ہو۔" اور اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن دس پندرہ دن کے بعد خود ہی گوپال کو ٹیلیفون پر کہنے لگی۔ "کیوں ناراض ہو گیا؟ بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کب ملوگے؟" اور تب آہستہ آہستہ گوپال نے اُس لڑکی کی معرفت اُس کی کئی سہیلیوں سے دوستی پیدا کر لی۔ اور اب وینکٹ آرٹ سرکل بنانے کے متعلق سوچ رہا ہے۔ گوپال کی مدد لینا چاہتا ہے۔ گوپال اپنی خوش قسمتی کیوں بانٹے؟ اُس کا جواب ٹھیک ہی تو تھا۔ "ہوش کی دوا کرو دوست، تمہارے تو بیوی ہے، بچے ہیں"۔ اِس سے کیا ہوتا ہے۔ بچے ہونا خوش قسمتی کی نشانی تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو شادی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور جس عورت سے شادی کی جائے۔ اُس سے محبت ہو بھی سکتی ہے۔ نہیں بھی ہو سکتی۔ اور محبت تو قناعت کا دُوسرا نام ہے۔ اس کا لب لباب یہی ہے کہ مجھے میری چیز مل گئی، میں اسی میں رچ جانا چاہتا ہوں۔ مست ہو جانا چاہتا ہوں، میرے لئے اس کے پرے کچھ نہیں۔ لیکن وینکٹ کیسے قناعت کرے، ایک وینکٹ ہی کیوں، کوئی بھی کیسے قناعت کرے۔ اصل میں تو آدمی کی شخصیت کے اظہار کا سنگِ بنیاد خود غرضی ہے۔ میں جس دُھن میں مست ہُوں، میری خوشی کے لئے مجھے اُس وقت اُس دھن کا، اُس ذہنی یا دلی کیفیت کا عکس ملنا چاہیئے۔ آدمی کی ذہنی کیفیتیں تو دن کے پہروں کی طرح ہیں۔ جن میں مختلف راگ چاہئیں۔ ایک صورت تو ایک ہی کیفیت کو پورا کرتی ہے۔ اور ایک ہی ضرورت کو۔ وہ بہت سی کیفیتوں کو پُورا کیا کرتی تھی۔ محبت کے پہلے جوش میں۔ پر اُس وقت دلہن ایک عورت تو نہیں ہوتی۔ زمین و آسمان کی سب عورتوں کا مُرکب ہوتی ہے۔ ایک ماحول ہوتی ہے۔ جو آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن جو ایک عورت ہے وہ کب تک ساری عورتوں کا مُرکب بنی رہ سکتی ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ بات شادی کے کچھ ہی مہینوں بعد معلوم ہو جاتی ہے۔ اکثر کو کئی برس بعد۔ اور تب جو زندگی کے دُوسرے جھنجٹوں میں اُلجھ کر نہیں رہ گئے انہیں پھر دوسری عورتوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے، دُوسری دُھنوں کے عکس کی۔ وینکٹ، تمہارے دانت مصنوعی ہیں، لیکن تمہارا جواب بڑا معقول تھا۔ "ہاں" "تم نے کہا تھا" بیوی ہے، بچے ہیں اور..... اور حسرتیں ہیں۔" وہ دیکھو کون آئی ہیں۔ باتیں بند کرو بھئی، ذرا دیکھ لینے

دو۔ دروازے میں دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ اُن کی نگاہیں اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ مسکرانے لگیں۔ ایک میز خالی نظر آئی ہے۔ سانولی کو نہیں دوسری کو دیکھو۔ سر کا ایک مبہم سا جھٹکا، لبوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ، بازو کے سہارے چھاتی سے لگی ہوئی کتابوں پر ذرا سا دباؤ، ہاتھ میں تھمے ہوئے بیگ کی ہلکی سی جنبش، اور وہ خالی میز کی طرف بڑھی اپنی سانولی سہیلی کے ساتھ۔ راؤ تمہارے لبوں میں تھما ہوا سگریٹ لرزنے لگا ہے۔ راؤ، تمہارے ہاتھ کانپنے لگے ہیں، یہ دیکھو، دیا سلائی بجھے جا رہی ہے، ہاتھ کو مضبوط رکھو نہیں تو سگریٹ نہیں سلگے گا۔ تمہاری تو آواز میں بھی تھرتھراہٹ ہے۔ ذرا اونچا بولو دوست، ان لڑکیوں میں سے ایک کو جانتے ہو؟ کس کو؟ وہ جس کی دونوں چوٹیاں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُن بازوؤں کو چوم رہی ہیں جنہوں نے کتابوں کو تھام رکھا ہے؟ اُس کو جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہے جیسے کسی نے آئینے کی مدد سے سورج کا عکس ڈال دیا ہو؟ اُس کو جس کے گالوں میں مسکراتے وقت دو دلنواز چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں؟ بڑے خوش قسمت ہو کم بخت۔ گندا؟ کیا پیارا نام ہے۔ مطلب کیا ہے اس کا؟ ایک سفید پھول جو مغربی گھاٹ کے پہاڑوں پر اُگتا ہے؟ دیکھو وہ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ مسکراؤ، گدھے کہیں کے مسکراؤ۔ اچھا رہنے دو۔ وہ تمہاری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں دور کھڑے ہوئے بیرے کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جاؤ اُس سے مل لو۔ باتوں باتوں میں اُسے کل پارسوں کے لئے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دے آنا۔ نہیں، خدا کی قسم ہم میں سے کوئی بھی تمہاری باتوں میں خلل انداز نہیں ہوگا۔ ہاں، ایک بات ہم جب کسی خالی میز کی تلاش کرتے ہوئے وہاں سے گزریں تو ہمیں دیکھ کر مسکرا دینا جیسے تم نے ہمیں پہچان لیا ہو۔ اُس وقت ہم کنکھیوں سے گندا کو دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہاری نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی، وہ بھی ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ہم پر ڈالے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت وہ ہمیں دیکھے گی ہماری نگاہیں اُس پر سے ہٹ کر خلاء میں کھو جائیں گی۔ لیکن اُسے یہ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔ گوپال، تم زیرِ لب مسکرانے لگے! دوست! تم ہماری باتوں کو بیوقوفانہ سمجھتے ہو نا! پر تمہیں معلوم ہے کہ گندا کا ہمیں ایک نگاہ دیکھ لینے سے کیا فائدہ ہے؟ ہمیں محسوس ہونے لگے گا۔ کہ ہم اُس سے ایک قدم نزدیک آ گئے ہیں۔ ہم اب کافی ہاؤس میں آنے والی عام بھیڑ کے فرد نہیں رہے۔ بلکہ کسی غیر مرئی زنجیر سے کھنچ کر ایک ایسے مخصوص حلقے کے ممبر بن گئے ہیں جس کے ایک کارکن کی گندا سے جان پہچان ہے۔ اور اس طرح گندا کو قریب سے نہ جانتے ہوئے بھی اُس میں اور ہم میں ایک اپناپن سا پیدا ہو جائے گا۔

راؤ، تم گندا کے پاس جانے لگے ہو؟ آج تو بڑی ہمت دکھا رہے ہو بھئی۔ اچھا جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وینکٹ، یہ راؤ کیا آج کچھ پی کر آیا ہے کہ اتنی دلیری دکھا رہا ہے۔ وینکٹ، راؤ اب پرے کونے میں کیا جھانک رہا ہے؟ جانتا ہے کہ اُس کونے میں اس کی جان پہچان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ لیکن پھر بھی جھانک رہا ہے۔ شائد کچھ تو اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کچھ باقی لوگوں کو۔ کہ وہ واقعی کسی کی تلاش میں ہے۔ خدا خدا کرکے اب اُس میز کی طرف چلا تو ہے جہاں وہ دونو لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ بھئی واہ، وہاں تو وہ رُکا ہی نہیں۔ ہوا میں مُنہ اُٹھائے خلاء میں آنکھیں گاڑے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اب جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہا ہے۔ شائد اب کسی کے انتظار کا بہانہ کر رہا ہے۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے گندا کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے کہ کہیں وہ تو اس کی طرف نہیں دیکھ رہی۔ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر باہر جھانکتا ہے، پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور سر ہلاتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اب آنے والا نہیں آئے گا۔ اب تک راؤ نے اپنے دل کو تسلی دے لی ہے کہ اب وہ اپنی شرافت کھوئے بغیر گندا سے بات چیت کر سکتا ہے۔ اُس کی میز کے پاس سے ہو کر گزرتے ہوئے وہ یکایک ٹھہر جائے گا۔ اور حیران کن لہجہ میں کہے گا "ہیلو، آج تم کافی ہاؤس میں کہاں؟" تب وہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھے گا۔ اور بڑبڑائے گا "کہتا تھا ڈیڑھ بجے آؤں گا۔ پونے دو ہونے کو آئے، کم بخت ابھی تک آیا ہی نہیں"۔ آخر کار۔ آخر کار وہ گندا کے پاس پہنچ ہی گیا۔ گندا مسکرائی ہے۔ اُس کی سہیلی نے بھی سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا ہے۔ اور راؤ کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلی۔ اُس

کا چہرہ سُرخ ہو اُٹھا ہے۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹیک دیئے ہیں اور تھوڑا سا آگے کو جُھک گیا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سگرٹ ہے۔ سگرٹ کا دھواں کانپتا ہوا ہوا میں اُٹھ رہا ہے، ضرور اُس کا سارا جسم کانپ رہا ہوگا۔ وہ کبھی ایک پاؤں کے پنجے پر زور ڈال کر کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی دُوسرے پر۔ اُس نے جیب سے رُومال نکالا ہے، اور ہتھیلی کو پونچھنے لگا ہے۔ ضرور اُسے پسینہ آرہا ہوگا۔ آخر حوصلہ کرکے کانپتی ہوئی آواز میں اُس نے پُوچھ ہی لیا ہے "تمہارے والد صاحب بمبئی ہی میں ہیں کیا؟" "ہاں" کُندا نے جواب دیا ہے۔ "بہت دن سے اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ غالباً اس اتوار کو ان سے ملنے آؤں گا۔" کُندا مُسکرائی ہے۔ اُس کے گالوں کے دلنواز گڑھے اور گہرے ہوگئے ہیں۔ وہ کہہ رہی ہے "میں والد صاحب سے کہہ دُوں گی۔" بس اور کچھ نہیں۔ راؤ اور کچھ نہیں بولا۔ اُس سے اور کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اُس نے کُندا کو اگلے دن یا اُس سے اگلے دن اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت بھی نہیں دی۔ اُس نے ٹھیک طرح سے اُس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اُس کا بدن کانپتا رہا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی رہی۔ اُس کی آواز لرزتی رہی۔ وہ واپس آگیا۔ اب اُس کے ماتھے پر پسینہ ہے۔ اُس کا چہرہ لال ہے۔ اُس کے لب خشک ہیں اور اُن پر ایک شکستہ سی مُسکراہٹ ہے۔ اُس کا جسم گرم ہے۔

بھئی، اس سارے قصّے کا مطلب کیا ہے۔ آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو۔ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز پر اُسی زمین کو گھسے جا رہے ہو۔

میں کچھ نہیں ثابت کرنا چاہتا۔ ہم سب یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم سب ایک ہی لڑکی کو کافی ہاؤس کے اندر آتا دیکھتے ہیں۔ لیکن اسی حقیقت کی بنا پر ہمارے زاویۂ نظر مختلف ہو جاتے ہیں۔ اِسی لئے مجھے کافی ہاؤس پسند ہے۔ اس میں نہ صرف خوبصورت لڑکیاں ہی آتی ہیں۔ بلکہ اُن کا یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کا تجزیہ کرنے کا بھی موقعہ ملتا ہے۔ وینکٹ، گوپال، راؤ، میں، ہم سب صرف ایک ایک شخص نہیں، ہم نمونے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک سماج کے کسی خاص فرقے کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے، وینکٹ تاجر ہے۔ پندرہ سال ہوئے وہ تیس روپے ماہوار پر ایک دفتر میں ٹائپ کرنے کے کام پر ملازم تھا۔ آج وہ اپنا مالک آپ ہے۔ بمبئی میں اشتہار بازی کی ایک مشہور کمپنی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مہینے میں دس ہزار کی آمدنی اُس کے لئے معمولی بات ہے۔ تیس روپیہ ماہوار سے دس ہزار روپیہ ماہوار اور پندرہ سال کا عرصہ۔ تیس سے پچاس ہوئے ہوں گے۔ پچاس سے سو، سو سے ہزار۔ قدم قدم پر وینکٹ نے سوچا ہوگا۔ کہ اور زیادہ پیسے بنانے کا کونسا طریقہ ہے۔ اُس کا جو تخیل تھا۔ جو دماغ تھا۔ اُن کو اُس نے اپنے پر قابو نہیں پانے دیا بلکہ اُن کو اپنا خدمت گار بنا کر رکھا۔ وہ زندگی کی مادی اصلیتوں سے ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ اُس کے لئے راگیوں کا راگ، شاعروں کی شاعری، مصوّروں کے شاہکار خبطی لوگوں کے ڈھیلے دماغوں کا نتیجہ ہیں جو بذاتِ خود تو کوئی خوبصورت چیز نہیں صرف اُس جیسے ٹھوس آدمیوں کا بیکار وقت میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ وینکٹ چیز کو دیکھتے ہی اُس کی اپنی زندگی میں وقعت کو پہچان لیتا ہے، وہ کسی قسم کی غیر مادی رنگینیوں کو اپنی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈالنے دیتا۔ اُس نے عورت کی ہستی کا بھی نچوڑ نکال کر رکھ دیا ہے۔ اُس کے لئے عورت گوشت کا ایک دلکش تودہ ہے جس کے جسم کے اُتار چڑھاؤ سے، جس کی شخصیت کے مخصوص اندازِ اظہار سے دل میں ایک دلچسپ سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ اُس گوشت کے دلکش تودے کو چھونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ لمس آدمی کے جسم میں ایک طوفان اور دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے، ایک طوفان جس سے آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، نتھنے پھولنے لگتے ہیں، جسم سے آگ کے شرارے چھوٹنے لگتے ہیں، ایک ہیجان جس میں دُنیا کی سُدھ بُدھ کھو جاتی ہے، جس میں قوسِ قزح کی رنگینی، بجلیوں کی کوک، بھونچالوں کے دھچکے، سب کچھ خلط ملط ہو کر شامل ہیں۔ اور پھر آدمی اُس گوشت کے تودے کو بازوؤں میں بھینچتا ہے اور اپنا بناتا ہے، اور پھر اُس عورت کی، اُس گوشت کے دلکش تودے کی نوعیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اصلیت کا پیروکار پھر اپنے اصل اور ٹھوس کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وینکٹ کے لئے عورت کی خوبصورتی کی تعریف بھی وہی ہے جو شاعروں کی شاعری کی، یعنی بیکار وقت میں دل بہلانے کا ذریعہ۔

کیوں وینکٹ، ٹھیک ہے نا؟ تمہارے لئے عورت کی خوبصورتی کو پرکھنے کی کسوٹی اُس تک رسائی کا امکان ہے جس کو نہیں پایا جا سکتا۔ نہیں خریدا جا سکتا (میرا مطلب ضروری طور پر پیسوں سے نہیں) وہی زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن اُس کے پانے کی ناکام آرزو میں تم اپنا وقت کھونے والے نہیں۔ وہ گوپال اپنے خوبصورتی کے پجاریوں کے اپنا وقت اور دماغ ضائع کرنے کے ذریعے ہیں۔ تم تو "نو نقد نہ تیرہ ادھار" پر یقین رکھتے ہو۔ جو مل گئی، جیسی مل گئی، جہاں مل گئی، اگر آسانی سے مل گئی تو وہی بھلی۔

گوپال تم مسکرانا نہ چھوڑو گے؟ تم نے بھی کبھی اپنے آپ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ تم اپنے آپ کو دوسروں سے بہت مختلف سمجھتے ہو۔ لاکھوں میں ایک، عام آدمیوں سے بہت اونچے، بہت پرے۔ اگر میری مسکراہٹ بھی اتنی معنی خیز ہو سکتی جتنی کہ تمہاری (اگرچہ زیادہ پائپ پینے سے تمہارے دانت زرد ہو گئے ہیں) تو میں تمہارے بھولے پن پر ضرور مسکرا دیتا۔ کہ باقی سب کو ٹھیک سمجھنے والے تم اپنے آپ کو ٹھیک نہیں سمجھ سکے۔ تم لاکھوں میں ایک نہیں ہو، لاکھوں جیسے ایک ہو۔ تم بھی سماج کے ایک مخصوص فرقے کے اُتنے ہی نمائندہ نمونے ہو جتنا کہ وینکٹ تمہاری قسمت میں بھٹکنا لکھا ہے۔ تم ذہنی تسکین سے ہمیشہ اُتنا ہی دُور رہو گے، جتنا کہ اب ہو۔ تم کبھی برازیل جانے کی سوچتے ہو کبھی نیوزی لینڈ۔ لیکن اگر تم سائبیریا بھی چلے جاؤ تو وہاں پہنچ کر تم اُس سے بھی پرے جانا چاہو گے۔ تم تصور کو حقیقت میں بدلنا چاہتے ہو۔ تخیل کو اصلیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہو، لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ تصور اور حقیقت دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر تم تصور کو حقیقت کا جامہ پہناؤ گے تو تمہیں نااُمیدی ہو گی۔ کیونکہ تصور حقیقت بن کر حقیقت کی طرح ہی غیر دلچسپ ہو جائے گا۔ تم آسمان کو چھونے کے منصوبے باندھتے ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ تم اگر اُڑ کر آسمان تک پہنچ گئے تو آسمان بھی سوائے پانی اور ہوا کے اور کچھ نہیں ہو گا، اور اُس آسمان کے پرے تمہیں ایک اور آسمان نظر آئے گا۔ آخر سراب کے سہارے نخلستان کی تلاش میں کب تک ریگستان کی صحرا نوردی کرتے رہو گے یا تو وینکٹ کی طرح تخیل کو حقیقت کا غلام بنا دو اور سمجھ لو کہ اصلیت تخیل کی آخری عملی منزل ہے، یا پھر یہ جان لو کہ اصلیت تصور کی پہلی سیڑھی ہے۔ جس کی آخری سیڑھی پہنچ سے بہت پرے ہے۔ لیکن خیر چھوڑو، تم تو خوبصورتی کو پکڑ لینا چاہتے ہو۔ مرمریں باہوں پر سر رکھ کر سونا چاہتے ہو۔ نرم، لمبے بالوں سے کھیلنا چاہتے ہو۔ شدتِ جذبہ سے کانپتی ٹھوڑی کو ہاتھوں میں لیکر اس کی چمکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتے ہو، سُرخ، بھرے نمدار ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کرنا چاہتے ہو، یہ سب کچھ ممکن ہے اور تم یہ سب کچھ کرتے ہو، لیکن یہ کرتے ہی تم اُس دوشیزہ سے دُور ہونے لگتے ہو۔ تمہارا ذہن کہتا ہے اِن مرمریں باہوں سے بھی زیادہ مرمریں باہیں ہو سکتی ہیں۔ ان بالوں سے بھی زیادہ خوبصورت لمبے بال ہو سکتے ہیں، اِن آنکھوں سے بھی زیادہ خوبصورت آنکھیں، ان ہونٹوں سے بھی زیادہ بھرے ہوئے ہونٹ۔ اور تب تم اِس نئی دوشیزہ کی تلاش میں کھو جاتے ہو۔ اور جب وہ مل جائے تو تمہیں پھر محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس سے پرے اس سے بھی زیادہ خوبصورت ایک اور دوشیزہ ہے اور تم اپنی اس جستجوئے تسکین کو کچھ پرامید بنانے کیلئے شراب کا سہارا لینے لگتے ہو۔ تمہاری دوپہر کافی ہاؤس میں کٹتی ہے۔ لیکن شام کو تمہارا بسیرا میخانے میں ہوتا ہے، میرا مطلب ساقی اور جام والے میخانے سے نہیں بلکہ ڈنشا، ڈنشا اینڈ کمپنی کی شراب کی دکان سے ہے جہاں نہ ساقی ہے نہ جام، صرف تمہارے اشاروں پر ناچنے والا بیرا ہے جو بہ حیثیت ایک مرد تمہاری خوبی کو اُس وقت پرکھتا ہے جب تم "وائٹ ہاؤس" وسکی یا "ڈاکیئرز" رم پی کر اس کو انعام دینے لگتے ہو۔ پی کر کچھ نا اُمیدی کم ہوتی ہے، کچھ سکون ملتا ہے، کچھ اُمید بندھتی ہے کہ اب جو لڑکی ملے گی وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہو گی۔ اور دل کو ڈھارس بندھتی ہے کہ اب تمہاری جستجوئے تسکین کی آخری منزل قریب ہے۔ پر دوست، اتنی لڑکیوں سے ہم صحبت ہونے کے بعد بھی تم ابھی تک تلاشِ حسن میں سرگرداں ہو۔ تمہارا علاج ڈنشا، ڈنشا اینڈ کمپنی کا شراب خانہ ہی ہے یا وہاں سے جھومتے نکلنے کے بعد کسی سڑک کا کنارہ ——

رُک جاؤ، رُک جاؤ، اپنے اس نفسیاتی تجزیہ کو ذرا دم لینے دو۔

راؤ کی خوبصورت دوست نے سر اور ہاتھ کی ایک ہم آہنگ جنبش سے بالوں کی ایک چوٹی کو پیچھے پیٹھ پر ڈال دیا ہے۔ اب وہ اپنی سہیلی سے کچھ کہہ رہی ہے۔ شائد پوچھ رہی ہے کھانے کو کچھ اور تو نہیں چاہئے؟ اب وہ بائیں ہاتھ سے بیرے کو بل لانے کے لئے اشارہ کر رہی ہے۔ کیوں

وینکٹ، اگر تمہیں کُندا کی سہیلی مل جائے (ذرا سانولی ضرور ہے) تو کیسی رہے!

گوپال، تم اپنی معنی خیز مسکراہٹ (تمہارے دانت پیلے ہی سہی) کے غیر مرئی ایلچی اُس خوبصورت لڑکی کی طرف نہ بھیجو جس کے گالوں میں بات کرتے وقت چھوٹے چھوٹے دلنواز گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ جانتے نہیں راؤ ابھی اُس سے باتیں کرکے آیا ہے۔ راؤ اُس کے باپ کو جانتا ہے۔

راؤ، کیا کہنے ہیں تمہاری دلیری کے۔ تم سب خوبصورت لڑکیوں کے باپوں کو جانتے ہو۔ تم اُن میں سے ہو جو سوال کا حل سوال کو نظر انداز کرنے میں ڈھونڈتے ہیں۔ تم ہمیشہ یہی کہتے رہو گے میں رما کے باپ کو جانتا ہوں۔ میں کرشنا کے بھائی کو پہچانتا ہوں، کملا کے چچا سے میری واقفیت ہے۔ لیکن میں رما اور کرشنا اور کملا کے ساتھ "نمستے، نمستے" سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ راؤ، تم کبھی آگے بڑھو گے بھی نہیں، تم نے تصوّر اور اصلیت کے درمیان ایک بڑی اُونچی دیوار تعمیر کر رکھی ہے۔ تم کئی بار تصوّر کے پروں پر اُڑ کر دیوار کے اس طرف جھانکتے ہو جدھر اصلیت ہے اور کھائی کی گہرائی دیکھ کر تمہارا دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے۔ تم جھانکنے تک سے ڈرتے ہو، کودو گے خاک۔ تم عورت کو کوئی مادی وجود دیتے ہوئے ہچکچاتے ہو۔ تمہارے لئے عورت ڈر کی چیز ہے۔ تم اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھے ہو۔ تم اپنے سے ہمیشہ یہی سوال پوچھتے رہتے ہو کیا مجھے کوئی عورت پسند کر سکتی ہے؟ اگر میں کسی عورت سے کوئی مذاق کر دوں تو کیا وہ میرے مُنہ پر تھپڑ تو نہیں کھینچ مارے گی۔ اور اگر بھُولے سے کسی کو مجھ سے عشق ہو بھی گیا تو میرا کوئی دوست اُسے مجھ سے چھین کر تو نہیں لے جائے گا۔ تم دل ہی دل میں لڑکیوں سے ملنے کے ارادے باندھتے رہتے ہو۔ اُن کو قابو میں رکھنے کے طریقے سوچتے رہتے ہو۔ اپنی کشش بڑھانے کیلئے اپنے اندازِ بیان کو، اپنے جذبات کے اظہار کو ایک مخصوص ڈھنگ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو لیکن وقت آنے پر ہمت ہار دیتے ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ تم سب سے بدقسمت ہو کیونکہ تمہارے اس ڈر نے تمہیں زندگی کی تھوڑی سی خوشی حاصل کرنے سے بھی روک رکھا ہے۔ وینکٹ کو دیکھو، اُس کے مادی نقطہ نظر سے تمہیں اتفاق نہ سہی لیکن زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کم سے کم اُس نے ایک خاص راستہ تو اختیار کیا ہوا ہے۔ وُہ عورت کو ایک مادی چیز سمجھتا ہے، خالص مادی چیز۔ شاعروں نے، فلسفیوں نے، ادیبوں نے عورت کے اردگرد جو رنگین، غیر مادی اور دلچسپ صفات کا ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے، اُس کی وینکٹ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ وہ جب ایسی شاعرانہ گفتگو سُنتا ہے تو چپکے سے مُسکرا دیتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ یہ عورت جس کی بابت اتنی رنگین بیانی کی جا رہی ہے اگر میرے بازوؤں میں نہ آئی تو کسی اور مرد کے بازوؤں کی زینت ہو گی۔ وہ خلاء میں نہیں گھومے گی اور نہ ہی شاعروں کی تمام شاعری اُس دُوسرے مرد کو اُس عورت سے وہی فائدہ اُٹھانے سے روکے گی۔ جو میں اُن عورتوں سے اُٹھاتا ہوں جو مجھے مل سکتی ہیں۔ اِسی طرح اگرچہ گوپال کی زندگی میں کافی تلخی، کافی ناکامی، کافی محرومی ہے۔ تو بھی وُہ اپنے حال میں مست ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو راستہ اُس نے اختیار کر رکھا ہے۔ اُس کا انجام سوائے تلخی اور ناکامی کے اور کچھ نہیں لیکن کم سے کم اُس کا راستہ معین تو ہے۔ اور جب وُہ اُن سنگ میلوں کو دیکھتا ہے۔ جن کی مدد سے وُہ اُس راستے پر بڑھتا ہے تو کچھ وقت کے لئے اُس کی زندگی بڑی ہری بھری ہو اُٹھتی ہے۔ اُس میں بھرے بھرے ہونٹ، اور دلنواز مُسکراہٹیں، اور بکھرتے گیسو اور چمکتی آنکھیں گھُومنے لگتی ہیں۔ لیکن اُس کی شکست اُس کی فتح ہی میں پنہاں ہے۔ کیونکہ وُہ ہر سنگِ میل کو منزل سمجھنے لگتا ہے، اور جب سنگِ میل پر پہنچتا ہے۔ تو یکایک محسوس کرتا ہے کہ منزل ابھی اور آگے ہے۔ لیکن راؤ تمہاری نہ کوئی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ تم تجربہ شروع ہی نہیں کرتے۔ اسلئے تم اپنی فتح اور شکست دونوں ہی سے ناآشنا ہو۔ تم آدمی نہیں، شتر مُرغ ہو جو ریت میں سر چھُپا کر دُنیا کی رنگینیوں اور مصیبتوں دونوں ہی سے بے بہرہ ہو جاتا ہے ——

پر بھلے آدمی تم کون سے تیس مار خاں ہو۔ تم نے کون سے قلعے فتح کر لئے ہیں۔ آتی جاتی لڑکیوں کو تو تم بھی ایسے دیکھتے ہو۔ جیسے مجنوں کے بعد عشق تمہارے ہی ورثے میں آیا ہے۔

ہاں عاشق تو ہوں، لیکن نہ وینکٹ جیسا، نہ گوپال جیسا۔ راؤ کی

طرح بزدل بھی نہیں ہوں۔ میرے لئے عورت نہ تو صرف گوشت کا تودہ ہے اور نہ مجھے یہ خیال ہے کہ اب جس عورت سے میری جان پہچان ہوگی۔ وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہے۔ میں تو عورت کو عورت بھی سمجھتا ہوں اور ایک خوبصورت شے بھی۔ عورت کو عورت سمجھ کر میں نے بھی اُس سے کئی بار ربط بڑھایا ہے۔ لیکن میں نے یہ خیال اپنے آپ پر کبھی غالب نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس عورت کو پاکر خوبصورتی کے مجسمہ کو پالیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے میں بھی گوپال کی طرح ہر خوبصورت لڑکی کے پیچھے بیکا کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اُس خوبصورت شے کو پاکر بھی خوبصورتی کی حرص نہیں جاتی۔ تو میں نے جان لیا کہ کسی چیز کی خوبصورتی اُس کے نہ پانے ہی میں ہے۔ میں نے اپنی نااُمیدی کو شراب کے گلاس میں غرق نہیں کیا۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ تلاشِ حُسن تو جستجوئے اُفق ہے۔ اس کی ابتدا مجھ سے ہے۔ اِس کی انتہا کوئی نہیں۔ اور اس لئے اب جب میں عورتوں کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہُوں تو اس لئے نہیں کہ میں اُنہیں پاسکوں۔ بلکہ اس لئے کہ اِس تعریف سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ میری تلاشِ حُسن کو ثمر ملتی ہے، مجھے قدرت کی تخلیق کی داد دینے کا موقعہ ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی سب سے خوبصورت تخلیق عورت ہے۔ اور اِس سے بھی بڑھ کر قدرت کی تخلیق مرد ہے جو اس خوبصورتی کی داد دے سکتا ہے۔ کُل کائنات خوبصورت ہے۔ سمندر کا ساحل سے ہمیشہ ٹکراتے رہنا، سوتے ہوئے مکانوں پر چھٹکتی ہوئی چاندنی، زور سے برستی ہوئی بارش کی ٹپ ٹپ، سُونے میں ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ۔ کتنی خوبصورتی ہے ان میں، عورت کی خوبصورتی کائنات کی اِس خوبصورتی کی زنجیر کی ایک اور کڑی ہی تو ہے۔ عورت کا حُسن کتنا متحرک اور نرالا ہے۔ اُس کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ اِسی لئے اس خوبصورتی کی کوئی تھاہ نہیں، کوئی کنارہ نہیں، کوئی منزل نہیں میں تو اب عورت سے پیار نہیں کرتا، عورت کے اظہارِ حُسن سے پیار کرتا ہوں یا یُوں کہو کہ یکبارگی ہی بہت سی عورتوں سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ کسی ایک عورت کا حُسن مکمل نہیں۔ میں عورت کو نہیں پکڑتا اُس کے حُسن کی یاد دِل میں رکھ دیتا ہوں۔

اِسی لئے کھوئے کھوئے رہتے ہو شاید!

ہاں، میری زندگی نہ ختم ہونے والا ایک نشہ ہے۔ ہمیشہ تلاشِ حُسن میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اِسی لئے چاہوں نہ چاہوں راہ چلتی ہر لڑکی کو دیکھنے کے لئے میری نگاہ بے ساختہ اُوپر اُٹھ جاتی ہے۔ اگر اُس کی پیٹھ میری طرف ہے تو دِل ہی دل میں اُس کے بال بنانے کے انداز کا جائزہ لیتا ہوں۔ جُوڑا بنا رکھا ہے اُس نے؟ پنجابی انداز میں؟ مراٹھی انداز میں؟ گجراتی انداز میں؟ کتنی خوبصورتی ہے گجراتی لڑکیوں کے بال بنانے کے انداز میں۔ ایجنٹا کی تصویروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ بالوں کو کس کر جوڑے کی لپیٹ میں نہیں لے لیتیں گویا اُن سے دُشمنی ہو۔ وہ بالوں کو بھی جسم کا ایک ذی حس حصہ سمجھتی ہیں اور اس پیار سے اُن کو جوڑے کی شکل میں گوندھتی ہیں کہ بال اور جوڑا دونوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اظہارِ خوبصورتی کی کتنی سمجھ ہے اِن کو۔ بالوں کو گردن کی پشت تک کچھ ڈھیلا ڈھیلا چھوڑ دیتی ہیں اور جہاں گردن اور کندھے ملتے ہیں وہاں بالوں کو کچھ اس صفائی سے جُوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہیں جیسے کوئی سانپ کُنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ اور جب بات کرتے وقت اُن کا سر دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہلتا ہے تو گردن کی پشت پر کا جُوڑا اِدھر اُدھر سرکتا ہے۔ اور بذاتِ خود باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کوئی ایسی لڑکی نظر آجاتی ہے۔ جس نے بالوں کی دو چوٹیاں کر رکھی ہیں۔ کتنے لمبے بال ہیں اِس کے۔ دونو چوٹیوں کے سرے کولھوں کو چھُو رہے ہیں، ڈھیلا ڈھیلا گُوندھا ہے بالوں کو، اور سروں کے پاس تو اُن کو بالکل سرکش ہی رہنے دیا ہے، اُن کے سرے پیچدار گول زینے سے بن گئے ہیں۔ کتنی شفقت اور محنت سے اِس نے بالوں کے سروں کو یوں گول کیا ہوگا! یا پھر اگر کوئی ایسی لڑکی سامنے سے آرہی ہو تو اُس کی مستانہ چال کو دیکھتا ہُوں۔ اُس کی پیشانی پر بہکی ہوئی پریشان زُلف کو دیکھتا ہُوں جسے وہ اپنی اُنگلیوں کے نازک لمس سے سر پر پیچھے کرتی ہے لیکن جو سرکش بنی اُسی تیزی سے پھر پیشانی پر لپک آتی ہے۔ آنکھوں کی مسرت خیز چمک کو دیکھتا ہوں، ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا ہوں، ساڑھی کی فنی لپیٹ سے نمایاں تر ہوتے ہوئے جسم کے دلآویز خطوط کو دیکھتا ہوں اور پھر . . . . . .

ہاں ہاں اور پھر . . . .

...... اور پھر کبھی کبھار کسی کو بلا لیتا ہوں۔

کسی خوبصورتی کی دیوی کو؟ کسی مجسمۂ حسن کو؟

نہیں، خوبصورتی کا خواب میرے دماغ سے باہر کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اصلیت خوبصورت نہیں ہے۔ اُس پر خوبصورتی کا خول میں چڑھاتا ہوں۔ خوبصورتی کی مُورت میرے تخیل کے رنگین گوشوں سے باہر قدم رکھتے ہی ناپید ہو جاتی ہے۔ میں عورت کو خوبصورت اس لیے کہتا ہوں کیونکہ وہ میری خوبصورتی کی پیاس کو اور بھی بڑھاتی ہے لیکن کوئی بھی عورت میرے خوابوں کی تعبیر نہیں کیونکہ کسی ایک عورت کا حُسن مکمل نہیں۔

تو پھر کس کو بلاتے ہو؟

کسی کو بھی، جو خوبصورتی میرے تخیل میں ہے اُس کی جھلک۔ صرف جھلک۔ مجھے کسی لڑکی میں مل جاتی ہے۔ میں اُس جھلک کو وسعت دیتا ہوں۔ قطرے کو سمندر بنا لیتا ہوں اور اُس کے خیال میں کھو جاتا ہوں۔ کچھ وقت کے لیے اُس کی اور خامیاں میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ دل میں یکبارگی ایک طوفان سا اُٹھتا ہے۔ اُس لڑکی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ حوصلہ کرتا ہوں اور لڑکی کو بُلا لیتا ہوں۔

اب سمجھے۔ پچھلے ہفتے جس لڑکی کو کافی ہاؤس میں لیے بیٹھے تھے، وہ بھی خوبصورتی کی ایک جھلک تھی!

ہاں، اُس لڑکی سے ملاقات کی بھی ایک کہانی ہے۔ میں پچھلے سال اگست کے مہینے میں پُونا سے بمبئی آ رہا تھا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھی جگہ بہت مشکل سے ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھنا پڑا۔ اُس کونے میں غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کا دروازہ اچھی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ ہلکی ہلکی بدبو سے دماغ پراگندہ ہو رہا تھا سوچا اس ڈبے میں سے نکل بھاگوں۔ اُٹھنے ہی لگا تھا کہ پرے کونے میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ اُس کا سر کتاب پر جُھکا ہوا تھا۔ اُس کے سر کے آدھے بال دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ اُس نے بالوں کی دو موٹی چوٹیاں کی ہوئی تھیں جو اُس کے دونوں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی گود میں جا کر ایک ہو گئی تھیں۔ میرے دماغ میں اُس کے بالوں کی خوبصورتی سرایت کر گئی۔ میں اپنے کونے کی گندی فضا بُھول گیا۔ اور لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے بالوں کی خوبصورتی کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ بالوں پر دھوپ کی چمک سے جو ایک مسرت خیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کے لیے تشبیہیں ڈھونڈتا رہا ——

کچھ دیر بعد لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے (جو غالباً اُس کا باپ تھا) اُسے کچھ کہا۔ لڑکی نے کتاب پر سے نظر اُٹھائی۔ چاروں طرف دیکھا۔ بالوں کی چوٹیوں پر ہاتھ پھیر کر اُنہیں ہلکے سے دبایا۔ مُسکرائی اور پھر سر جُھکا کر پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ مجھے اُس کی مُسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ اب جب میں اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اُس لڑکی کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے غیر معمولی کہا جا سکے یا جو خاص جاذبِ نظر ہو۔ لیکن اُس وقت میں اُس کی خوبصورتی کا جائزہ اُس کے بالوں کی خوبصورتی سے لے رہا تھا۔ جو واقعی خوبصورت تھے۔ اور اس لیے اُس وقت مجھے اُس کا چہرہ، اُس کے خدوخال بہت دلآویز معلوم ہُوئے۔ میں اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کب وہ سر اُٹھائے اور مُسکرائے۔

اُنہی دنوں میں ایک رسالے کے لیے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کا اُس کہانی سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن یہ لڑکی میرے دماغ پر کچھ اِس طرح چھا گئی تھی۔ کہ بمبئی پہنچ کر میں نے اُس کے بالوں کی تعریف میں دو تین صفحے لکھے اور بے محل ہوتے ہوئے بھی اُن کو اُس کہانی میں جڑ دیا۔ وقت پا کر میں اُس لڑکی کو بھُول گیا، صرف اُس کے بالوں کی خوبصورتی کی یاد ذہن کے کسی گوشے میں گھر بنا کر رہ گئی۔

قریباً ایک سال بعد پچھلے ہفتے میں نے اُسی لڑکی کو کافی ہاؤس میں بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ راؤ اُس دن کافی ہاؤس میں نہ تم تھے، نہ وینکٹ۔ صرف گوپال ایک کونے میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اور کافی ہاؤس میں داخل ہوتی ہوئی لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں بھی گوپال کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی پیتے پیتے میں نے کئی بار اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس لڑکی کی نظریں بھی دو تین بار مجھ پر پڑیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اور اُس کا ساتھی اُٹھ کر چلے گئے اور میں گوپال [illegible] میں محو ہو گیا۔

جب میں کافی ہاؤس سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہی لڑکی سامنے بس سٹینڈ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ معاً میں نے سوچا کہ وہ وہاں کھڑی نہ معلوم کب تک بس کا انتظار کرتی رہے گی کیوں نہ اُسے اپنی موٹر میں بٹھا کر اُس کی منزل تک پہنچا دوں۔

بس سٹینڈ پر پہنچکر میں نے موٹر روک دی اور اُس کا دروازہ کھولتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ "آپ کو کہاں جانا ہے۔" اُس نے جگہ کا نام بتا دیا میں بھی اُدھر ہی جا رہا تھا۔ نہ جا رہا ہوتا تو بھی ضرور کہہ دیتا کہ اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میری بغلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اِس جرأت کیلئے معذرت پیش کرتی ہوئی بولی کہ آج کل بس کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور مجھے آج گھر جلدی پہنچنا ہے۔ میں نے بات چلانے کے لئے کہا۔ "میں آپ کو ایک بار پہلے بھی مل چکا ہوں"۔ اور وہ بولی "مجھے بھی کچھ کچھ یاد پڑتا ہے"۔ میں نے کہا "میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ پچھلے سال اگست کی بات ہے۔ ریل گاڑی میں، پُونا سے بمبئی آتے ہوئے"۔ اور وہ کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ اُس ڈبے میں کچھ چینی لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بہت شور و غل تھا"۔ اور میں نے کہا "آپ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ اور آپ نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں کی ہوئی تھیں۔ اور آپ کے بالوں پر سُورج چمک رہا تھا جس سے آپ کے بال سنہری معلوم ہو رہے تھے۔ میں اُن بالوں کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ آپ پڑھنے میں محو تھیں۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ آپ کے بال دھُوپ میں سنہری لگتے ہیں آپ کی مسکراہٹ بھی ضرور صبح کی نرم دھوپ کی طرح خوشگوار ہوگی"۔ وہ لڑکی مسکرائی اور سامنے سڑک کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "یاد نہیں پڑتا میں اُس وقت کونسی کتاب پڑھ رہی تھی۔ گجراتی کی تھی یا انگریزی کی؟" میں نے کہا۔ "پچھلے سال آپ کو دیکھنے کے بعد میں نے آپ کا ایک کہانی میں ذکر کیا تھا۔ اور وہ کہانی بڑی مقبول ہوئی۔ یہ سب آپ ہی کی وجہ سے تھا۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے"۔ وہ لڑکی صرف مسکراتی رہی۔ اُس کی منزل قریب آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ کو کوئی عذر نہ ہو تو کل کافی ہاؤس میں میرے ساتھ کافی پیجئے"۔ اور اُس نے جواب دیا "میں وعدہ تو نہیں کرتی کیونکہ عام طور پر ہم چار پانچ سہیلیاں کالج سے چھٹی ملنے پر اکٹھی ہی کہیں چائے پینے چلی جاتی ہیں۔ اور میں اُن کو چھوڑ کر آ نہیں سکتی۔ لیکن میں کوشش ضرور کروں گی۔"

اگلے دن وہ مجھے کافی ہاؤس میں ملی۔ یہ بات تم سب کو معلوم ہے، جب وینکٹ اور راؤ میرے پاس بیٹھنے لگے تھے۔ تو میں نے کہا تھا۔ میں آج اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں مجھے کسی کا انتظار ہے۔ راؤ تم کانپنے لگے تھے۔ اور تم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے ایک سگرٹ سلگا لیا تھا۔ اور وینکٹ، تم میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولے تھے "ہمیں بھی یاد رکھنا"۔

وقت مقررہ کے پانچ منٹ بعد وہ لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی دروازے پر رک کر اپنی گردن کو لمبا کر کے، کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور اُس کے پتلے ہونٹ ایک ہلکے تبسم کے زیرِ اثر تھوڑے سے کھل گئے۔ میں نے بیرے کو کافی لانے کے لئے کہا۔ وہ کہنے لگی معاف کیجئے مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی، اور وہ پھر اپنے پتلے ہونٹوں سے مسکرائی۔ میں نے اُس لڑکی سے پوچھا۔ آپ کا نام کیا ہے اور وہ بولی "پدما"۔ میں نے کہا بڑا پیارا نام ہے۔ پدم "کنول" کو کہتے ہیں۔ تم کنول ہو۔ اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ پدم کنول کو کہتے ہیں لیکن میرا نام پدما ہے اور پدما لکشمی کو کہتے ہیں۔ مجھے اپنا نام بالکل پسند نہیں۔ کاش میرا نام اُرملا، یا اُوشا، یا سرِودلا ہوتا"۔ اور میں نے کہا اپنا نام کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ لیکن پدما واقعی بڑا پیارا نام ہے۔ وہ چپ رہی اور اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلیوں پر حنا کی صندلی تحریر ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ میرا خیال تھا۔ کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں حنا ایسی دیسی آرائشی چیزیں پسند نہیں کرتیں۔ اُن کی پسند غازہ اور پاوڈر اور لپ سٹک لیکن پھر میں نے سوچا کہ یہ بمبئی ہے اور بمبئی میں سب کچھ ممکن ہے۔ اور میں نے کہا "پدما میں نے تمہارے بالوں سے متاثر ہو کر کچھ لکھا تھا۔ سنو گی"۔ وہ بولی میری پرورش بمبئی میں ہوئی ہے۔ میری زبان اُردو نہیں۔ پھر بھی میں سمجھنے کی کوشش کروں گی"۔ اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔ جب میں کہانی میں لڑکی کے بالوں کی تعریف کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ پدما اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اُس نے اپنے بالوں کی دونوں چوٹیوں کو جو اُس کی پیٹھ پر لٹک رہی تھیں پیار سے پکڑ کر آگے کر لیا ہے اور اب وہ اُس کے کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی آغوش کو چُوم رہی ہیں۔ اور وہ اُنہیں پیار سے تھپتھپا رہی ہے۔ اور اب اُس نے ایک چوٹی کے

سرے کو ہاتھوں میں لے کر اُسے کھول ڈالا ہے۔ اور اُسے انجانے طور پر پھر گوندھنے لگی ہے۔ اور میں نے کہا کیا کسی اور نے کبھی تمہارے بالوں کی تعریف نہیں کی اور اُس نے چوٹی کے سرے کو شفقت سے گوندھتے ہوئے کہا، "معلوم نہیں" ....

جب وہ چلی گئی تو وینکٹ نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا "آج تو چڑیا کو پھانس لیا"۔ وینکٹ برا نہ ماننا۔ اُس وقت میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی تمہارے لئے اپنی آنکھوں کی نفرت کو نہ چھپا سکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ گویا کسی نے پوجا کے پھولوں پر تھوک دیا ہو۔ تم چپکے سے کھسک گئے تھے۔

"پر تمہاری پدما کئی بار کافی ہاؤس میں آتی ہے۔ اُس دن کے بعد تمہیں اُس کے ساتھ ملتے تو نہیں دیکھا۔"

میں پھر اُس سے ملا بھی نہیں۔ میں گوپال ہوتا (گوپال تمہارے دانت بہت پیلے ہیں۔ دوست تمباکو پینا کم کردو) تو پدما سے اگلے دن ملتا اور پھر اُس سے اگلے دن، جب تک کہ اُس کی خوبصورتی سے سیر ہو کر اُس سے مایوس نہ ہو جاتا۔ لیکن مجھے پدما کی خواہش نہیں، اُس کے بالوں کی خوبصورتی درکار ہے۔ اور وہ میں دُور سے دیکھ لیتا ہوں۔

"نزدیک سے شاید اور بھی بہتر ہو۔"

نہیں، اُس کے بالوں میں تو جو ہے سو ہے ان کی اصلی خوبصورتی میرے تخیل میں ہے۔ اور تصور بُعد میں ہے۔ قرب میں حقیقت ہے۔ اور حقیقت میں مایوسی ہے۔

عجیب آدمی ہو۔

ہاں، بہت عجیب ——

ممتاز مفتی

احسان علی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی احسان علی کی۔ محلے میں کون تھا جو اُن کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے۔ جہاں بوڑھوں کی محفل لگی ہوتی۔ تو کھانسی کی آوازوں کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا محلے کے کنوئیں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی۔

جوان لڑکیاں انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں۔ مٹیار عورتیں دیکھ پاتیں تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ خواہ مخواہ جی چاہتا کہ کوئی بات کریں۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔ مثلاً اس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی۔ یہاں کھڑے ہو کر کسے تاڑ رہے ہو احسان علی؟"

"یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ جو لگا ہے۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں"۔ دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو"۔ بھابی کہنے لگی "اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے"۔

"اور تو کیا اپنے لئے دیکھ رہا ہوں بھابی"۔ احسان علی مسکرایا۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ احسان علی ہنس کر بولا۔ "دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی۔ چاچی اپنے لئے دیکھو تو لوگ گھورتے ہیں۔ کسی کے لئے دیکھو تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں"——— جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا۔ ایسا جواب دیتے کہ سن کر مزہ آ جاتا ——— شاداں نے یہ سن کر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "چاچی اس عمر میں اور دل بہر کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا"

احسان علی نے آہ بھری۔ بولے "کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں"

"اتنی عمر ہو چکی ہے چچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی"۔ شاداں مسکرائی ———

"ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں مٹی"۔

"اچھا شاداں ایمان سے کہنا" وہ سنجیدگی سے بولے "کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے؟"

"ہائیں چچا"۔ شاداں ہونٹ پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئی۔ "میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں"۔

"یہ بھی ٹھیک ہے"۔ وہ ہنسے "جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں۔ لیکن جب جوان تھی۔ توبہ جی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھی۔ کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں؟"

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے۔

ان کے جانے کے بعد بھابی نے کہا۔ "توبہ بہن، احسان علی اور بات کرنے سے چوکے"۔

چاچی بولی "سر ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی اب تو باتیں ہی باتیں ہیں"۔

"لے بہن"۔ شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب کونسا حاجی بن گیا ہے۔ اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے"۔

"لیکن شاداں" بھابی نے کہا "شاباش ہے اس کو۔ کبھی محلے کی لڑکی کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا"۔

"یہ تو میں مانتی ہوں"۔ شاداں نے ان جانے میں آہ بھری۔

"یہ صفت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے"۔ چاچی نے کہا۔

جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سن پائی تو بولے "اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں"

"کیوں" چاچی نے ہنس کر کہا "یہ کیا جھوٹ ہے۔ تمہاری یہ صفت واقعی خوب ہے۔ میں تو منہ پر کہوں گی احسان علی"۔

"لو چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارا محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا" شاداں بولی۔

احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے بولے "چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلّی کوئیں میں گر گئی۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر بولی نہیں آج کی رات یہیں بسر کریں گے"۔

"یہ بلّی کا واقعہ کیا ہوا"۔ چاچی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا"۔ شاداں بولی۔

"بس تو چھوڑ اس بات کو"۔ بھابی نے کہا "احسان علی کی بات کریدنے سے نکلے گا کیا؟"

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے "چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے بیچاری ایسی بنی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں؟"

"ہائے اللہ۔ سنا تم نے چاچی؟" شاداں چلائی۔

"سمجھی بھی ہو اس کی بات؟" بھابی مسکرائی

"سب سمجھتی ہوں"۔ چاچی نے ہنس کر کہا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے"۔ شاداں بولی "کہ محلے والیاں ایسی ہیں۔ پر میں پوچھتی ہوں چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی ریجھ جاتے اُس پر؟"

"تم اُس کی باتیں سنو"۔ بھابی نے کہا۔

"توبہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے"۔ چاچی ہنسی۔

"کسی محلے والی پر ریجھتے تو اک بار مزہ چکھا دیتی تمہیں چچا"۔ شاداں آنکھیں چمکا کر بولی "جوتا دکھا دیتی میاں کو۔ کیوں بھابی؟"

"واہ" احسان علی مسکرائے "شاداں جس نے جوتا دکھا دیا سمجھو بات پکی کر دی"

"ہائے میں مرگئی"۔ شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

"احسان علی تجھ پر خدا کی سنوار" چاچی نے ہاتھ چلایا۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گزشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں۔ لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہراتی اور وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں۔ جوان مٹیاریں تو اب بھی بلا بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔ جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا۔ خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی "ہائے میں مرگئی۔ یہ تو اپنا احسان علی ہے"۔ ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی مخدوش نگاہوں سے گھورتی تھیں۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے۔ اور یوں ہم کلام ہوتے جیسے اپنی فراخدلی کی وجہ سے ان کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں وہ اکثر کہا کرتے "بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے۔ جنہیں نہ ہو انہیں کبھی نہیں ہوتی"۔

"حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے۔ بابا جی"

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے"۔

"دیکھ لو اتنی عمر ہو چکی ہے۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے؟ وہی چھیڑ خانی ۔۔ لاحول ولا قوۃ"۔

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی متبسم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو کر واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا ایمپائر بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرتے۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے "چچا جی ہمارے آڑی بنیں گے"۔ "نہیں ہمارے"۔ ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں۔ "لو دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں"۔ چق کی اوٹ میں سے آواز آتی۔ "بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے"۔ سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی "ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی"۔ شاہ نشین سے چاچی بولتی "توبہ شاداں تو بھی کسی رُخ چین لینے نہیں دیتی"۔ شکر کر کہ احسان علی کا دھیان اور کھیلوں سے ہٹا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے"۔ مسجد سے آتا جاتا کوئی محلے دار انہیں دیکھ کر ہنستا "کب تک اس لڑکپن لڑکوں کے کھیل میں لگے رہوگے۔

اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔" احسان علی ہنس کر گنگناتے "وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار"۔ دوسرا آ کر کہتا "دنیاداری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی؟ صوم وصلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو۔" احسان علی کہتے "باباجی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا"۔ "تم میں احساس نہیں کیا" باباجی پوچھتے اور وہ جواب دیتے "احساس تو ہے پر غلاظت بھی ہو" اس بات پر کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اور وہ ہنستے "لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آگیا۔" اور وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ کیسا ویران دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ موسم سرما میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر ازار بند بُنا کرتی تھیں۔ دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں۔ مٹی کی ہنڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلا لگ جاتا۔ ہاتھ چلتے دھاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آوازیں پیدا کرتے۔ تیلیاں ٹکراتیں۔ ازار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی۔ گلے ہوتے شکائتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے۔ مگر قہقہے کی آواز نہ آتی۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے۔ حدیثوں کے حوالے دیئے جاتے۔ اولیاء کرام کی حکایات سنائی جاتیں۔ ہنگامہ تو رہتا تھا۔ مگر اس میں مزاح کی شیرینی نام کو نہ ہوتی۔ عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا۔ پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آ بسے ان کے آنے کے بعد محلے کا رنگ بدل گیا۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آ نکلتے اور آتے ہی ایسی بات کرتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہو جاتے۔ آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سُننے لگتے۔ بات بات پر لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھول جاتے۔ لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اس پر احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

"بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی"۔ احسان علی کو لاحول سے چڑھتی چڑ۔ ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔

پھر ـــــ ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا۔

چوگان میں عورتیں حسب معمول جمع تھیں۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو آتے دیکھ لیا۔ چاچی کو اشارہ کر کے باآواز بلند بولی "چاچی خدا جھوٹ نہ بلائے۔ آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی چچا احسان علی بنے ہوئے ہیں۔ راہ چلتی لڑکی کو تاڑتے ہیں"۔

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا "تم تو خواہ مخواہ اُس بیچارے ـــــ"

شاداں نے پھر سے اشارہ دہرایا۔ جسے دیکھ کر چچی کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا۔

"آج کل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی" شاداں نے پھر سے بات شروع کی "بال کھچڑی ہو جاتے ہیں پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی"۔

"ہاں شاداں" چچی نے مُنہ بنا کر کہا "زمانہ ہی ایسا آیا ہے"۔

اس کے بعد مجمع پر خاموشی چھا گئی ہر کوئی احسان علی کی بات سُننے کی منتظر تھی۔ اگرچہ وہ سب یوں بیٹھ گئی تھیں۔ جیسے انہیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

احسان علی آئے اور چُپ چاپ اُن کے پاس سے گزر گئے۔

اُنہوں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران ہو گئیں۔

"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہوا ہے" چاچی زیر لب بولی۔

"میں تو آپ حیران ہوں"۔ شاداں ہاتھ ملنے لگی "اے ہے احسان علی اور چپ چاپ پاس سے گزر جائے"۔

"میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے" بھابی نے انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

"کہیں گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے تھے" شاداں نے پوچھا۔

"لو"— چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا "جس روز نواب بی بی سے لڑا اس روز تو اور بھی چہکا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں بھابی یاد ہے کل کیسے ہنس ہنس کر گھر کی لڑائی کی بات سنا رہا تھا؟"

"ہاں"۔ بھابی مسکرائی جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشہ ہوا۔

"اس کا کیا ہے"۔ چاچی بولی "اس کے لئے تو ہر بات تماشہ ہے۔ چاہے موت کی ہو یا بیاہ کی"

"ہائے چاچی کیسی اچھی طبیعت ہے احسان علی کی۔ کبھی ماتھے پر تیوری نہیں دیکھی۔ ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا۔"

"پر میں کہتی ہوں ضرور آج کوئی بات ہے"۔ بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔

شاداں ازار بند لپیٹتے ہوئے بولی "چلو تو چل کر نواب بی بی سے پوچھیں"۔

"اے ہے دو جوڑے تو چڑھا لینے دے" بھابی نے کہا۔

"ہونہہ دو جوڑے اتنا لوبھ بھی کیا"۔ اُس نے اٹھ کر بھابی کے ازار بند کو زبردستی لپیٹ دیا۔

پہلے تو وہ نواب بی بی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی کہنے لگی "خیر تو ہے۔ احسان علی کو کیا ہے آج؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں" نواب بی بی نے جواب دیا۔

"وہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا اسے باہر جاتے ہوئے"۔ بھابی نے کہا۔

"میں نے تو بلکہ انہیں چھیڑنے کی خاطر کچھ کہا بھی تھا" شاداں بولی "میں نے کہا چلو دو گھڑی کا مذاق ہی رہے گا۔ پر انہیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی۔ کہیں میری بات کا برا ہی نہ مان لیا ہو۔ توبہ میں نے بات ہی کیوں کی۔"

"اونہوں" نواب بی بی نے کہا "برا ماننے والا نہیں وہ۔"

"کسی فکر میں پڑا تھا۔ جیوں پاس سے گزر گیا"۔ چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے"۔ نواب بی بی نے کہا "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج۔ لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے۔"

"ہائیں میں مر گئی" شاداں چلائی۔ "آپ اپنی شادی کیلئے لکھا ہے کیا، توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے"۔ چاچی بولی۔ "اللہ رکھے جوان لڑکا ہے آپ کماتا ہے۔ لکھ دیا تو کونسی قیامت آگئی۔"

"میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہئے اس بات میں۔"

"اونہوں انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامزد کر دو لیکن اُن کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی ہوس نہیں گئی۔"

"نہ بہن" چاچی بولی "مجھ سے تو آپ انہوں نے کئی بار کہا ہے۔ کہ چاچی جہاں لڑکا کہے گا۔ اس کی شادی کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا آجکل یہ کام لڑکے کی مرضی بغیر نہیں ہوتے۔ بات بھی سچی ہے۔"

"یہ بات ہے"۔ نواب بی بی بولی "تو اب کیوں سر پیٹ کر باہر نکل گیا ہے۔ لڑکے نے اپنی بیوی تلاش کر لی ہے تو ——"

"اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے"؟ شاداں چلائی

"سچ؟" بھابی ران پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہاں بھابی" نواب بی بی بولی "پہلے تو اُسے اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پٹی پڑھاتے رہے اور اب اُس نے اپنی بیوی کا چناؤ کر لیا ہے تو میاں گرم ہو رہے ہیں"

"کون ہے وہ"؟ چاچی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ اسکول میں اُستانی ہے۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اس کی۔"

"ہم بھی تو دیکھیں"۔ شاداں نے منت کی۔

نواب بی بی اُٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی۔

"ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم" شاداں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

"اے ہے" چاچی بولی "ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں۔"

"توبہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے" بھابی ہنسی

"کتنی خوبصورت ہے" شاداں بولی "احسان علی کو ایسی خوب صورت بہو کہاں سے مل سکتی تھی۔"

عین اُس وقت احسان علی آگئے شاداں کی بات سُن کر وہ گھبرا گئے۔ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے پھر کمرے سے باہر جانے لگے۔ لیکن شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں "مبارک ہو چچا" وہ بولی "نئی بہو مبارک ہو۔ محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اللہ رکھے

لڑکے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔"

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا منہ فق ہو گیا لیکن جلد ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولے "وہ تو بیوقوف ہے بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں بیاہنے کیلئے نہیں۔ بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا؟"

"کیوں اس کو کیا ہے"۔ شاداں بولی "دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے"۔

"یہی تو مصیبت ہے" وہ سر کھجلاتے ہوئے بولے۔

"آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو احسان علی۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا۔" بھابی بولی۔

"پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں نا بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو۔ یہ دیکھ لو۔ یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے"۔ وہ جوش میں بولے "دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے۔

"کیوں نواب بی بی کو کیا ہے" چاچی ہنسی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چولھے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی؟"

آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت لڑکی ہو اس میں حرج ہی کیا ہے۔" شاداں مسکرائی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے لیکن چاچی یہ تیتریاں تو یارانہ لگانے کیلئے ہوتی ہیں۔ بیاہنے کیلئے نہیں"۔

"ہائیں" شاداں نے ناک پر انگلی رکھ لی" احسان علی تم نے تو حد کر دی"۔

"کوئی محلے کی بیاہ لیتا پھر چاہے جہاں مرضی ہوتی یارانے لگاتا پھرتا"۔ احسان علی اپنی ہی دھن میں کہے گئے۔

"توبہ میری، احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے"۔ چاچی بولی۔

"لو اسے دیکھو نا ذرا" احسان علی نے پھر تصویر اُن کے سامنے رکھ دی۔ "یہ آنکھیں!! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا"۔

"اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا۔ بھلی اچھی تو ہے"۔ شاداں مسکرائی۔

"مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہو نا"۔ احسان علی ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگے۔

"اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو"۔ چاچی ہنسی

"بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائے گا۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں آخر مجھے بھی تو اسی گھر میں رہنا ہے"، وہ مسکرائے۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی بولی" ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا"۔

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اُسی طرح گم سُم ہو گئے۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔ دفعتاً وہ اُٹھ بیٹھے "حمید کی ماں مجھے آپ جا کر اس سے ملنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھ دے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں"۔

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ چٹکلے سنائے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو پیش کرنے کیلئے آپ بیتیاں بیان کیں لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ تو وہ دلیلوں پر اتر آئے۔ لیکن اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اسے دھمکانا شروع کر دیا۔ جلد ہی دھمکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس پر حمید بولا" ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں"۔ اس وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

دفعتاً وہ پھر جلال میں آ گئے بولے "اچھا بیشک بیاہ لاؤ اُسے لیکن وہ ہمارے یہاں کبھی نہ آئے گی کبھی نہیں۔ ہم اس سے کبھی نہ ملیں گے"۔ اس پر حمید اُٹھ بیٹھا بولا "آپ کی مرضی"۔ "لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مصر کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا "میں مجبور ہوں ابا جی" حمید نے کہا "ہماری شادی ہو چکی ہے"۔ "ہو چکی ہے؟" وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے "ہو چکی ہے؟۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" "یہ حقیقت ہے"۔ حمید نے سنجیدگی سے کہا" اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے"۔

"ایک ہفتہ؟" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا" یہ بات ہے تو پھر جھگڑا ہی گیا" وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن اُن کی ہنسی بیحد کھسیانی تھی۔ حمید اٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا" ایں!

احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا "تم تو کہتے تھے۔ یہ کمرہ پڑوسیوں سے متعلق ہے۔" "اور کیا کہتا آپا جی" حمید مسکرایا اور پھر باآواز بلند بولا "نسرین۔ آجاؤ آپا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" "اوہ!" احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی "تو یہ بات ہے۔"

نسرین بڑے پُروقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی "سلام عرض کرتی ہوں۔" سریلی آواز کمرے میں گونجی دو ایک ساعت کیلئے وُہ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے پھر دفعتاً انہیں احساس ہؤا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہیئے "بیٹھئے۔ تشریف رکھیئے۔ تشریف رکھیئے" وُہ گھبرا کر بولے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وُہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا۔ فضول۔ "ہاں بھئی" وُہ حمید سے مخاطب ہوئے "تم انہیں محلے میں لاؤ نا۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے" "سچ!" حمید بولا "کیا واقعی آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آئیں؟" "اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں۔ تمہیں چھٹی لینی چاہیئے۔ ہاں۔" "چھٹی تو میں نے پہلے ہی سے لے رکھی ہے" حمید مسکرایا۔ "تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا حماقت ہے" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی "کل ہی پہنچ جاؤ وہاں۔ اچھا میں اب جاتا ہوں۔ نسرین کو ساتھ لانا۔ سمجھے؟"

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وُہ سب چوگان میں تھیں۔ نسرین نے کالا ریشمیں برقعہ اتارا۔ ایک ساعت کے لئے وُہ جھجک گئیں —— رسمی سلام ہوئے۔ دعائیں دی گئیں۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے۔ جب دلہن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی۔ ایک بولی "اے بہن دلہن کا ہمارے ساتھ کیا میل"۔ شاداں بولی "کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے" تیسری نے کہا۔ "منہ پر اللہ مارا پوڈر دو دو انگل چڑھا ہؤا ہے۔" چوتھی نے کہا۔ "ویسے تو چودھویں کا چاند ہے۔ احسان علی کا گھر تو منور ہو گیا۔" "ہاں بہن" شاداں نے آہ بھر کر کہا۔ "اُسے محلے والیاں پسند نہ تھیں۔" شاداں نے سر اٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے۔ بھابی بولی "سُنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے۔" "لاحول ولا قوۃ۔" احسان علی کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں بولی "لو چاچی آج تو چچا کے مُنہ سے بھی لاحول سن لیا۔ احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہؤا تو لگے سرکنے وہاں سے۔ شاداں نے بڑھ کر ہاتھ سے پکڑ لیا بولی "اب کہاں جاتے ہو میں تو گن گن کے بدلے لوں گی۔ چاچی ہنسی، بولی "کیسی مبارک دلہن آئی ہے کہ احسان علی کے منہ سے عربی کے لفظ نکلے۔" "پر چاچی" شاداں چلائی "ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے انہیں" "اے ہے شاداں" بھابی بولی "کیا کہہ رہی ہے تو؟" "ٹھیک تو کہہ رہی ہوں"۔ شاداں چمکی "اس روز میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ وُند نہیں ہوتا۔" "اب تو اُسے جانے بھی دے گی یا نہیں" چاچی چڑ کر کہنے لگی "گھر بہو آئی ہے اور تو نے اُسے یہاں پکڑ رکھا ہے۔"

اسی شام کو جب وہ نہا دھو کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسب معمول ازراہ مذاق چچا سے کہا "خیر سے دلہن گھر میں آئی ہے تمہیں تو شکرانہ کے نفل ادا کرنے چاہئیں احسان علی"۔ جب کبھی شاداں انہیں مذاق سے نفل یا نماز ادا کرنے کو کہا کرتی تو احسان علی جواب میں کوئی نا کوئی فقرہ چست کر دیا کرتے لیکن اس روز وُہ بولے "سچ —— اچھا شاداں تو بھی کیا کہے گی کہ چچا نے کبھی میری بات نہیں مانی۔ آج تو تیری بات پوری ہی کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وُہ حمام کے پاس جا بیٹھے۔ اور وضو کرنے لگے۔ پہلے تو سمجھتی رہی کہ مذاق کر رہے ہیں لیکن جب وُہ جائے نماز پر کھڑے ہو گئے تو شاداں حیران رہ گئی۔

اگلے روز تمام محلے میں بات مشہور ہو چکی تھی۔ کہ احسان علی نے نفل پڑھے۔

"سچ"۔ چچی بولی۔

"کیا واقعی" بھابی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ سنبھال لیا ——

"نہیں نہیں میں نہیں مانتی"۔

"تمہاری قسم"، شاداں نے ہاتھ چلا کر کہا۔

"مبارک قدم ہے دلہن کا" چاچی بولی "کہ احسان علی مصلے پر کھڑے ہوئے۔"

محلے کی ڈیوڑھی تک بات پہنچی تو اس پر بحث ہونے لگی۔

"اجی ہر بات کے لئے وقت مقرر ہے"
"میں کہتا ہوں شکر کرو کہ اس نٹ کھٹ نے سجدہ کیا۔"
"آخر کب تک نہ کرتا سجدہ"

احسان علی کو آتے دیکھ کر ایک بولا۔ "آخر آ گئے نا راہ راست پر"
"ہاں بھئی اب تو چھپ چھپ کے نفل پڑھے جاتے ہیں۔"
"احسان علی تو کہا کرتا تھا۔ جب غلاظت کا احساس ہو تو ——"
"آ گئے نا عورتوں کی باتوں میں" احسان علی نے ہنسنے کی کوشش کی۔
"کون ہے بابا جی جو عورت کی بات میں نہیں آتا۔ سب مجھ سے ہیں۔"
"لیکن اس میں بُرا کیا ہے" بابا جی نے کہا "ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا۔"

دو دن تو احسان علی کے گھر میں ہنگامہ رہا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ محلے کے کمین میراثی ڈوم اور بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آموجود ہوئے پھر تیسرے دن جب انہیں فراغت ہوئی تو نواب بی بی نے کہا "اب کیا دلہن کیلئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کرو گے۔ اور محلے والے انہیں تو دلیمہ کی دعوت دینی ہو گی۔"

پہلے تو احسان علی شہر جا کر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے پھر جب انہوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کے ساتھ حمید جانے کو تیار ہو گیا ہے تو وہ گھبرا گئے "بولے حمید کا جانا ٹھیک نہیں۔ دولہا کو دلہن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں۔" "تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا؟" نواب بی بی نے چڑ کر پوچھا "تو میں ہی چلا جاتا ہوں"۔ وہ بولے۔ اس بات پر حمید کہنے لگا "میرے جانے میں کیا حرج ہے ابا جی۔ آپ جو گھر ہیں۔ نسرین اکیلی تو نہ رہے گی۔" احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا "آپ جا کر نہ جانے کیا کیا اُٹھا لائیں گے۔" "اوہ یہ بات ہے۔" احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تو دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" اس بات پر نواب بی بی چلائی "ائے ہے نئی دولہن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں۔ لوگ کیا کہیں گے۔" احسان علی خاموش ہو گئے۔ اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لے کر دو روز کیلئے شہر چلا گیا۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے۔ چوگان میں بیٹھی عورتوں کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ پھر ڈیوڑھی میں جا بیٹھے۔ لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دُلہن اور ان کے نفلوں کی بات چھڑ گئی۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے۔ بچوں نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا اور لگے شور مچانے۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا۔ اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرین کے کمرے سے اس طرف کھلتی تھی۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آ کھڑے ہوئے چوگان میں شاداں نے انہیں پکڑ لیا اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز انہیں کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ بار بار اوپر کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انہیں ملی۔ بولی "رات کیلئے کیا بنواؤں"۔ "جو تم چاہو"۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ نسرین انہیں کی چارپائی پر بیٹھ گئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ "اوہ ——" اُن کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا نسرین چونک پڑی "کیا چاہیئے آپ کو" "میں تو بھول ہی گیا"۔ وہ اپنی ہی دھن میں بولے "کیا"۔ نسرین نے پوچھا۔ "کچھ نہیں کچھ نہیں"۔ وہ بڑبڑائے "میرا مطلب ہے"۔ انہیں خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُن کا مطلب کیا ہے اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں۔ اُن کی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جا پڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو "میرا مطلب ہے" وہ بولے "مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے"۔ انہیں وضو کرتے دیکھ کر نسرین نے جائے نماز بچھا دی۔ اور آپ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آ کھڑے ہوئے ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ مڑ کر دیکھا۔ نسرین بیٹھی کچھ بُن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے "میرا مطلب ہے۔ یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی تو مسجد ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرین کچھ کہے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد انہیں پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چوگان سے نکل گئے۔ کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے۔ ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں انہیں ہوش آیا۔ سوچنے لگے۔ پھر نہ جانے وہ مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر محلے والے اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک بولا "اُس کو بھولا نہ جانئے جو صبح گیا گھر واپس آوے شام"۔ دوسرا کہنے لگا۔ "آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے"۔ یہ سُن کر معاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا

چاہتے ہوں۔ مین اس وقت باباجی آ گئے۔ احسان علی کو پکڑ لیا "اگر واپس نہیں جایا کرتے احسان علی"۔ وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے۔ اس بات پر انہیں اطمینان سا ہو گیا بولے "یہ دیکھو میں تو نہیں آیا لایا جا رہا ہوں"۔ "چلو یونہی سہی" باباجی نے کہا تیسرا بولا "آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے۔ نئی بہو کے وم قدم کو دعا دو بھئی" چوتھے نے کہا۔ "ورنہ کہاں احسان علی کہاں مسجد" اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر جما دیا۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن بار بار نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سُرخ چپلی اُن کی آنکھوں تلے ناچتی۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ اُف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے کیسی واہیات بو تھی۔ "ہاں وہ میری کتاب" وہ آپ ہی آپ گنگنائے "کتاب؟" نسرین کی آواز کمرے میں گونجی "میں دیتی ہوں آپ کی کتاب"۔ "نہیں نہیں" وہ چلائے "میں خود لے لوں گا۔" وہ اُٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی۔ لاحول ولاقوۃ بے اختیار ان کے مُنہ سے نکل گیا۔ دُور ہی رُک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں۔ "وہ نیلی وہ بائیں طرف، والی" وہ چلائے —— "وہاں رکھ دو"۔ انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا —— "وہاں"۔

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا۔ لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں —— دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی۔ کیا واہیات طریقے سے بیٹھی ہے انہوں نے سوچا کیا نمائشی انداز ہیں۔ اوہ وہ پھر چونکے "کیا بھتے نائی کی ماں نہیں آئی" وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے "کوئی کام ہے کیا؟" نسرین نے پوچھا۔ "نہیں نہیں" وہ گھبرا گئے "ویسے وہ سونے کو تو آئے گی نا لیاں" "اس کی کیا ضرورت ہے" نسرین بولی "میں جو ہوں"۔ "اوہ" وہ از سرِ نو گھبرا گئے۔

"میں جو ہوں ہیں جو ہوں" دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں —— "اوہ گیارہ بج گئے"۔ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں"۔ نسرین نے جواب دیا۔ "وقت ہی نہیں گزرتا۔"

"وقت ہی نہیں گزرتا وقت ہی نہیں گزرتا" گھڑی کراہنے لگی۔

وہ اٹھ بیٹھے اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔

رات کو وہ گھبرا کر اُٹھے۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ "جینی جینی" کسی نے تمسخر سے انکے کان میں کہا۔ سرہانے پر کالے بالوں کا ڈھیر لگا تھا۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں پڑی تھیں جن پر روغن چمک رہا تھا۔ "فضول" انہوں نے منہ بنایا۔ اٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے۔ صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں —— بال گوری نے بکھیر کالے۔ نہ جانے کیوں انہوں نے محسوس کیا جیسے اُن کی زندگی کی تمام ترنگینی ختم ہو چکی تھی۔

اندر آ کر وہ سوچنے لگے "ہوں تو دو بجے ہیں"۔ "وقت گزرتا ہی نہیں۔ وقت گزرتا ہی نہیں" گھڑی چلّانے لگی۔

جائے نماز کو دیکھکر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا۔ حمیدہ نے کس قدر فحش غلطی کی ہے بیوقوف۔ انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا۔ اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت انہیں نماز گویا یاد ہی نہ تھی میرے اللہ میرے اللہ دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں۔ رکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے۔

مین اس وقت شاداں چاچی کیساتھ کوٹھے سے نیچے اُتری۔ "چپ" شاداں زیر لب بولی "وہ سو رہے ہوں گے۔ آج تو چچا احسان سے وہ مذاق کر کے رہوں گی۔ کہ یاد کرینگے"۔ چاچی ہنس پڑی بولی "تجھے بھی تو ہر سمے شرارتیں ہی سوجھتی ہیں"۔ "اور وہ کیا لحاظ کرتے ہیں میرا" شاداں نے کہا۔

"ہائیں" انہیں سجدے میں پڑے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا "میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کیجا رہی ہے"۔ "نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے"۔

"سچ" چاچی نے ہونٹ پر اُنگلی رکھ لی۔ "اور یہ دیکھو دلہن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو"۔

احسان علی چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ انکے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ "ہائے میرے اللہ" شاداں نے پھر اپنے آپکو سنبھالا۔ احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً مُنہ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرہ پر جھریاں چھا گئیں جیسے یکلخت وہ بوڑھے ہو گئے ہوں۔ "احسان علی" —— شاداں نے چیخ سی ماری۔

احسان علی نے منہ پھیر لیا۔ ایک ہچکی نکل گئی۔ اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا گویا چینی کا نازک سا کھلونا ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو گیا ہو۔

ہاجرہ مسرور

ایک بچی

اس دن شام ہی سے پھوار پڑ رہی تھی اور بس مجھے خواہ مخواہ ہی تو اُلجھن ہو رہی تھی۔ ادھر چند سال سے اکثر یہی حالت رہتی گھٹی گھٹی، دبی دبی بیزاری اور اُلجھن سی —— اس پر شام ہی سے وہ ہلکی ہلکی پھوار —— مجھے ہلکی ہلکی ادبی دبی کیفیتوں سے جانے کیوں نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جھما جھم بارش ہو تو سارا پانی مکانوں کی چھتوں سے ندی نالے کی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ ہلکی ہلکی پھوار تو ایسے غضب کی ہوتی ہے۔ کہ تگڑے تگڑے مکان بھی ڈھ جاتے ہیں اس سے —— لاکھ کوشش کرنے کے باوجود میں اُلجھتی ہی چلی جا رہی تھی —— جتنی لمبی عمر ہو اتنی ہی لمبی اُلجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے لگو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ میں بھی تو پنتیس سال کے لگ بھگ ہو رہی تھی —— ہے رے!

میرے سرہانے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے سرد اور یخ ہوا خاموشی سے داخل ہو رہی تھی۔ اس پر بھی دماغ میں گویا انگیٹھی سی دہک رہی تھی ——

رات کا ابتدائی حصہ تھا لیکن میری گلی میں انسان تو انسان کتے تک گم سُم ہو چکے تھے اور مجھے اس وقت یہ سکوت ہمیشہ سے زیادہ کھل رہا تھا۔ اس گلی کے مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا کہ میں بھی وہی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اُس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا۔

لمبے چوڑے کمرے میں برابر برابر سلیقے سے بچھے ہوئے پلنگوں پر میری ماں اور پانچوں بہنیں لحافوں میں گھسی گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی تھیں۔ چُپ چاپ، لحافوں تلے ڈھیر، جیسے میری طرح ان سب کو بھی کوئی اُلجھن گھیرے ہوئے ہو۔ —————— ایک کمرے میں برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ —— جیسے ہم سب قیدی ہوں، جنرل وارڈ کے مریض یا کسی یتیم خانے کے یتیم ——

"بھئی اللہ —— بھئی اللہ ——" میرے سر میں دھمک سی ہونے لگی اور جیسے میرے اندر ہی اندر کوئی اُلجھ کر جھٹکنے لگا۔ بھئی اللہ! سب سو گئے، سب لحافوں تلے دفن ہو گئے —— کوئی بھی نہیں بولتا۔ کیا سب کے سب حلق تک کھانا ٹھونس کر لیٹے ہیں جو ہوں ہاں تک کرنے کی سکت نہیں رہی —— کھائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے یہ لوگ، گویا میری کمائی ہے بھی تو حرام کی۔ دن بھر ڈیڑھ سو روپے کے لئے میں اپنا بھیجا کوڑھ مغز لڑکیوں سے پچی کروں اور یہ سب اُونھیں مرے سے حلق تک بھر کے —— اور وہ چچا جان بھی تو نہیں آئے ابھی تک باہر سے؛ یہ بھی تو کچھ کم خود غرض نہیں ہیں۔ بیچارے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کے بعد ان کی بیوی اور بچوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ باتوں کے چکنے اور کاموں کے خوار۔ آئیں گے گیارہ بجے باہر سے۔ کون اُٹھ کر دروازہ کھولے گا۔ بڑے آئے چچا جان بنکر یقیناً ہماری برائے نام جائیداد کے حساب کتاب میں بھی گڑبڑ کرتے ہوں گے۔ جبھی تو راتوں کو باہر رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں جانے کہاں چھچھوندروں کی طرح چھچھلاتے پھرتے ہیں۔ چچی جان کو مرے ہوئے تیس سال ہو گئے۔ جبھی سے یہ رنڈوے ہیں۔ کہتے ہیں انہیں مرحومہ سے عشق ہے۔ ہاں بھئی ہو گا "مرحومہ" سے عشق۔ ورنہ روایت ہے کہ چچی جان زندگی بھر ان کے عشق کی لگام اپنی طرف موڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر بھئی ہندوستانی مردہ پرست ہیں۔ مرحومہ سے عشق ہو جانا کچھ عجب بھی نہیں جبھی تو اس سوگ میں راتوں کو باہر رہتے ہیں —— میں بھی مر جاؤں گی تو سب مجھے چاہنے لگیں گے۔ کیا لڑکی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کی اور باپ کے بعد گھر سنبھال لیا —— بھئی اللہ! اس زندگی سے تو بہتر ہے کہ مر جاؤں جلدی —— مگر ابھی تو اُٹھ کر دروازہ کھولنا ہے —— اللہ کرے مر جائیں چچا جان۔

اور میری اُلجھن بڑھتی ہی گئی۔ روزانہ کی یکرنگی اور بے کیفی کا احساس جیسے چُبھنے لگا —— یہی برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ اور میری جوان بہنیں اور بوڑھی ماں —— جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں۔ میز پر رکھے ہوئے لیمپ پر اپنا تکیہ کھینچ ماروں اور میز کے نیچے بیٹھی ہوئی پالتو بلّی کو اُٹھا کر کھڑکی سے نیچے گلی کے سرخ سرخ فرش پر دے ماروں تاکہ وہ اتنے زور سے چیختی ہوئی بھاگے کہ دور تک گلی کا سناٹا درہم برہم ہو جائے —— میری بہنیں مجھے دیوانہ سمجھ کر چیخیں مارنے لگیں اور میری اماں، اپنی بیٹا صفت بیٹی کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اپنا سینہ کوٹ لیں۔

مگر میں نے سوچا کہ یہ تو ایک بالکل فضول سی حرکت ہوگی کیونکہ اس کے بعد پھر یہی گھر ہو گا اور یہی سب کچھ —— بس ایک ذرا سا ہنگامہ آزادی کا مذاق جیسے الیکشن کے کرتب، جیسے نٹوں کا کھیل، جیسے ....

"بھئی اللہ —— "میرے اندر پھر کوئی پاؤں ٹپک کر ٹھنکا میں نے بیزار ہو کر کروٹ بدلی اور میرے سر کے نیچے صبح کا اخبار کھڑکھڑایا —— میں نے اسے اٹھا کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے بھی تھک گئی۔" پاکستان —— اکھنڈ ہندوستان —— زندہ باد برطانوی ہندوستان۔" میری اُلجھن نے ایک نئی راہ سُجھائی۔ جی میں آیا کہ بے تحاشا برطانوی ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاؤں تاکہ میرے پڑوس میں بسے ہُوئے مختلف سیاسی عقاید کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور مجھے بھر بھر گالیاں دینے لگیں۔ کتنی خوشی کی بات ہوگی ایک بار تو سب کے دل پر ایک سی چوٹ لگے۔ ایک ہی درد اُٹھے ایک مشترکہ جذبہ پیدا ہو؟ —— اور میں اپنا نعرہ بلند اور بلند کرتی جاؤں۔ سڑکوں پر گلیوں میں، شہروں شہروں —— یہاں تک کہ گاندھی جی کو اپنے اکھنڈ ہندوستان اور مسٹر جناح کو اپنے پاکستان کی ایک نمایاں اور ٹھوس شکل نظر آجائے۔ برطانوی ہندوستان زندہ باد! مگر میری توبہ! میں کر ہی کیا سکتی ہوں سوائے بستر میں لیٹ کر رات گئے تک اُلجھنے کے، میری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں ہوگا۔ خارج نہ داخلی۔ دن بھر لڑکیوں کو پڑھاؤ —— ہندوستانیوں کے متعصبانہ غمزے سہو۔ میری ہیڈ مسٹرس سیاست کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود خالص اکھنڈ ہندوستانی ہیں۔ مسلمان استانیوں کی خفیہ پاکستانی میٹنگوں میں شرکت کرو جن میں ہندوؤں کے کفر سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے اور وہ میٹنگیں جو پانی پلانے والی مہترانی تک کو دیکھ کر خندہ پیشانی سے منتشر کر دی جاتی ہیں۔ —— گھر آؤ تو ایک ایک کی سنو، ایک ایک کو سناؤ۔ رات کو پڑے پڑے بھول بھلیوں میں بھٹکو —— مہینے کی پہلی کو مٹھی بھر تنخواہ، لون مرچ اور آٹا دال کے حسابات کی نذر کرتے ہوئے گرم کوٹ کی تمنا اگلے مہینے پر ملتوی کرتے جاؤ —— لعنت ہے۔

گیارہ بارہ بجے چچا جان آئینگے اپنے پلنگ پہ اینڈ اینڈ کر ہماری سرپرستی کرنے کو تو اس لئے اُٹھ کر دروازہ کھولو۔ چچا جان بقول خود خدا سے ڈرتے ہیں اس لئے ہماری سرپرستی کے لئے حاضر ہوتے ہیں —— اور حکومت برطانیہ کو مہذب ملکوں کے طعنوں کا ڈر ہے اس لئے نیم وحشی ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتی کہ کہیں یہ ملک پتھر کے زمانے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ کانگریس اور مسلم لیگ الیکشن کے دانے پہ چونچیں لڑائے ہُوئے ہیں۔ میں اور میری بہنیں خواہ مخواہ ایک چُھند سے چھو کر سکے کے لئے سوچ سوچ کر مری جا رہی ہیں۔ وہ چُھند سا چھو کر اجسے محبت تک کرنا نہیں آتی اور جس کی منگنی میرے رشتے کے خان بہادر ماموں کی ادھیڑ عمر صاحبزادی سے ہو چکی ہے —— میں نے دل شکستہ ہو کر صوبہ بنگال کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ معلمہ کی جگہ کے لئے عرضی دے دی ہے اور میری بہن نے بجائے خودکشی کرنے کے ایک مقامی اسکول میں معلمہ بننا گوارا کر لیا ہے حالانکہ وہ ملازمت کو عورت کی توہین تصور کرتی ہے۔ عجیب مذاق ہے یہ دنیا —— اللہ کرے ساری دنیا میں ایسی بارش ہو جس میں ایٹم بموں کی جھڑیاں لگ جائیں —— مگر بھئی نہ جانے امریکہ اور برطانیہ کے دو گڈم نے ایٹم بم کے راز سے اللہ میاں کو واقف بھی ہونے دیا ہے؟

میرے سر کے اندر دھک دھک سی ہونے لگی۔ نہ جانے یہ دل اس قدر پاؤں چلا کیوں ہے، کبھی کہیں دھک دھک ہو رہی ہے کبھی کہیں —— میں نے اپنا سر اُٹھا کر تکیوں پر دے مارا۔

"پنہیاں بھرت بھرت میں ہاری، ہو موری بہیاں پرانی۔" گلی سے جیسے کوئی نشے میں لہکتا ہوا گزرا۔ مست اور بے پروا۔ اور مجھے بھی یُوں لگا جیسے میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں بیکار سینے پر پڑے پڑے —— پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پہ ہالہ بناتے بناتے —— چُولہے میں جائیں یہ بیہودہ خیالات

ہاں تو پھر اے اللہ میاں میری عرضی بنگال میں منظور کرا دو۔ بس وہاں پہنچ کر اپنی موجودہ ماتحتی کا ردِّ عمل خوب دل لگا کر کیا کروں گی۔ مچھلی اور چاول کو ملا کر معتدل بنائی ہوئی غذا کا استعمال کیا کروں گی اور فرصت کے اوقات میں صرف روحانیات پر کتابیں پڑھا کروں گی۔ اللہ کرے میری عرضی منظور ہو جائے۔

کھٹ کھٹ کھٹ —— دروازے کی زنجیر کھڑکھڑائی جانے لگی —— کُنجی ہولے ہولے کھڑکانا، ہو راجہ دِھیرے دھیرے آنا۔ میرے دل میں میرا مردود پھر تلملایا۔ مگر دروازہ تو چچا جان کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اللہ کرے کسی دن ہمارے ہاں ڈاکہ پڑے اور لمبے تڑنگے ڈاکو اس گھر کی سب عورتوں کو زبردستی اُٹھا کر لے جائیں۔

کھٹ کھٹ ——

نوجوانی کی نیند آگئی نیضو کو۔ اور کوئی بھی نہیں اُٹھتا۔ نہ اُٹھے۔ میں بھی نہیں اُٹھنے کی۔ چاہے سردی سے اکڑ کر دم نکل جائے ان کا میری جُوتی کی نوک سے —— اور گھومیں آدھی آدھی رات تک۔

کھٹ کھٹ ——

شرم نہیں آتی کنواری بھتیجیوں کا آدھا درجن رکھے ہوئے ارے کہاں بتائی اتنی رَین؟

فیضو کو شاید رحم آگیا۔

"جاگ رہی ہو زاہدہ —— ہاں ابھی رات بھی کتنی گئی ہے۔" چچا جان نے میرے پلنگ کے قریب آکر کہا۔

"ہُوں! ——" میں نے جواب دیا۔

"لو یہ مٹھائی۔" انہوں نے رومال کی پوٹلی میرے لحاف پر پھینک دی اور سب لحافوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ "بچیوں میں بانٹ دو۔" وہ اوورکوٹ اتارنے لگے۔

بستروں سے سر بلند ہُوئے، جیسے واقعی سب بچیاں ہی تو ہوں۔

"اِدھر لاؤ کیا ہے حضرت آپا جانی! ——" تقاضہ ہُوا تو مجھے غصہ آگیا اِس چھچھورے پن پر۔ میں نے پوٹلی اماں کے لحاف پر اُچھال دی۔

"کیا بخارات دماغ کو چڑھ گئے آپا جانی؟" ساجدہ نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔

"نہیں تو کوئی بات نہیں ——" میں نے اپنی تلخی کو دبا کر کہا۔ میں کبھی کبھی ان سب سے دبنے لگتی ہوں —— مٹھائی کے حصے بخرے ہونے لگے اور میں نے لحاف مُنہ پر ڈال لیا۔ میری اُلجھن اس چاؤں بھاؤں میں اور بھی بڑھ گئی —— اور میں نے طے کر لیا کہ بنگال ضرور جاؤں گی۔ بنگال کا جادو مجھ پر نہیں چل سکے گا۔ سُنا ہے۔ بنگال کے مرد تو اتنے بُزدل ہوتے ہیں۔ کہ اپنے ہاں کی مشہور اور مقبول پیداوار "بنگال کے جادو" پر بھی بڑی آسانی سے غیر بنگالیوں کا قبضہ گوارا کر لیتے ہیں۔ "ہونہہ! میری چوٹی تو بہت چھوٹی ہے۔ مجھے کیا ڈر ہے؟ بس اطمینان سے مچھلی بھات کھاؤں گی —— اور —— بنگال کا غذائی قحط تو ختم بھی ہو چکا۔

"ایک بچّی لوگی —— تم میں سے کوئی؟" چچا جان نے پوچھا۔ میں ایک دم بستر سے اُبل پڑی اور میری طرح میری سب بہنیں بھی۔ مگر اماں کو جیسے مٹھائی کھاتے کھاتے اونگھ سی آگئی۔

"دھی لوگی دھی" گوری سی گھوسن مجھ سے ہر روز پُوچھ جاتی ہے۔

جی! —— جی! ہم سب نے کورس میں کہا۔

"کسی کال کے مارے بنگالی کی اولاد؟" اماں نے پوری طرح بُرا مانتے ہُوئے سوال کیا۔

"ارے نہیں بھابی، ان کنگلوں کی اولاد لے کر کیا کرنا ہے ——" چچا جان کی عزّت پر جیسے حرف آگیا۔

"واہ آپ قحط کی وجہ سے ہی بنگالیوں کو نیچ سمجھتے ہیں جو سرمایہ داروں کا لایا ہُوا ہے۔" زہرا بالکل پنڈت نہرو کے انداز میں گرجی۔

"مگر جناب کال کے مارے لوگوں کی بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر اُن کے لال چھین لینا بھی تو انسانیت کی توہین ہے۔" ناظمہ جیسے گدھوں جیسی سنجیدگی کے ساتھ ہائی اسکول کی طالبہ ہونے کا فخر ہے۔ بھن بھنائی۔

"اور بھوک کے ماں باپ کی گود میں ایک بوند دودھ کے لئے دم توڑتے ہوئے بچے دیکھتے رہنا عین انسانیت ہے۔" ساجدہ بے تکے پن سے ہنستے ہُوئے چلائی۔ بیچاری کو اپنے پھیلے ہُوئے دہانے کی ہنسی بہت عزیز ہے۔

سب کے سب زور سے ہنس پڑیں جیسے لطیفہ ہی تو ہو گیا ہو۔

"لاحول ولا ——!" چچا جان کی بیٹھی ہوئی آواز نے سب کو خاموش کر دیا۔ "تم لوگ تو ہر موقعے پر اپنا اپنا تصنیف کردہ فلسفہ جھاڑنے لگتی ہو۔"

ساجدہ ہنسنے لگی۔ ناظمہ نے گھٹنے ٹکا کر چھُونا مناسب سمجھا اور ناظمہ کو اپنے بکھرے ہُوئے بالوں میں گرہ دینا یاد آگیا۔ باقیوں نے محض مسکرانے پر اکتفا کی —— اور میں سوچنے لگی۔ کہ "ایک بچہ —— ایک بچہ مجھے مل جائے تو ——" میری نسائیت کی گود میں مامتا ہمکنے لگی۔ "ارے! میں جھینپ سی گئی ——" دھت —— خان بہادر کا داماد بن کر مست ہے چُغد کہیں کا۔ میں تجھ سے کہیں بلند ہوں، میں غیر کی اولاد کو بھی اپنا سکتی ہوں ——" کھسیانی بلّی کھمبے پر جھپٹی۔

باہر بارش کی ہلکی ہلکی پھواریں ننّھی ننّھی بوندیوں میں تبدیل ہو گئیں اور سائبان پر جیسے کوئی گیت گنگنانے لگا۔

"وہ بچی شریف کی اولاد ہے سمجھیں تم لوگ!" چچا جان نے زوردار سفارش کی

"تمہاری ہی شرافت کا تو نتیجہ نہیں ہے میاں۔" اماں نے ہنس کر چھیڑا اور بھتیجیاں کھلکھلا اُٹھیں۔ میرے دل میں جیسے سمندر کے کھاری پانی کی ایک لہر سر اُٹھا کر لپکی کہ کہیں سچ مچ وہ چچا جان کی ریاضت کا پھل تو نہیں؟

"خدا کی قسم آپ تو مذاق کرتی ہیں بھابی جان! وہ اپنا سفید بالوں سے ڈھکا ہُوا سر جھکا کر شرمائے۔ اور مجھے اس قدر بے تکے لگے۔ کہ میں بھی شرما گئی" ناظمہ نے پوچھا۔

"کس کی بچی ہے وہ۔ کیوں چچا جان! ——"

"ایک غریب آدمی کی، اس کی بیوی کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے اس نے —— دودھ پیتی بچی چھ مہینے کی ہے

نہیں اس بچی کا ــــ باپ بیچارا بنئے کا ملازم ہے، کہاں بچی کو سنبھالتا پھرے۔
بڑی لڑکی پانچ برس کی ہے اور لڑکا تین برس کا۔"

"لڑکا مل جائے مجھے ــــ" اماں کی حسرت زبان پر آگئی۔ حد ہے آدھی درجن لڑکیاں اور لڑکا ایک بھی نہیں۔

"لڑکا تو نہیں دے گا وہ ــــ اس کی نسل چلے گی اس سے۔" انہوں نے کاروباری انداز میں ٹکا سا جواب دے دیا۔ اور میں سوچنے لگی کہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے ہمارے لیڈر اس معمے کا حل کیوں نہیں کرتے کہ نسل لڑکی چلاتی ہے یا لڑکا؟ کیونکہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کا بنیادی تعلق براہ راست اسی معمے سے ہے۔

"تو پھر لڑکی لے کر کیا کرنی ہے اور پھر دودھ پیتی بچی ــــ؟" اماں کی دلچسپی ختم سی ہو گئی۔

"بڑی لڑکی بھی ملے گی اس کے ساتھ؟" ناظمہ نے بقول خود "غوریاتے" (غور کرتے ہوئے) ہوئے سوال کیا۔

"نہیں پلی پلائی بچی نہیں دے گا وہ، چار دن بعد اسے گھر میں پیسے پکنے کھانے کی امید ہوگی۔" انہوں نے جواب دیا۔

تو پھر کیا فائدہ، جب تک بچی کے ساتھ بڑی لڑکی نہ ملے، جو کم از کم بچی کا گو موت تو کرہی لے گی۔ چند دن بعد اور کچھ نہیں تو گود میں ٹانگے ٹانگے پھرے گی اسے۔ چھوڑئیے کون برسوں کی مصیبت مول لے۔" ناظمہ نے لیٹ کر رضائی گردن تک اوڑھ لی۔

"میں لوں گی۔" ناظمہ کے مقابلے میں اپنی آواز مجھے کتنی بھلی لگی اور ناظمہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو۔ کہ وہی زاہدہ ذرا سی بچی پالنے کو تیار ہے۔ جس نے کبھی اپنی چھوٹی بہنوں کو گود میں اُٹھانے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔

"میں بھی لے سکتی ہوں۔ کیا قیمت ہو گی؟" ناظمہ پر ضد سوار ہوئی۔

"تھو ہے، انسان کی قیمت ادا کریں گی امیرزادی!" میں نے جل کر کہا۔

"چپ رہو ناظمہ! آپا جان کے نزدیک انسان کی کوئی قیمت نہیں" ــــ

ــــ ساجدہ نے اپنے مخصوص بے تکے پن میں ہنستے ہوئے کہا۔ اور میرے جی میں آئی کہ اُٹھ کر دو دو تھپڑ لگاؤں ان لڑکیوں کے ــــ چھوٹی ہو کر!

میری ساری آزاد خیالی اور ترقی پسندی بے جان سی ہونے لگی۔

"اس بچی کو پال لو، بس یہی قیمت مقرر کی ہے اس کے باپ نے!" ــــ چچا جان نے دلّال کا حق ادا کیا۔

"اے اللہ ہمارا ملک! اللہ کرے یہاں بھی اشتراکی نظام قائم ہو جائے جلدی سے ــــ" فاطمہ کی آواز بھرا گئی۔ "بیچارے بچے اور ان کے والدین ــــ"

اسے اشتراکیت پر عبور رکھنے کا دعویٰ ہر وقت اُکسایا کرتا تھا۔

"اور تمہارا سر ــــ" زہرا کی قنوطیت گویا ہوئی۔ "ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس پڑی پڑی سوکھو اور اپنے اندر ایک کمیونسٹ کو موٹا کئے جاؤ۔"

"آپ کل صبح بچی کو مجھے دکھا دیجئے۔ میں اس کی پرورش کروں گی۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا ــــ میں نے سوچ لیا تھا کہ بنگال جا رہی ہوں پینتیس کے لگ بھگ ہوں شادی کرنا نہیں یا یوں کہو کہ شادی کرے گا ہی کون اس بڑھیا سے۔ یہ بچی مل جائے تو مستقل کنوارے رہنے کی شاندار وجہ پیش کر دیا کروں گی ــــ اور پھر میرے لئے بھی زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہو جائے گا ــــ

باہر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا کرو گی بچی لے کر، تمہارے لئے اتنی بہت سی بہنیں کیا کم ہیں پالنے کے لئے۔" اماں نے میری دوڑتی ہوئی گاڑی کے آگے ایک پتھر لڑھکا دیا۔

"جی! مجھے رونا سا آگیا۔ "میری بہنیں ــــ میں انہیں پالتی رہوں، چاہے یہ سب مجھے جوتی کی نوک پر بھی نہ رکھیں۔ میں کسی سے کوئی گلہ نہیں کرتی۔ مگر یہ ضرور چاہتی ہوں کہ کوئی میرا بھی ہو ــــ میرا اپنا۔ مجھے اس پر بالکل اختیار ہو۔ میں چاہتی ہوں ــــ میں چاہتی ہوں۔" میری آواز بھرانے لگی۔ آنکھیں جل اُٹھیں اور کنپٹیاں دل کی طرح دھڑکنے لگیں۔

"ملکیت کا جنون انسانیت کو تباہی کے غار میں دھکیل کر رہے گا۔" فاطمہ جوش کے ساتھ بولی۔ "آپ بچی کو اس لئے پالیں گی کہ اس پر آپ کو پورا اختیار ہو ــــ مارکس کہتا ہے ــــ"

"چپ رہو مارکس کی نانی ــــ" زہرا بڑبڑائی۔ "آپا جان ہمیں پڑھا دیتی ہیں اسی لئے اب ہمیں ذلیل سمجھنے لگی ہیں۔ ہماری بدنصیبی اس سے پہلے کہ ہم کسی لائق ہوتے ابا مر گئے۔ خیر اطمینان رکھئے ہم اپنا بوجھ نہیں رہنے دیں گے آپ پر ــــ"

"اپنی چونچ بند کیجئے مستقبل کی اُستانی جی۔" ناظمہ اُبھری زہرا پر۔

"بھئی اللہ! میرا جی چاہا اپنا سر پھوڑ لوں ــــ میری حالت کا کسی کو

اندازہ نہیں۔ مجھ سے کسی کو ہمدردی نہیں۔ میں کسی سے بھی اپنا دُکھ درد نہیں کہہ سکتی اور اگر کہوں تو سب مجھے نکو بنا لیتے ہیں ——— یہ ہے میری وقعت ———"

میں پوری یکسوئی سے رونا چاہتی تھی۔

"بچ بچ ———" ناظمہ نے کروٹ بدل لی۔ میرا جی چاہا اسی وقت خودکشی کر لوں ———

"تو پھر وہ بچی!" ناظمہ نے اصل موضوع کو پکڑا۔ "آپ کل ضرور اسے دیکھ لیجئے آپا جان۔"

"ہاں کل اسے لے آؤں گا۔ بڑا ثواب ہوگا اسے پال کر، دستوں کی بیماری میں مبتلا ہے، علاج ہو گیا تو ٹھیک ہو جائے گی ———" چچا جان بولے۔

"عذاب ہو جائے گی نگوڑی ——— جو بھی لے اپنی ذمہ داری پر لے۔ مجھ سے اب بچوں کی چھیچھا لیدر نہ ہوگی۔ صاف بات ہے۔" اماں نے پھر ایک پہاڑ لڑھکانے کی کوشش کی۔ "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اسے نہیں پال سکے گا، بڑے دل گردے کا کام ہے بچے پالنا۔ ابھی تم لوگوں کو شعور ہی کہاں ہے۔"

"اماں جان! آپ کے ہاں آپا جان کوئی چودہ سال کی عمر میں پیدا ہوئی تھیں نا؟" ناظمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ زہر چھڑکتی۔ اماں تپ کر چپ ہو گئیں۔

"اگر وہ خوبصورت ہو تو آپ ضرور لے لیجئے۔" ساجدہ ہنستے ہوئے بولی ——— "گھر بھلا لگے گا بچے سے۔"

"اس کے باپ سے پکے اسٹامپ پر لکھوا لیجئے گا۔ کہ اس نے ہمیشہ کے لئے دے دی۔ اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا ———" ناظمہ بولی۔

"اچھا اچھا آ تو جانے دو۔ لڑکی ذات ہے چار دن میں بڑھ کر اس لائق ہو جائیگی کہ گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی۔ آپا جان کے پاؤں دبا دیا کرے گی" ——— زہرا بولی۔

"ہاں بڑھاپے میں کچھ تو سہارا ہوگا اُن کا۔" ناظمہ نے کہا۔

"لعنت ہے سب پر۔ ایک معصوم بچی کے لئے غلامی کا جال بُن رہی ہیں۔ اس سے تو مر جائے وہ ———" فاطمہ چلائی۔

"اپنی اپنی رائیں محفوظ رکھئے آپ لوگ ———" مجھے ایک دم تاؤ آ گیا "تمیز بھی ہے بات کرنے کی ——— چچا جان! صبح بچی کو ضرور لے آئیے۔" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اچھی بات ہے۔ اب سو جاؤ سب۔ رات کافی ہو گئی۔" چچا جان نے لحاف سے منہ ڈھک لیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر بارش کا شور بڑھ رہا تھا۔

"میاؤں ——— میاؤں ———" پالتو بلی میرے پلنگ کے نیچے گھوم گھوم کر گویا اظہار خیال کرنے لگی۔ میں نے اپنا جسم تکیوں پر گرا دیا ——— ٹھنڈک کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔

ایک ننھی سی بچی ہنستی کھیلتی، ہاتھ پاؤں مارتی میرے احساسات پر چھائے جا رہی تھی ——— زندگی کی تمام محرومیاں اور ناکامیاں جو کانٹوں کی طرح کھٹک رہی تھیں ذہن میں یوں دب گئیں جیسے تھیں ہی نہیں۔

میری ہنڈیا کھدبدنے لگی۔

میں اسے لے کر بنگال چلی جاؤں گی ——— ایک آیا رکھ لوں گی تاکہ وہ دن بھر اُسے اُٹھائے اسکول میں میرے سامنے رہے۔ اسکول سے واپس آکر بس بچی ہی کے کاموں میں لگ جایا کروں گی۔ اسے اچھی طرح نہلا دُھلا کر، خوبصورت سِلے ہوئے کپڑے پہناؤں گی، کنگھی کروں گی۔ اور پھر صفائی سے دودھ بنا کر اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔ میں خود بنگالی عورتوں کی طرح ایک ہلکی سی دھوتی میں اپنا پورا جسم لپیٹ کر، بال کھول کر ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر اسے جھولا جھلایا کروں گی ——— رات کو اپنے پہلو میں لٹا کر لوری دیا کروں گی۔ آ جا ری نندیا تو آجا ذرا بٹیا کو میری سُلا جا ذرا۔ وہ میرے سینے سے لگی آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسکراتی ہوئی سو جائے گی ——— زلف بنگال کی سی سیاہ راتوں میں جب میں کوئی خواب دیکھ کر چونکوں گی۔ تو میں تنہا نہیں ہونگی بلکہ وہ میرے سینے سے لگی ننھی ننھی سانسیں لے رہی ہوگی ——— آہ میرے اللہ!

اور پھر میری ننھی تھوڑے دنوں بعد بولنے لگے گی۔ میری باتیں سمجھنے لگے گی ——— میں ہنسوں گی تو وہ قہقہے لگائے گی۔ میں روؤں گی تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے گی۔ جب کبھی کچھ سوچ کر میں سو جایا کروں گی۔ تو وہ میرے چہرے کو اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبا کر اپنی فکر مند آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر، وجہ پوچھا کرے گی ——— پھر میں اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا کروں گی ——— میری ننھی! میری بچی! ——— کتاب اُٹھا لاؤ میں تمہیں پڑھاؤں گی اور میری ننھی نہایت ذہانت سے فر فر اپنا سبق پڑھ ڈالا کرے گی ——— اللہ! میری ننھی مجھے مل جائے ———"

میرا دل مارے خوشی کے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "سنو جی تم لوگ!" میں نے سر اٹھا کر مارے خوشی کے سب کو اپنا اونچا مکان دکھانا چاہا۔ "میں بچی کو صرف اس لئے لے رہی ہوں کہ اسے اپنی بچی سمجھوں، سمجھیں تم لوگ! خواہ وہ کالی کلوٹی ہو — خواہ اس کا نقشہ باورچی خانے میں بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں کی طرح ہو — میں ماں بن کر اِسے پالوں گی — میں اسے اپنے ساتھ بنگال لے جاؤں گی — میری زندگی اس کے لئے وقف ہے۔" میرے مکان کے کنگرے آسمان کو چھونے لگے۔ "ہوں — ہوں!" میری چھوٹی بہنیں اس طرح ہوں ہوں کرنے لگیں جیسے میں کہانی ہی تو کہہ رہی تھی۔

"تم لوگ کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں اتنی قربانی نہیں کر سکتی اس بچی کے لئے" مجھے غصہ آگیا۔

"ہیرا! — ہیرا!" ساجدہ نے تالیاں بجائیں۔

"بدتمیز کہیں کی — کمینی! —" میری زبان مارے تاؤ کے اینٹھ کر رہ گئی۔

"زاہدہ!" اماں نے پکارا

"کہیئے!" میں نے شمشیر بکف انداز میں جواب دیا۔

"بچی سے محبت کرو گی، اس کے لئے زندگی وقف کر دو گی تو دنیا کیا کہے گی؟" — اماں نے بزرگانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا کہے گی دنیا — میں پروا نہیں کرتی۔"

"یہی کہ تمہاری حرامی بچی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کا نام پہلے ہی بدنام ہے۔"

اڑڑادہم — میرا مکان ڈہنے لگا۔

ریل چھوٹ گئی۔ میں خالی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور کانوں میں انجن سنسنا رہا تھا۔

میں چپ ہو گئی۔ میں اسے اپنی بچی سمجھوں گی اور کہوں گی — لیکن کوئی اور کہہ دے گا تو — کوئی اور یہی سمجھے گا تو — میں تو ڈوب کر مر جاؤں گی۔ میرے کنوار پنے پر تو خواہ مخواہ کلنک لگ جائے گا۔ "ممکن ہے بنگال میں کوئی میرا چاہنے والا منتظر ہو، ممکن ہے — مگر یہ حرامی بچی کا ٹیکا دیکھ کر کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کرے؟" شادی کی دبائی ہوئی خواہش نے بھرپور وار کیا۔

"بھئی اللہ — بھئی اللہ —" میں پھر الجھنے لگی۔

باہر پھوار گر رہی تھی —

عزیز احمد

مدن سینا اور صدیاں

تب وی تال نے کہا:۔

——————— "مہاراج! اگلے زمانے میں ایک راجہ تھا جس کا نام ویرآبا ہوتھا۔ انگ پورہ اُس کی راجدھانی تھی۔ اور دُور دُور کے راجے اُس کو باج دیتے تھے۔ سات سمندر پار کے سوداگر چھوٹے چھوٹے جہازوں میں بیٹھ کر بھارت ورش میں آتے، اور اُس کی راجدھانی سے موتی، مسالے، ہیرے، اور نہ جانے کیا کیا خرید لے جاتے۔ بیوپار کی برکت سے انگ پورہ کے ویش بہت امیر ہونے لگے۔ اور انگ پورہ کے ویش سوداگروں کے مکان روپ اور صفائی میں دوسرے ملکوں کے راجوں کی ڈیوڑھیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ انہیں ویش امیر سوداگروں میں سے ایک کا نام ارتھادت تھا۔ اُس کے ایک بیٹا تھا انمول ہیرے جیسا، جس کا نام دھن دت تھا۔ ایک بیٹی تھی جو دوسری تمام لڑکیوں میں یوں دمکتی جیسے کنکروں میں سُچا موتی۔ اِس کا نام مدن سینا تھا۔

ارتھادت اپنے بیٹے دھن دت کو ساتھ لے کر سمندر کنارے کے کسی شہر کو چلا جاتا تھا جہاں افریقہ اور روم دیس کے سوداگر مال خریدنے آتے تھے۔ اُس کی بیٹی مدن سینا اپنی سکھیوں، سہیلیوں کے ساتھ باغ میں کھیلا کرتی۔

ساون کا مہینہ آیا۔ مدن سینا اور اُس کی سکھیاں جھولتی اور گاتی جاتی تھیں۔ آکاش بادل کی رضائی اوڑھے ہلکی ہلکی پھوار برسا رہا تھا۔ مدن سینا اور اُس کی سکھیاں پنچھیوں کی طرح چہچہا رہی تھیں۔ اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بڑی بڑی بوندیں درختوں سے گرنے لگیں۔ کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور دھرم دت کو پاس کھڑا دیکھ کر مدن سینا کی ایک سکھی بول اُٹھی۔ "تیرا دوست یہاں نہیں۔ وہ تو اپنے پتاجی کے ساتھ سمندر کنارے کے شہر کو گیا ہے۔"

مدن سینا نے دیکھا کہ دھرم دت اُسے برابر گھور رہا ہے۔ شرم سے اُس نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ دھرم دت اُسی طرح گم سم کھڑا رہا جیسے وہ اندھا، گونگا یا بہرا ہے۔ بچارا کیا کرتا۔ اتنی دیر میں پریم کے تیروں نے اُس کی سمجھ بوجھ کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سوداگر بچہ بھلا کیا جانتا تھا کہ اُس کے دوست دھن دت کی بہن مدن سینا جوان ہو کر ایسی سندر نکلے گی۔ وہ ایک پاگل کی طرح مدن سینا کو گھور ہی رہا تھا کہ مدن سینا اور اس کی سکھیاں چڑیوں کی طرح آپس میں چہچہائیں کھلکھلائیں، اور پنچھیوں کی طرح پھُر سے اُڑ کر مدن سینا سمیت مکان میں کہیں غائب ہو گئیں۔

جب دھرم دت کی آنکھوں نے مدن سینا کو اوجھل پایا تو اُس کے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ گم سم وہ اپنے گھر واپس پہنچا۔ اور صبح تک چاند کی کرنوں کے زخم سہتا، چاندنی کے بھالے کھاتا۔ بچھونے پر کروٹیں بدلتا رہا۔

تڑکے اُٹھ کے وہ سیدھا ارتھادت کے باغ کی طرف چلا۔ اب بھی آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی اور پتیوں کے کٹوروں میں پانی اور اوس میں امتیاز مشکل تھا۔ ابھی انگ پورے سے رات کے اندھیارے کا بادل اُٹھنے نہیں پایا تھا۔ باغ میں مدن سینا اکیلی تھی۔ بالوں کے لئے پھُول چُننے آئی ہوگی۔ اُس کی سہیلیاں معلوم نہیں اپنے اپنے گھروں میں تھیں یا ابھی مدن سینا ہی کے یہاں پڑی سو رہی تھیں شاید اوس اور صبح کاذب کے پانی کی بوندوں اور ہوا کی بھینی بھینی خوشبو اور پتوں میں گرگٹوں کی سرسراہٹ سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اُن کے ہردے ابھی جاگنے نہیں پائے تھے یا شاید جاگ جاگ کے سو گئے تھے۔

اکیلی مدن سینا نے پھول توڑنے میں پھر پیروں کی چاپ سُنی اور اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور پھر اُس نے کسی کو چھلانگ مارتے دیکھا اور کانٹوں کی باڑھ سرسرا کر رہ گئی۔

پھر مدن سینا نے دھرم دت کو اپنے پاس کھڑا پایا۔ اس طرح کہ گویا وہ اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لے گا۔ اور خوف سے اُس کا جسم کپکپانے لگا۔ اس

اس افسانے کی لڑی ہیں مدن سینا کا قصہ کتھا سرت ساگر سے، اور ڈوری گن کا جامر کے فرینکلن کے قصے سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے کے مرکزی خیال کے ارتقا اور نشو و نما کو ظاہر کرنے کے لئے ان دونوں قصوں کی ضرورت تھی۔ باقی تمام حصے طبعزاد ہیں۔

کے ہاتھوں سے شبنم اور پانی سے دُھلے پھول گر گئے۔ اور بارش کی ہلکی ٹھنڈی پھوار میں بھی اُس کی مانگ کے نیچے پیشانی پر پسینے کے گرم گرم قطرے نمودار ہُوئے اُس نے چیخنا چاہا مگر چیخ نہ سکی۔ اس ڈر کے مارے کہ اُس کی ادا سیاں یہاں اُسے اس نوجوان کے پاس اس وقت دیکھیں گی تو اُسے بردوش نہ سمجھیں گی۔ اور کیا اُس کی سکھیاں اُسے یہ کہہ کے بدنام نہ کریں گی کہ وہ خود بڑی رات گئے یا اتنے تڑکے دھرم دت سے ملنے آئی ہوگی۔

اتنے میں دھرم دت کے ہاتھ جو اُسے بھینچنے کے لئے اُٹھ رہے تھے، نیچے گرے۔ دھرم دت اُس کے چرنوں میں گر پڑا۔ "مدن سینا تو میری نہ ہوئی تو میں مرجاؤں گا۔"

مدن سینا نے اُس سے کہا۔ "دھرم دت یہ آج تجھے کیا ہو گیا۔ تجھے معلوم ہے میں کنواری ہوں اور میرے پتا نے میری منگنی ایک دوسرے دیش سوداگر سمدردت سے کی ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس سے میرا بیاہ ہونے والا ہے۔"

دھرم دت زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ کے اُس نے کہا۔ "جو ہونا ہے ہو جائے۔ تیرے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" اُس کے ہاتھ پھر اُٹھے۔ مدن سینا کو بھینچنے کے لئے۔ اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ کہیں یہ زبردستی نہ کرے۔ بدنامی کے ڈر سے وہ چلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"سُن تو۔ پہلے میرا بیاہ تو ہو جانے دے۔ میرے پتا کی تمنا تو پوری ہو جائے کہ وہ مجھ کنواری کو دُلہن بنتی دیکھیں۔ پھر میں تیرے پاس ضرور آؤں گی کیونکہ تیرے پریم نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے اُسے روکتی ہُوئی اور پیچھے ہٹی۔

راستہ روک کے دھرم دت نے کہا۔ "میں ایسی عورت سے پریم نہیں کر سکتا جو پہلے کسی اور مرد سے ہم آغوش ہو چکی ہو۔"

اور مدن سینا نے ڈر کر کہا۔ "اچھا تو میں بیاہ ہوتے ہی فوراً تمہارے پاس آؤں گی اور اس کے بعد اپنے پتی کے پاس جاؤں گی۔"

اس پر بھی دھرم دت نے اُس کا ہاتھ پکڑے ہی لیا اور اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک مدن سینا نے بھگوان کی قسم کھا کے اپنے وعدے کی توثیق نہیں کی۔ تب اُس نے اُس کا ہاتھ چھوڑا اور چھلانگ مار کے کانٹوں کی باڑ کود گیا۔

پانی کی پھوار رُک گئی تھی۔ مدن سینا کا دل جو دھک دھک کر رہا تھا۔ اب بیٹھنے لگا۔ وہ بہت اُداس اُداس گھر کے اندر گئی۔

جب بیاہ کا دن آیا اور سب رسمیں پوری ہو چکیں تو مدن سینا اپنے پتی سمدردت کے گھر گئی۔ خوشیوں میں دن گذرا اور جب اکیلے میں اُس کے پتی نے اُسے اپنے آغوش میں جکڑنا چاہا تو وہ تڑپ کے نکل گئی اور دھیرے دھیرے روتے اور آنسو پُونچھتے ہوئے سر جھکا کر اُس نے کہا ——— "میرے پتی، میرے بالم، میرے ناتھ، میں تجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے جو کہنا ہے سُن اُٹھ اور وعدہ کر کہ تُو مجھے سزا نہیں دے گا۔ تاکہ میں جو کہنا چاہتی ہُوں، تجھ سے کہہ سکوں۔"

جب سمدردت قسم کھا چکا تو مدن سینا نے چند روز پہلے جب اُس کے والد اور بھائی سفر پر تھے۔ دھرم دت کے باڑھ پھاند کے آنے اور بارش کی ہلکی پھوار اور شبنم اور آنسوؤں کی کہانی اُسے سنائی۔ اور آخر میں اُس سے کہا۔ "میرے ساجن اب تو بتا، اب میں کیا کروں، میں تو اُس پاپی سے بچن ہار چکی۔"

سمدردت قسم تو کھا ہی چکا تھا۔ نہ وہ اُسے سزا دے سکتا تھا نہ اُسے روک سکتا تھا۔ اُس نے مدن سینا کو اجازت دے دی کہ اپنا قول پورا کرنے کو جہاں اُس کا جی چاہے جائے۔

وہ اُٹھی، اور اپنے پتی کے گھر سے باہر چلی گئی۔

اُس رات کو آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ مگر بجلی نہیں چمک رہی تھی کہ اننگ پور ے کی سڑک پر کوئی چور ڈاکو گھات لگائے بیٹھا ہو تو نظر آجائے یا کوئی کالا یا چتکبرا سانپ کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہو تو پاؤں پڑنے سے پہلے ہی راہی کو خبر ہو جائے۔

مدن سینا اس اندھیرے کی وجہ سے اپنے جیون سے اور بھی بے پروا ہو کر دھرم دت کے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ برگد کے ایک موٹے تنے کے پیچھے سے لپک کے ایک ہٹے کٹے ڈاکو نے اُسے دبوچ لیا۔ نہ وہ اُسے چھوڑنا چاہتا تھا نہ اُس کے زیوروں کو۔ اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کے دیش سوداگر کی لڑکی نے دھرم دت سے اپنے وعدے، شوہر کی اجازت اور سب واقعات بیان کئے اور آخر میں منت کر کے کہا۔ "ڈاکوؤں کے راجہ بس مجھے گھنٹہ بھر کے لئے چھوڑ دو۔ میں اپنا قول پورا کر لوں۔ اُس کے بعد میں یہیں واپس آؤں گی۔ جیسا سلوک

تمہارا جی چاہے کرنا اور تم کوئی چنتا نہ کرو۔ میں اپنا بچن پورا کردوں گی۔"

ڈاکو نے یہ سُن کر اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور وہ سیدھی دھرم دت کے گھر پہنچی۔ جو اتنے دنوں سے اُس کے عشق اور اُس کی تمنا میں بے چین تھا لیکن اُسے اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھے سے اُسے سکتہ ہو گیا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے آنے پائیں۔"

مدن سینا نے اپنی اور اپنے بالم کی گفتگو اس کے سامنے دہرائی تو دھرم دت جو اُس کے سوا کسی اور کو کبھی چاہ نہ سکتا تھا کہنے لگا۔ "تم نے تو اپنا بچن پورا کیا لیکن تم جو کسی دوسرے کی پتنی ہو میرے کس کام کی ہو جس طرح تم آئی ہو ویسی ہی چلی جاؤ کوئی تمہیں دیکھنے نہ پائے" ایک آنکھ سے ہنستی اور دوسری سے روتی مدن سینا اُسی راستے واپس ہوئی۔ لیکن اُس نے ڈاکو سے بھی بچن ہارا تھا اور اُس بڑ کے سامنے اُس ڈاکو سے ملنا تھا۔ بڑ کے پاس پہنچتے پہنچتے اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

بڑ کی آڑ سے ڈاکو کلہاڑی لئے پھر دھم سے سامنے آ کودا۔ اُسے مدن سینا کے آنے کی تو آشا نہیں تھی۔ مگر وہ دوسرے امیر راہگیروں کو لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا۔ مدن سینا کو اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

اور مدن سینا نے یہ قصہ بیان کیا کہ دھرم دت نے ہاتھ لگائے بغیر ہی اُسے چھوڑ دیا۔ اس پر اس ڈاکو نے اُسے کہا، جواب تک اپنی کلہاڑی سے درخت کی لکڑی کی طرح ہزاروں کے سر توڑ چکا تھا۔ "تیری سچائی سے خوش ہو کے میں بھی تجھے چھوڑتا ہوں۔ جا اپنے سونے چاندی اور عزت کے زیوروں سمیت اپنے گھر جا۔"

سمدردت جس کا دل پہاڑی ندی کی طرح سر پٹک رہا تھا۔ کواڑ پر ہلکی سی تھاپ کی آواز اور زیوروں کی چھنا چھن سُن کے اُٹھا۔ مدن سینا نے اُس کے چرنوں کو چھو کے جب سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں جو آنسو چھلک رہے تھے۔ وہ رنج یا بیکسی کے نہیں خوشی اور پریم کے تھے۔ سمدردت سے اُس نے رات کی کہانی سنائی۔ کس طرح سچ اور اپنے بچن کے پاس کی وجہ سے دھرم دت اور ڈاکو دونوں کے دلوں میں بھگوان نے ترس اور رحم ڈالا۔ کس طرح وہ پاک اور اچھوتی اپنے ساجن، اپنے ناتھ کے پاس واپس آئی۔ سمدردت کو اپنے گھرانے کی آبرو بچنے سے زیادہ خوشی اس کی ہوئی کہ اُس نے ایسی سچی اور قول کی پکی استری پائی اور اُس کے بعد مرتے دم تک دونوں نے ہنسی خوشی دن گذارے۔

قصہ ختم کرکے ویتال نے مہاراج تری دی کرم سینا سے پوچھا "جے مہاراج کی۔ اب مہاراج یہ بتائیں کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ فراخدلی سے کس نے کام لیا — مدن سینا کے پتی نے یا دھرم دت نے یا ڈاکو نے؟"

تب مہاراج نے کچھ سوچ کے اُسے جواب دیا۔ "ویتال۔ اُن تینوں میں سچ پوچھو تو دراصل فراخدل وہ ڈاکو ہی تھا۔ اُس کا پتی ہی اُسے کیسے نہ جانے دیتا۔ جب کسی پتنی اور کسی مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اُسے کیسے روک سکتا ہے۔ دھرم دت اس لئے اُس سے دست بردار ہو گیا کہ وقت گذر جانے کی وجہ سے اُس کا عشق سرد ہو چکا تھا اور شاید وہ ڈرتا تھا کہ مدن سینا کا پتی دوسرے دن راجہ سے اُس کی شکایت نہ کردے۔ لیکن ڈاکو، وہ بے اصول، بدمعاش، اندھیارے کا باسی، وہ سچ مچ فیاض اور فراخدل تھا کہ اُس نے ایسی خوبصورت عورت کو جواہرات سمیت چلے جانے دیا۔"

معلوم نہیں ویتال اب کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ کشمیر کے کسی پہاڑ پر جہاں ناظر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، کوئی اور پچیسی لکھ رہا ہے یا شہروں اور دیہاتوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کبھی شیواگرام بھی گیا ہو۔ اور اُس نے مدن سینا کے اصولوں کو اہنسا اور ستیہ گرہ کے لقب سے سیاست پر چسپاں ہوتے دیکھا ہو۔ یہ صدیوں کا تانا بانا۔ سچائی کا تقاضا تو یہی ہے کہ غنیم حملہ کرنا چاہتا ہے تو گھر کے دروازے کھول دو۔ بھارت ماتا کی عصمت اور عزت کو ہاتھ لگائے بغیر وہ الٹے قدم واپس ہو جائے گا۔ اس کا کیا علاج کہ فاشسٹ شہنشاہیاں دھرم دت اور ڈاکو اتنی شریف بھی نہیں۔

اور معلوم نہیں ویتال بابو کو پتہ ہے یا نہیں کہ مدن سینا کی اولاد چار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے۔ اُس کی اور سمدردت کی اولاد کا اثر برما میں راجکماری تھو دھما تسادی کے فیصلوں پر بھی ہوا۔ بہار دانش، طوطی نامہ، داستاں چہل وزیر اور معلوم نہیں کہاں کہاں پھرتے ہوئے اُس کے پوتے پڑپوتوں نے سُنا ہے کہ گرین لینڈ جانے والے وائکنگ سیاحوں میں گھر کر اس نے چیتان کی پہاڑیوں کی بھی سیر کی۔ اِسی خاندان کی ایک شاخ نے سائبریا کے برفستانوں میں قیام کیا جہاں سے انہیں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد نکال دیا گیا۔

(۲)

لیکن مہاراج تری دی کرم سینا نے اپنے قول فیصل میں یہ کیوں کہا "جب کسی پتنی اور کسی اور مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اُسے کیسے

روک سکتا ہے۔"

کیا ابن حزم سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ انڈریاس کیپی لانس تک پہنچتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے درباری آدابِ عشق میں اس کی تفسیر ملتی ہے۔ جب ملکہ اور خواتین ایک دربارِ عشق یا عدالتِ عشق ترتیب دیتی تھیں، جس میں عاشقوں کی بے وفائی اور معشوقاؤں کی جفا پر استغاثے ہوتے تھے۔ اور احکامات اور سزائیں دی جاتی تھیں۔

ایک خاتون الف کو مدن سینا کی طرح اپنے پتی ہی سے محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس جاہلیت کے زمانے میں خاوند خداوند نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ نائٹ اپنی زندگی اور اپنی خدمت کو مذہب اور خواتین کی خدمت کے لئے یکساں وقف رکھتے تھے۔ بہرکیف اس خاتون الف پر دھرم دت کی طرح ایک مردِ شریف کاؤنٹ جی عاشق تھا۔ عاشق اور معشوقہ کی بحث و محبت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو دونوں حریفوں نے میری ملکہ شامپین سے فیصلہ چاہا اور اُس نے کئی خواتین کے مشورے سے یہ فیصلہ صادر کیا۔

"ہم اعلان کرتے ہیں اور ہم اسے امرِ طے شدہ سمجھتے ہیں کہ عشق ایسے دو افراد کے درمیان اپنی طاقتوں کا اثر نہیں ڈال سکتا جو ایک دوسرے سے منکوح ہوں۔ کیونکہ عشاق ایک دوسرے کو ہر چیز آزادی سے دیتے ہیں کسی جبر یا مجبوری سے نہیں۔ لیکن شادی شدہ جوڑے میں فریقین مجبور ہیں کہ بطور فرض ایک دوسرے کی خواہشیں پوری کریں۔ اور ایک دوسرے سے امر میں انکار نہ کریں . . . . . "

اس فیصلہ کی تاریخ یکم مئی ۱۱۷۴ء ہے۔

اس کے آٹھ یا نو سال بعد اس فیصلہ پر دو یہودیوں کارل مارکس اور اینگلز نے نظرِ ثانی کی۔ اُن کا فیصلہ یہ ہے:۔

"ہمارے بورژوا اپنے مزدوروں کی بیویوں اور بیٹیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے رنڈیوں کا تو ذکر ہی کیا، انہیں ایک دوسرے کی بیویوں کو پھسلانے میں انتہائی لطف آتا ہے۔"

(۴)

مجھ جیسے راوی پر کون اعتبار کرے گا —— اور یوں بھی ہندوستانی مورخوں کو کون سند کے قابل سمجھتا ہے —— لیکن میرے خیال میں سمدرودت اور مدن سینا کی اولاد اس طرح ولایت پہنچی ہوگی کہ جب شام اور مصر کی فتح کے بعد خسرو پرویز قسطنطنیہ پر ایک طرف سے بڑھ رہا تھا۔ اور اُس کا حلیف وحشی اور قوم کا کاغان (خاقان)، یورپی جانب سے۔ اُس وقت خسرو پرویز کو صلح کے لئے جو تاوان جنگ بازنطینی قیصر نے پیش کیا۔ وہ ایک ہزار طلائی مہروں، ایک ہزار نقرئی مہروں، ایک ہزار ریشمی عباؤں، ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں پر مشتمل تھا۔

ان ایک ہزار کنواریوں میں سیرا یا شیریں شامل نہیں تھی۔ مشرقی افسانہ نگاروں کے برخلاف مغربی مورخوں کو اس سے اتفاق نہیں کہ یہ سیرا یا شیریں بازنطینی قیصر موریس کی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ سیرا یا شیریں کسی مشہور اعلیٰ رومی گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ جس طرح اُس کے رومی نام سیرا کو بگاڑ کر ایرانی افسانہ نگاروں نے اُسے شیریں بنا دیا —— اس لفظ میں ایرانی تصورِ حسن کی رُوح پنہاں ہے —— اُسی طرح اُس کے شوہر شہنشاہ کو اُس کی زندگی ہی میں پرویز کا لقب ملا۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے مردانہ حُسن میں ستاروں کی سی جگمگاہٹ تھی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ خسرو پرویز کو اپنی ملکہ شیریں سے جس قدر عشق تھا، ملکہ اُسی والہانہ عشق سے اُس کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ اب مدن سینا، دھرم دت اور سمدرودت کے مثلث نے یہ شکل اختیار کی۔

مدن سینا	..	..	شیریں
سمدرودت	..	..	خسرو پرویز
دھرم دت	..	..	فرہاد

فرق اتنا تھا کہ مدن سینا کو اپنے شوہر ہی سے محبت تھی۔ لیکن شیریں کا دل اپنے حسین شوہر شہنشاہ کا نہیں۔ ایک کمین دکمتر مزدور کا غلام ہو چکا تھا یہاں تیشہ اور جوئے شیر اور کوہ کنی کا قصہ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مدن سینا کی طرح شیریں نے بھی وصل کا وعدہ کیا تھا سمدرودت کی طرح خسرو پرویز نے اس وعدے کی توثیق کی سمدرودت اپنے وعدے پر اس لئے قائم رہا کہ اُس وقت عورت خانگی جائیداد نہیں بننے پائی تھی۔ لیکن شیریں اور فرہاد دونوں ایرانی شاہان شاہ کی رعایا اور اس کی ملکیت تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ شیریں کے جسم کا مالک تھا۔ اُس کے دل کا مالک نہ بن سکا۔ لیکن اُس نے سمدرودت کے برخلاف وعدہ پورا نہ ہونے دیا۔ "گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب" نے کم ظرفی سے اپنی جان دے دی۔ شیریں کا دل اور زیادہ ٹوٹ گیا۔ خسرو پرویز کو اس وعدہ شکنی اور کامل فتح کے بعد اتنی بھی مسرت

اور اتنا بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا جتنا رومی صوبوں کی فتح کے بعد۔ اس نے اُن ہزار بازنطینی کنواریوں سے معلوم نہیں کس طرح دل بہلایا۔ اور دل بہلا ہی رہا تھا کہ اسکندرون کی خلیج پر ہرقلیس اعظم کی فوجیں اُتریں ــــ رُومی شہنشاہ کے پیشرو نے شیریں اور ایک ہزار کنواریوں کو ایرانی کے سپرد کیا تھا۔ ہرقلیس نے تُرک خاں کو اپنی خوبصورت بیٹی بھینٹ چڑہانے کا وعدہ کیا۔ دست گِرد کے قلعہ میں اپنی بے شمار خواصوں اور عورتوں کو جن کی تعداد تین ہزار تھی ــــ چھوڑ کر خسرو پرویز بھاگ نکلا اور پھر ایک تاریک بُرج میں اُس کے ساتھ اُس کے انسانیت ناشناس بیٹے نے وہی سلوک کیا جو اکثر تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔ ہرقلیس ممکن ہے کہ اُن ہزار رومی لڑکیوں کو چھڑالایا ہو۔ جواب کنواریاں نہ رہی تھیں۔ ممکن ہے جب بازنطینی شہنشاہ زیتون کی شاخوں، اور بے شمار چراغوں میں گھرا ہوا قسطنطنیہ واپس ہوا تو اُس کے جلوس میں ہزارہا ایرانی دوشیزائیں ہوں ممکن ہے اس سلسلے میں ایران کے پڑوسی راج اننگ پورہ کے تاجروں کی بہو بیٹیاں بھی ہوں اور اس طرح مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ پہنچی ہو۔

جب بازنطینی شہنشاہ ہرقلیس قسطنطنیہ میں ایران سے مصر و شام کے صوبوں کو واپس چھین لینے کی خوشیاں منا رہا تھا تو شام کے ایک گمنام گاؤں پر عرب کے ایک غیر معروف شہر مدینہ کے باشندوں سے اُس کے فوجیوں کی کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ اس واقعہ کو ہرقلیس نے اس وقت اتنی ہی اہمیت دی جتنی اُس نے اور ایرانی شاہان شاہ نے عربی پیغمبر کی چِٹھیوں کو دی تھی۔

لیکن بہت جلد ریگستان کی فوجیں مرو سے لے کر مصر تک چھا گئیں جو صوبے ہرقلیس نے ایرانیوں سے واپس چھینے تھے۔ عربوں نے فتح کر لئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوایوب انصاری کے پرچم کو صرف یونانی آتش روک سکی۔ اور یونانی آتش کے زیر سایہ مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ میں پروان چڑھی اور یہاں سے بہ سلسلۂ تجارت بڑھتی ہوئی مغربی یورپ تک پہنچی۔ جنوبی فرانس میں اس نے ماؔنی کے اثرات کو باقی رکھا۔ لاطینی مصنفوں سے اس کا حال بوکاچیو اور چاسر نے سُنا۔

لیکن جس طرح وتیاؔل نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا تھا میں آپ سے پوچھتا ہوں "سب سے زیادہ کم ظرف کون تھا، خسرو پرویز؟ یا شیریں؟ یا فرہاد؟"

۴

چاسر کے فرینکلن یعنی چودھویں صدی عیسوی کے اُس زمیندار نے جو غلام تو نہ تھا مگر عالی خاندان اور شریف النسل بھی نہ ہوتا تھا۔ کچھ اس قسم کا قصہ بیان کیا۔

آرموریکا میں جس کو بری طینی بھی کہتے ہیں۔ مدن سینا کی اولاد میں ایک خاتون تھی جس کا نام ڈوری گن تھا۔ اسی ملک میں ایک نائٹ بھی تھا ملک کے شریف ترین طبقے کا نمائندہ۔ اس کا نام آروے راگس تھا۔ اُسے اس خاتون سے عشق تھا اور وہ بیحد زحمت اُٹھاتا اور کوشاں رہتا۔ کہ بہترین طریقے پر اس خاتون کی خدمت کر سکے۔ اپنی خاتون کو خوش کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے، بڑی بڑی مہمیں سَر کیں۔ تب کہیں جا کر وہ ڈوری گن کو جیت سکا۔ بالآخر اس کی قابلیت و شہامت کو اس خاتون نے اپنے شایانِ شان پایا۔ خاص طور پر اُس کے عجز اور اُس کی تابعداری کی وجہ سے اُس کی خدمت اور اس کی درخواست پر اُس نے ایسا ترحم کا جذبہ محسوس کیا کہ اُس نے اُسے اپنا شوہر یا اپنا آقا بنایا۔ آروے راگس نے خود اپنی مرضی سے یہ قسم کھائی کہ وہ ایک نائٹ کی طرح اپنا خاتون کی خواہش کے خلاف کبھی اپنا حکم چلانے کی کوشش نہ کرے گا۔ کبھی رشک و حسد کا اظہار نہ کرے گا۔ ہمیشہ اُس کی اطاعت کرے گا۔ ہر بات میں اُس کی مرضی کا پابند رہے گا۔ بالکل اُسی طرح جیسے کوئی عاشق اپنی معشوقہ کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔

ڈوری گن نے بڑے انکسار سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ "جناب جس طرح مجھے آپ نے اپنی مردانہ شرافت سے اس قدر حکومت بخشی ہے۔ اُسی طرح میں بھی اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خادمہ اور سچی بیوی رہوں گی۔ اس کا میں آپ سے پکا عہد کرتی ہوں۔"

دوست اور عشاق ایک دوسرے کی تابعداری کرتے ہیں۔ محبت ایک فریق کے استبداد اور دوسرے کی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جب استبداد آتا ہے تو عشق کا دیوتا اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے اور یہ جا، وہ جا، رخصت۔ ہر چیز کی طرح محبت کی روح بھی آزاد ہے۔ فطرتاً عورتیں بھی غلامی نہیں، آزادی چاہتی ہیں ــــ (اقباؔل نے زمرد کے گلوبند کی ایک ہی کہی) ــــ اور مرد بھی۔

یہ معاہدہ سیدھا سادہ مگر کتنا عاقلانہ تھا۔ خاتون کو اپنا شوہر کیا ملا بیک وقت آقا بھی ملا اور خادم بھی۔ محبت میں غلام اور ازدواج میں آقا۔ نائٹ کو آقائی بھی ملی اور خدمت بھی۔ خدمت؟ نہیں اس سے زیادہ تو آقائی ہی کیونکہ اُسے بیوی بھی ملی اور محبوبہ بھی۔

کارہائے نمایاں سرانجام دینا ہر نائٹ کا فرض تھا۔ اس فرض کو انجام دینے آرٹے لیس
انگلستان کے جزیرے میں گیا جسے برطانیہ بھی کہتے ہیں کتاب کہتی ہے کہ یہاں اُسے دو سال لگ گئے
اس دوران میں اُس کی بیوی ڈوری گن اُسے اپنے دل کی زندگی کی طرح چاہتی رہی۔ اُس
کے فراق میں روتی اور آہیں بھرتی، تڑپتی، راتوں کو جاگتی، نالہ و زاری کرتی، فاقے کھینچتی ہے
آرٹے لیس کے خط کبھی کبھی آتے۔ کبھی وہ بری ٹینی کے ساحل پر کھڑی ہو کے اُس کے
جہاز کا انتظار کرتی اور چٹانوں کو دیکھ دیکھ کر ہول کھاتی اس ڈر سے دعائیں مانگتی کہ کہیں اُس
کے شوہر اُس کے محبوب کا جہاز بھی ان چٹانوں سے ٹکرا کے پاش پاش نہ ہو جائے۔ خدایا تو دیکھتا
ہی ہے کہ کتنے انسانوں کو یہ چٹانیں غارت کرتی ہیں لاکھوں انسانوں کی جانیں ان چٹانوں نے چھینی ہیں
کیا تیرے انسانوں کا جینا ضروری ہے جو تیری صنعتوں میں تیرے شاہکار سمجھے جاتے ہیں جنہیں تو نے اپنی شبیہ کے
مطابق بنایا ہے ــــــ بہت کم وہ خوش ہوتی یا ہنستی بولتی بیگم منی کی چھ تاریخ کو اپنی سہیلیوں کے جبر
کرنے سے وہ ایک ناچ میں گئی۔ اس ناچ میں ڈوری گن کے ساتھ ایک اسکوائر ناچ رہا تھا۔ اسکوائر
یعنی قرونِ وسطیٰ کا بڑا زمیندار لیکن کسی نائٹ کا محض سپاہی یا اردلی اور اُس کی خاتون کی متابعت
کرنے والا ایامر کا ب یا ملتفت ــــــ تازگی اور آراستگی میں شمالی یورپ کے مئی کے مہینہ کا جیسا۔ اس کا
نام آرے لیس تھا۔ ناچنے اور گیت گانے میں عدیم المثال تھا۔ نوجوان تھا مضبوط تھا صالح تھا
امیر تھا اور عقلمند تھا۔ لوگ اُسے پسند کرتے تھے اور اُس کی قدر
کرتے۔ اس زندہ دل اسکوائر کو دنیا میں سب سے زیادہ ڈوری گن سے محبت
تھی۔ اس حال میں اُسے دو سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن اُس نے اپنا
دردِ دل کسی سے نہ کہا تھا۔ ناامیدی اُس پر غالب تھی نہ زبان سے کچھ کہہ نہیں
سکتا تھا ــــــ صرف اپنے گیتوں میں وہ اپنے دل کا دکھ کچھ نہ کچھ نچوڑ لیتا۔ عام
انداز میں واسوخت لکھتا۔ یہ بتاتا کہ وہ عشق میں گرفتار ہے اور کوئی اُسے نہیں
چاہتا۔ گیتیں، نغمے، نظمیں، واسوختیں لکھتا، اور بتاتا کہ وہ اپنے غم کا اظہار
نہیں کر سکتا مگر وہ اس طرح عذاب بھگت رہا ہے جیسے دوزخ میں کوئی خبیث
روح صدائے بازگشت کی طرح اُس کی قسمت میں بھی موت لکھی ہے۔

لیکن اس ناچ کے موقعہ پر اُس نے ہمت کر کے ڈوری گن سے حال
دل کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میری ساری خدمت بیکار ہے۔ میرا دل پارہ پارہ
ہو رہا ہے۔ خاتون میرے رنج اور درد پر رحم کیجئے۔ کیونکہ آپ کا ایک لفظ
مجھے جلا یا مار سکتا ہے۔"

وہ آرے لیس کی طرف دیکھنے لگی: "اس سے پہلے میں نہیں سمجھ
سکی تھی کہ تمہارا مطلب کیا ہے لیکن آرے لیس اب میں تمہاری خواہش کو
سمجھ گئی۔ اُس خدا کی قسم جس نے مجھے روح اور جان دی۔ کہ کسی اور کی
بیوی ہوتے ہوئے میں بیوفائی نہیں کر سکتی۔" پھر اُس نے مذاق میں کہا۔ "آرے
لیس، اُس خدائے بلند و برتر کی قسم جو اوپر ہے چونکہ میں دیکھتی ہوں کہ تم اس
قدر گڑگڑا کر التجا کر رہے ہو۔ اس لئے سنو کہ اُسی دن میں تمہاری معشوقہ بنونگی۔
جس دن بری ٹینی کے ساحل کی یہ دیو ہیکل چٹانیں جن سے ٹکرا ٹکرا کے جہاز
اور کشتیاں پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساحل سے ہٹ جائیں گی۔ ایک ایک
پتھر ہٹ جائے گا۔ اُس دن میں وعدہ کرتی ہوں میں تمہاری معشوقہ بنوں گی۔"
اس سے زیادہ ناممکن اور کیا چیز ہو سکتی۔ فرہاد کو پہاڑ کاٹنے کی جو شرط
پیش کی گئی تھی۔ اُسے انسان کی محنت پورا تو کر سکتی تھی۔ وہی شرط یہاں پھر دہرائی
گئی لیکن وہ اگر کٹھن تھی تو یہ ناممکن۔

آرے لیس اپنے گھر واپس گیا۔ اُسے یقین آ گیا کہ اب موت سے بچنا
مشکل ہے۔ اپنے دل کو اُس نے سرد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ سورج کے دیوتا
سے اُس نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگی کہ کسی معجزے کے ذریعے یہ چٹانیں ہٹ
جائیں۔ دعائیں پوری نہ ہوئیں اور ڈوری گن کا شوہر گھر واپس آ گیا۔ اپنے
نوجوان اور شریف و باعزت نائٹ کو دوبارہ پاکے وہ پھولے نہ سماتی تھی۔

جادو اور طلسمات، انسان عاقل کی عقل سے زیادہ پرانے ہیں پہلے
شاید مشرق میں چل نکلے، پھر مغرب میں کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ جون آف
آرک کی جان اس الزام میں گئی، اور اس الزام میں اٹھارویں صدی میں کیسانووا
کو ایسی سخت قید بھگتنی پڑی کہ اُس سے اُس کا نکل بھاگنا، انسان کی قوتِ ارادی
اور اُس کے جذبۂ آزادی کا معجزہ ہے۔ کسی لاطینی مصنف کے دماغ نے جو مشرقی
داستانوں سے سرشار تھے۔ مدن سینا کے ڈاکو کو جو ٹانگ پوہ کی ایک سڑک
پر بڑ کے پیچھے چھپ کے راہگیروں کو لوٹا کرتا تھا۔ ایک جادوگر راہب بنا دیا
یہ راہب جو جادوگر بھی تھا، اور فلسفی بھی، آرے لیس اور اُس کے بھائی کو مشرقی
طلسمات کے تماشے دکھانے لگا، جیسے کٹھ پتلی کا کھیل۔ بازوں سے چھوٹے
چھوٹے پرندوں کا شکار، شکاری کتوں سے ہرنوں کی ڈاروں کی ڈاروں کا
شکار۔ اور اُس نے اپنی شعبدہ کاری سے آرے لیس کو ڈوری گن کے ساتھ
خود اپنے آپ کو ناچتا دکھایا۔ اور بالآخر ایک ہزار پونڈ کے معاوضے میں اُس
نے بری ٹینی کی ساری چٹانیں غائب کرنے کا ذمہ لیا۔

اور قرونِ وسطیٰ میں جادو کا جو زور تھا۔ اُس زور سے چٹانیں غائب ہو

گئیں۔ اب موجیں نرم نرم خراماں خراماں پھیلتی پھیلتی بری طینی کے ساحل تک آجاتیں۔ پہاڑوں سے سر نہ ٹکراتیں، چٹانوں سے پٹک کر جھاگ نہ اُگلتیں۔

جادو نے وہی کام کر دکھایا جو فرہاد جیسے پتھر پھوڑنے والے کے تیشے نے کیا تھا۔

آرے لیس نے ڈوری گن کو اُس کا وعدہ یاد دلایا۔ اپنے دردِ عشق کا ذکر کیا۔ اُسے سمجھایا کہ اب بھی وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے تو وہ اُس کی بیگناہ موت کی ذمّہ دار ہوگی۔ اپنے باغ کو اُس نے ملنے کا مقام تجویز کیا۔

وہ رخصت ہوگیا، تو وہ حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس کے چہرے پر خون کے ایک قطرے کے آثار بھی نہ تھے۔ ایک دو روز روتی آہ وزاری کرتی رہی۔ اس طرح غش کھا کھا جاتی کہ دیکھنے والوں کو دُکھ ہوتا۔ لیکن کسی سے اُس نے کہا نہیں کہ اُس کی حالت غیر کیوں ہے۔ کیونکہ اُس کا شوہر دو تین دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ اکیلے میں وہ قسمت کا گلہ کرتی۔ جس نے اُس کے لئے یہ جال پھیلایا تھا۔ جس سے نکلنے کا موت یا بے عزّتی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ سمجھتی کہ جسم کی بے حرمتی سے تو موت ہی اچھی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو شریف بیویوں اور کنواریوں نے اپنے جسم کو پامالی سے بچانے کے لئے اپنی جانیں لے لی ہیں۔

ایک دو روز وہ یہی سوچتی رہی یہاں تک کہ اُس کا قابلِ عزت نائٹ آردے راگس گھر واپس آیا اور اسے زار زار روتے دیکھ کے اس کا سبب پوچھا، تو وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بالآخر اُس نے آرے لیس سے اپنی شرط کا ذکر کیا۔ جس کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ مگر جو پوری ہوگئی اور اپنے وعدے کا ذکر کیا۔

اس کے شوہر نے اپنے چہرے کو بشاش بنا کے دوستانہ الفاظ میں اُسے سمجھایا۔ "کہ قول پورا کرنے سے بڑھ کے انسان کا کوئی اور فرض نہیں" پھر وہ بھی بے اختیار رونے لگا اور اُس نے کہا اور کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا تاکہ میں اس طرح اپنا رنج برداشت کرسکوں اور تم بھی اپنے چہرے سے تکدّر ظاہر نہ ہونے دینا۔ تاکہ لوگ اس کا سبب نہ تاڑ جائیں۔" پھر اُس نے اپنے ایک اسکوائر اور ایک خادمہ کو حکم دیا۔ کہ ڈوری گن کو فلاں مقام پر پہنچا آئیں۔

بازار ہی میں آرے لیس ملا اور ڈوری گن سے پوچھا کہ کہاں جارہی ہے۔ اُس نے جواب دیا۔" افسوس۔ تمہارے باغ کو، جہاں تم نے بلایا تھا اور جہاں اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے جانے کا میرے شوہر نے حکم دیا ہے۔"

اس واقعہ پر آرے لیس کو سخت حیرت ہوئی اور اُسے بڑا ترس آیا — اُس پر بھی کیونکہ وہ اس طرح گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اور قابلِ عزت نائٹ آردے راگس پر بھی جس نے اُسے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے کہا تھا۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنی ہوس پر قائم رہنا بڑی کمینگی ہوگی۔ فیاضی اور شرافت کے خلاف بڑا سخت جرم ہوگا۔ اس لئے اُس نے خاتون کو اُس کا ہارا ہوا قول معاف کر دیا۔ اور کہا۔" اسکوائر — نائٹ کا ارذلی بھی شرافت کا فرض اُسی طرح بے جھجک ادا کر سکتا ہے۔ جیسے کوئی نائٹ۔"

جادوگر راہب کو اُس نے پانچ سو پونڈ لے جا کے دیئے۔ اور باقی رقم کے لئے مہلت مانگی۔ جادوگر کے پوچھنے پر آرے لیس نے کہا کہ اس کی محبوبہ اُس کے باغ تک آئی مگر اُس کی نہ ہوئی۔ آردے راگس نے اپنی شرافت سے گوارا کر لیا۔ کہ خواہ صدمہ اور کوفت سے اُسے موت ہی کیوں نہ آئے وہ اپنی بیوی کو بدعہدی کا مرتکب نہیں ہونے دیگا۔ اور جب اس نے خود ڈوری گن کو اس قدر مغموم دیکھا تو اُس نے اُسے بغیر چھوئے ہوئے باغ سے واپس جانے کی اجازت دی۔

جادوگر راہب نے اُسے ہزار پونڈ معاف کر دیئے۔ اور کہا ایک راہب بھی تم لوگوں کی طرح شرافت کے کام کرسکتا ہے۔

چاسر کے فرینکلن نے دیتال کی طرح پوچھا۔" آقاؤ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں بتاؤ ان میں سب سے زیادہ شریف اور فیاض کون تھا؟" اس قسم کے سوال قرونِ وسطیٰ میں اکثر پوچھے جاتے تھے۔ اور سوالاتِ عشق کہلاتے تھے۔

کلاس میں ایک لڑکی نے اُٹھ کے پروفیسر کو جواب دیا۔" میرے خیال میں ڈوری گن سب سے زیادہ فیاض تھی۔ وہ خودکشی کر سکتی تھی، لیکن اس طرح اُس کا وعدہ پورا نہ ہوتا۔"

سب ہنسنے لگے۔

(۴)

جس شب رگھبیر پلیس میں ہسپانیہ کے مظلومین کی امداد کے لئے ناچ اور تفریحات کا جلسہ تھا۔ اُس شام کو پانی زور سے برسا تھا۔ مالابار ہل کی

سڑکیں ڈھلوانوں پر موٹر کے ٹائروں کو پھسلا پھسلا کے گویا نیچے گرا رہی تھیں رگھبیر پیلیس سے کوئی ایک فرلانگ اِدھر اُدھر موٹروں کا ایسا ہجوم تھا کہ راستہ ملنا ہی مشکل تھا۔ مجبوراً سر سمدر نے اپنے شوفر سے کہا "اگر گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ہم یہیں اُتر جاتے ہیں۔ کیوں ڈارلنگ"۔

جواں سال لیڈی سمدر رائے نے بے بسی سے اپنی سفید ساڑھی اور اُس کے کامدانی کام اور نفیس نارسی بورڈر کی طرف دیکھا۔ یہاں سے رگھبیر پیلیس تک فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے میں سر سمدر کے شارک اسکن کے جاکٹ پر اگر کوئی دھبہ آجائے تو کوئی خیال بھی نہ کرے گا، لیکن اس ساری پر سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی داغ لگ جائے۔ تو اُس کی شام کرکری ہو جائیگی۔

"میں سمجھتی ہوں اُترنا ہی پڑے گا۔ اس طرح تو گھنٹہ بھر سے پہلے راستہ نہیں ملے گا"۔

ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اس قدر دروازہ کھولنے میں کامیابی حاصل کی کہ چندرا ـــ یہ لیڈی سمدر کا نام تھا ـــ بمشکل اپنی ساری کو اپنے جسم سے لپٹا کے اُتر سکی۔ اور پھر موٹروں کی بھیڑ میں آدمیوں اور مڈگارڈوں سے دامن بچاتی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ وہ رگھبیر پیلیس کے پورٹی کو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ پورٹیکو ہی میں مسز سنگھ کھڑی تھی۔

وہ مسکرا کے ان دونوں کی طرف بڑھی۔ "شام بخیر چندرا۔ آپ اچھے تو ہیں سر سمدر۔ آپ کو کہاں اُترنا پڑا ـــ ایک فرلانگ ـــ ہاہا" اس کا موٹا جسم، سر کے مصنوعی گھنگھریالے بال، نچلا چوڑا ہونٹ، اور اودے رنگ آبادی ہمرو کا کوٹ" سب اسی ہنسی میں لہرائے۔ "چندرا ڈارلنگ وشواش نگر کے تینوں راجکمار اُس میز پر ہیں ۔ تینوں جہابیر، رگھبیر اور رگھوبیر۔ تینوں تم سے ملنا چاہتے ہیں خصوصاً رگھوبیر ۔ ۔ ۔ اوہ ڈارلنگ جب سے اس نے تمہاری تصویر "ہم حتم آن نگر" میں دیکھی ہے ـــ وہی جو ڈکنن نے کھینچی تھی۔ تب سے تمہارے متعلق بحران میں مبتلا ہے۔ قطعی طور پر بحران میں ۔ ۔ ۔ اور آج تم بالکل جادو کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ ساحرہ سی ـــ کیوں سر سمدر ۔ ۔ ۔ ڈارلنگ مجھ پر فرض ہے کہ تمہیں ان سب سے ملاؤں۔ اس طرف سر سمدر"۔

سر نوشیرواں افراسیاب سے باتیں کرتے مڑ کر سر سمدر نے مسز سنگھ سے کہا "ابھی ایک منٹ میں مسز سنگھ۔ آپ لوگ جائیں میں ابھی وہاں آتا ہوں"۔

سر نوشیرواں نے ایک نوجوان یوروپین عورت کو دیکھ کر سلام کے لئے سر خم کیا۔ اُس کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کا ہندوستانی نوجوان تھا

"کون ہیں؟" سر سمدر نے پوچھا۔

"مسٹر اور مسز وحید امجد" سر نوشیرواں نے اس گذرتے ہوئے جوڑے کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ عورت آسٹرین ہے ۔ ۔ ۔ کئی رجواڑوں میں پیانو بجانے کی تعلیم دے چکی ہے۔ اپنے شوہر کی تقدیر اس کی بنائی ہوئی ہے۔ اُس کا تشہیر و اشتہار کا کاروبار ہے اور اب یہ حالت ہے کہ میرین ڈرائیو میں دو سو روپے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ سے ڈیڑھ سو کی نوکری مانگنے آیا تھا۔ ۔ ۔ لیکن سمدر۔ کچھ پیو گے نہیں؟" اُس نے سمدر کا بازو پکڑ کے کہا۔ "آج دو بار ہیں۔ ایک اوپر اور ایک قطب شمالی والے کمرے میں۔ اور یہ قطب شمالی وغیرہ کمرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ چلو"۔

اس برآمدے کے بعد ایک اور بڑا نیم برآمدہ سا تھا جس میں کیپن میک کا ناچ آرکسٹرا ٹانگو بجا رہا تھا اور کوئی چار سو جوڑے ناچ رہے تھے۔ روشنی اور ہسپانوی موسیقی کے سیلاب میں طرح طرح کے ہندوستانی اور یورپی زنانے لباس، کالے یا نیم سفید پوش مردوں کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ گویا روشنی موسیقی کی صوتی حرکت اور انسانی جسم اور جنسوں کی کشش کی حرکت سب ایک زندگی کی مرکب حرکت میں ضم ہو رہی تھیں۔ میزوں کے درمیان سے جان پہچان والوں کو سر کے اشارے یا تبسم سے سلام کرتے یا جواب دیتے کسی کسی میز پہ ایک آدھ منٹ کے لئے ٹھہر کر کوئی بات کرتے ہوئے وہ بائیں طرف کے دروازے میں مڑے اور اس مشہور "قطب شمالی" والے کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایرکنڈیشننگ کے ذریعہ اس قدر سردی کا انتظام کیا گیا تھا کہ رقص کے سانسوں اور موسیقی سے گرم کمرے سے نکل کے یہاں داخل ہونے پر یقیناً سردی معلوم ہوتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر اور دیواروں کے ساتھ ساتھ، اور فرش پر روئی کے گالوں اور سفید کاغذ کی کترن سے برف کی طرح طرح کی شکلیں تھیں، برفانی پہاڑ، برفانی ٹیلے جما ہوا برف۔ برف کے جزیرے۔ ایک طرف ایک وھیل نما صوفا تھا۔ ایک طرف قطب شمالی کے ریچھ کی شکل کی ایک کرسی تھی۔ ایک اسکیمو خیمے کے نیچے شراب کی بوتلیں اور گلاس، طرح طرح کے مرکبات۔ طرح طرح کے جام تھے اور دو انگریز لڑکیاں اسکیمو کپڑے پہنے ساقی گری کر رہی تھیں۔ جون۔ میرے لئے

ایک گملٹ اور تم سمدر؟"

"گملٹ" سر سمدر نے اختصار سے جواب دیا۔"شکریہ"۔

کُھلے ہوئے دروازے سے سر سمدر نے راجکماری کی میز کی طرف دیکھا۔ تین نیم ڈرامائی راجکمار۔ تینوں کلا رنگ کالا سا، بال گھنگھریالے تینوں ٹیل کوٹ پہنے۔ تینوں انگلستان کے پبلک اسکولوں کے پڑھے ہوئے ایٹن اور ہیرو اور پھر آکسفورڈ۔ ساتھ ہی ایک امریکن لکھ پتی، ہندوستان میں ایک امریکی موٹر کمپنی کا جنرل ڈائریکٹر اور ہوائی فوج کا ایک انگریز گروپ کیپٹن۔ بیڑے کا ایک کوموڈور۔ اور کئی ر... انگریز، پارسی، مسلمان، ہندو میز پر وہسکی، سوڈے، برانڈی، جن، کاک ٹیل اور گملٹ کے گلاسوں کی شفاف چمک اور اس ہجوم میں کوموڈور کی سفید وردی کو اُس نے اُٹھتے دیکھا۔ میز کے دوسرے کنارے سے اُس کی اپنی بیوی چندرا ہنستی ہوئی اُٹھی۔ پھر وہ رقص کرنے والوں کے ہجوم میں رقص کے سیلاب میں غائب ہو گئے۔ اور سر سمدر نے اپنا گملٹ ختم کیا۔ محسوس کیا کہ اُس کے ادھیڑ اعصاب کو اس سے زیادہ تیز چیز کی ضرورت ہے۔ جون کی طرف مسکرا کر اُس نے کہا۔"مس بریڈلے۔ ڈبل جن پلیز۔" جون نے پیسے لے کے ڈبل جن کا گلاس اُسے اور وہسکی سوڈا کا گلاس سر نوشیرواں کو دیا۔ قطب شمالی والے کمرے میں اُس سے چند قدم کے فاصلے پہ ڈھیلے نرم صوفے پر مہاراجہ وشواش نگر شارک اسکن کا جیکٹ پہنے، بڑے انداز سے کاک ٹیل کا گلاس گھما گھما کے خورشید مقدس جی سے باتیں کر رہے تھے —— بوہرہ تاجر جو اپنے سسر کے سٹے کے روپیہ کی وجہ سے اب لکھ پتی بن گیا تھا۔ خان بہادر بن ہی چکا تھا۔ اور ابھی سے راجوں اور مہاراجوں سے اس طرح کندھے سے کندھا بھڑا کے ملنے کی کوشش کرتا تھا گویا وہ اُس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ ریس کورس پر پانی کی طرح روپیہ خرچ کرتا۔ اُس کا اپنا اصطبل مہاراجہ مانڈو کے اصطبل سے کچھ کم نہیں تھا۔ اور اُس کا گھوڑا ذوالفقار دو سال سے برابر عرب ڈاربی جیت رہا تھا۔

سر نوشیرواں نے رازدارانہ انداز میں سر سمدر سے کہا۔"اس نو دولتیے کو دیکھو——"

"ہوں"

کھلے ہوئے دروازے سے پھر بوڑھے کوموڈور کی آغوش میں ادھیڑ سر سمدر نے اپنی جوان بیوی کا جیتا جاگتا مسکراتا جسم دیکھا۔ موسیقی ختم ہوئی، دوبارہ شروع ہوئی۔ اب راجکمار رگھوبیر کے ساتھ اُس کی بیوی ناچنے کو اُٹھی۔ ٹم ٹم ٹن ٹن۔ من۔ من۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ ایک۔ دو۔ تین چار۔" قطب شمالی والے کمرے کے مصنوعی برفانی فرش پہ سر سمدر کے پاؤں وقت کا اندازہ کرنے لگے۔ بینڈ نے ایک جھرجھری لی ہنسی، قہقہوں، ہم آغوش جسموں کی گفتگو کی رفتار، جن کے گلاس میں سما گئی۔ ایک انگریز لڑکی آلۂ مکبر الصوت کے پاس کھڑی ہو کے ہسپانوی انداز میں، انگریزی لہجے کے ساتھ ایک فرانسیسی "پوئما" گانے لگی۔ "رافائے لی جو۔" اور "جو" کا ادا معلوم ہوتا تھا قیامت کی خبر لائے گا۔

رگھوبیر کے جسم سے لپٹی ہوئی، آنکھوں سے آنکھیں بندھی ہوئیں، لیکن ٹانگیں —— محرک اور جسم کے سارے ہیجان سے بے پروا اور بے تعلق ٹانگیں —— مشین کی طرح، کوچ کرتی ہوئی فوجوں کی طرح، موسیقی کی پابندی کرتی ہوئی، ٹانگیں اُلجھے بغیر، ذرا سی بھی غلطی کئے بغیر برابر رقص کر رہی تھیں۔ سر سمدر نے جلدی سے جن کا گلاس ختم کیا۔ مسکرا کے جون کا شکریہ ادا کیا۔ اور سر نوشیرواں سے پوچھا۔"اوپر بھی ناچ ہو رہا ہے۔"

"ہاں مگر وہاں ذرا دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔"

"تو بہت ہی دلچسپ ہوگا۔" سر سمدر نے کہا۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ اگر وہ یہیں نیچے کے رقص کے کمرے میں ناچے گا۔ تو اُس کی بیوی کی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ پورا لطف نہ اُٹھا سکے گی۔

وہ سر نوشیرواں افراسیاب کو وہیں چھوڑ کے اپنے سیاہ پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کی بیوی چندرا رگھوبیر کے جسم سے ذرا انچ بھر دور ہٹ کے اُس کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ اس نے بھی مسکرا کے اُس کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔ پھر باہر کے برآمدے کی بھیڑ سے ہوتا ہوا چوڑے چوبی زینے پر سیٹی بجاتا ہوا چڑھنے لگا۔

"دوسرے درجے" کے کچھ لوگ نیچے اُتر رہے تھے۔ اس "دوسرے درجے" میں مہاراجاؤں، اعلیٰ ترین حکام اور لکھ پتی کارخانوں کے مالکوں کے سوا سب ہی شامل تھے۔ جونیئر آئی۔ سی۔ ایس چھوٹے کارخانوں کے مالک، بڑے تاجر، فلم کمپنیوں کے ڈائریکٹر اور ہندوستانی پردۂ سیمیں کے درخشاں ستارے مہاراجاؤں کے کنٹرولر اور اے ڈی۔ سی۔ میجر اور اُن سے کم درجے کے

فوجی افسر۔

اوپر کا ناچ ہال بہت بڑا تھا اور کوئی ایک ہزار کے قریب لوگ اُس کے بے شمار ستونوں کے درمیان ناچ رہے تھے۔ چاروں طرف برآمدوں میں میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور سرسمدر واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا۔ کہ مہاراجہ مانسرور کے ایک اے ڈی۔ سی نے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُسے دیکھ لیا۔ "ہلو سرسمدر۔"

"اوہ۔ گڈ ایوننگ۔" سرسمدر نے جواب دیا۔ وہ اکثر مہاراجہ مان سرور کی پارٹیوں میں بلایا جا چکا تھا۔ "یہاں اُوپر تو تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"سرسمدر اگر آپ جگہ تلاش کر رہے ہیں تو ہماری میز پر چلیئے۔"

"ضرور شکریہ۔"

اِس اے ڈی سی کا نام آفریدی تھا۔ میز پر بمبئی کے ایک مشہور تاجر کا بیٹا اکرام بھائی۔ دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفریدی نے سرسمدر کا اُس سے اور دونوں لڑکیوں سے تعارف کرایا۔ ایک لڑکی کا نام اُس نے چھایا دیوی بتایا۔ یہ اینگلو انڈین تھی، لیکن بڑی ہی فیشن ایبل ساڑی پہنے۔ ایک زمانے میں فلمستان کی مشہور پری رہ چکی تھی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب ہندوستانی فلموں کی پریاں بالعموم اینگلو انڈین ہی ہوتی تھیں، اور بولتے فلم کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔ پھر ان ستاروں پر زوال آیا۔ بہت کم باقی رہیں۔ زیادہ تر اِدھر اُدھر نکل گئیں۔ چھایا نے بھی اودھ کے ایک تعلقدار صاحب سے شادی کی۔ وہ پی کے اسے خوب ٹھوکتا تھا۔ تین چار سال بعد یہ طلاق لے کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اب "غیر وابستگی" کے عالم میں بمبئی میں مقیم تھی۔ دوسری لڑکی شیریں پارسی تھی۔ موٹی، بھدی، پست قد اور بے ہنگم چہرے پر چوتھائی انچ غازے کی تہ جمی تھی۔ بالائی لب کے روئیں جو اس غازے کے بغیر شاید اچھی خاصی مونچھیں معلوم ہوتے، اب بھی غازے کی اس دبیز تہ سے بغاوت پر آمادہ تھے۔

آفریدی نے سب کے لئے وہسکی اور سوڈا منگوایا۔ سرسمدر نے چھایا سے ناچنے کی فرمائش کی۔ یہ دی آنا کا والٹس تھا۔ ہلکا، شیریں، تیز۔ اُس نے اپنے سینے کے مقابل چھایا کا نوجوان جسم محسوس کیا۔ بھرے بھرے بازو اور شانے۔ سینے ابھی تک سخت۔ بال رنگے ہوئے مگر گھنے، اور گردن اور شانوں اور پُشت کو حسین سے حسین تر بناتے ہوئے، جسم گداز اور گٹھا ہوا ہونٹ سرخ، آنکھیں چمکتی ہوئی اور بناتی ہوئی۔

"آپ بہت اچھا ناچتے ہیں سرسمدر۔" چھایا نے اُس سے کہا اور اُس کے دانتوں اور اُس کی پلکوں نے مل کے جال پھینکا۔

"نہیں مجھے تو ناچنا کچھ یوں ہی سا آتا ہے۔ لیکن آپ بہت اچھا ناچتی ہیں۔ جیسے کوئی پری ناچے۔" اس کلمۂ تحسین پر وہ ہنسی، اُس کا پورا جسم ہلا اور ہلتے ہی سینوں سے لے کر رانوں تک اُس کے چمٹے ہوئے گداز جسم کے تمام عضلات میں ہنسی اور گدگداہٹ کی سی جُنبش ہوئی۔ اِس جُنبش نے سرسمدر کے اُدھیڑ جسم سے ٹکر کھائی۔ "آپ بہت خوبصورت ہیں۔ غیر معمولی ... جیسے گریٹا گاربو۔"

"اوہو" اُس نے کلّے پھُلا کے اور پھر ہنس کے کہا۔ "یہ تو تعریف نہیں ہوئی، سرسمدر۔ گریٹا گاربو تو ہرگز خوبصورت نہیں۔"

"پھر آپ کِسے خوبصورت سمجھتی ہیں؟"

"جون کرافرڈ۔ میرے خیال میں جون کرافرڈ بہت خوبصورت ہے۔"

"چھایا دیوی آپ اُس سے کہیں خوبصورت ہیں۔ آپ میں بڑی کشش، بڑی غیر معمولی دلفریبی ہے۔ بالکل کسی راجکماری کی سی"

وہ پھر ہنسی، پھر جسم کی ایک ایک رگ، ایک ایک عضو ہنسا، پھر اُس کی بوٹی بوٹی نے سرسمدر کو چھیڑا۔ "دیکھئے سرسمدر آپ نے پھر غلطی کی۔ راجکماریوں سے زیادہ تو اِن کی ساریاں خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"آپ کا ذہن ایسا ہی تیز ہے جتنی آپ کی صورت دلکش ہے۔ . . . چھایا دیوی آپ نے فلم کی زندگی ناحق چھوڑی۔ مجھے یقین ہے اب بھی آپ واپس جائیں تو بمبئی میں تو کوئی اور ایکٹرس آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"وہ دن گذر چکے" چھایا نے کہا۔ "اب اس مارکٹ میں میری ساکھ نہیں رہی۔ ہاں اگر مجھے کسی بڑے آدمی کی مدد مل سکے تو شاید ——" اور اُس کی بھوری آنکھوں نے سرسمدر کی آنکھوں کو چھیدنے کی پوری کوشش کی، اس کا جسم رقص کے آخری گھماؤ میں سرسمدر کے جسم سے اس قدر قریب آگیا کہ اس قربت کی تیزی نے وی آنا کے والٹس کے آخری گھُماؤ کو دس درجہ اور زیادہ تیز کر دیا۔

میز کی طرف واپس آتے ہُوئے اُس نے کہا۔ "شکریہ چھایا دیوی . . اس مسئلے کے متعلق پھر تفصیل سے بات چیت کریں گے۔ آپ دو ایک روز

میں مجھ سے آفس میں ملیں ... مجھ سے جو ہو سکے گا ... بمبئی کی تمام فلم ایجنسیوں میں آپ ... ."

شیریں اکرام بھائی کی گود میں بیٹھی تھی۔ سرسمدر نے ویٹر سے اور وسکی اور سوڈا اور خواتین کے لئے کاک ٹیل لانے کو کہا۔ آفریدی نیچے مہاراجہ کے پاس گیا تھا۔

شیریں نے اکرام بھائی کے کالر کو چھیڑتے ہوئے پوچھا "اس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے۔ اور اُس نے دور ایک پردے کی طرف اشارہ کیا۔

سرسمدر نے جواب دیا "بڑا خراب بھیڑیا"۔

"اوہ" شیریں نے مصنوعی طور پر سہم کے کہا۔

آفریدی آگیا۔ اور دوسرا ناچ لیمبتھ واک شروع ہوا۔ آفریدی نے چھایا اور اکرام بھائی نے شیریں کو سنبھالا۔ دونوں لڑکیوں نے سرسمدر سے معافی مانگی۔ اُس نے بھی اجازت چاہی وہ خود متوسط طبقے کی اس صحبت سے سیر ہو چکا تھا۔ چوڑے چوبی زینے اُتر کے پھر اُس نے نیچے کی رقص گاہ کا قصد کیا راستے میں کوموڈور نشے میں دُھت بحری فوج کے ایک اور افسر سے کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا "میرے خیال میں لیڈی سمدر بہت آسانی سے ... ."

سرسمدر کو دیکھ کر اُس کے ساتھی افسر نے کہا "ششش شش شش"۔ نشے میں جھوم کر کوموڈور نے کہا "ششش شش شش"۔ اور دونوں دوسری طرف مڑ گئے۔ رقص گاہ کے ایک ستون کے قریب اُس کی بیوی رگھوبیر سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھیں ایک نوجوان افسر کے چہرے پر جمی تھیں جو دور کھڑا ہوا کسی انگریز لڑکی سے باتیں کر رہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے مائیکروفون پر فرانسیسی گیت گائے تھے۔ ایک ہندوستانی فوجی افسر چیکوسلواکیہ کے سفارت خانے کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا "یہ ٹیکسی ناچنے والی" (وہ لڑکیاں جو دس روپیہ چندہ داخل کرنے پر آپ کے ساتھ ایک ناچ ناچتی ہیں)۔ یہ جو ادھر سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑی ہے۔ مس اسکرین۔ ڈورا اسکرین ذرا اس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل۔ اگر یہ تیار ہو جائے تو میں آج اس سے شادی کر لوں"۔ ... سرسمدر نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اونچا قد، دبیز جسم، سینے خوب اُبھرے ہوئے، اینگلو انڈین۔ وہ مسکرایا اُس نے اپنی بیوی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ لیمبتھ واک ... ناچنے والوں کے ہجوم میں اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ایک جھٹکے میں وہ رگھوبیر کے جسم پر آگری، دونوں ہنسے، اور جھٹ گئے اور پھر ناچنے لگے۔

"تیتری میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے"۔ وہ تلخی سے مسکرایا۔ اور قطب شمالی والے کمرے کی طرف چلا۔ بوڑھا سر نوشیرواں افراسیاب اب بھی وہیں تھا۔ اور وسکی پر وسکی چڑھائے جا رہا تھا "ہیلو سمدر! خوب لطف اُٹھا رہے ہو؟"

ناچ ختم ہوا مائیکروفون پر کسی نے اعلان سنایا "ہسپانیہ کے مظلوم پناہ گیروں کی امداد کے لئے لندن کے لارڈ میئر نے جو چندہ جمع کرنا شروع کیا ہے۔ اُس سلسلے میں ہم بمبئی سے بھی حتی الامکان مدد کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مجھے اُن رضاکار خواتین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے آج کے شو اور ناچ کو کامیاب بنانے کے لئے خاص طور پر محنت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تعریف کی مستحق مس ڈورا اسکرین ہیں۔ مس ڈورا اسکرین بارسلونا کی فتح کے وقت اسپین میں موجود تھیں۔ انہوں نے وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اُس شولری کے جذبے کے تحت جو نوجوانی اور انسان پرستی ہی کا حصہ ہے مس ڈورا اسکرین کے ایک پیار کا نیلام ہوگا ... " یہ کہہ کے وہ ہنسا۔ مجمع نے زور و شور سے تالیاں بجائیں۔ ہال میں مرد عورت سب سانس تھامے کھچا کھچ بھر گئے۔ جو پیچھے تھے وہ اسٹولوں پر کھڑے ہو گئے۔ مس اسکرین۔ ڈورا۔ سینے خوب اُبھرے ہوئے، دبیز جسم، اونچا قد۔ ذرا اُس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل۔ آرکسٹرا کے تخت پر مسکراتی کھڑی تھی، تبسم اور آنکھیں دونوں میں چمک تھی اور شاید شرم کی بھی ذرا سی جھلک ہو۔ پھر پیار کا نیلام ہوا۔ پچاس سے شروع۔ سو ہوا تو کپتانوں نے بولی بند کر دی۔ ہزار تک بڑے تاجر، کارخانوں کے مالک بولیاں بولتے رہے۔ اُس کے بعد صرف کروڑپتی اور مہاراجے باقی رہ گئے اور بالآخر مہاراجہ وشواشونگر نے چار ہزار چھ سو روپیہ میں مس ڈورا کا ایک بوسہ خریدا۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے آگے بڑھے، اور بڑھاتے گئے۔ اُن کی گھنی، خضاب لگی ہوئی مونچھوں نے ڈورا اسکرین کے لبوں کو ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے لئے چھوا۔ اور پھر حسینہ نے ہنس کے اپنا منہ ہٹا لیا۔ مہاراجہ کے تینوں بیٹے مہابیر، رگھبیر اور رگھوبیر مجمع کے پیچھے آپس میں کچھ کہہ کے ہنسے اور ٹہلنے لگے۔

اور سمدر سوچنے لگا "کیوں؟ نیلام کیوں؟ کیا مہاراجہ یوں چار ہزار چھ سو

نہیں دے سکتے تھے۔ یا نیلام ہی ہونا تھا تو کسی اور چیز کا کیوں نہیں ہوا۔ پکاسو کی کسی تصویر کا نیلام ہو سکتا تھا۔ جو جمہوریت پسندوں کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ یا کسی اور تصویر کا، کسی بلا کا نیلام ہو سکتا تھا۔ ایک عورت کے بوسے کا انعام کیوں؟ کیا وہ بھی تجارت کا مال ہے؟"

تجارت کے مال کا خیال آتے ہی سمدر کو اپنی بیوی چندرا کا خیال آیا۔ اپنی بنائی ہوئی تیتری کا۔ یہ پر پرزے اُسی نے تو نکالے تھے۔ پروں کی جگہ ریشمی ساڑیاں سینکڑوں کی، ہزاروں کی ساڑیاں۔ پر نکل چکنے کے بعد اُڑنے سے کون روک سکتا ہے۔ اِدھر اُدھر اُس نے اپنی بیوی کو ڈھونڈھا۔ قطب شمالی والے کرہ کے دروازے پر سگریٹ کے دھوئیں میں اُس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔

آہستہ سے چندرا کے پاس جا کے اُس نے کہا۔ "ڈارلنگ اب گھر چلوگی"۔ چندرا مسکرانے لگی۔ چھایا کی طرح اُس کے دانتوں اور پلکوں نے مل کے جال بچھایا۔ "اب تو کہیں جا کے پارٹی پُر لطف ہو رہی ہے۔ اور آپ ابھی سے چلنے کو کہتے ہیں"۔

"تو پھر ڈارلنگ مجھے اجازت دو۔ صبح سویرے مجھے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی ایک مجلس میں جانا ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ راجکمار رگھبیر سے کہنا وہ تمہیں گھر چھوڑ دیں"۔

آخری جملے کے طنز پر چندرا کے لبوں نے ذرا پیچ و تاب کھایا۔ مگر فوراً ہی سنبھل کے وہ مسکرانے لگی۔ اور اس کے ماتھے کی بندی کھل سی گئی۔

"شکریہ۔ ڈارلنگ" اُس نے اپنے شوہر سے کہا۔

ناچ تو شاید دو ڈھائی بجے ختم ہو گیا ہوگا مگر صبح کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر آئی۔ رگھبیر ہی کی موٹر میں گاڑی سے اُترنے کے بعد رگھبیر نے چندرا کے ہاتھ کو ایک طویل بوسہ دیا۔ پھر سمدر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور سوتا بن کر مسہری پر لیٹ رہا۔ چندرا دبے پاؤں آئی —— اُس کی مسہری کے قریب۔ ایک لمحہ تک وہ سوچتی رہی کہ اپنے سوتے ہوئے شوہر کو پیار کرے یا نہیں؛ پھر اُس کے چہرے پر تلخی کی سیاہی، اور اُس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز کجی پیدا ہوئی۔ اور وہ ساری کو فرش پر پھینک، اپنی مسہری پر لیٹ رہی۔

سات بجے سر سمدر اٹھے۔ اُن کی تیتری مسہری پر غافل پڑی سو رہی تھی۔ اس کے پر توڑنا کس قدر آسان تھا؛ پر چاندی ہی کے تو تھے۔ چاندی کا دروازہ بند کر دو۔ تیتری اور اس کے پر دونوں غائب۔ اور تیتری پھر کملا کیڑا بن جائے گی

ایک طلاق کے بعد دوسرا ملنے میں اتنی آسانی نہ ہوگی۔ مگر اُنہیں چندرا پر بڑا ترس آیا۔ اُن کی بیوی مگر سن میں اُن کی بیٹی کے برابر۔ اور وہ سوچنے لگے۔ کہ اُن کی بیٹی ہوتی تو کیا وہ اُس کے پر نوچتے۔ کیا وہ اُسے روتا دیکھ سکتے۔ . . . اپنے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ اُنہوں نے ملتوی کر دیا۔

کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔ ہم سب میں زیادہ فیاض کون ہے —— میں؟ جو مالک ہوں اور اپنی ملکیت پر جبر نہیں کرتا؛ یا ڈورا جس نے اپنا پیار بیچا؛ یا میری چندرا جس نے اپنی ریشمی آرام و آسائش کے لئے اپنے والدین کو اپنا جسم میرے ہاتھوں بیچ لینے دیا۔ وہ ہنسا۔ سماج کے اس کھنکھتے ہوئے راج میں کون فیاض ہے؛ کون فیاض رہ سکتا ہے؟ یہاں تو ہر طرف لین دین ہی لین دین ہے۔ یہاں شکر و شکایت اور گلہ شکوہ کیا؟

(۵)

رات کے ساڑھے سات بجے کے قریب صغیر اپنے چھوٹے سے فلیٹ کو واپس آیا۔ ماہم میں مچھلیوں کی بُو یہاں تک آتی تھی۔ مگر شہر میں فلیٹ مہنگے تھے۔ دروازہ مقفل تھا جس کے معنی یہ تھے کہ ناصید جہاں، اس کی بیوی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ابھی تک نہیں آئی تو کھانا کب پکے گا۔ قریب کے ایرانی ہوٹل کے کھانے کا نام سن کر اُسے اُبکائیاں آتی تھیں۔

ہندوستان میں اشتراکی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ ہیں جن میں سے صرف چند کو "قلب او کافر، دماغش مومن است" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پہلی قسم کے زیادہ تر اشتراکی گورنمنٹ آف انڈیا یا صوبجاتی سرکاروں میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ملک کے بہت سے ادیب، بہت سے شاعر، بہت سے اخبار نویس اسی قسم میں گنے جا سکتے ہیں۔ اگر وجہ جواز کی کمی تھی تو جون ۱۹۴۱ء سے وجہ جواز بھی مل گئی۔ اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی مالا بار ہل بمبئی یا جوبلی ہل حیدر آباد یا مال لاہور یا کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی میں قیام کرے اور اشتراکی ہونے کا دعویٰ کرے۔ ان میں سے ممکن ہے۔ بعض ایسے ہوں۔ جنہیں اشتمالی تحریک سے تھوڑی بہت ذہنی ہمدردی ہو۔ مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو وقت آنے پر اپنے فیشن ایبل پتے تک سے دست بردار ہونے کو تیار ہو۔ دوسری قسم کے اشتراکی وہ ہیں جو برسوں جیل بھگت چکے ہیں۔ مزدوروں کے ساتھ رہ کے انہیں کی خوراک کھا چکے ہیں۔ بیماریوں میں ایک خوراک دوا کے لئے ترس چکے ہیں۔ ایسے اشتراکیوں میں سے بہت سوں نے

کبھی سرکاری یا کسی اور آرام دہ ملازمت کی کوشش نہیں کی۔ جب موقع آیا تو اُس سے انکار کیا اور ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو اپنے لئے آرام طلبی یا جاہ طلبی کا بہانہ نہیں بنایا۔

صغیر اور اس کی بیوی ناہید جہاں دونوں کا شمار اس دوسرے قسم کے اشتراکیوں میں تھا۔ وہ اگرچہ یوپی کا رہنے والا تھا۔ لیکن عرصے سے بمبئی میں سُوت کے کارخانے کے مزدوروں کی تنظیم کرتا رہا تھا۔ اُس کی قابلیت اور اُس کی خوبی تحریر کو دیکھ کر اب دو تین سال ہوتے ایک مقامی قومی اخبار میں اُسے ڈیڑھ سو روپیہ کی جگہ دی گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں، اور وہ بھی بمبئی کی زندگی کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ کیا ہوتے ہیں۔ لیکن اب وہ تنہائی اور ٹھوکروں کی زندگی سے تھک گیا تھا ——— بیزار نہیں ہوا تھا۔ وقت پڑے تو وہ اب بھی ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار تھا ——— لیکن دو سال کی جیل، خراب غذا، دن رات بیمار۔ مزدوروں کی قربت کی وجہ سے وہ تھک ضرور گیا تھا۔ اس نوکری نے اُسے دم لینے کی ذراسی مہلت دی۔ اور قدرت نے اُسے ایک رفیق بھی عنایت کیا۔ یہ رفیق یا رفیقہ حیات اُس کی بیوی ناہید جہاں تھی۔ اس نے ایک متوسط طبقے کے بورژوا خاندان سے بغاوت کی تھی۔ تعلیم مکمل کئے بغیر چل کھڑی ہوئی تھی۔ آل انڈیا نرسس ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں اس نے نرسنگ کی تربیت البتہ حاصل کر لی تھی اور اس کے سوا اسے لکھنے کا سلیقہ تھا۔ اردو افسانے اچھے خاصے لکھ لیتی تھی اور رسالوں سے کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ افسانوں کے دو تین مجموعے بھی چھپ چکے تھے جن سے یکمشت آمدنی ہو جاتی۔

صغیر سے ناہید جہاں کی ملاقات دہلی میں نئے ادیبوں کے ایک جلسے میں ہوئی۔ ناہید کا پہلا عاشق اُس سے الگ ہو چکا تھا اور اُس کی یادگار اُس کا پہلا بچہ اس زندگی سے، اب وہ تیس سال کی تھی، لیکن اب بھی اُس کے کندنی جسم پر زردی اور جھُریاں کہیں پھٹکنے نہ پائی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں کے چہروں کی بے رونقی کے دو اسباب ہو کرتے ہیں۔ پہلے تو اس بے رونقی کا باعث تازہ اور صاف ہوا کی کمی تھی۔ بڑی حد تک یہ سبب اب بھی باقی ہے۔ لیکن ایک تھوڑی سی تعداد ایسی لڑکیوں کی بھی ہے ——— خصوصاً بڑے شہروں میں ——— جن کے نزدیک تازہ اور صاف ہوا کے استعمال کی واحد شکل یہ ہے کہ اُن کا چہرہ طرح طرح کے غازوں، لوشنوں، کریموں سے تھوپا اور رنگا جائے۔ تاکہ جب وہ ہوا کھانے نکلیں تو دائیں بائیں دونوں طرف چاہنے والوں کے جنازے نکل جائیں جس پارٹی میں وہ جائیں وہاں آدھے نوجوان تو دیکھتے ہی بیہوش ہو جائیں۔ اور باقی آدھے جو بیہوش نہ ہوں وہ سجدے میں گر پڑیں۔ ناہید نے پہلے سبب سے بغاوت کی تھی، اور دوسرے سے احتیاط برتی تھی۔

صغیر کے چہرے پر البتہ زردی تھی۔ تھکن کی، زخمی سپاہی کے رخساروں کی زردی۔ زردی جو اُس کے دُبلے رخساروں سے ہو کر اُس کی مونچھوں تک چلی گئی تھی۔ اس دُبلے لانبے چہرے پر مونچھیں کتنی دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ دلچسپ لیکن مضحکہ خیز نہیں۔ کیونکہ صغیر کی آنکھیں اگرچہ اندر دھنس گئی تھیں۔ اُن میں اب بھی کشش تھی۔ اب بھی ایک طرح کی جاذبیت تھی۔ اُس کے دُبلے لانبے چہرے کے خدوخال میں اب بھی تناسب تھا۔ اُس کا سینہ بھی اندر کو دھنس رہا تھا۔ مگر ناہید جانتی تھی اس کا علاج کتنا آسان ہے۔ حیاتین ا اور د۔ اور سینہ کی مچھلیاں پھر اُبھر آئیں گی۔ اُسے خود اپنی تیس سال کی عمر کا احساس تھا۔ اُسے بھی رفاقت کی ضرورت تھی۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد، چند روز ساتھ پھرنے کے بعد اُس نے صغیر کے لئے ایک طرح کی محبت محسوس کی۔ ایسی محبت جو والہانہ عشق کے مقابل اُنس سے زیادہ قریب تھی۔ ہمدردی، اُنس، رفاقت، دلسوزی انسانیت کی محبت ——— اور اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔ ناہید اپنے میاں کے ساتھ بمبئی گئی۔ جہاں اُسے ایک ہسپتال میں میٹرن کی جگہ مل گئی۔ اور اُس نے آہستہ آہستہ نرسوں کی تنظیم شروع کی۔

اُس روز صغیر نے اپنی کھادی کی شیروانی اتاری۔ کھادی کے کرتے اور پاجامے کو اُس نے بڑے چوکور آئینے میں دیکھا جس میں ناہید، جو لبوں پر سرخی نہیں لگاتی تھی، اپنے گداز، بھرے ہوئے جسم، چوڑے صحت مند سینے اور اُس پر سادہ یونیفارم کی بہار دیکھ لیا کرتی تھی۔ خصوصیت سے وہ اپنے بالوں کا تماشا دیکھتی جو اُس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ اور صغیر کو ان بالوں سے عشق تھا۔ آئینے میں اپنے کھدر کے لباس کو دیکھ کر صغیر کو ذرا سی کوفت ہوئی۔ چند تناسب جسموں پر تو بے شک کھدر اچھے سے اچھے کپڑے سے زیادہ کھلتا ہے۔ ورنہ عموماً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کسی پتیلے تکیے اور کسی گاؤ تکیہ پر کسی نے موٹا جھوٹا غلاف چڑھا دیا ہو۔

اُس کے لکھنے کے میز پر ایک چٹھی تھی۔ "میں مقبول کے ساتھ سینما دیکھنے جا رہی ہوں۔ ممکن ہے مجھے واپسی میں دیر ہو۔ نعمت خانے میں کچھ سینڈوچ اور بسکٹ رکھے ہیں۔ ناہید۔"

صغیر اس چٹھی کو پڑھ کے سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اُس کا دماغ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ اُس کی متاہل زندگی میں یہ پہلی بار تھی کہ اُس کی بیوی، اُس کے کسی دوست کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ اور شاید تنہا۔ کم از کم مقبول دادر میں سیوا جی پارک کے قریب تنہا رہتا تھا۔ صغیر اپنے آپ سے حجت کرنے لگا۔ مجھے یہ فرض کر لینے کا کیا حق ہے کہ وہ مقبول کے ساتھ تنہا سینما گئی ہے۔ ممکن ہے اور بھی کئی لوگ ہوں۔

وہ اپنے میز پر بیٹھ کے کام کرنے لگا۔ آج کل وہ اس مبحث پر تحقیق کر رہا تھا کہ کیا مارکسیت مذہب کی غیر معاشی قدروں کو برداشت کر سکتی ہے۔ یہ شبہ اُس کے دل میں عرصے سے کھٹک رہا تھا۔ کہ مارکس معاشیین کا امام فلسفیانہ اسلحہ سے اچھی طرح مسلح نہیں تھا۔ مابعد الطبیعات پر اچھی طرح حاوی ہوئے بغیر فلسفے اور مذہب کو اُنہیں کے ہتھیاروں سے شکست دیئے بغیر مادیت ارتقا بالضد کوئی باقاعدہ فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ وہ عملی نظام بن جائے لیکن فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ مارکس کے بہت سے عقیدتمندوں نے اس قسم کا شک محسوس کیا تھا۔ مثلاً بازارف، بوگدانوف، لوناچارسکی، برمن۔ ہل فونڈ، یوش کے وچ اور سودروف۔ اِنہی کے جواب میں لینن نے "مادیت اور تجرباتی تنقید" لکھی تھی۔ لیکن لینن کے دلائل سے صغیر کی تشفی نہیں ہو سکی تھی۔

وہ کام کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے۔ لیکن ناہید نہیں آئی۔ اب تک اُسے آ جانا چاہیئے تھا۔ سینما زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ لوگ فورٹ کے کسی سینما کو گئے ہوں۔ ممکن ہے بس ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اُس نے نعمت خانے سے سینڈوچ نکال کے کھائے۔ پھر کام کرنا چاہا۔ مگر ناہید کی ہنستی ہوئی صورت، اُس کے بھرے بھرے بارونق گال، اور سفید دانت، اُس کے چوڑے شانے، اُس کے جسم کی گرمی برابر حائل آ جاتے اوراق کو دھندلا کر دیتے۔ سطروں کا مطلب خبط کر دیتے۔ دماغ کی منطقی رفتار میں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے۔ استدلال کے سامنے یکلخت اعصابی پہاڑ، جذباتی خندقیں پیدا کر دیتے۔ ایک خلا پیدا ہو جاتا اور دل میں ایک طرح کا درد سا ہونے لگتا۔

پھر گیارہ بجے دادر کی طرف سے اور فورٹ سے معلوم نہیں کتنی بسیں آئیں۔ اور سامنے کی سڑک سے شور مچاتی گزر گئیں۔ اُس نے لینن کی کتاب اور اپنی نوٹ بک دونوں کو بند کیا اور ٹہلنے لگا۔ اب پہلی مرتبہ ایک عجیب طرح کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ ایسا جذبہ جو اگر تکمیل کو پہنچے تو صدمہ کہلائے۔ لیکن اس ابتدائی درجے میں اُس کے لئے کوئی نام نہیں تھا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ، اس کے متوازی ایک اور جذبہ تھا، خلجان کا سا۔ اس کا نام متعین تھا۔ شک۔

اُس نے سگریٹ سلگایا اور ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا کہ مجھے شک اور کسی قسم کے صدمے کا حق ہی کیا ہے۔ ناہید یا اُس کا جسم میری ملکیت تو ہے نہیں کیا اس مہاجنی تمدن سے پہلے بربریت کے سنہری دور میں تمام عورتیں، تمام مردوں اور تمام مرد تمام عورتوں کی ملکیت نہیں ہوتے تھے۔ ممکن ہے یہی قانون فطرت ہو۔ ممکن ہے "جوڑے دار" شادیاں قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہوں۔ تمدن کی صبح کاذب کے ساتھ ساتھ یہ شادیاں وجود میں آئی ہیں۔ پہلے مائیں بہنیں حرام ہوئیں، پھر قبیلے کی عورتیں حرام ہوئیں۔ پھر ایک مرد اور ایک عورت کی جوڑے دار شادیاں ہونے لگیں۔

اور وہ سوچتا رہا۔ قانونِ فطرت؟ لیکن انسان کا کام تو فطرت کے قانون کی پابندی نہیں، اُس کی تسخیر ہے۔ ہل اور ٹریکٹر، دوربینیں اور خوردبینیں سب قانون فطرت توڑنے کے لئے ہیں۔ زمین اور زندگی اور ستاروں پر انسان کے حکم چلانے کے لئے ہیں۔

ناہید۔ ناہید۔ ناہید ابھی تک نہیں آئی اور مقبول یقیناً خوبصورت ہے۔ چھ فیٹ دس انچ قد۔ پنجابی۔ سرخ و سفید۔ لڑکیوں کی حد تک تو وہ اسم بامسمّٰی ہے۔ سب کی سب اُس پر کیسے مرتی ہیں۔

پھر دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ ہی سے جلا کے اُس نے سوچنا شروع کیا۔ ناہید اور مقبول۔ لیکن اِن جوڑے دار شادیوں میں صرف ایک شریک حیات کی پابندی عورتوں ہی پر لازم قرار دی گئی۔ عصمت کا مطالبہ صرف اُن سے کیا گیا۔ رہ گیا یہ نظریہ کہ عصمت کی قید عورتوں نے خود اپنے اوپر عاید کی ہے۔ اس کے معاشی وجود کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت نکلے۔ جب عورت اس قدر قربانی پر تیار ہو گئی تو مرد جو مویشیوں اور غلاموں کو اپنی خدمت اور مزدوری کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ عورت کو بھی اپنی خادمہ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ انسان قدیم کی سمجھ میں آ گیا کہ بچے کی پیدائش میں باپ کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔ حقِ مادری اور قانونِ وراثت مادری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ عورت کی جنس کو پوری معاشی اور عمرانی شکست ملی۔ کیا ناہید بھی میری اس

طرح کی باندی، اس طرح کی کنیز ہے۔ کیا اور سب آزادیوں کی طرح جنسی آزادی کا سوال خود بخود نہیں پیدا ہوتا۔ لاطینی لفظ "فیمولس" کے معنی گھریلو غلام کے ہیں اور فیمیلیا کے معنی غلاموں کی اُس کل تعداد کے ہیں، جو کسی ایک مرد کی ملکیت ہو۔ یہی لفظ فیمیلیا آج بھی اطالوی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

عورت کس لئے دوسرے مردوں کے پاس نہ جائے۔ اسی لئے نا کہ وراثت پدری کی حد تک شک کا امکان باقی نہ رہے۔ میاں صغیر تمہارے پاس کونسا اثاثہ، کونسی جائیداد ہے؟ رفتہ رفتہ عصمت کا یہ تخیل کم از کم مشرق میں اپنے معاشی پس منظر سے نکل کر مقصود بالذات بن گیا۔ عزت کو مال اور جان دونوں سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ ہم مشرق ہمیشہ تصورات کے دیوانے رہے ہیں۔ . . . از بام خانہ تا بہ ثریا از آنِ من۔ مشرقی مرد تو ہمیشہ بام خانہ سے ثریا تک علم کلام، مجادلے، عزت نفس، عصمت تخیل کے ہوائی قلعے بناتے رہتے اور بام خانہ کے نیچے رہنے والی گھر والی کو انہوں نے ان خیالی محلوں کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ امیر خسرو اپنی لڑکی کو دیوار کی طرف پُشت کرکے بیٹھے رہنے کی تعلیم دیتے رہے۔ کبھی کبھی مرد بھی ان ہوائی قصروں سے نیچے اُتر آتے۔ اور مرد پرستی اور بہیمیت کے گندے دلدل میں ایسے غوطے لگاتے کہ حیرت ہوتی۔ . . .

ابن یمین . . . اُس کا دیوان بڑی آب و تاب سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ صغیر اُس کے ورق الٹتا رہا اور صرف موعظت اور پند اور حق پرستی ہر ہر شعر سے ہویدا تھی۔ یہاں تک کہ وہ ایک غزل پر پہنچا۔ ایسی فحش غزل کہ میرزا کانی اور جعفر زٹلی شرما جائیں۔

ابن یمین کے دیوان سے اُس کے دماغ کی منطقی حرکت جو اُس کے جذباتی بے چینی سے برابر لڑ رہی تھی پھر اُسے گھریلو عورت کی طرف واپس لے آئی۔ اور صغیر نے سوچنا شروع کیا۔ قرونِ وسطیٰ بلکہ یونانِ قدیم کے —— اور پھر الف لیلا کے وہ دو مشہور ڈرامائی کردار۔ چالاک عاشق اور بیوقوف شوہر وہ ڈرامہ جس کو اینگلز نے بڑی خوبصورتی سے اس ایک جملے میں بیان کیا ہے۔ شوہروں نے بیویوں پر فتح پائی، لیکن ان شکست کھانے والیوں نے اپنی عالی ظرفی سے فاتحوں کے لئے تاج کا انتظام کر دیا۔ . . . اور تاج! فرانسیسی اور سترہویں اور اٹھارویں صدی کے انگریزی ڈرامہ کا وہ سینگوں کا تاج۔ سینگوں کا تاج جو غریب شوہر کو تو نظر نہیں آتا۔ لیکن جسے اور سب دیکھ دیکھ کے ہنستے ہیں۔ سینگوں کا تاج جس کے معنی یہ ہیں کہ اس بادشاہ کی ملکہ ہرجائی ہے۔ اِس بادشاہ کی ملکہ دوسرے مردوں کے جسم سے واقف ہے

اس رفتارِ تخیل سے ایک منٹ کے لئے صغیر کا جذبۂ رشک، سارے دماغی استدلال پر حاوی ہو گیا۔ آئینہ میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا جو لال ہو رہا تھا۔ اُس کے زرد چہرے کو لال ہونے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ یہ سرخی زردی کی ضد نہیں، اُس کی انتہا تھی۔ آئینے میں اُسے اپنے سر پہ کہیں سینگ نظر نہیں آئے۔ خدا کا شکر ہے۔ دُنیا، یہاں تک کہ ہندوستان۔ کم سے کم شہروں کا ہندوستان —— قرونِ وسطیٰ کو صدیوں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ورنہ سینگوں کا اُگ آنا کچھ عجیب بات نہ ہوتی۔ اب ہنسنے والوں کے حربے دوسرے ہیں۔ زیادہ تر تو پیٹھ پیچھے بھونڈا مذاق کرکے، جس میں جنسی فعل کی طرف بازاری اصطلاح میں اشارہ ہوتا ہے۔ ہنس لیتے ہیں اور معاملہ رفت گذشت ہو جاتا ہے۔ بعض خدا بیدردی سے بدنصیب شوہر کے سامنے بھی ذکر کر دیتے ہیں، لیکن صاف صاف نہیں، اشارتاً اور طنزاً۔ اور اس امر سے بالکل مطمئن کہ اُن کے اپنے گھر محفوظ ہیں۔ ذرا مسخرے اپنے گھروں کی تو نبض دیکھیں۔

لیکن اسی درمیان میں انسان نے جنسی تعلق میں ایک ایسا ارتقائی جذبہ تخلیق کیا ہے۔ جسے کوئی اور حیوان نہیں جانتا۔ عشق کا جذبہ، والہانہ کشش کا جذبہ، ایک دوسرے کے لئے مکمل قربانی اور کامل ایثار کا جذبہ۔ اگر اُس کی اور ناہید کی شادی کی تہہ میں یہ جذبہ کسی نہ کسی طرح پیدا ہو چکا ہے۔ تو دونوں فریقوں پر عصمت واجب آتی ہے۔ تب تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں اور دونوں میں سے کوئی کسی اور کے لئے نہیں۔ . . .

سینما کے بعد مقبول کے فلیٹ میں وہ انتظار کرتی رہی۔ یعنی اُس کا تحت الشعور انتظار کرتا رہا کہ جو حسین نوجوان اُس کے سامنے صوفے پہ بیٹھا ہے۔ اب اُس کا ہاتھ اُس کے جسم سے مس کرے گا۔ اب اُس کے لب، اُس کے اپنے لبوں کو طلب کریں گے اور ناہید خود اپنے آپ کو کوئی جواب نہ دے سکی، کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر ہاتھ بڑھیں یا لب قریب آئیں تو وہ مزاحمت کرے یا نہیں، اور مزاحمت کرے تو کس قدر۔ وہ خود تو جانتی نہ تھی۔ شاید عین وقت پر وہ تصفیہ کر سکتی۔ کھانے کے بعد اس تنہائی میں اور سب طرح کی باتیں ہوئیں۔ کاغذ کے کارخانوں کے مزدوروں کی انجمن کے متعلق جس میں مقبول کام

کر رہا تھا۔ نرسوں کی زندگی کے متعلق۔ جنگ اور جدید ادب پر تبصرے ہوئے۔ کچھ مشتبہ مذاق بھی ہوا اور مقبول نے ناہید کے حُسن کی تعریف بھی کی۔ لیکن عاشقی کی تھوڑی بہت کوشش کی تو صرف آنکھوں میں۔

اور آنکھوں کا باہمی ربط ناقص سا تھا۔ ایک طرح کی جنسی کشش ضرور تھی۔ لیکن نگاہوں کا ربط جذبِ مطلق کا ربط نہیں تھا۔ مقبول کو اپنے دوست کا، اور ناہید کو اپنے شوہر کا لحاظ تھا۔ اور یہ لحاظ نہ بھی ہوتا، تب بھی نگاہوں میں صرف گنگنی سی گرمی تھی، آگ نہ تھی اور بجلی کا تو کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ اس لئے نہ ہاتھوں نے ربط قائم کرنے کی کوشش کی، نہ لبوں نے۔

مگر نگاہوں کی یہ ہلکی سی کشش کیا تھی؟ اور اس سے عارضی لطف کیوں حاصل ہوا؟ یہ سوال ناہید نے مقبول کے فلیٹ سے واپس ہوتے ہوئے سوچا۔ غالباً اس قسم کی خفیف سی جنسی کشمکش جو جسمانی ربط کی طلبگار تھی ایک طرح کا نفسیاتی سیفٹی والو ہے۔ ایک مرد سے والہانہ عشق کے بعد جذبات کی سیرگاہ۔ دل کی خفیہ تمنائیں نکالنے کا ایک بے خطر ذریعہ۔ شاید اسی لئے مغربی تمدن کا حکم ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ رقص نہ کریں۔ دوسروں کے ساتھ ناچیں۔ اور دعوتوں کے میزوں پر اپنے شوہر کے ساتھ نہ بیٹھیں دوسرے مردوں کے پاس بیٹھیں۔ انہی رعایتوں سے شاید یورپ نے ازدواجی زندگی کی عصمت کو کامیاب بنانا چاہا۔ مطلق العنانی حکمرانی کے سوا یہی ایک صورت تھی۔

اب ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ وہ بس سے اُتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بےچینی سے یہ خیال اُسے پریشان کرنے لگا کہ کہیں صغیر کو شک نہ ہو۔ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھ رہا ہو۔ اس کے بعد پھر عشقیہ ازدواجی زندگی میں ایک کانٹا سا کھٹکنے لگے گا۔ اسی لئے شاید عورتوں نے شروع شروع میں عصمت کو اپنے اوپر لازم گردانا تھا۔ پھر ناہید کو تعجب ہوا کہ کیوں وہ خود صغیر کے سامنے اپنی بریت پیش کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ معصوم ہے اور وہ صرف اُسی کو چاہتی ہے۔ آخر وہ اُس کی ملکیت تو نہیں۔

اور صغیر نے زینوں پر اس کے قدموں کی چاپ پہچانی۔ دروازہ کھولا وہ ہنستی ہوئی کھری آنکھیں، اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ دو گداز گورے ہاتھ بڑھے اور اِن ہاتھوں نے اس کے جسم کو گھیر لیا، دو گداز نازک لبوں نے اُس کے لبوں پر مہر لگا دی اور یہ بوسہ ایسا سچا، اِتنا والہانہ تھا کہ فریقین میں سے کسی کو نہ کچھ پوچھنے کی ضرورت رہی۔ نہ جواب دینے کی۔

"پیارے تم نے وہ سینڈوچ کھلئے۔ جلدی میں تمہارے لئے میں اور کچھ نہ بنا سکی۔ کہو تو ابھی انڈوں کا خاگینہ تل دوں۔"

تب وی تال نے پوچھا "مہاراج آپ بتایئے اِن تینوں میں سب سے زیادہ فراخدل اور فیاض کون تھا؟ مقبول جس نے اپنے دوست کا لحاظ کیا، یا صغیر جس نے عورت کی ذات اور اُس کے حق کا لحاظ کیا۔"

مہاراج تری دی کرم سینا نے کہا۔ "ویتال اس عجیب آنے والے زمانے کے لحاظ سے میں بھلا کیا تصفیہ کر سکتا ہوں کیونکہ تو کہتا ہے کہ اُس عجیب زمانے میں کشتیاں مچھلیوں کی طرح پانی کے اندر چلیں گی۔ اور مکان ہوا میں پنچھیوں کی طرح اُڑیں گے۔ اور لوہے کی نلیوں میں سے آگ نکلے گی۔ لیکن اس آگ کی بھٹی سے پگھل کر نکلنے کے بعد اگر انسان سچ مچ کھرا سونا بن جائے۔ اور ایسا واقعہ جیسا تو بیان کرتا ہے پیش آئے تو میں تو یہ کہوں گا کہ صغیر، ناہید اور مقبول تینوں برابر فیاض تھے۔ یا یہ کہ ان میں سے کوئی خاص طور پر فیاض اور فراخدل نہ تھا۔ ہر ایک اپنا اور دوسرے کا حق جانتا تھا۔ اور دل اور جسم کی محبت میں امتیاز کر سکتا تھا، ان دونوں کے فرق کو سمجھتا تھا۔"

"جے مہاراج کی" ویتال نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

بلونت سنگھ

لمس

آدھی رات کے بعد گیدڑوں نے "ہُوا ہو" کا شور مچانا شروع کیا تو کیا مجال رات بھر ایک لمحہ کو بھی زینب کی آنکھ لگی ہو۔ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں پہلے کی طرح ان کی کوئی مرغی نہ چوری ہو جائے۔ وہ انگریزی مرغی کھو کر اس کے دل کو کس قدر افسوس ہوا تھا۔ مرغیاں باہر دڑبے میں بند رہتی تھیں۔ اندر جگہ نہیں تھی۔ . . . تاریک اور خاموش رات میں مرغی کی ذرا سی آواز بھی سنائی دیتی تو وہ کولہوں پہ ہاتھ رکھ کر دڑبے کی طرف چل دیتی۔

رات بھر جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح جب وہ بستر سے اٹھی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا گھر چھوٹے سے قصبے کے ایک سرے پر تھا۔ کرایہ کا مکان بھی نہ تھا کہ بدل لیا جاتا۔ اپنا مکان بنوایا گیا تھا۔ ہر چند مکان میں جگہ بہت تنگ تھی۔ اور ان کا کنبہ مکان کی مناسبت سے بڑا ہی تھا۔ لیکن اس میں گزارا کرنا لازمی تھا۔

اس کا خیال تھا کہ آج وہ دن بھر کے کام دھندوں سے وقت نکال کر جی بھر کر سوئے گی۔ اس کا شوہر بڑی نہر پر ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا۔ گھر سے دو دو روز بلکہ اس سے بھی زیادہ غائب رہتا اور جب کبھی گھر آتا بھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ ادھر آیا، اُدھر گھر کے سامان کو اوپر تلے کیا۔ کبھی بچوں سے پیار اور کبھی اس سے۔ . . اور پھر سائیکل اٹھائی اور غائب۔

سورج نکل آیا تھا۔ وہ چارپائی پہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو ملنے لگی۔ اور تو اور آج اس کا چھ سالہ حنیف بھی اس سے پہلے جاگ اُٹھا تھا۔ شاید وہ رویا ہو اس نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن اس کی سیانی بیٹی روشنک اگرچہ ابھی گیارہ سال کی بچی ہی تھی۔ لیکن ان معاملات میں بہت سمجھدار تھی۔ اس نے بھیا کا دل پرچائے رکھا ہوگا۔ تبھی تو بیچارا معصوم بچہ فرش ہی پر پھسکڑا مارے میٹھا بسکٹ کے خالی ڈبے میں گتے کے پہیے لگا کر گاڑی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور روشنک اپنے بھیا کے قریب ہی بچھی ہوئی چٹائی پر پیٹ کے بل لیٹی کروشیے سے میز پوش کی جھالر بن رہی تھی۔ جب سے اس کا ایک لڑکا فوت ہوا تھا اسے اپنے بچوں سے اور بھی زیادہ محبت ہو گئی تھی۔

یوں بھی اُس کی آنکھیں خراب ہی تھیں۔ گرمیوں میں تو تھوڑی بہت سرخی اس کی آنکھوں میں ضرور دکھائی دیتی تھی۔ بعض اوقات دکھنے بھی لگتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ صبح اُٹھ کر پہلے وہ دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں کے مَیل کو صاف کرتی تھی۔ اور آج وہ اپنی آنکھوں کو اچھی طرح صاف بھی نہ کر پائی تھی کہ ماں کا محبت بھرا دل اُمڈ آیا۔ "اللہ خیر . . . میں واری جاؤں۔" کہتی ہوئی وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھی اور اپنے بچوں کو باری باری اس نے خوب سا پیار کیا۔ آج اسے اپنے بچے بہت ہی پیارے دکھائی دے رہے تھے۔

سب سے پہلے اِسے دہی بلونا تھا۔ سگھڑ عورتیں دہی بلونے کا کام تو تاروں کی چھاؤں ہی میں کر لیتی تھیں وہ خود بھی اس طرح کیا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب دہی کی مٹکی کے قریب پیڑھی پہ بیٹھی تو دل کو وہ اطمینان حاصل نہ تھا۔ اور پھر اب حنیف بھی اس کے گلے کا ہار ہو رہا تھا۔ بچے کو نہار منہ باسی روٹی پر مکھن رکھ کر کھانے کی عادت تھی۔ آج اتنی دیر ہو گئی تھی کہ بچارے سے بھوک برداشت نہ ہوتی تھی۔ وہ اسے پیار کر کے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ بس ٹھنکے جاتا تھا . . . وہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی۔ . . . ابھی کل تک اس کے گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ نہ معلوم کہاں کے رشتے دار آن ٹپکتے ہیں اگر کسی کے گھر میں قیام کرنا ہو تو یونہی دور کی رشتہ داریاں قائم کر کے انتہائی ڈھٹائی سے پاؤں جما دیتے ہیں۔ اپنے دُکھ سکھ میں ان کی صورت دکھائی تک نہیں دیتی یوں بھی چلے آئیں تو خیر لیکن وہ اپنے بیمار عزیزوں کو بھی اُٹھا لاتے ہیں۔ ایک دن پہلے جو مہمان رخصت ہوئے تھے وہ بھی اپنی ایک چھوٹی سی بیمار بچی کو علاج کی غرض سے لے آئے تھے۔ اور پھر ان کا ہر قسم کا خرچ یہاں تک کہ ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی قیمت بھی انہیں کے سر پڑی۔ اور اس پر قیامت یہ کہ ڈاکٹر نے جواب بھی دے دیا کہ لڑکی کا جانبر ہونا محال ہے۔ لیکن وہ لوگ اس وقت تک ان کے گھر سے نہیں ٹلے جب تک اُن کی بچی مر نہیں گئی۔ اندر والے جس کمرے میں بچی مری تھی۔ وہ اس کے فرش کو دھو ڈالنا چاہتی تھی۔ بلکہ وہ اس پلنگ کی نواڑ کو بھی دھلوا لینا چاہتی تھی۔ جس پر بیمار لڑکی پڑی رہتی تھی۔ ان سب باتوں

کو سوچ کر اسے عجب کراہت سی محسوس ہونے لگی۔ . . . اللہ ہی سب کا مالک ہے۔ . . لیکن اوروں کے گھروں میں جا کر مرنا سمجھی ہی کی بات تو ہے۔ . . . . ان سب کاموں کے لئے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔ ادھر حنیف تھا کہ بس روئے جا رہا تھا۔ . . . پہلے تو چمکارتی پچکارتی رہی آخر تنگ ہو کر اس نے زنّاٹے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ بہن اسے اٹھا کر پرے لے گئی پھر وہ دودھ بلونے لگی اور بچے کی چیخوں کی آواز سُن کر دوپٹے کے آنچل سے اپنے ہی آنسو پونچھنے لگی۔

خدا خدا کر کے دودھ بلویا ـــــ مکھن نکال کر لکڑی کے چوڑے دہانے والے برتن میں رکھا اور پھر آپ ہی آپ اس کی نظر اوپر اُٹھ گئی۔ اس جگہ کتے بھی بہت زیادہ تھے۔ ہر وقت ان کی جھپٹوں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ اس نے چھت پر صحن کے آر پار بان کی رسیاں باندھ رکھی تھیں۔ . . . لیکن اب اُس نے دیکھا کہ بچوں نے رسیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ اس طرح کام میں سے کام نکل آتا تھا۔ اور ہر ادھورے کام کو دیکھ کر اس کا دل پریشان سا ہونے لگتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی کہ ساتھ والے مکان سے بوڑھی جلاہی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اُوپر پہنچی تو معلوم ہوا کہ منڈیر پر رکھا ہوا اُپلا پچھواڑے رہنے والے جلاہوں کے گھر میں جا پڑا تھا۔ سڑیل مزاج دادی بکے جا رہی تھی اور بیچاری روشنک دم بخود کھڑی تھی۔ اتفاق کی بات حنیف کا ہاتھ لگنے سے ایک ہلکا پھلکا اپلا اُن کے صحن میں جا گرا تو کونسا قہر آ گیا۔ کوئی اینٹ پتھر تو نہیں کہ کسی کا سر پھٹ جاتا. . . . . لیکن بڑھیا مفت میں اس قدر تڑخ گئی تھی۔ اس پر اسے بھی غصہ آ گیا اور اس نے بھی کھری کھری سنا ڈالیں۔ ادھر سے بڑھیا کی بہو بھی ساس کی حمایت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگی۔ اس پر اسے اور طیش آیا۔ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اس قدر چیخی اور چلائی کہ گلا بیٹھ گیا بڑی مشکل سے جا کر کہیں امن قائم ہوا۔ . . . اور وہ رسیاں باندھ کر نیچے آئی۔

روشنک کے اسکول جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ حنیف کی عادت تھی کہ وہ بھی بہن کے ساتھ ضرور جاتا تھا۔ عام طور پر بچے اسکول جانے سے کتراتے ہیں۔ حنیف پڑھائی کے قابل تو نہ تھا لیکن وہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ اس نے جلدی سے توا چولہے پر رکھا۔ تاکہ بچوں کو کھلا پلا کر اسکول بھیجے اور بعد میں وہ باقی کاموں سے بھی نپٹ لے۔ پراٹھے پکتے اور کھانا کھاتے وقت بھی حنیف تھوڑی بہت چھین جھپٹ کرتا رہا۔ بہنیں بیچاری نیک ہی ہوتی ہیں۔ بھائیوں کی زیادتیاں چُپ چاپ برداشت کر لیتی ہیں ادھر وہ خود بھی چُپ تھی۔ حالانکہ حنیف کی چیخوں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ لیکن وہ اس خیال سے دل پر جبر کئے رہی کہ اب اگر اس نے بچے پر ہاتھ اٹھایا تو مفت میں گھنٹہ بھر تڑپا دے گا۔ کھانا کھا کر اسکول تو چلا ہی جائے گا۔

ابھی بچے تیار ہو ہی رہے تھے کہ نینو کمہارن چھم چھم کرتی آن ٹپکی۔ نینو کمہارن قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنے خاوند کے ساتھ گدھوں پر برتن لاد کر منڈی چک دین جاتی اور جب لوٹتی تو اس کا خاوند تو گدھے ہانکتا ہوا پون میل پرے گاؤں کو چلا جاتا لیکن وہ ان کے ہاں ضرور رک جاتی۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی ابھی لال جوڑا بھی نہ اُترا تھا۔ شادی سے پہلے اگرچہ ہاتھ پاؤں کی مضبوط تھی لیکن اس کا جسم کمزور تھا مگر شادی ہوتے ہی نہ معلوم اس پر کیا جادو ہو گیا کہ روز بروز اس کے جوبن میں چار چاند لگتے جا رہے تھے۔ کلے پھول رہے تھے۔ ان پر سرخی جھلک مارتی تھی۔ سارا جسم بھر گیا تھا۔ سانولا سلونا رنگ ایسا نکھرا کہ اب نیا ہی روپ نکل آیا۔ اور ادھر وہ خود تھی کہ شادی سے پہلے تو وہ اچھی موٹی تازی تھی۔ کیسے بھرے بھرے بازو اور کیا کاٹھ تھی اس کی۔ لیکن شادی کے بعد وہ روز بروز گھلنے لگی۔ کوئی ایسی فکر بھی نہ تھی۔ کھانے پہننے کو خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لیکن گال تھے کہ پچکے جا رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے تھے کہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ جسم تھا کہ اس میں بھرتی نام کو نہ رہی تھی۔

جب نینو چھم سے ان کے صحن میں داخل ہوئی تو سونی سونی فضا میں رونق دکھائی دینے لگی اور حنیف کا ایک پاؤں تو پائجامے کے پائنچے میں تھا اور ایک باہر کہ وہ اسے دیکھتے ہی جیسے رسی تڑا کر بھاگا اور دوسرے لمحہ میں نینو کی گود میں تھا۔

نینو کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا جس نے ایک مرتبہ اس سے بات کر لی بس اسی کا ہو رہا۔ ہنسی تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ باتیں تھیں کہ پھول جھڑتے تھے۔ صورت تھی کہ دل میں کھبی جاتی تھی۔ . . . انسان اس کی موہنی صورت بس دیکھا کرے۔ خدوخال تو خیر معمولی ہی تھے۔ لیکن چہرے کی رنگت اور صحت ایسی کہ بس جی ہی نہیں بھرتا تھا۔

اگر کبھی وہ مصروف ہوتی اور ایسے میں کوئی ملنے کے لئے آجاتا تو دل میں بُرا مان جاتی تھی۔ ہزار کوشش کرنے کے باوجود سیدھے منہ بات نہ کر پاتی تھی۔ لیکن نینو کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ وہ جب بھی پہنچ جائے۔ اسے اس کی آمد پر ہمیشہ دلی مسرت ہوتی تھی۔ نینو نہ صرف صورت اور سیرت ہی کی اچھی تھی بلکہ وہ تھی بھی چلبلی اور کام کرنے والی۔ . . . جب آتی کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ ذرہ برابر بھی تکلف نہ کرتی۔ اس لئے اس کا آنا مبارک ہی ہوتا تھا۔

روشنک اسکول کو چلدی۔ حنیف پٹ کر بیٹھا۔ نینو آئی ہوئی تھی اسے نینو سے بہت محبت تھی۔ بھلا وہ نینو کو چھوڑ کر اسکول کیوں جانے لگا۔ چنانچہ وہ نینو کی گود میں بیٹھا رہا۔ . . . نینو کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کا لڑکپن نہ گیا تھا۔ اسے اس قسم کے کئی چھوٹے موٹے طریقے یاد تھے۔ جن سے وہ حنیف کو ہنسا کر خوش کر سکتی تھی . . . زینب نے سوچا چلو اگر نینو گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ نہ بھی بٹائے اور محض حنیف کا دل بہلائے رکھے تو بھی اسے کام کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ . . . لیکن نینو کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ آج وہ زیادہ دیر تک نہ رُکے گی۔ اس کا خاوند قصبے میں کسی دوست سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ اس لئے وہ ادھر چلی آئی۔

اور واقعی تھوڑی دیر بعد نینو کے خاوند کی آواز سنائی دی اور نینو اس بات پر اظہار تاسف کرتی ہوئی رخصت ہو گئی کہ آج زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع نہ ملا حنیف نینو کے گلے سے لپٹا ہوا باہر تک گیا اور پھر گدھے کی سواری کرنے کے بعد بڑی مشکل سے کہیں واپس آیا . . . اور واپس آتے ہی لگا ماں کا آنچل تھام کر ٹھنھنانے . . . ماں جس طرف جاتی وہ روتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیتا ـــــ اس مرتبہ نینو کی آمد سے وہ گھاٹے میں رہی۔ اگر وہ نہ آتی تو کم از کم حنیف اسکول کو سدھارتا اور وہ مزے سے سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔

باہر گونی میراسن کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ گونی بھی عجب باتونی عورت تھی۔ ادھر صبح ہوئی ادھر وہ آنچل سنبھالتی ہوئی گھر سے نکلی اور لٹو کی طرح سارے قصبے میں گھوم گئی . . . وہ عورت کیا تھی چلتا پھرتا اخبار تھی۔ اسے دیکھ کر عورتیں آٹے یا گوبر میں سنے ہوئے ہاتھ پھیلائے اپنے اپنے گھر سے باہر آن کھڑی ہوتیں اور پھر گونی ناک پر انگلی رکھ کر اور بھنوؤں کو جنبش دے کر جو کوئی داستان چھیڑ دیتی تو بس اللہ دے اور بندہ لے، سننے والے کے کان پک جائیں لیکن خدا کی بندی کی زبان کو لگام کون دے . . . اس کی آواز سنتے ہی زینب نے سوچا کہ کیوں نہ حنیف کو اس کے ہمراہ اسکول بھیج دے۔ لیکن گونی کو اندر بلانا ایک نئی مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ . . . اور وہی بات ہوئی گونی اندر آئی اور اس نے ابھی قصبے کی اسٹاپ پریس خبریں ہی سنائی تھیں کہ زینب کے سر میں درد ہونے لگا۔ یک نہ شد دو شد۔ . . . کسی نہ کسی طرح اُس نے حنیف کو گونی کے ساتھ روانہ کر کے آئی بلا ٹالی۔ لیکن گونی کے چلے جانے کے بعد وہ اس قدر تھک گئی کہ دم لینے کے لئے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس کا دل اکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ دماغ پر غنودگی طاری تھی جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گونی نے آج ایک خبر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ ان کے مکان سے تقریباً پچاس قدم پرے ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ جس کی اُوپر والی منزل پر ایک چوڑی والا اپنے کنبے سمیت رہتا تھا۔ چوڑی والے کی بیوی بہت طرح دار اور بانکی تھی۔ پہلے پہل اس نے اسے پڑوس والوں کے ہاں کسی شادی کے موقعہ پر دیکھا تھا۔ بیگاں اس کا نام تھا۔ کیا موہنی صورت پائی تھی اس نے۔ اور ادھر اس کا خاوند تھا۔ کچھ عجیب سی صورت تھی اس شخص کی بدصورت نہ سہی لیکن اس کی شخصیت میں ذرہ برابر بھی کشش نہ تھی۔ لیکن عورت ہزاروں میں ایک تھی۔ اس رات شادی کے موقعہ پر عورتوں نے مل جُل کر سوانگ رچایا۔ بیگاں نے مرد کا سوانگ بھرا۔ کیسی بے ڈول سی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے وہ اینٹھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی مصنوعی مونچھیں دوات کی روشنائی سے لکیریں کھینچ کر بنائی گئی تھیں جو بہت مضحکہ خیز نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر اس کی چھاتیوں کا اُبھار۔ مرد کا سوانگ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ بھلا گونی میراسن سے چپ کہاں رہا جائے۔ ہانک لگائی۔ "حضور والا! پہلے انہیں تو سنبھالئے۔" عورتوں کی اس بے تکلف مجلس میں اس بات پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ دوہری ہو ہو گئیں۔

ان دنوں وہ لوگ قصبے میں نئے نئے آئے تھے۔ بیگاں کی بے تکلفی کو اس کے الھڑپن پر محمول کیا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ کئی قسم کی افواہیں اُڑنے لگیں۔ چھوٹے سے قصبے میں اس قسم کی چٹپٹی باتیں چھپی ڈھکی رہ ہی نہ سکتی تھیں۔

خود اس نے دو تین مرتبہ غیر مردوں کو ان کے گھر میں گھستے ہوئے دیکھا تھا۔ زینب اللہ کے عذاب سے ڈرنے والی عورت تھی۔ وہ ان باتوں پر یقین ہی نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ جو غیر مرد وہاں آتے ہوں وہ اس کے خاوند کے دوست ہوں۔ لیکن ایک روز گرمیوں کی دوپہر کو تو اسے اس بات

کا یقین کرنا ہی پڑا۔ . . . اس دن گھر پر کوئی نہ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں وہ عموماً پچھلے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ کیونکہ یہ کمرہ نسبتاً سرد تھا اور وہاں سورج کی کرنیں بھی سیدھی نہ پڑتی تھیں۔ وہ کسی کام سے اُٹھ کر باہر والے کمرے میں آئی کہ اتفاق سے اس کی نظر اُٹھی اور بیگاں کے مکان پر جم گئی۔ بیگاں کا خاوند دن بھر چوڑیاں بیچا کرتا تھا اور وہ خود گھر پر تنہا ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں کسی مرد کا آنا شک سے خالی نہ ہو سکتا تھا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس دن بیگاں نے بال دھو کر بکھیر رکھے تھے۔ چست قمیص پہن رکھی تھی۔ . . . اور پھر کھڑکی میں سے کسی مرد کا جھپٹ کر بڑھتا ہوا ہاتھ دکھائی دیا۔ بیگاں قلانچ بھر کر ہنستی ہوئی پرے چلی گئی اور اس کی رنگین چندیا مرد کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اس وقت بیگاں کے لمبے اور گھنے بال کیسے لہرائے تھے۔ . . . اور پھر بیگاں نے اپنے گھر کی کھلی کھڑکی بند کر دی۔ . . . اور آج گونی نے نئی خبر سنائی تھی۔ کہ کل رات بیگاں نئے تھانیدار بازخاں کے ہاں پہنچی ہوئی تھی۔ گونی نے کیسے گال پر انگلی رکھ کر کس قدر پُراسرار انداز میں یہ واقعہ بیان کیا۔ نیا تھانیدار دو ایک مرتبہ ان کے گھر کے آگے سے گزرا تھا۔ وہ ہٹا کٹا لمبا چوڑا طرّے باز شخص تھا۔ . . . کیا ان عورتوں کو خدا کا بھی کچھ خوف نہیں اور دوزخ میں حرام کار عورتوں کو جو عبرتناک سزائیں دی جائیں گی۔ . . . پھر وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی کہ فاحشہ عورتوں کو مرنے کے بعد کون کونسی اذیتیں دی جائیں گی۔

اب تو ایک بجنے کو تھا۔ وہ یونہی بیکار وقت گنوا رہی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور ان پر زور دے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر والے کمرے میں گئی اور پھیلے ہوئے سامان پر نگاہ ڈالی۔ چارپائیاں الٹی سیدھی کھڑی یا بچھی تھیں۔ بڑے پلنگ کے پایوں کے نیچے رکھی ہوئی اینٹیں ادھر ادھر کھسک گئی تھیں۔ کھونٹی پر ٹنگا ہوا بڑا ترازو ایک طرف کو لٹک گیا تھا اور اس کے اوپر تلے رکھے ہوئے پلڑوں پر پڑے ہوئے لوہے کے باٹ کھسک کر نیچے گرنے ہی کو تھے۔ وہ رضائیاں اور گدے جو جگہ کی کمی کی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے کنڈوں میں اڑا دیئے گئے تھے۔ ان پر دو دو اُنگل گرد جمی ہوئی تھی۔ مکڑیوں کے لمبے چوڑے جالے ادھر اُدھر کونوں میں لہلہا رہے تھے۔ اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ یہ سب کام کرنا تھا۔ اس نے بے دلی سے بانس کے سرے پر جھاڑو باندھی اور جالے صاف کرنے کے لئے اسے اُٹھایا۔ اوپر اتفاق سے اس نے پلنگ کا سہارا لیا تو اس کے پایوں تلے سے اینٹیں کھسک گئیں اور پلنگ دھم سے زمین پر آن رہا۔ اوپر سے روشنک کے کھلونوں کا ٹرنک کھسک کر گر پڑا اور کھلونے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اسی گڑبڑ میں بانس ترازو کو سے چھو گیا اور باٹ فرش پر لڑھک گئے۔ اسی افراتفری میں اُس نے زور سے بانس پیچھے ہٹایا تو وہ چھت پر لٹکی ہوئی رضائیوں سے جا ٹکرایا۔ وہ بھی جیسے اشارے کی منتظر تھیں دھما دھم اس کے سر پر گرنے لگیں۔ . . . ایک مرتبہ تو یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو۔ . . . اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کمرے کی حالت اور بھی ابتر دکھائی دینے لگی۔ اب کام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے چڑچڑے پن سے بانس پرے پھینک دیا۔ اور خود زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی باہر والے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہی سے اس کی طبیعت مضمحل سی تھی۔ آج بسم اللہ ہی لڑائی سے ہوئی تھی۔ اس نے دوپٹہ اتارا۔ پسینہ پونچھا۔ دوپٹے کو رسی پر اُچھال دیا۔ اور پھر گردن سے قمیص اُٹھا کر دستی پنکھے سے ہوا کرنے لگی۔

کھڑکی میں سے سامنے کے مکانات کا ختم ہوتا ہوا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ صابن اور میل والا پانی بہہ کر کچی سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ نیچے کی منزل والے غریب لوگوں کی کھٹمل بھری چارپائیاں دھوپ میں پڑی تھیں اور ان کے غلیظ کپڑے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ . . . اُوپر کی منزل پر کھڑکی میں سے بیگاں سر باہر نکالے کھڑی تھی۔ وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ تیز چمکتی ہوئی دُھوپ میں اس کا چہرہ کس قدر حسین دکھائی دے رہا تھا۔ موئی حرام کار، روز بروز موٹی ہوتی جا رہی تھی اور گالوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیسی صاف شفاف سرمگیں آنکھیں تھیں اس کی۔ . . . ہونٹ کیسے ترشے ہوئے تھے . . . . اس کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کے چہرے پر آن گرتی تھی۔ جسے وہ ہر مرتبہ پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ . . . اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسرت انگیز اطمینان کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ . . .

زینب نے کھڑکی بند کر دی اور دوسری کھڑکی کھُلی رہنے دی۔ جہاں سے دُور دُور تک پھیلے ہوئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرف کوئی مکان نہ تھا۔ ویران زمین کا بہت بڑا ٹکڑا حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین بنجر تھی۔ اس پر کبھی کوئی فصل نہ اُگ سکتی تھی۔ اِکّا دُکّا روکھا سوکھا درخت کھڑا دکھائی دے جاتا یہ ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ جس کے چاروں طرف پکی اینٹوں کی ایک پست سی دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک کونے میں چڑھ کھڑی مصلا

ایک کنواں تھا۔ دن کو تیز دھوپ کی وجہ سے ہوا میں بھنگے سے اُڑتے ہوئے دکھائی دیا کرتے تھے یا رات کو مرگھٹ میں پڑے ہوئے لکڑی کے کنڈے چٹخنے اور چنگاریوں کی ایک پھلجھڑی آسمان کی طرف اُڑ جاتی۔ . . . .

اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اور پھر جیسے مکان کے باہر کی طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکھنے کی آواز آئی۔ کبھی کبھار اس کا خاوند اس طرف سے گذرتا ہوا چند گھڑیوں کے لئے ادھر بھی آن نکلتا تھا۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار . . . چوکھٹ کے اندر جیسے دھم سے پاؤں رکھنے کی آواز آئی . . . اس کی ادھ کھلی سی آنکھیں دیوار میں سے کھڑی ہوئی لکڑی کی سیدھی موٹی کھونٹی پر جم گئیں جس کے نیچے تھیلا لٹکا ہوا تھا . . . کیسا بے کیف سا منظر تھا اس نے جیسے آنکھیں پھیر لینے کے خیال سے سر ایک طرف کو ڈال دیا۔ اور اس طرح بغیر کسی خاص کوشش کے اس کی نظریں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پھیلی ہوئی بنجر زمین پر دوڑنے لگیں . . . حسب معمول گرد اور سوکھے پتوں کا ایک بگولا اٹھا اور ایک بڑے بھاری ستون کی طرح دھرتی کی چھاتی پر گھومنے لگا۔ اس قدر تیز گردش . . . جیسے دھرتی کے سینے کو پھاڑ کر نہ معلوم کس طرف کو نکل جائے گا . . . لیکن دھرتی خاموش اور بے حس تھی۔ وہ لاش کی طرح چُپ چاپ لیٹی تھی بگولا بڑی تندی کے ساتھ گھومتا ہوا پرے چلا جاتا کبھی نزدیک دکھائی دینے لگتا۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا جیسے زمین کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا ہو اور کبھی پھر جھوم کر اُٹھ کھڑا ہوتا . . . وہی ستون کا ستون . . . اس قسم کے بگولے ہمیشہ اُٹھا کرتے تھے۔ اسی طرح تیزی اور تندی دکھا کر ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن زمین ویسی کی ویسی رہ جاتی۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تھی . . . یہ منظر کس قدر خشک بے مزہ اور بے رنگ سا تھا . . . آہستہ آہستہ پاؤں کی چاپ رخصت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی . . . غالباً اس کا خاوند چلا گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ پھیر کر کروٹ بدلی . . . اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ہڈیاں جیسے پس کر رہ گئی تھیں۔ چھاتیاں جل رہی تھیں۔ ہوا گرم اور بوجھل تھی۔ دوپہر کے وقت کوئی کتا تک بھونکتا سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف کہیں بہت دور کوئی شخص گنڈاسے سے چارا کاٹ رہا تھا . . . .

مہندر ناتھ

"کھڑکی کھول دوں ؟" اُس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ اور میرا جواب سنے بغیر اس نے کھڑکی کھول دی۔

کھڑکی کھلتے ہی ہَوا کا ایک زبردست جھونکا آیا۔ اور کمرے میں ایک عجیب ٹھنڈک سی پھیل گئی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "میں ہلکی ہلکی بارش میں عجیب حظ سا محسوس کرتا ہوں۔ ہلکی، ملائم، بے آواز بارش۔ یہ ننھی ننھی بوندیں کتنی خوبصورتی سے ان سرسبز پتوں پر گر رہی ہیں۔ اور ہَوا خوشی سے جھومتی ہوئی ان گرے ہوئے پھولوں کو چوم رہی ہے۔ یہ سرسبز پتے، یہ سرخ پھول، کیا تمہیں پسند نہیں۔ آخر کیا چاہتے ہو تم ؟

"چائے پیو گے۔ آج میں نے نیا ٹی سٹ خریدا ہے۔ اس پیالے کی طرف دیکھو کتنا حسین اور خوبصورت ہے۔ میں پرانے پیالوں میں چائے نہیں پیتا۔ ہمیشہ دلفریب رنگین، نئے پیالوں میں چائے پیتا ہوں۔ لو چائے پیؤ !

"چائے سے میرا جگر خراب ہو جائے گا۔"

"تو سگرٹ پیو، بالکل نیا تازہ۔ ایک کش تو لگاؤ۔ اگر خوشبو سے دماغ معطر نہ ہو جائے۔ تو پھر گلہ کرنا۔ ارے سگرٹ بھی نہ پیو گے۔ مجھے تو سگرٹوں سے محبت ہے۔ چائے کی پیالی سے محبت ہے۔ اور ادھر تم ہو کہ عورتوں کی محبت میں سرگرداں نظر آتے ہو۔ عورتوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔ جہاں عورت نظر آئی وہیں جم گئے۔ خیر یہ رزائی اوڑھ لو۔ دیکھو کتنی پیاری ٹھنڈک ہے جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی ہے۔ بالکل شراب کے نشے کی طرح۔

مجھے اس رزائی سے محبت ہے۔ ہر چھ ماہ بعد رزائی کو بدل لیتا ہوں رات کے وقت جب سردی پاؤں سے بڑھتی ہوئی دماغ کی طرف جاتی ہے تو میں رضائی کو اپنے اردگرد لپیٹ لیتا ہوں۔ کتنا سکون ملتا ہے، اس نرم اور گرم رضائی میں۔ جیسے کسی حسین عورت کے گرم جسم سے لپٹا ہُوا ہوں۔

رضائی عورت سے بدرجہا اچھی ہے۔ اسے نہایت آسانی سے ہر چھ مہینے کے بعد بدلا جا سکتا ہے۔ نئی بنوائی جا سکتی ہے لیکن دوست! عورت کو بدلنا اتنا آسان نہیں، زندگی میں ایک بار عورت سے شادی کر کے انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ صرف ایک بیوی کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بیوی کے ناز نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ دن بھر شکوے شکایتیں، مار دھاڑ، بچوں کا شور، ایک غوغائے عظیم، ایک مسلسل جہنم، میاں! شادی کبھی نہ کرنا۔ ارے ہاں شادی میں نے بھی نہیں کی ——— اور کبھی نہیں کروں گا ———

باہر اُسی طرح بارش ہو رہی تھی۔ ننھی ننھی بوندیں، آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ پتے اسی طرح سبز تھے۔ پھول بارش میں نہا رہے تھے۔ ایک کبوتر کھڑکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور کرنے لگا غٹر غوں۔ غٹر غوں

"میری طرف کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو۔ ارے ہٹاؤ اس کبوتر کو۔ یہ کیوں چلا رہا ہے۔ یہ بھی آئے "عشق کرنے"۔ اس نے تالی بجائی کبوتر ایک لمحہ کے لئے پھڑپھڑایا۔ اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ ارے "زینت" ——— کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ بڑے شریر ہو تم۔ میں خود اس قصے کو نہایت وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے میرے متعلق غلط افواہیں اڑا دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ زینت میری داشتہ تھی، کوئی کہتا ہے۔ کہ میں زینت سے شادی کرنے والا تھا۔ لیکن زینت نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں ہندو تھا۔ کوئی کہتا ہے میں نے زینت اور عارف کے درمیان لڑائی کرائی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن تمہاری پروا ضرور کرتا ہوں۔ تم کافی ذہین اور سمجھدار ہو۔ اس دنیا میں ذہین آدمی بہت کم ملتے ہیں اسی لئے تمہیں ہی راز کی باتیں بتاؤں گا ؟ یہ واقعہ میرے ذہن پر اس طرح حاوی ہو گیا ہے کہ میں اس کے بوجھ

تلے دب گیا ہوں میں اس بوجھ کو اتارنا چاہتا ہوں تاکہ میرا جی ہلکا ہو جائے ——— زینت کو تم نے کئی بار سٹوڈیو میں دیکھا ہوگا۔ مجھے اس کی آنکھیں پسند تھیں۔ اگر تم نے اُسے غور سے دیکھا ہے تو تمہیں اس بات کا ضرور احساس ہُوا ہوگا۔ کہ وہ خود اتنی خوبصورت نہ تھی جتنا شباب نے اُسے خوبصورت بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اپنے خاوند کے ساتھ سٹوڈیو میں آتی۔ اُس کا خاوند ——— جو بالکل موالی لگتا تھا۔ جونک کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہُوا تھا۔ اس کا خاوند کافی آوارہ اور اوباش قسم کا آدمی تھا۔ زینت کے خاوند کو علم تھا کہ اُسے اس سے اچھی بیوی کبھی نہ مل سکے گی۔ اسی لئے وہ زینت سے پل بھر جدا نہ ہوتا۔ زینت پر بہت سے لوگ فریفتہ تھے سٹوڈیو کے کئی ایکٹر اُس پر جان دیتے تھے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ آگے بڑھ کر اظہارِ محبت کر سکے۔ کبھی زینت کے خاوند سے ڈرتے تھے۔ خوف کھاتے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر غلطی سے کسی نے زینت کے سامنے اظہارِ عشق کر دیا۔ تو اس کی لاش سڑک پر خون میں لتھڑی ہوئی ملے گی۔ شاید زینت خود بھی اپنے خاوند سے ڈرتی تھی۔ اُس کے ذہن پر ایک قسم کا جمود طاری تھی۔ اس کی باتوں، اس کی چال ڈھال، اس کی ہنسی، اس کی مسکراہٹ سے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پرواز کے لئے تیار ہے۔ لیکن کس کے ساتھ ——— ؟ شاید ابھی تک اُس نے یہ فیصلہ نہ کیا تھا۔ زینت کا خاوند زینت کی خوب خاطر مدارت کرتا۔ اُسے اچھے اچھے کپڑے سلا کر دیتا۔ سٹوڈیو میں اس کا کھانا لاتا۔ اگر رات کو شوٹنگ ہوتی۔ تو وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر زینت کا انتظار کرتا رہتا۔ اور جب شوٹنگ ختم ہوتی تو دونوں اکٹھے گھر جاتے۔ اگر وہ کبھی زینت کو کسی خوبصورت لڑکے سے بات چیت کرتے دیکھ لیتا تو اُس کا خون کھول اٹھتا۔ رات بھر زینت کو گالیاں دیتا رہتا۔ اور جیب سے پشاوری چاقو نکال کر کہتا۔

سالی اگر دوسرے سے عشق کیا تو اس چھرے سے پیٹ چیر دوں گا۔ ناک کاٹ لوں گا!

اور زینت چھرے کو دیکھ کر چپ ہو جاتی۔ چاقو دیکھ کر اُس کا دل دہل جاتا۔ اور وہ بستر میں منہ چھپا کر رونے لگتی۔

اسی دوران میں عارف سٹوڈیو میں نوکر ہُوا۔ دیکھنے میں خوبصورت وجیہہ دلکش جوان لیکن جب باتیں کرنے لگتا تو ساری دلکشی جاتی رہتی ایسا محسوس ہوتا کہ اگر یہ شخص باتیں نہ کرے تو اچھا ہے۔ عارف خاموش طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا۔ ہنستا تو چپکے سے، مسکراتا تو چپکے سے، بیٹھتا تو چپکے سے، مجھے اس کی چُپ سے نفرت تھی۔ وہ انسان ہی کیا جو باتیں نہ کر سکے۔ جو دوسروں کو باتوں سے مرعوب نہ کر سکے! یوں تو عارف کافی ذہین اور عقلمند تھا لیکن اُس ذہانت کا کیا فائدہ جو دوسروں کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔

مگر لڑکیوں کے معاملے میں عارف کافی خوش قسمت تھا۔ وہ زینت کی زندگی میں چُپکے چپکے داخل ہُوا۔ دونوں میں کسی ایک کو بھی معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اُس کے بعد کیا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ بدمست شرابیوں کی طرح ——— عارف میں ایک خوبی تھی کہ وہ خوب شراب پی سکتا تھا۔ کتنے ہی جام پی جاتا لیکن کم بخت بدمست نہ ہوتا۔ آپے سے باہر نہ ہوتا۔ شراب پی کر اُس کی ٹانگیں نہ لڑکھڑاتیں۔ کسی کو گالیاں نہ دیتا۔ واہیات مذاق نہ کرتا۔ قے نہ کرتا۔ بس جام پہ جام چڑھائے جاتا۔ اور مجھے تم جانتے ہی ہو کہ دو جام پینے کے بعد گھر سے باہر دوڑنے لگتا ہوں۔ عورتوں کو چھیڑتا ہوں، مردوں سے لڑتا ہوں، پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ زبان میں لکنت آ جاتی ہے! اور اگر زیادہ پی لوں تو قے پر قے کرنے لگتا ہوں ——— تمہاری قسم۔ نہایت ہی بیوقوف اور ناکام شرابی ہوں ——— "عورت اور شراب"۔ میرا مطلب ہے زینت اور شراب ——— دونوں اچھی چیزیں ہیں۔ مگر مجھے دونوں راس نہ آئیں۔ دونوں چیزیں، مجھے بدمست کر دیتی ہیں۔ شراب پی کر بہک جاتا ہوں، اور خوبصورت عورت دیکھ کر بھی ——— اور عارف؟ کم بخت عارف! خاموش عارف مجھ سے زینت چھین کر لے گیا یعنی زینت عارف کے پاس کیسے پہنچی۔ یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ان دنوں ہم سب نے مل کر تہیہ کیا کہ ایک ڈراما سٹیج کیا جائے۔ زینت کے خاوند کی منت سماجت کی اور بڑی مشکل سے زینت کو سٹیج پر ایکٹ کرنے کے لئے راضی کیا۔ اس ڈرامے میں، میں نے بھی پارٹ کیا۔ عارف

اور زینت نے بھی! —— اس کھیل کے دوران میں عارف اور زینت ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ عارف نہایت خاموشی سے سگرٹ سلگاتا۔ اور دھوئیں کو ہوا میں چھوڑتے ہوئے زینت کی طرف دیکھنے لگتا۔ زینت چپ تھی، خاموش تھی لیکن تیار تھی۔ شاید پرواز کا وقت آگیا تھا میں سب کچھ سمجھ گیا لیکن زینت کے خاوند کو اس بات کا علم تک نہ ہوا۔ شاید اُسے اپنے پشاوری چاقو پر ناز تھا لیکن زینت کے پر وبال اس چاقو کے وار سے بہت آگے جا چکے تھے۔ زینت نے ہتیہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اب اپنے خاوند کیساتھ نہیں رہے گی۔ اور عارف اس موقع کی تاک میں تھا کہ کب زینت اس کی آغوش میں آتی ہے ——
زینت کے خاوند اور عارف میں بہت فرق تھا۔ زینت کا خاوند ان پڑھ، شرابی، اجڈ اور گنوار تھا لیکن عارف پڑھا لکھا، ذہین خوبصورت اور ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ زینت عارف کی طرف کیوں راغب ہوئی؟ کیا یہ لیلےٰ مجنوں کی محبت تھی، یا شیریں فرہاد کی، لیکن دوست! یہ لیلےٰ مجنوں کی محبت نہ تھی۔ زینت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھی۔ جو اُسے ایک اچھا STATUS دے سکتا۔ جو اُسے اس گندی نالی سے نکال کر ایک اعلےٰ پائے کی ایکٹرس بنا سکتا۔ ابھی تک تو وہ چھوٹے موٹے پارٹ کرتی رہی تھی لیکن اب اُسے آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ زینت کی پرواز میں محبت تھی، جنون تھا لیکن یہ محبت محض عرشی نہ تھی ایک Calculated Step تھا آگے بڑھنے کا۔ زینت نچلے طبقے کو چھوڑ کر متوسط درجے میں آنا چاہتی تھی۔ جہاں جہالت کم ہے۔ لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ روپیہ نچلے طبقے سے زیادہ ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں —— اور یہ سب باتیں سوچ سمجھ کر ایک صبح زینت عارف کے مکان کی طرف چل دی —— اور عارف نے چپکے سے زینت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ عارف خوش تھا۔ یہ اس کے خاموش عشق کی پہلی فتح تھی۔ اور شاید میری آخری شکست تھی۔ میں اس ڈرامے میں کیا کرتا رہا۔ مجھ پر کیا گزری۔ زینت میری طرف کیوں مائل نہ ہوئی۔ اس کی وجہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے اس بات کا بہت رنج ہوا کہ زینت عارف کے پاس کیوں چلی گئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اپنی صورت سے گھن آنے لگی تھی۔ اور دوست یار کہنے لگے تھے ——

"ارے کل کا لونڈا۔ اور زینت کو اپنے گھر لے جائے۔ اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔ تمہارا اور عارف کا کیا مقابلہ۔ عارف تمہارے سامنے چمار لگتا ہے، چمار۔ سالا بازی لے گیا اس بار"۔

اور یہ سب کچھ سن کر میں کڑھتا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتا۔ اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو عارف زینت کو گالیاں دینے لگتا اور سوچتا عارف اور زینت میں کبھی نہ بن سکے گی۔ یہ چار دن کی چاندنی —— اور پھر اندھیری رات۔ پھر دیکھنا دونوں آپس میں کس طرح لڑیں گے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے —— اور اس دوران میں کبھی کبھی عارف ملتا۔ اس کے ساتھ اکثر زینت ہوتی۔ دونوں اکٹھے سیر کرنے جاتے سینما دیکھنے جاتے۔ بازار جاتے اور میں دن بھر کڑھتا رہتا اور اس کوشش میں سرگرداں رہتا۔ کہ کسی طرح ان دونوں میں اَن بن ہو جائے۔

کبھی کبھی مجھے اُمید بندھ جاتی کہ زینت کا خاوند عارف کو چاقو مار کر ضرور ہلاک کر دے گا۔ لیکن کافی عرصے تک زینت کا خاوند دکھائی بھی نہ دیا۔ ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ زینت کا خاوند مل گیا اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اس نے مجھے دیکھا اور وہیں رک گیا۔ جیب میں سے پشاوری چاقو نکالا اور ایک ہی جھٹکے سے چاقو کا پھل اندھیرے میں بجلی کی طرح کوند گیا۔

میں لپک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پھر آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ میرے قریب آکر اُس نے کہا۔

"بابو! عارف کہاں ہے"۔

"مجھے کیا معلوم"۔

"سالا کہیں مل جائے تو پیٹ چیر دوں، کیا یہ شریفوں کے چلن ہیں۔ اُلو کا پٹھا۔ میری بیوی چھین کر لے گیا۔ شرم نہیں آئی اُس حرامزادے کو، بابو میں تو تمہارا لحاظ کرتا ہوں"۔ آخری فقرہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ "نہیں تو سالے کو کب کا مار دیا ہوتا۔ سالی

زینت کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جائے گی۔ بابو میں موالی ہوں موالی، مجھے اپنی جان تک کی پروا نہیں۔ میں نے کیوں کے خون کر دیئے ہیں۔ لیکن پولیس کی جرأت نہیں پڑتی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ تمہاری قسم بابو! دونوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں۔ لیکن تمہارا لحاظ کرتا ہوں۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا۔ گھبراؤ نہیں دوست! گھبراؤ نہیں۔ زینت تمہاری ہے اور تمہاری ہو کر رہے گی۔ عارف زینت سے شادی نہیں کرے گا۔ عارف کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ زینت کو کچھ دن اپنے پاس رکھے گا۔ اور پھر زینت بازاروں میں گھومتی ہوئی نظر آئے گی۔ تمہارے پاؤں چومے گی۔ اچھا یہ چاقو ذرا جیب میں ڈال لو۔ ارے مرد ہو کر عورت کے لئے روتے ہو۔

تم ایک نہیں سو عورتیں رکھ سکتے ہو۔ عورت کے لئے خون کرنا گناہ ہے۔ چودہ سال قید کاٹنا گناہ عظیم ہے۔ اور پھر تم جوان ہو، عورت تمہارے پاؤں کی جوتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ زینت خود تمہارے پاس آئے گی۔ اور اگر وہ نہیں، تو کوئی اور آئے گی۔

"نہیں بابو! میں سالی کو ایسے نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک روپے نہ دے گی طلاق نہ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، سو فیصدی درست کہتے ہو۔ طلاق نہ دینا جب تک تمہیں روپے نہ ملیں۔"

"سالی سمجھتی کیا ہے۔"

خوب سمجھتی ہے تمہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ سالا سود خور پٹھان ہی نکلا۔ چلے تھے چھرا مارنے۔ بات ٹھہری آخر روپوں پر ———

زینت کے خاوند نے چاقو جیب میں ڈالا اور مجھے آداب کرتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اُس دن سے مجھے زینت کے خاوند سے نفرت ہو گئی۔

زینت نے اپنے خاوند کو کچھ روپے دے کر طلاق لے لیا۔

اب زینت اور عارف اکٹھے رہتے تھے۔ عارف کو کافی عرصے کے بعد ایک حسین لڑکی ملی تھی۔ اُس نے اس حسن کی شراب کو جی بھر کر پیا۔ زینت نے اپنے آپ کو عارف کے حوالے کر دیا۔ زینت خوش تھی عارف خوش تھا۔ اُس کی آغوش میں زینت تھی، خوبصورت، جوان رسیلی۔ وہ زینت سے عشق کر سکتا تھا۔ محبت کر سکتا تھا۔ اس کے سیاہ چمکیلے بالوں سے کھیل سکتا تھا۔ اُس کے رخساروں کو چوم سکتا تھا۔ بلکہ چومتا تھا۔ اس کے جسم سے پیار کرتا تھا۔ اس کے جسم کی لطیف خوشبو سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اور سب کچھ کرتا تھا لیکن جب زینت نے شادی کے لئے کہا۔ تو عارف کا بنا بنایا گھروندا دھم سے نیچے آپڑا۔

عارف زینت سے شادی کر لے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ زینت اس سے پہلے ایک موالی کے گھر سات برس تک رہ چکی تھی۔ اور وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر وہ زینت سے شادی کر لے، تو اُس کے ماں باپ کیا کہیں گے۔ عارف کو اپنے ماں باپ کا اتنا ڈر نہ تھا۔ دراصل وہ خود زینت سے شادی نہ کرنا چاہتا تھا۔ زینت اُس کے پاس رہ سکتی ہے۔ اس کے گھر میں رہ سکتی ہے۔ وہ اُسے ایک داشتہ بنا کر رکھ سکتا ہے لیکن بیوی بنا کر نہیں ———

اس سے پہلے عارف کئی گھاٹنوں سے ایسا تعلق قائم کر چکا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ وہ ہر گھاٹن کو اپنی بیوی بنا لیتا، گو زینت گھاٹنوں سے بدرجہا اچھی تھی لیکن اس موالی کی آغوش ——— ؟

توبہ! توبہ!! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا ذہن یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔

"ارے۔ اس موالی کی بیوی کو گھر میں رکھ لیا۔"

"کیا عارف کو کسی شریف گھرانے کی لڑکی نہ مل سکتی تھی!"

"اجی! ان ایکٹروں کو ان باتوں کی کیا پروا۔"

"فلم انڈسٹری میں پڑھے لکھے نوجوان بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔"

عارف یہ طعنے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ ہی وہ اس سر دردی کو مول لینا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کبھی اس بات کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ کہ زینت شادی کے لئے اپنے آپ کو یوں بید ھڑک پیش

کرے گی۔

اور اسی بات پر عارف اور زینت کی لڑائی ہوگئی۔ عارف نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور زینت ایک ہوٹل میں چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد زینت میرے پاس آئی۔ میں خوش تھا، کہ زینت نے عارف کو چھوڑ دیا ہے۔ اور میں دوستوں کو اس لڑائی کے قصے سناتا۔ عارف دراصل کمینہ ہے۔ شرم نہیں آئی۔ زینت کو گھر سے نکالتے ہوئے میاں! تم ایک عورت سے عشق کرتے ہو، محبت کرتے ہو اور عورت سب کچھ تم پر نثار کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر تمہارے پاس آتی ہے۔ تم ہر طریقے سے اُس کے جسم سے لذت اخذ کرتے ہو۔ اور جب وہ شادی کے لئے کہتی ہے تو صاف انکار کر دیتے ہو؟ کہاں کی ہے یہ شرافت۔ سچ کہتا ہوں، عارف نہایت ہی ذلیل انسان ہے، ارے بھئی عارف نے ایک بار بھی زینت سے نہ کہا۔ کہ آؤ تمہیں ساڑھی خرید دوں کوئی نیا سینڈل منگوا دوں، سونے کی انگوٹھی لے دوں۔ یا کبھی کانوں کے آویزے ہی خرید کر لاتا۔ میں نے اتنا کم ظرف انسان کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے ایسے لونڈوں سے نفرت ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زینت میرے پاس آئی۔ بڑی گھبرائی ہوئی تھی بچاری۔ میں نے اُسے ڈھارس دی اور کہا۔

زینت، تم گھبراؤ نہیں۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو۔ مجھ سے لو۔ تم یہاں رہ سکتی ہو۔ لیکن تم میرے پاس کیا کرو گی رہ کر۔ وہ ہوٹل اچھا ہے۔ اُس میں رہو۔ لیکن تم یہاں آسکتی ہو۔ یہاں کھانا کھاؤ، مجھ سے باتیں کرو، ہنسو، کھیلو اور بھول جاؤ۔ عارف کو، وہ کمینہ ہے۔ تمہیں اس دنیا میں کئی عارف ملیں گے۔ جوان لڑکی کو دیکھ کر کس کا دل زور زور سے دھڑکنے نہیں لگتا، تو وہ مسکرا پڑی۔ اور پھر اُس دن کے بعد وہ ہر روز میرے گھر آنے لگی۔ میں نے اُسے ریشمی ساڑھیاں خرید کر دیں۔ نئے سینڈل خرید کر دیئے۔ میں اُسے بازار لے گیا، سینما لے گیا، وہ اکثر میرے ساتھ رہتی۔ میں جو کہتا اُس پر عمل کرتی۔ کئی بار اُس نے میرا کھانا پکایا۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ رات ٹھنڈی اور یخ بستہ تھی۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر تھا —— میں نے کہا۔ زینت، میرے قریب آؤ!

وہ میرے قریب آگئی۔

اس چارپائی پر بیٹھو۔

وہ چارپائی پر بیٹھ گئی

سینڈل اتار دو۔ اُس نے سینڈل اتار دیئے۔

رضائی اوڑھ لو۔ اُس نے رضائی اوڑھ لی۔

آرام سے لیٹ جاؤ۔ وہ آرام سے لیٹ گئی۔

اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں کے ساتھ چھو رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ اب بیٹھ جاؤ۔

اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ تم خوبصورت ہو۔

اور وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کہا۔ زینت سے نہیں۔ بلکہ اپنے آپ سے۔ کہ وہ آج تمہارے پاس ہے، تمہارے قریب ہے۔ وہ اکیلی ہے، تم اکیلے ہو۔ باہر گھپ اندھیری رات ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور یخ بستہ ہے۔ زینت خوبصورت ہے۔ جوان ہے، اس کی کمر میں لچک ہے۔ باہوں میں گداز ہے۔ خون میں گرمی ہے جسم میں حدت ہے۔ آنکھوں میں شراب ہے وہ تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ تمہاری عزت کرتی ہے۔ تمہیں چاہتی ہے۔ تمہیں پیار کرتی ہے۔ تم نے کئی بار اس کے گالوں کو ہاتھ لگایا۔ لیکن وہ چپ رہی۔ کئی بار وہ تمہارے سینے سے چمٹ گئی۔ لیکن تم خاموش رہے۔ تم زینت سے الگ تھلگ رہے۔ تم اُس کے جسم کو چاہتے ہوئے بھی دھکاتے رہے۔ اُس کے جسم کی مہک سے لطف اندوز ہو کر بھی اُس سے دور رہے آخر یہ کب تک۔ وہ کب تک تمہارے پاس اس طرح رہے گی۔ وہ چلی جائے گی اور ضرور چلی جائے گی۔

لیکن ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی میں زینت سے جسمانی طور پر الگ تھلگ رہا۔ میرے دل میں صرف ایک کانٹا تھا۔ اور وہ تھا عارف زینت عارف کے ساتھ رہ چکی ہے۔ عارف کے پاس رہنے کا اتنا رنج نہ تھا۔ جتنا اس بات کا کہ میرے ہوتے ہوئے اُس نے عارف کو کیوں پہلے انتخاب کیا۔ اگر عارف کے پاس جانے سے پہلے وہ میرے پاس آتی۔

تو میں فوراً اُس کے ساتھ پیار کرتا۔ اُس سے شادی کر لیتا۔ لیکن اب نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ارے عارف کی معشوقہ کو لے اڑا۔ میاں دوسروں کا اگلا ہُوا کھاتے ہو۔ تم عارف سے زیادہ خوبصورت ہو۔ تم چاہو تو دنیا کی بہترین عورت کو حاصل کر سکتے ہو۔ اور میں چُپ ہو جاتا۔ اور سوچتا۔ اور پھر سوچتا۔ کبھی کبھی خیال آتا۔ کہ ان چاندنی راتوں کو برباد نہ کیا جائے۔ جیب میں روپیہ ہے۔ جسم میں خون ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ عورت میرے قریب ہے۔ میں زینت کے جسم کو چاہتا ہوں۔ زینت میرے جسم کو چاہتی ہے ——— لیکن کم بخت عارف؟ عارف کا خیال آتے ہی میں پریشان ہو جاتا۔ سارے خون میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ جاتی۔ سارا جوش و خروش ختم ہو جاتا۔ اور تم نے خود مجھے کئی بار بھکاریوں کی گالیاں دیں۔ اور میں خاموشی سے تمہاری گالیاں سنتا رہا ———

زینت اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ پیاری ہے۔ میں اب بھی اس کے جسم کو چاہتا ہوں۔ لیکن عارف کی گرہ ایک پھندا بن کر اٹکی ہوئی ہے ——— آہستہ آہستہ زینت سب کچھ سمجھ گئی۔ اور اُس نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا۔

"اب وہ کیا کرتی ہے؟"

"پہلے اُس نے ایک سیٹھ کو پھانس رکھا تھا۔ اب اس نے ایک خوبصورت لونڈے کو اپنے گھر میں رکھا ہُوا ہے اور اب کہتی ہے۔ کہ وہ کسی مرد سے شادی نہیں کرے گی۔ اگر مردوں کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ عورتوں کو داشتہ بنا کر اپنے گھروں میں رکھ سکتے ہیں۔ تو کیا عورتیں مردوں کو اپنے گھروں میں داشتہ بنا کر نہیں رکھ سکتیں۔ میرے پاس کس بات کی کمی ہے۔ اچھے خاصے روپے کماتی ہوں۔ حسین ہوں، جوان ہوں، چالاک ہوں۔ لوگوں کو اُلّو بنا سکتی ہوں۔ اب شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔

بڑے مزے سے اس نے ایک خوبصورت لڑکے کو اپنے گھر میں رکھا ہُوا ہے۔ اور دونوں مزے سے رہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ سورج دور پہاڑی کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہنے لگا۔

"کمبخت! خوبصورت عورت تھی میں نے یونہی ہاتھ سے کھو دی!"

آپ کے پسندیدہ فن کار اور ان کے تازہ شاہکار
HIS MASTER'S VOICE
جھلملاتے ہوئے ستاروں کی طرح دلفریب ہوسٹائیل گیت
شریمتی بینا چودھری
جھک بک چمکے گگن میں تارے
دل ہو گیا پرایا
N 16706
مسکراتے ہوئے پھولوں کی طرح مسرت خیز سہرا
سریندر کور
لاج روپ جوانی دی موری اک
پریاں وانگ اڈاریاں مارنظراں
N 13518
لہراتے ہوئے بادلوں کی طرح رومان انگیز ڈھولک گیت
منور سلطانہ
ہارا میری اکھ کیوں بھر گے
اوے مناں تن دل نہیں لگدا
N 13517
دی گراموفون کمپنی لمیٹڈ ۔ ڈم ڈم بمبئی مدراس دہلی لاہور
کولمبیا ریکارڈ
لو پھر بہار آگئی
اس رومان انگیز موسم میں
یہ ریکارڈ سنئے
ودیاناتھ سیٹھ
سپنوں میں آنا ہے ۔ گیت
نیناں کیوں روتے ہیں ۔ "
G.E. 5045 ریکارڈ نمبر
جمیلہ بائی (کانپور)
شبد سنا دے کوئلیا ۔ خیال بسنت بہار
اوگن چت نہ دھرو ۔ ٹھمری بھرویں
G.E. 5026 ریکارڈ نمبر
پنجابی ڈھولک گیت
دلشاد بیگم
چاننی رات اے آ پریتم
گجریاں والیا ویرا
G.E. 5444 ریکارڈ نمبر
کولمبیا گراموفون کمپنی لمیٹڈ ۔ ڈم ڈم بمبئی مدراس دہلی لاہور

بقیہ ننانوے ناٹ آؤٹ

نے ہمارے سامنے بیٹھ کر سب کچھ درست کیا۔ بڈی کے کہنے پر میری تھوڑی سی تعریف بھی شامل کی گئی۔

اب سیکنڈ شو کا پروگرام بنا۔ شیطان نے وہ اوور کوٹ اُتار دیا جس کو پہن کر زیادہ سردی لگتی تھی اور جو پہلے اُلٹوایا گیا تھا پھر سیدھا کرایا گیا تھا پروگرام اُسی سینما کا تھا جس میں پہلے گئے تھے۔ شیطان بولے — آج سردی زیادہ ہے آج پھر رضائیاں اوڑھ کر چلیں گے۔ اور نوکر حقہ لے کر ساتھ چلے گا۔

— ذرا سی دیر میں ہم رضائیاں اوڑھے اِتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈی سڑک پہ جا رہے تھے اور تقسیم انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڈی بار بار کہہ رہا تھا — "یو لائے او لوائے، آج میں اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر رہا ہوں، میں چیمپین ہوں، میں نے ایک کپ جیتا ہے — یاہ ہُوڈُا!"

اور جب ہم شہر کے بہترین سینما میں رضائیاں اوڑھے پکچر دیکھ رہے تھے اور حُقے کے کش لگا رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات نہ ہمیں چیمپین سمجھ رہے تھے نہ ہیرو، بلکہ غالباً ایسی خواتین سمجھ رہے تھے جو حُقہ پی رہی تھیں۔

شفیق الرحمٰن

ننانوے ناٹ آؤٹ

بڑی مشکلوں سے ہم نے وہ میچ جیتا، یا یوں کہیئے کہ ہارتے ہارتے بچے اب ہم سیمی فائیلز جیت کر فائیلز میں آ گئے تھے۔ سب سے زیادہ سکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اُس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی سٹروک ایسا نہ تھا جو اُس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تین رنز بنائیں۔ اُس کے بعد جو اُچھل اُچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک سکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بیحد تیز کھیلا، آگے بڑھ بڑھ کر جو ہٹیں لگانی شروع کی ہیں تو پانچ رنز کا اور اضافہ کر دیا۔ جب ہم شام کو روپیٹ کر جیتے ہیں۔ اور آخری کھلاڑی نے ہٹ لگائی ہے تو مقصود گھوڑا پچیس رنز بنا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے گذرے تھے وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے اُن کی بولنگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے دس نے بولنگ کی تھی۔ گیارہواں وکٹ کیپر تھا اور مجبور تھا۔ ورنہ وہ بھی حسب توفیق مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ٹیموں کے ہارنے کا اتنا ڈر نہیں جتنا جیت جانے کا ہے۔

سیکنڈ شو دیکھنے کے لئے میں مقصود گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوسٹل میں پہنچا۔ اُن کے کمرے میں جا کر کیا دیکھتا ہوں۔ کہ بڑی مدھم روشنی میں ایک بڑے سے پلنگ پہ چند حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے ہیں۔ اُن میں شیطان بھی تھے۔ بولے —— "سردی بہت زیادہ ہے اور ہم تھکے ہوئے بھی ہیں۔" شیطان میچ میں کھیلے تھے اور حسب معمول دونوں رننگز میں صفر سکور کی تھی۔ اُنہوں نے ہمارے لئے ایک رضائی منگوائی اور ہم دونوں بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ مقصود گھوڑا بولا۔ "رُونی صاحب آپ کیسے ہیں؟" —— شیطان بولے —— "میں بفضل خدا خیریت سے ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلب ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ...." میں نے سینما کا پروگرام بتایا اور پوچھا کیا بجا ہے؟ —— شیطان گھڑی دیکھ کر بولے —— "جمرات ہے۔" ویسے سینما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ شیطان بولے۔ "ایک گھنٹے کا کیا ہے دس منٹ میں گذر جائے گا۔ آج سینما اسی طرح چلیں گے۔ رضائیاں اوڑھ کر —— اور نوکر بھی ساتھ چلے گا حقہ لے کر۔ آج میچ جیتا ہے۔"

بڑی بحث ہوئی۔ مقصود گھوڑے نے کہا —— میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ رضائیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ —— شیطان جلدی سے بولے —— میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں آج رضائیاں اوڑھ کر چلنا ہوگا۔ سردی بہت زیادہ ہے اور میرا اوورکوٹ ایسا ہے جسے پہن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے۔"

"وہی اوورکوٹ تو نہیں جسے اُلٹوایا گیا تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں! پہلے اُسے الٹوایا گیا تھا۔ پھر سیدھا کرایا گیا ہے۔" شیطان بولے۔

"یہ روشنی بہت مدھم ہے۔ میں نے بات ٹالنے کو کہا۔ شیطان نے نوکر سے پوچھا —— "کیوں یہ بلب کتنے ہارس پاور کا لائے ہو؟" اس غریب نے بلب کی ہارس پاور بتا دی۔ شیطان بولے —— آج بجلی ہی کم آ رہی ہے۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نوکر حقّہ بھر کر لے آیا۔ سب نے رضائیاں لیں۔ شیطان اپنی عینک ڈھونڈھنے لگے کسی نے بتایا کہ ایک عینک تو ان کی ناک پہ ہے۔ بولے —— آج کل میرے پاس تین عینکیں ہیں۔ ایک دُور کی چیزوں کے لئے دوسری نزدیک کے لئے اور تیسری ان دونوں کو ڈھونڈنے کے لئے۔ میں بقیہ دو عینکیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جج صاحب کے کنبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کہیں گے کہ عجب بدمذاق لڑکا ہے۔ شہر کے بہترین سینما میں رضائی اوڑھے بیٹھا ہے۔ اُن دنوں رضیہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی اور

میں کافی بیزار تھا۔ شیطان مجھ سے بیزار تھے۔ بار بار وہ یہی کہتے کہ میاں اگر بس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہیئے —— دوسری ابھی آتی ہوگی۔

چلتے چلتے پھر کسی نے شیطان کو مشورہ دینے کی کوشش کی، وہ بولے —— میں آپ کو یہی مشورہ دُوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔ ذرا سی دیر میں ہم ٹھنڈی سڑک پر اتنی ٹھنڈ میں رضائیاں اوڑھے جا رہے تھے۔ اور ہمارے پیچھے نوکر حقّہ تھامے آرہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جج صاحب نہ آئے ہوئے ہوں۔ ویسے وہ سیکنڈ شو میں اکثر آجایا کرتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو پکچر شروع ہو چکی تھی۔ جج صاحب کی موٹر جیسی ایک موٹر باہر کھڑی تھی۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اندر ہونگے میں نے اپنی رضائی تو مقصود گھوڑے کے سر پر ڈالی اور شیطان کی نظر بچا کر ایک طرف ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو جج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں نظر نہ آجاؤں مگر ذرا سی دیر میں ننھی میرے سامنے کھڑی تھی —— مجھے پیچھے جانا پڑا۔ جج صاحب ساتھ جج صاحب کی بیگم، حکومت آپا اور رضیہ میٹھی تھیں۔ میں نے سلام کیا اور مجھے ننھی کی سیٹ ملی۔ ننھی میری گود میں بیٹھ گئی۔ جج صاحب نے پہلے تو میرے نہ آنے کی شکایت کی میں نے امتحان کا بہانہ بنا دیا۔ پھر بولے "وہ خواتین کون تھیں؟" میں چونک پڑا —— "کیسی خواتین؟ —— کب بھلا ——؟" بولے —— "ابھی ابھی تمہارے ساتھ آئی تھیں ——!"

"جی نہیں میرے ساتھ تو کوئی نہیں آیا۔ میں تو اکیلا آیا ہوں۔" میں صاف مُکر گیا۔

"اور وہ کون ہیں ——؟" انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا —— "ارے لاحول ولاقوۃ!! —— یہ خواتین تو حقّہ پی رہی ہیں۔

شیطان وغیرہ حقّہ پی رہے تھے "خواتین نہیں ہونگی کوئی اور ہوگا" میں نے کہا۔ وہ بولے —— "عجب پُراسرار شبیہیں ہیں۔ غالباً یہ خواتین نہیں ہیں —— یا شاید ہوں۔"

میں نے کن آنکھوں سے رضیہ کو دیکھا جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ فوراً اُس نے منہ پھیر لیا۔ عرصے سے رضیہ مجھ سے ناراض تھی۔ ایسی ناراض تو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ مجھ سے بات کرتی نہ میری طرف دیکھتی۔ اور یہ بے رُخی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جتنا میں جانے کی کوشش کرتا اُتنا ہی وہ اور روٹھ جاتی۔ ہوا یہ کہ —— کالج میں ڈراما بھی اُن ہی دنوں ہوا۔ جن دنوں ٹینس ٹورنمنٹ ہو رہا تھا۔ ٹینس میں سرلا میری پارٹنر تھی۔ اُدھر ڈرامے میں بھی ہم اکٹھے تھے۔ شام کو یا تو میچ ہوتا اور یا پریکٹس ہوتی۔ اس کے بعد ریہرسل، اور رات کو میں اُسے چھوڑنے جاتا۔ نہ جانے ننھی نے ہمیں کہاں دیکھ لیا۔ جا کر رضیہ سے کہہ دیا۔ اگلے روز اتفاق سے اُس نے ہمیں کالج سے اکٹھے نکلتے دیکھ لیا۔ پھر چند دنوں کے بعد کھیل کے بعد سرلا بولی۔ میرے ڈیڈی شام کی ٹرین سے گذر رہے ہیں۔ مجھے سائیکل پر سٹیشن لے چلیئے۔ ٹرین آدھ گھنٹہ ٹھیرے گی۔ اس کے بعد فوراً ہی ریہرسل کے لئے آجائیں گے۔ میں اُسے سائیکل پر لے کر نکلا ہی تھا۔ کہ رضیہ اور حکومت آپا مل گئیں۔ بس اُس دن سے رضیہ ناراض ہو گئی۔ نہ جانے اس میں ناراض ہونے کی بات کیا تھی۔ سرلا پارٹنر تھی۔ اور وہ سٹیشن پر جانا چاہتی تھی۔ اور پھر فوراً ریہرسل کے لئے واپس بھی آنا تھا۔ ہم دونوں کے پاس فقط ایک سائیکل تھی۔ اور رضیہ کا رُوٹھنا بالکل بے جا تھا۔ اُدھر سٹیشن پر ہمیں ایک نہایت ہی کرخت قسم کے دراز ریش بزرگ ملے جنہیں ہرگز ڈیڈی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

حکومت آپا حسبِ معمول خفا تھیں۔ شیطان کا خیال تھا کہ اُن کو مجھ سے ایک حسرت آمیز نفرت ہے۔ اور تو اور ننھی بھی کچھ کچھ ناراض تھی۔ ہم جج صاحب کے ہاں جو کچھ توڑتے پھوڑتے ننھی کے سر لگا دیتے شیشے کے گلاس، چینی کے گلدان، الماریوں کے شیشے غرضکہ جو کچھ بھی ہم سے ٹوٹتا ننھی کا نام لے دیتے۔ باغیچے سے جتنے پھول اور پھل ٹوٹتے وہ بھی ننھی کے سر لگتے۔

دوسرے یہ کہ شیطان کئی کئی مرتبہ کوکو بیتے۔ ننھی کوکو، بھوت اور چڑیلوں سے بہت ڈرتی تھی۔ رات کو ننھی کو سُنا سنا کر شیطان کوکو بنواتے کوکو آنے والی ہے —— کوکو کب آئے گی؟ اب۔ کوکو آگئی۔ کئی مرتبہ تو یہ ہوا کہ ننھی سو رہی ہے اور شیطان نے کوکو کہہ کر ڈرا دیا۔ بعد میں کہہ دیا کہ میں تو کوکو بنوا رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ شیطان رات کو ننھی کے پاس بیٹھ کر انگریزی ریکارڈ بجایا کرتے۔ انگریزی کے ریکارڈوں کے متعلق ننھی کا یہ خیال تھا کہ ایک کمرے میں مختلف قسم اور مختلف سائز کے بہت سے کتے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور آپس میں خوب لڑتے ہیں۔ کبھی چھوٹے چھوٹے کتے اور کبھی بڑے بڑے، پھر بڑے اور چھوٹے کتے آپس میں لڑتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں۔ تو خوب روتے ہیں۔ بعض اوقات ایک بوڑھا سا کتا اکیلا بیٹھ کر زور زور سے روتا ہے

بعض اوقات بلیاں اور مرغیاں خوب لڑتی ہیں۔ ایسے ریکارڈ سن کر بھی ننھی خوب ڈرتی۔

میرا اور شیطان کا امتحان نزدیک تھا۔ اس لئے ہم دونوں جج صاحب کے ہاں سے ہوسٹل میں چلے آئے تھے۔ ہمارے ہوسٹل دُور دُور تھے لیکن ہمارا وقت اکٹھے ہی گزرتا۔ ادھر جج صاحب خوب کوٹھیاں بدل رہے تھے۔ پچھلے چند ماہ میں انہوں نے چار پانچ مرتبہ مکان بدلا تھا۔ شیطان جب کبھی اُن سے ملتے یہی پوچھتے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔ اُن کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی تھی۔ جج کے ہاں چوری — عجیب سی بات تھی۔ صبح صبح پتہ چلا کہ رات کو چوری ہوئی ہے لیکن سب چیزیں جُوں کی تُوں موجود تھیں۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ چرایا کیا گیا ہے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور محض تفریحاً آئے تھے۔ بعد میں جا کر پتہ چلا کہ میرے سارے کپ جو انگیٹھی پر اور الماریوں میں رکھے تھے غائب ہیں بڑے نامعقول چور نکلے۔

وہ کوٹھی تھی بھی سُنسان سی جگہ میں۔ پھر ایک مرتبہ سارا کنبہ کسی دوسرے شہر میں گیا۔ میں اور شیطان سیکنڈ شو دیکھ کر بہت دیر سے لَوٹے۔ کوٹھی میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہم دیوار کود کر چھوٹے راستے سے اندر چلے آئے۔ اندھیرے میں آہٹ سنائی دی۔ دبے پاؤں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک صاحب تالا کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ جب تالا کھُل گیا تو شیطان نے چور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا — "یار بڑا افسوس ہے" اُس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہم نے اُسے کہیں نہ جانے دیا۔ بلکہ اُسے اندر لے آئے اُسے کافی پلائی گئی۔ چاکلیٹ کھلائے گئے۔ وہ بیچارہ بڑا پشیمان تھا۔ میں نے اپنے کپوں کے متعلق پوچھا۔ وہ قسم کھا گیا کہ اُس نے کپ نہیں اُٹھائے۔ اگر وہ چوری کرتا بھی تو کپ کبھی نہ اُٹھاتا — سپورٹسمین چور معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے ہاتھ ملا کر اُسے رخصت کیا۔ جج صاحب نے کوٹھی بدلی۔ نئی کوٹھی میں ہر روز بجلی فیل ہو جاتی تھی۔ پھر مکان بدلا اُس کے پڑوس میں رات دن قوالیاں ہوتی تھیں بینڈ بجتے تھے۔ ایک دو مرتبہ پھر اسی طرح ہوا۔ اب موجودہ مکان ایسی جگہ تھا کہ آس پاس بے شمار لڑکیاں رہتی تھیں۔ سہ پہر کو لڑکیاں سکولوں اور کالجوں سے لَوٹتیں۔ شام کو خوب رونق ہوتی۔ شیطان نے اُس جگہ کا نام مینا بازار رکھا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوسٹل چھوڑ کر جج صاحب کے ہاں آجائیں گے۔

جج صاحب بدستور اُن خواتین کو دیکھ رہے تھے جو جھینپ رہی تھیں۔ اور اُن کے متعلق ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ رضیہ نے سر پہ دوپٹہ اس انداز سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اُس کی ناک کا ذرا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک حسین ترین ناک کا حصہ تھا۔ حکومت آپا مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ کہ میں اتنے دنوں سے کیوں نہیں آیا۔ اور آج کل اُس لڑکی کا کیا حال ہے۔ جو میرے ساتھ سائیکل پر تھی۔ وہ لڑکی بہت حسین بھی نہیں ہے لیکن بُری بھی نہیں ہے، بڑی شوخ سی ہے اور ہمیں کسی نے اور بھی باتیں بتائی ہیں۔ جو اس وقت کہنے کی نہیں ہیں۔ کیونکہ ننھی سُن رہی ہے۔ ننھی جو میری گود میں تھی بولی — میں بالکل نہیں سُن رہی ہوں۔ میں نے خوشامد کے طور پر ننھی کو کہانیاں سنائیں۔ — سنو ننھی ایک کہانی — ایک شخص شیر کا شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ شیر بولا — آہاہا۔ اچھا ایک اور کہانی سنائیں — سنو۔ دو چیتے کے شکاری اور ایک چیتا — ایک چیتے کا شکاری اور ایک چیتا — ایک چیتا — ننھی پھر ڈرنے لگی۔

انٹرول ہوا اور روشنی میں جج صاحب کو یہ تو یقین ہو گیا کہ وہ خواتین نہیں ہیں۔ لیکن اب یہ بحث شروع ہوئی کہ یہ لباس کس قسم کا ہے اور یہ کس قسم کے حضرات ہیں اور کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ شیطان اور دیگر حضرات نے رضائیوں میں منہ سر لپیٹ رکھے تھے۔ ورنہ ضرور پہچانے جاتے۔ میں نے بات ٹالنے کے لئے اپنے کرکٹ میچ کا ذکر شروع کر دیا۔ کہ آج ہم ایک میچ جیت کر فائنلز میں آ گئے ہیں۔ دو روز کے بعد ہمارا میچ ہے چار روز تک ہوگا جس میدان میں میچ ہوگا وہ جج صاحب کی کوٹھی اور مینا بازار کے بالکل پڑوس میں تھا

وہ بولے۔ ہم ضرور دیکھیں گے۔ اسی ہفتے میں کئی چھٹیاں بھی ہیں۔ پکچر ختم ہوئی چلتے وقت میں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا۔ جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جلدی سے اُس نے مُنہ پھیر لیا۔

ہمارے کلب کے کپتان گیدی صاحب تھے۔ اُن کا اصلی نام شاید زیدی تھا لیکن اُن کو گیدی ہی کہا جاتا تھا۔ اُن کا قد بہت چھوٹا تھا اور بقول شیطان وہ سطح سمندر سے ساڑھے چار فیٹ بلند تھے۔ اُن کے ساتھ ہر وقت اُن کے دو مشیر ہوتے۔ جو کافی دراز قد تھے۔ گیدی صاحب اُن کے درمیان میں چلتے شیطان

نے ان تینوں کا نام ایک سو ایک ــــ ۱۰۱ ــــ رکھا ہوا تھا ــــ اُن کے قول کے مطابق ٹیم کی انتخابی کمیٹی بھی یہی تھی اور وہ ممبروں پر مشتمل تھی ــــ گیدی صاحب اور سمتھ سمتھ کا اصلی نام بلدیو سنگھ تھا۔ وہ بولر تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اُن کا سٹائل مشہور آسٹریلین بولر فلیٹ وڈ سمتھ سے بہت ملتا ہے۔ ہر وقت وہ یہی الاپتے رہتے۔ چنانچہ اُن کا نام بلدیو سنگھ سمتھ رکھا گیا۔ جو بعد میں سمتھ رہ گیا۔ اخبار میں بھی یہی چھپتا۔ بڈی بھی ہمارے کلب کا ممبر تھا۔ وہ اس ٹورنمنٹ کے تینوں میچ کھیل چکا تھا۔ امریکہ میں وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا اور اچھا کھلاڑی تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا اور اچھا کھلاڑی تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس سال کی طرح کھیلتا، بلا ترچھا رکھتا۔ اور ہر وقت ہلاتا رہتا۔ مُنہ میں چیونگ گم ہے مُنہ ہل رہا ہے۔ ہاتھوں میں ترچھا بلا ہے۔ ہاتھ ہل رہے ہیں۔ بلا ہل رہا ہے۔ خود ہل رہا ہے۔ جیسی بھی گیند آتی وہ ضرور بلا گھما دیتا۔ بعض اوقات سکور بھی کر لیتا تھا۔ کیچ بہت اچھا کرتا تھا۔ اسی لئے اُسے سلپس میں کھڑا کرتے۔ ہر میچ میں دو تین کیچ اُس کے ہوتے۔ ہماری ٹیم میں دو تین اچھے کھلاڑی بھی تھے۔

پہلی مرتبہ ہم لگاتار تین میچ جیت کر فائنل کھیلنے والے تھے۔ دو روز کے بعد میچ تھا۔ ایک نہایت اچھے کلب کے ساتھ مقابلہ تھا۔ جیتنے والی ٹیم کے لئے ایک دزنی سا چیلنج کپ اور گیارہ چھوٹے چھوٹے کپ منتظر تھے۔

سہ پہر کو ساری ٹیم پریکٹس کے لئے آئی۔ گیدی صاحب بیٹنگ کی ترتیب مرتب کرنے لگے۔ شروع میں وہ اور مقصود گھوڑا تھے۔ بڈی ساتویں وکٹ پر۔ آٹھویں وکٹ پر میں اور نویں پر شیطان۔ شیطان نے بڑا حساب لگایا۔ جب اُنہیں پتہ چلا کہ وہ گیارہویں کھلاڑی ہیں تو مچل گئے۔ گیدی صاحب سے بولے

ــــ مجھے گیارہواں کیوں بھیجا جا رہا ہے؟

بڈی نے جواب دیا ــــ اس لئے کہ کوئی بارہواں نہیں ہوتا۔ گیدی بولے ــــ "کپتان صحیح اندازہ لگا سکتا ہے اور اُس کا نظریہ ہمیشہ درست ہوتا ہے"۔

شیطان بولے ــــ "ہر شخص کے دو نظریے ہوتے ہیں ــــ اس کا ذاتی نظریہ اور غلط نظریہ"۔

مصیبت یہ تھی کہ شیطان نہ بولر تھے، نہ بیٹسمین، نہ وکٹ کیپر۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ ایک اعلیٰ درجہ کی ٹیم میں پانچ اعلیٰ درجے کے بیٹسمین ہونے چاہئیں۔ چار بہترین بولر۔ ایک وکٹ کیپر اور ایک ردّی۔

ہر میچ میں شیطان کا سکور یا تو صفر ہوتا یا دو یا تین۔ ہر میچ کے بعد وہ یہی کہتے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو دیکھنا۔ اگلے میچ میں کیسے ہاتھ دکھاتا ہوں۔ بڈی نے کئی مرتبہ پوچھا بھی کہ لاسٹ میچ تک کیا تمہارا ارادہ اِنّا لِلّٰہ ہونے کا ہے۔ لیکن یہ شیطان کا محبوب فقرہ تھا۔

ہر روز جب مشرق سے سورج نکلتا ہے تو کلیاں کھِل کر پھول بن جاتی ہیں تتلیاں جاگ اُٹھتی ہیں۔ پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ کائنات میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ ہر روز سورج ڈوبتے وقت ایسی شفق پھولتی ہے کہ سب کچھ جگمگا اُٹھتا ہے چاندنی رات میں ایک عجیب سا فسوں آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔

ــــ لیکن حکومت آپا کو اس کا علم تک نہ تھا۔

جس وقت ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو عجب سہانا سماں تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں ٹہنیوں اور پتوں پر رقصاں تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ چند رنگ برنگے پرندے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ گلاب کے پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی ــــ لیکن یہ سب کچھ بیکار تھا۔ کیونکہ بالکل نزدیک ہی حکومت آپا ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔

ہم دیر سے اُن کے ہاں نہیں گئے تھے۔ اور ہماری غیر حاضری میں وہ اپنے محبوب ترین مشغلے یعنی فضول کی بحث اور لڑائی جھگڑے سے لطف اندوز نہ ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ اس کے لئے کم از کم دو کی ضرورت ہے۔

حکومت آپا مجھ سے اس لئے بھی خفا تھیں کہ جب وہ موٹی ہو گئی تھیں۔ تو میں نے اُن کو دُبلا ہونے کا مناسب نسخہ نہیں بتایا۔ میں نے فاقہ کشی کیلئے کہا وہ بولیں ــــ "نہیں کوئی کھانے کی ایسی چیز بتاؤ جس سے میں دُبلی ہو جاؤں"۔ بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے اُن کا لنچ چھڑایا۔ ایک روز جا کر دیکھا تو وہ چائے پر پلاؤ کھا رہی تھیں تو میں نے اُن کا لنچ پھر شروع کرا دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح صبح شام کلیان گایا کرتی ہیں ــــ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں اور سورج غروب ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہم اندر گئے سب ملے۔ رضیہ بھی ملی۔ اُسی طرح منہ بنا رکھا تھا۔ جتنی دیر بیٹھی رہی۔ مُنہ موڑ کر، اور چپ چاپ کچھ دیر کے بعد اُٹھ کر چلی گئی۔ ہمیں کھانے پر ٹھہرا لیا گیا۔ میں اکیلا بیٹھا ریڈیو سُن رہا تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہ شیطان اور حکومت آپا کہاں چلے گئے۔ دیر سے غائب ہیں۔ باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو چاند نکلا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ ضرور یہ دونوں باغ میں ہونگے اور رومانی گفتگو ہو رہی ہوگی۔ میں دبے پاؤں گیا۔ واقعی وہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے تھے۔ اور رومان انگیز باتیں ہو رہی تھیں۔ میں چھپ کر سُننے لگا۔

شیطان بولے ـــــ "سچ مچ تم بہت پیاری معلوم ہو رہی ہو۔"
حکومت بولیں۔ "سچ مچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں۔ ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔"
شیطان بولے ـــــ "یقیناً ان چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے جب تم جون میں آئیں تو تمہاری جون بدلی ہوئی تھی۔"
حکومت بولیں۔ "یقیناً میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"
شیطان بولے ـــــ "روپے مانگتا کون ہے تم سے، بھلا ایسی رومان انگیز فضا میں جہاں باغ کا ایک گوشہ ہو۔ فوارہ چل رہا ہو۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو تو وہاں روپوں کا کیسے خیال آسکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے ـــــ!"
"سچ مچ ـــــ؟" حکومت آپا شرما گئیں۔
"ہاں سچ مچ!"
"بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے؟"
"کلوروفارم کی ـــــ! ـــــ جانتی ہو حکومت! انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟"
"کون ہے ـــــ؟"
"آئینہ! ـــــ اور کئی انسان آئینے کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ آئینہ کچھ کہے وہ ایک نہیں سنتے۔ اُن میں سے ایک تم بھی ہو۔"
اب حکومت آپا کچھ بگڑنے لگیں۔ شیطان جلدی سے بولے ـــــ "نہیں یہ بات نہیں ہے، وہ تو یونہی مُنہ سے نکل گیا تھا۔"
اب پھر رومانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا بولیں ـــــ "رومانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کونسی ہے؟"
شیطان بولے ـــــ "ڈکشنری!"
حکومت شیطان کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہیں پھر بولیں ـــــ "تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟"
شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے ـــــ "کیا بتاؤں ناک لمبی کیوں ہے یہ فطرت کے راز ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہارا ماتھا باہر کو کیوں نکلا ہوا ہے۔ تمہارے کان مڑے ہوئے کیوں ہیں۔ تمہارے دانت خرگوش کے دانتوں سے کیوں ملتے ہیں۔ حکومت تم اُن ہستیوں میں سے ہو جن سے اگر وقت پوچھا جائے تو گھڑی بنانے کا طریقہ بتا دیں۔ تم اُن صحرا نوردوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں ـــــ اور کل ـــــ کل بھی یہیں ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت لاجواب ہے۔ اور اب سب یہی کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی ہی شاندار ہوگا۔"

اب تو باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ کھانے پر رضیہ کہیں دُور بیٹھی تھی۔ حکومت آپا شیطان سے دور اور مجھ سے نزدیک تھیں عجب فضول سا وقت گذرا۔ واپسی پر میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا۔ روٹھنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لئے میں نے سرلا سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔
شیطان بولے ـــــ "اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو سرلا کو ہر وقت سائیکل پہ بٹھائے پھروں۔ اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز دو مرتبہ گذارا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ روٹھنا دُوٹھنا سب درست ہو جائے۔ میری مانو تو آج سے تم بھی رضیہ سے رُوٹھ جاؤ۔ مکمل طور پہ رُوٹھو۔ پرسوں پیچ پر سرلا کو ضرور بلاؤ اور اُس کے ساتھ خوب چہلیں کرو۔ اور پھر قدرت کا تماشہ دیکھو۔
میں نے اُن کو اپنا خواب سنایا جو رات کو میں نے دیکھا تھا ـــــ "میں نے دیکھا کہ رضیہ نے آسمانی اوڑھنی اوڑھ رکھی ہے۔ جس میں سنہرے تارے ہیں اور روپہلی پھُول رضیہ کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ دمکتے ہوئے چہرے پہ کالی کالی لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ اُس کے سیپ سے دانتوں ـــــ"
"تو جناب آج کل خواب بھی ٹیکنی کلر میں دیکھتے ہیں ـــــ سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟"
"کیا ہے؟"
"یہی کہ کوئی خواب نہ آئے۔"
میں نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا کہ جب سے رضیہ روٹھی ہے میں جیسے ہر وقت تنہا سا رہتا ہوں۔ شیطان بولے ـــــ "اگر تنہا رہتے ہو یا تنہائی سے ڈرتے ہو۔ تو کبھی شادی نہ کرنا۔" میں نے ایک رُومان شروع کیا ہے۔ وہ بولے "بھئی محبت کی ایک بہترین کہانی میں تمہیں سناتا ہوں ـــــ سنو ـــــ وہ بولا کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ ـــــ وہ بولی 'نہیں' ـــــ اور اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کہو کیسی کہانی ہے۔ ہاں ایک اور یاد آگئی ـــــ یہ بھی سُن لو ـــــ وہ بولی۔ ہم دونوں شادی کیوں نہ کر لیں ـــــ وہ بولا۔ لیکن ہم دونوں سے شادی کون کرے گا؟

تیسرے روز ہمارا میچ شروع ہوا۔ کچھ چھٹیاں تھیں اور کچھ مینا بازار کا قرب ویسے بھی وہاں چاروں طرف لاتعداد ریٹائرڈ بزرگ رہتے تھے۔ وہ سب کے سب آئے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں آئیں۔ ہماری مخالف ٹیم کے ساتھ بھی اچھے لمبے چوڑے کنبے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے کپتان نے حسب معمول ٹاس ہارا اور ہم فیلڈ کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ ہمیں میدان میں پہنچ کر ہوا۔ جدھر نظر اٹھاؤ رنگ برنگے ملبوس دکھائی دیتے تھے۔ بڑی بولا ––– ہوائے او ہوائے آج مجھے امریکہ یاد آرہا ہے۔ ہمارے کپتان گیدی صاحب بولے ––– دوستو اگر یہ میچ نہ جیتا تو آئندہ کھیلنا چھوڑ دیں۔ "آئندہ کھیلنا چھوڑ دیں گے" والا فقرہ وہ ہر میچ میں کئی مرتبہ کہتے۔ شیطان بولے اگر زندگی نے وفا کی تو دیکھنا تماشہ۔ بولنگ سمتھ اور میں شروع کیا کرتے تھے۔ گیدی صاحب نے چمکتی ہوئی نئی گیند میرے ہاتھ میں دی۔ اور میں فیلڈ جمانے لگا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ اُن کو شامیانے کی طرف باؤنڈری لائن پر بھیج دیا جائے۔ غالباً اس لئے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بڑی سلپس میں تھا۔ تالیاں بجیں اور بیٹسمین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بیحد موٹے تھے اور دوسرے بالکل ذرا سے تھے۔ کم عمر بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسی یار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونک کر بولے ––– "اچھا؟ ––– اتنا کم عمر اور ابھی سے ایک یار جنگ بہادر کا لڑکا کمال ہے"۔

جب وہ موٹے تازے حضرت ایمپائر سے پوچھ کر نشان لگا رہے تھے۔ تو شیطان نے پھر وہی رٹ لگا دی۔ آخر میں نے ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا اُن موٹے تازے حضرت کا نام قلندر صاحب تھا ––– شاید قلندر بیگ یا قلندر حسین ہونگے۔ یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا۔ کہ جب میری تیسری گیند اُن کی توند سے چھو کر وکٹ کیپر کے برابر سے گذر گئی تو یار جنگ بہادر کے صاحبزادے ادھر سے چلا کر بولے ––– قلندر صاحب وہیں ٹھیریئے۔ سمتھ کے اوور میں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام چُنّو میاں تھا۔ سمتھ کی گیند پر اُنہوں نے ہٹ لگائی۔ اُدھر سے قلندر صاحب چلائے ––– چُنّو میاں وہیں ٹھیریئے۔ دیر تک یہی ہوتا رہا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھیرنے کے لئے کہتے رہے۔

چُنّو میاں میرے سامنے آئے۔ میں خوب تیز گیندیں پھینک رہا تھا۔ سب کی سب اُن کے سر کے اوپر سے گذر گئیں۔ ایک گیند پر اُنہوں نے کٹ مارنے کی کوشش کی اور گیند بڈی کے سامنے سے گذری لیکن اُس نے ہاتھ تک نہیں ہلایا۔ معلوم ہوا کہ آپ لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مفت کی باؤنڈری ہوگئی۔ قلندر صاحب نے ایک گیند ہوا میں اُٹھا دی۔ گیند شیطان کی طرف جا رہی تھی۔ سب کو اُمید تھی کہ وہ کیچ کر لیں گے۔ لیکن اُنہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں وہ کسی اور طرف دیکھ رہے تھے۔ گیند اُن کے پاس ہی گری۔ جب شور مچا تو شیطان چونکے۔ جتنی دیر میں گیند واپس آئی تین رنز ہو چکی تھیں۔ اب معلوم ہوا کہ سوائے بولر اور بیٹسمین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلندر صاحب نے وکٹ کے سامنے ٹانگ اڑا دی۔ اور میں نے چلا کر اپیل کی تو امپائر چونک پڑے ––– جیسے جاگ کر بولے ––– ایں؟ پھر آہستہ سے کہنے لگے۔ بھئی معاف کرنا۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ یہ امپائر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے۔ وکٹ کیپر نے بھی کئی آسان سے کیچ چھوڑے سمتھ بولے ––– یار یہ لڑکیاں ہمیں ہرائیں گی۔ قلندر صاحب اور چُنّوں میاں تیس تیس سکور کر چکے تھے۔ شیطان نہ تو کیچ کرتے اور نہ گیند روکتے۔ تنگ آکر میں نے اُن کو نزدیک بلایا۔ گیدی بولے ––– بھئی اب ایک آدھ کو ضرور آؤٹ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں اور سمتھ ساری عمر بولنگ کرتے رہیں گے اور قلندر صاحب اور چُنّوں میاں ساری عمر کھیلتے رہیں گے۔ دفعتاً قلندر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی ––– یہ کیچ میرا تھا۔ گیند اُوپر چڑھتی گئی۔ میں ہاتھ پھیلائے گیند کا منتظر تھا اور گیند نیچے آتی ہی نہ تھی۔ اس وقفے میں جیسے ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ بچپن، لڑکپن ––– ساری شرارتیں ––– سب کچھ نگاہوں کے سامنے پھر گیا اور جب خدا خدا کر کے گیند نیچے آئی تو اتنی ذرا سی معلوم ہوئی جیسے زیرے کا دانہ ہو۔ میں نے اُچھل کر دونوں ہاتھوں میں گیند کو یُوں دبوچ لیا جیسے کوئی چھین لے گا۔

قلندر صاحب آؤٹ ہوگئے۔ جب وہ جا رہے تھے تو شیطان بولے ––– قبلہ اب آپ کے بغیر یہ میدان خالی خالی سا معلوم ہوگا ––– واقعی قلندر صاحب نہایت موٹے تھے۔ اب جو نئے صاحب آئے۔ اُنہوں نے شیطان کو دیکھا اور ان سے لپٹ گئے۔ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ بولے ––– آپ مجھے پہچانتے ہیں میں وہی غلام فقیر ہوں۔ شیطان نے بغور دیکھا اور بولے ––– ممکن ہے کہ آپ وہی غلام ہوں لیکن فقیر وہ ہرگز نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ وہ بولے ––– میں سچ مچ وہی ہوں، ذرا بدل گیا ہوں۔ پہلے سے میرا قد چھوٹا ہوگیا ہے"۔

اب وہ دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر امپائر نے ٹوکا تب غلام فقیر صاحب نے کھیلنا شروع کیا۔ میری پہلی ہی گیند کو اُنہوں نے لیگ کی طرف اُٹھا دیا۔ اور ایک صاحب کے پاس گیند آگری۔ اُنہوں نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے اُن کا نام پکارا تب چونک کر اُنہوں نے گیند اُٹھائی اور ازراہِ کرم میری طرف پھینک دی۔ کچھ دیر میں لڑکیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس فیلڈ کی طرف گیند جاتی۔ فوراً اُس کا نام لے کر اسے مطلع کیا جاتا۔ تب گیند واپس آتی۔

چنتو میاں نے گھوم کر لیگ کی طرف ہٹ لگائی۔ آگے مقصود گھوڑا دنیا و مافیہا سے غافل مراقبے میں کھڑا تھا۔ دھم سے گیند اُس کے پیٹ میں لگی۔ اُس نے نعرہ لگا کر وہیں دبا لی۔ چنتو میاں آؤٹ ہُوئے۔ اور اُن کو جاتے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک کھجور جیسے لمبے حضرت تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے ایک چھکا لگا دیا۔ گیند کی چمک ختم ہو چکی تھی۔ اور میری گیندیں بالکل سیدھی جا رہی تھیں۔ نہ کوئی بریک ہوتی تھی نہ کچھ۔ میں نے گیدی صاحب سے کہا کہ اب سلو بولر کو بلائیے۔ وہ بولے لنچ تک ٹھیر جاؤ۔ اتنے میں شیطان لپک کر آئے اور میرے کان میں بولے —— وہ جو دو لڑکیاں دیکھ رہے ہو۔ سفید شلوار اور نیلی ساری وہ چنتو میاں کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے پاس ہی بیٹھی ہیں۔ دو وکٹیں سمیٹ لیں۔ جب ہم لنچ کے لئے گئے۔ تو چار وکٹوں پر ایک سو پچیس سکور تھا۔ شیطان کے غلام فقیر چالیس ناٹ آؤٹ تھے اور اس میں اُنہوں نے کوئی بیس چالیس لئے ہونگے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ لنچ کے وقت کو کس طرح گذاروں۔ کیونکہ میں لنچ سے بے نیاز ہوں۔ ہجوم میں سے کسی نے ہلو کر دی۔ میں نے دیکھا۔ سرلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہلو کر کے میں بھی اُس کے پاس چلا گیا۔ نزدیک ہی رضیہ مُنہ بنائے بیٹھی تھی۔ میں جج صاحب اور حکومت آپا سے ملا۔ رضیہ کی طرف میں نے دیکھا تک نہیں۔ بلکہ اُس کے پاس ہی بیٹھ کر سرلا سے باتیں کرنے لگا۔

سرلا رضیہ جیسی حسین تو نہ تھی لیکن نہایت ہی ہنس مُکھ اور ستھری لڑکی تھی جب دیکھو مسکرا رہی ہے۔ چہرہ کھلا ہُوا ہے۔ اتنے میں چنتو میاں اُن دونوں لڑکیوں کو لئے ہُوئے آئے۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ شیطان کا کہنا درست تھا۔ وہ اُن کی بہنیں تھیں ہمارے ایک بوڑھے پروفیسر جو نزدیک ہی رہتے تھے۔ اپنی لڑکیوں سمیت آئے ہُوئے تھے۔ وہ لڑکیاں بھی میرے پاس آ بیٹھیں۔ ایک ہم جماعت بھی مل گئی۔ خوب مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے سو ڈیڑھ سو واقف لڑکیاں اور بھی آجائیں۔ تاکہ آج رضیہ کے سامنے اُن سب سے باتیں ہوں۔ شیطان نے جب مجھے دیکھا تو فوراً لپک کر آئے لیکن میں نے جلدی سے حکومت آپا کو بُلا کر حکومت آپا کو بُلا کر شیطان کو اُن کے حوالے کر دیا۔ شیطان بولے —— یہ ہجوم کافی بدمذاق معلوم ہوتا ہے اب تک کسی نے ہمارا آٹو گراف نہیں لیا۔

لنچ کے بعد دونوں سلو بولرز آ گئے۔ میں اور شیطان شامیانے کے سامنے باؤنڈری لائن پر کھڑے تھے۔ میں سرلا سے باتیں کر رہا تھا اور حکومت آپا شیطان سے باتیں کر رہی تھیں۔ شیطان کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے مجھے ٹافیاں دیں۔ جنہیں میں بڑی بے تکلفی سے وہیں کھانے لگا۔ گیدی صاحب پہلے بھی ہمیں ٹوک چکے تھے۔ اُن سے نہ رہا گیا۔ اُنہوں نے ہم دونوں کو سلپس میں بُلا لیا اور بڈی کو ہماری جگہ بھیج دیا۔ کیونکہ بڈی کا ہجوم میں کوئی واقف نہ تھا۔ اب شیطان بہت گھبرائے کیونکہ سلپس میں بہت سنجیدگی سے فیلڈ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ دیر وہ سہمے ہُوئے رہے اور یہی دعائیں مانگتے رہے۔ کہ کوئی کیچ نہ آجائے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد ہم خوب باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ شیطان نے شکایت کی کہ میں نے چنتو صاحب والی دونوں لڑکیوں سے اُن کا تعارف کیوں نہ کرایا۔ میں نے بتایا کہ مجھے اُن سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ کل تعارف کرا دیا جائے گا۔ اور میں شیطان کے بتائے ہُوئے نسخے پر عمل کر رہا ہوں۔ "بہت خوب" —— اُنہوں نے مسکرا کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" —— شُوں سے ایک چیز آئی اور شپ سے شیطان کے ہاتھ سے چپک گئی —— لاحول ولاقوۃ، یہ تو گیند تھی۔ ایک صاحب بلا سنبھالے واپس جا رہے تھے۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا۔ شیطان نے ایک نہایت لاجواب کیچ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہُوئے۔ پانچ وکٹوں پر سکور ایک سو اٹھانوے تھا اور وہ غلام فقیر بیاسی ناٹ آؤٹ تھے۔ ارے! —— یہ تو سنچری پر تلا ہُوا ہے۔ نئے صاحب آئے۔ شروع میں معلوم ہو رہا تھا۔ کہ یہ اب آؤٹ ہُوئے۔ اب آؤٹ ہُوئے۔ لیکن ذرا سی دیر میں وہ بھی جم گئے۔ چار پر دو سو سکور تھا۔ پہلے میچوں میں چار نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ فائنل تھا۔ ایک اچھے خاصے ٹورنمنٹ کا —— ہم نے دیکھا کہ چاروں طرف بے رونقی تھی۔ بزرگ حضرات جا چکے تھے۔ اور لڑکیاں بھی اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں۔

چار کے بعد دو سو ایک پر گیدی صاحب نے نئی گیند لی۔ مجھے بلایا گیا۔ میں نے

بڑی تیز سپینگیں اور بریک کرائے۔ لیکن اُن فقیر صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نئی گیند پر تو وہ اور بھی محتاط ہو گئے تھے۔ اُدھر بُوڑھے امپائر صاحب جو سارا دن کھڑے رہ رہ کر تنگ آ چکے تھے۔ اپنے پُرانے قصے سُنا رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ کیا کرتا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ بات یوں تھی۔ شیطان بولے ـــــ اچھا تو کیا آپ سچ مچ کبھی چھوٹے بھی تھے۔ اور وہ ناراض ہو گئے ـــــ فقیر صاحب نے پھر وکٹ کے آگے ٹانگ اڑا دی۔ دھپ سے گیند لگی اور میں نے اپیل کی۔ اُنھوں نے اُسی خفگی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ شیطان کی اس حرکت سے اُن فقیر صاحب کی جان بچ گئی ورنہ اس مرتبہ تو وہ سچ مچ آؤٹ تھے ـــــ غضب خدا کا ـــــ اب اُن کا سکور نوّے تھا۔ بڈی نے مجھے مشورہ دیا کہ دوسرے کھلاڑی کو یارکر دو۔ میں نے ایک یارکر پھینکا اور بڈی کا مشورہ نہایت کارآمد ثابت ہوا۔ سمتھ نے دوسری طرف سے کئی یارکر پھینکے۔ لیکن فقیر صاحب بڑے مزے سے کھیلتے رہے۔ شام کو سات وکٹوں پر سکور دو سو چالیس تھا۔ اور فقیر صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

ہم لوگ بیحد بیزار تھے۔ ایک بڈی غریب تھا جو سب کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اُس کے لطیفوں پر کوئی ہنستا ہی نہ تھا۔ سب یہی کہتے کہ بھئی یہ تو میں نے پہلے سے سُن رکھا ہے۔ حالانکہ بڈی کے لطیفے ہمیشہ نئے ہوا کرتے تھے۔ بڈی کہیں سے موٹر لایا ہوا تھا۔ ہم تینوں روانہ ہُوئے۔ شیطان بولے ـــــ یار بڈی ذرا آہستہ چلاؤ تم موٹر ہمیشہ اسی طرح چلاتے ہو جیسے کسی حادثے کا ریہرسل کر رہے ہو۔

~~~~~~~~

اگلے روز صبح اخبار جو پڑھتے ہیں۔ تو اس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کیچ کا ذکر نصف کالم میں تھا اُدھر فقیر صاحب کی خوب بُرائیاں کی ہوئی تھیں۔ میں نے شیطان سے پوچھا بھی، وہ بولے اخبار کا رپورٹر وہاں موجود تھا یہ اُس کی بے لاگ رائے ہے۔ شیطان ایک کیمرہ لائے ہُوئے تھے بولے۔ آج چنّو میاں اور اُن کی دونوں بہنوں کی تصویریں اُتاروں گا اور سرلا کی بھی۔ شیطان نے سرلا کی تعریفیں شروع کر دیں۔ غالباً اُن کا ارادہ اُس پر عاشق ہونے کا تھا میں نے بڑی مشکل سے اُن کو روکا۔ وہ اس شرط پر مانے کہ میں اُن دونوں لڑکیوں سے اُن کا تعارف آج ضرور کرا دوں۔

میں نے رضیہ کا ذکر کیا کہ رُوٹھ کر بھی دیکھ لیا۔ وہ بدستور خاموش ہے شیطان بولے۔ تم دیکھتے جاؤ۔ اگر خود آ کر سلام نہ کرے تو سہی۔ تم آج صرف سرلا کے ساتھ رہنا۔ ہم سائیکلوں پر روانہ ہُوئے۔ راستے میں سرلا ملی شیطان آہستہ سے بولے ـــــ میں چلتا ہوں، تم اسے سائیکل پر بٹھا لو۔ اور یہ خیال رہے کہ رضیہ تم دونوں کو ضرور دیکھ لے۔

مسکراتی ہوئی سرلا مجھے دیکھ کر اور بھی مسکرانے لگی۔ میں نے اُسے آگے جا کر لڑکیوں میں اُتارا جہاں رضیہ نے بخوبی دیکھ لیا۔ سرلا نے مجھے ایک رنگین ربن کا ٹکڑا دیا ـــــ بولی ـــــ یہ لیجئے ـــــ گڈ لک کے لئے۔ ٹینس کے میچ سے پہلے وہ ہمیشہ مجھے ربن کا ایک ٹکڑا دیا کرتی تھی۔ بچ صاحب ملے، بولے اور کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن اُس لڑکی کی سنچری نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ نہایت بری طرح کھیلا ہے۔ اگر وہ ایک اور رن بنا گیا تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔ تم لوگوں کی فیلڈنگ بہت بری ہے۔ تم نے سکور بہت زیادہ کرا دیا ہے کہیں ہار نہ جاؤ۔ کھیل شروع ہوا۔ ہم بالکل بیزار تھے۔ میرے اوور میں فقیر صاحب نے کچھ نہیں کیا۔ وہ ہر گیند کو روک لیتے تھے۔ ہجوم خاموش تھا۔ سب اُن کی سنچری کے منتظر تھے۔ شیطان پھر شامیانے کے سامنے باؤنڈری لائن پر کھڑے تھے۔ اُن دونوں لڑکیوں کے بالکل قریب۔ ایک اوور وہ وہاں رہتے اور دوسرے اوور میں میدان عبور کر کے دوسری طرف جانا پڑتا۔ سمتھ کا اوور آیا لیکن شیطان وہیں کھڑے رہے۔ چند گیندوں کے بعد دفعتاً اُنہیں خیال آیا کہ وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگے۔ جب وہ میدان عبور کر رہے تھے تو ایک گیند اُن کے قریب سے گذری اور اُنہوں نے یُونہی پکڑ لی ـــــ کیچ ہو گیا۔ کھلاڑی نے بڑی اچھی ہٹ لگائی تھی اور جہاں شیطان نے کیچ کیا۔ وہاں آس پاس کوئی فیلڈر نہ تھا۔ شیطان نے پھر ایک حیرت انگیز کیچ کیا تھا۔ تالیاں بجنے لگیں، سب نے یہی سمجھا کہ شیطان گیند کو اچھی طرح سمجھ کر خود بھاگے تھے۔ سکور وہی تھا۔ لیکن فقیر صاحب ابھی تک ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔ اور ہم سب کے سینوں پر مُونگ دل رہے تھے۔

یکایک ہجوم میں سے کسی بزرگ نے چلّا کر کہا ـــــ کہ اُس سے بولنگ کراؤ جس نے ابھی کیچ کیا ہے۔ گیدی صاحب کو نہ جانے کیا سُوجھی۔ شیطان کو بُلا کر گیند ہاتھ میں دے دی۔ شیطان بڑے گھبرائے۔ کیونکہ آج تک اُنہوں نے کبھی میچ میں بولنگ نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُن کے سامنے اُن کے غلام فقیر کھڑے تھے۔ جن کا سکور ننانوے ہو چکا تھا۔ فیلڈ جمائی تھی۔ اس لئے
~~~~~~~~

صاحب نے پوچھا ــــ تم تیز گیند پھینکتے ہو یا آہستہ؟ شیطان بولے۔ ــ مجھے کیا پتہ؟ ابھی پھینک کر دیکھوں گا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کتنے فاصلے سے دوڑ کر آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہر بولر کا دوڑنے کا فاصلہ مختلف ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ قدم گنے اور مختلف جگہوں پر نشان لگائے۔ گیدی صاحب نے فیلڈ کھڑی کی، نیا کھلاڑی آچکا تھا۔ اب جو کچھ ہُوا وہ شیطان اور کرکٹ دونوں کے لئے ایک معجزہ تھا۔ اور بقول شیطان کرکٹ کی تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے گیند رومال سے خوب صاف کی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، اور عجب بے ڈھنگے طریق سے بھاگنا شروع کیا۔ وکٹوں کے پاس آکر ان کے قدم غلط ہو گئے۔ اور ایک نہایت ہی بیہودہ گیند اُنہوں نے پھینکی۔ فقیر صاحب نے آگے بڑھ کر بلا گھمایا اور ایک غدر مچ گیا۔ چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا ــــ فقیر صاحب کی سنچری پر نہیں بلکہ اُن کے آؤٹ ہونے پر، شیطان نے اُن کی وکٹیں اڑادیں ــــ سنچری نہیں ہوئی۔ وہ ننانوے پر آؤٹ ہو گئے۔ ــــ شیطان نے سچ مچ کمال کر دیا۔ اسکور وُہی دو سو چالیس تھا۔ شیطان بولے ــــ بس اب کسی اور سے بولنگ کراؤ۔ میں گھبرا رہا ہوں۔ گیدی بولے بھئی اوور تو ختم کرو۔ شیطان کی تیسری گیند پر کھلاڑی نے ہٹ لگائی اور بھاگا۔ بڈی نے نہایت پھرتی سے گیند روکی اور وکٹ میں نشانہ لگایا ــــ اُسے رن آؤٹ کر دیا۔ شیطان بولے یہ بھی میری ہی وکٹ رہی۔ یہ خاص رن آؤٹ کرانے والی گیند تھی۔

شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شاباش دینے کے بہانے سے اُنہیں پیٹ کر رکھ دیا گیا۔ سکور وہی دو سو چالیس تھا اور ساری ٹیم آؤٹ ہو چکی تھی۔

اب ہماری اننگز شروع ہوئی۔ میں اور سرلا رضیہ کے قریب بیٹھے تھے۔ اور وہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ رضیہ نہایت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ آج اُس نے میرا پسندیدہ لباس پہن رکھا تھا۔ بال بھی میری پسند کے مطابق بنائے ہُوئے تھے۔ گلے میں وہ سادہ سا ہار تھا۔ جو میں نے اسے دیا تھا۔ مخالف ٹیم فیلڈ کرنے چلی۔ اور شیطان کیمرہ لے کر پیچھے اُن کی تصویریں اُتاریں۔ باقاعدہ پوز کرا کے ــ پھر گیدی صاحب اور مقصود گھوڑا بلّے لے کر شامیانے سے چلے ــــ شیطان نے اُن کی تصویریں اُتاریں۔ میں نے اُن دونوں لڑکیوں سے شیطان کا تعارف کرا دیا۔ . . . .
اور اب خوب باتیں ہو رہی تھیں شیطان کی ہدایت کے مطابق میں نے ٹافیاں اور چوسنے کی گولیاں تقسیم کیں۔ رضیہ ہماری طرف بدستور دیکھ رہی تھی لیکن ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ یا ہمارے مخالف بولرز نہایت ہی اچھے تھے یا ہمارے بیٹسمین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے۔ جو کوئی کھیلنے جاتا وکٹوں کے ہاتھ لگا کر واپس آجاتا۔ جب ساتویں وکٹ پر بڈی بلّا لے کر گیا تو سکور چھتیس تھا۔ بڈی کے مُنہ میں چیونگ گم تھا۔ اور چہرے پر مسکراہٹ جلتے ہی اُس نے ترچھے بلّے سے ایک چوکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر پھر چوکا۔ پھر چھکّا، پھر چوکا۔ غرضیکہ بولرز کے چھکّے چھڑا دیئے۔ اُدھر سے بولر چلاتا اِدھر سے بڈی چلتا اور جہاں گیند زمین پر پڑتی وہیں ہٹ لگتی۔ وہ تیز اور آہستہ ہر قسم کی بولنگ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہا تھا۔ سمتھ آؤٹ ہوا تو میں گیا۔ میں نے کوشش کی کہ بڈی کی مدد کروں اور گیندیں روکنے لگا۔ اسی کوشش میں آؤٹ ہو گیا۔ شیطان گئے اور حسب معمول پہلی گیند پر واپس آ گئے۔ ــــ ساری ٹیم ننانوے پر آؤٹ ہو گئی۔ اُسی ننانوے پر جو غلام فقیر اکیلے کا سکور تھا۔ غضب خدا کا۔ اور ہماری ٹیم کی ننانوے میں بڈی کا سکور چوالیس تھا اُسی بڈی کا سکور جو کرکٹ بیس بال کی طرح کھیلتا تھا۔ جو اپنے آپ کو کبھی کرکٹ کا کھلاڑی نہیں سمجھتا تھا۔ جج صاحب نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ہم ضرور ہاریں گے گیدی صاحب ہمت ہار بیٹھے تھے۔ سب لنچ کے لئے چلے گئے اور میں سرلا کے پاس آ بیٹھا۔ وہ بولی چلیئے باہر گھاس پر بیٹھ کر چلغوزے اور اخروٹ کھائیں۔ ہم باہر چلے گئے۔ سرلا اپنی کسی سہیلی حمیدہ کا ذکر کر رہی تھی جس کو وہ بہت پسند کرتی تھی۔ اتنے میں شیطان آ گئے۔ بولے ــــ حمیدہ وہی تو نہیں جو لباس بہت اچھا پہنتی ہے؟

سرلا بولی ــــ 'ہاں'

"اور یہ بات مسں لگتا بھی اچھا ہے؟"

"ہاں!"

"اور یہ لڑکی حسین ہے۔"

"ہاں!"

"اور جو گاتی بھی خوب ہے۔"

"ہاں! ——— کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں، جانتا تو نہیں جانتا لیکن جاننا چاہتا ہوں، کیا آپ کبھی اُس سے میرا تعارف کرا دیں گی؟"

مسز لے بولی ——— ضرور

شیطان حمیدہ کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہم دونوں نے اُس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر حمیدہ کی باتیں ہونے لگیں۔ شیطان بڑا اشتیاق ظاہر کر رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آئی کہ شیطان کے دیوتا کوچ کر گئے۔ یہ ایک مس ریچھ تھیں۔ مس ریچھ پر شیطان چند ماہ پہلے بُری طرح عاشق تھے۔ عاشق کیا اُن کے دیوانے بنے ہُوئے تھے۔ اُدھر مس موصوفہ میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس پر کوئی عاشق ہوتا ہوا اچھا لگے۔ یہ نام اُن کو بہت زیب دیتا تھا۔ وہ نہایت موٹی اور بد ریش تھیں۔ اُن کی والدہ شیطان کو کبھی پسند کرتی تھیں کبھی نہیں۔ وہ بھی اپنی ماں کی سی اپنی ماں کی ہی سی تھیں۔ بس ذرا نیا ماڈل تھیں۔ بعض لوگ کہتے تو وہ اپنی ماں سے قدرے حسین معلوم ہوتی تھیں۔ شیطان کا خوب مذاق اُڑتا ——— کہ ریچھوں کے سلسلے میں ہم پل کر جوان ہُوئے ہیں ——— سو نعمتیں کی کھلائے پلائے ریچھ کا بچہ ——— تو ہی ناداں چند ریچھوں پر قناعت کر گیا ——— یا کہ تیرے ریچھ کے ریچھ ابھی اور بھی ہیں، تو اپنا ریچھ دیکھ میرا انتظار دیکھ ——— وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شیطان باز نہ آئے اور اس وقت تک عاشق رہے جب تک اُن کا موڈ عاشقانہ رہا۔ پھر خود بخود راہِ راست پر آ گئے۔ ہماری کا خیال تھا کہ شیطان مس ریچھ پر اس لئے عاشق ہوئے ہیں کہ اس وقت اور کوئی عاشق ہونے کے لئے نہیں ہے۔ اُن سے تعارف نہایت ہی پُر لطف طریقہ سے ہوا تھا۔ ہم کہیں اور شیطان اُن چھٹیوں میں کہیں سے آ رہے تھے۔ شیطان مادر زاد تھے اس لئے سیکنڈ میں سفر کر رہے تھے۔ ایک جنکشن پر گاڑی بدلی۔ دوسری گاڑی چلنے والی تھی۔ بھاگا دوڑی میں سامان رکھوا رہے تھے۔ کہ ہجوم میں ہمیں ایک سفید ریش، فقیر دکھائی دیا جو ایک بچے کی انگلی پکڑے جا رہا تھا۔ فقیر کافی بڑھا تھا اور قدرے گبرا بھی تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً ترس آ جاتا ہے۔ اپنی جیبیں ٹٹول کر بولے ——— میرے پاس نوٹ ہیں۔ تمہارے پاس کچھ ٹوٹا ہوا ہو تو اس بیچارے کو دے دو۔ بہلا ریزگاری ہمیں گھبراہٹ میں کہاں سوجھتی تھی۔ بڑی مشکل سے دو آنے ملے۔ جلدی سے اُس فقیر کو دیئے۔ اور قلیوں کے پیچھے بھاگے۔

سیکنڈ میں کافی جگہ تھی۔ گاڑی چلنے سے ذرا دیر پہلے کسی کا بہت سا سامان آ گیا۔ اس کے بعد ایک سالم کنبہ۔ اور اس کے بعد وہی فقیر اُسی بچے کے ساتھ سیکنڈ میں آ بیٹھا۔ سارا کنبہ اُسے ابا جان کہہ رہا تھا ——— لاحول ولا قوۃ! ——— ہم بڑے شرمندہ ہُوئے وہ بزرگ جو ہمیں اُس وقت فقیر معلوم ہوئے نہایت معزز قسم کے حضرت نکلے۔ دراصل کچھ تو اُن کا لباس سادہ تھا۔ کچھ ہم گھبرائے ہُوئے تھے۔ اور کچھ شیطان کو ترس زیادہ آ گیا تھا۔ اُنہوں نے ہمارے دو آنے واپس کئے اور بڑے مزے کی باتیں ہُوئیں۔ اُسی کنبے میں مس ریچھ بھی تھیں۔ بس شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً عاشق ہو گئے۔ واپسی میں بڈی کو بتایا گیا وہ بولا۔ شاید یہ پانچویں لڑکی ہے جس پر تم اس سال عاشق ہُوئے ہو۔

شیطان بولے ——— نہیں چوتھی ہے ایک لڑکی پر میں دو بار عاشق ہوا تھا۔

جب شیطان رُو بصحت ہُوئے تو مس ریچھ سے میلوں پرے بھاگنے لگے۔ کیا تو اُن کے درشن کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ اور کیا اب اُن کے درشن سے بیزار ہونے لگے۔ اور اکثر کہا کرتے کہ جن جن باتوں پر پہلے شرم آتے ہُوئے فخر محسوس ہوتا تھا اُن ہی باتوں پر اب فخر محسوس کرتے ہُوئے شرم آتی تھی۔

وہ تو شیطان کی خوش قسمتی سے مس ریچھ نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ وہ سیدھی ہماری طرف آتیں۔

جب ہم فیلڈ کرنے بار ہے تھے تو ننھی آئی بولی ——— آپ اس طرح گیند کیوں نہیں پھینکتے۔ پوچھا۔ کس طرح؟ بولی اسی طرح جیسے اُس روز پھینکی تھیں۔ پوچھا۔ کس روز؟ بولی ——— میں بھول گئی ٹھیریئے ابھی پوچھ کر آتی ہوں اور سیدھی رضیہ کے پاس گئی۔ اچھا تو یہ سبق رضیہ صاحبہ ہمیں ہدایت دے رہی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا جس پر لکھا تھا ——— "بگ تھیوری"

خیال تو اچھا تھا لیکن مصیبت وہی کیچ کرنے کی تھی۔

ان کی دوسری اننگز شروع ہوئی۔ گیدی صاحب نے بڑی غلطیاں کیں، ایک تو یہ کہ سمتھ کو بہت جلد ہٹا لیا۔ اُس کی جگہ شیطان سے بولنگ کرائی، سب نے کہا کہ سمتھ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہو گیا، لیکن گیدی نہ مانے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر گیدی صاحب کو جوش آیا۔ تو اُنہوں نے خود بولنگ کی۔ اور وہ گیندیں پھینکنی شروع کیں جن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ گگلی ہیں لیکن کچھ نہ بنا۔ شیطان بار بار مجھ سے شرط بدتے۔ "لگاتے ہو دس روپے —— یہ کھلاڑی پچاس سے اوپر سکور کرے گا۔" میں انکار کرتا تو فوراً کہتے —— "اچھا چلو لگاتے ہو دس روپے —— یہ کھلاڑی پچاس سے نیچے سکور کرے گا۔" میں برابر انکار کرتا رہا کیونکہ میرے روپے ختم ہو چکے تھے۔ شیطان نے کہا کہ حکومت آپا سے اُدھار لے لو۔

جب ہم چائے پینے لگے تو سکور ڈیڑھ سو تھا اور صرف چار کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے وہ غلام فقیر تھا ابھی کھیل رہے تھے اس مرتبہ انہوں نے شیطان سے بالکل بات نہیں کی شاید خفا ہو گئے گیدی صاحب بالکل نا امید ہو چکے تھے۔ جج صاحب نے بھی بیزاری کا اظہار کیا بلجے یعنی میچ کا نتیجہ صاف نظر آ رہا ہے لیکن سرلائی نے بڑی ہمت بندھائی، بولی۔ آپ ضرور اچھا کھیلیں گے۔ میں نے وہ ربن جو دیا تھا نمی پھر آئی بولی آپا کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔ میں نے کہا کہ اپنی آپا سے کہو کہ ابھی مانتا ہوں۔ میں نے گیدی صاحب سے لیگ تھیودی کے لئے کہا۔ وہ بہت گھبرائے، بمشکل رضامند ہوئے۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کافی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند ایسی تیز بریک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود لیگ بریک ہو رہے تھے۔ اتنی تیز گیندوں پر۔ گیدی صاحب بولے یہ اِتنے تیز لیگ بریک تم نے کب سے شروع کئے؟ —— میں نے کہا —— آج سے۔ بلکہ ابھی سے۔ تیسری گیند پر بڈی نے بیگ پر ایک نہایت خوبصورت کیچ کیا اور فقیر صاحب شامیانے کی طرف چل دیئے۔ فقیر صاحب کے آؤٹ ہونے پر سب خوش ہوئے —— سوائے فقیر صاحب کے۔ اگلی گیند پر کھلاڑی نے گلانس کیا اور بڈی نے زمین پر لیٹ کر گیند دبوچ لی اب تو شور مچ گیا۔ دو گیندوں پر دو کھلاڑی آؤٹ۔ آوازیں آ رہی تھیں کہ ہیٹ ٹرک کرو۔ ہیٹ ٹرک کا خیال ہی ایسا ہے کہ ماتھے پر پسینہ آ جاتا لوگ طرح طرح کے شورے مجھے دے رہے تھے۔ میں نے انتہائی گھبراہٹ میں گیند پھینکی۔ گیند بالکل معمولی سی تھی۔ کھلاڑی نے گھوم کر لیگ کی طرف لگانے کی کوشش کی۔ گیدی صاحب نے اُچھل کر ہوا میں کیچ کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا ہاتھ پہنچا بھی، گیند ہاتھ سے چھو بھی گئی لیکن کیچ نہ ہوا گیند کا رُخ بدل گیا۔ دوسرے فیلڈر نے پھرتی سے ہاتھ بڑھایا لیکن کیچ پھر بھی نہ ہوا میں نا اُمید ہو گیا کہ اب کوئی نہیں کیچ کر سکتا۔ فیلڈر کے ہاتھ سے گیند چھوٹی اور رخ پھر بدل گیا اتنے میں بڈی بجلی کی طرح تڑپا اور گرتی ہوئی گیند دبوچ لی —— ہیٹ ٹرک ہو گیا —— سچ مچ کا ہیٹ ٹرک —— جس کے خواب دیکھے جاتے ہیں —— جس کی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ گیدی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں نے وہی ہیٹ بڈی کے سر پر رکھ دیا تالیوں کے شور میں مجھے رضیہ کی تالیاں بالکل علیحدہ سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ہیٹ ٹرک اُسی کا تھا۔ میرے اگلے اوور میں بڈی نے پھر ایک لاجواب کیچ کیا ایک کیچ سمتھ نے بہت دور باؤنڈری لائن پر کیا۔ آخری کھلاڑی کو میں نے بارکر سے واپس بھیج دیا۔ ایک سو اٹھاون پر ساری ٹیم آؤٹ۔ میں نے نو رن پر چھ وکٹیں لی تھیں، محض لیگ تھیودی کی بدولت اور یہ مشورہ رضیہ کا تھا۔ ہماری ٹیم اب چست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر اُمید کی جھلک۔ نمی نے دوڑ کر میرا استقبال کیا اور بولی۔ —— دیکھا میں کہتی نہ تھی۔ شیطان میرے کان میں بولے۔ اگر تم مجھے کسی طرح ریچھ سے محفوظ رکھ سکو تو کل کے اخبار میں تمہاری تعریفیں ہی تعریفیں ہونگی۔ پوچھا —— کیونکر؟ بولے —— رپورٹر میرا دوست ہے اور وہ سب کچھ میرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔ میں انہیں حفاظت میں حکومت آپا کے پاس لے گیا۔ وہاں ریچھ تو کیا بھوت پریت بھی شیطان کے پاس نہیں پھٹک سکتے تھے۔

نمی نے مجھے ایک چاکلیٹ دیا، پوچھا کس نے دیا ہے؟ بولی آپا نے۔ پوچھا —— کونسی آپا نے؟ بولی —— نہیں بتاتے۔ میں نے کہا پھر ہم نہیں لیتے۔ بولی —— رضو آپا نے۔ میں نے ایک پرزے پر شکریہ لکھ کر دیا —— یہ رضو کو دے دینا۔ وہ بولی —— آپ ادب نہیں کرتے ہماری آپا کا، صرف رضو کہتے ہیں —— رضو آپا نہیں کہتے۔ میں نے کہا وہ آپا ہونگی تمہاری، ہماری تو وہ صرف رضو ہیں۔ بولی میں ابھی جا کر کہتی ہوں۔

اب ہمیں جیتنے کے لئے دو سو تین رن کا نہیں ۔۔۔ کرنے کے لئے دو سو نناوے اور ہارنے کے لئے دو سو اٹھانوے ۔۔۔ سو یا دو سو مقصود گھوڑا ہنہنا کر بولا —— "قسم ہے راجی کی یہ اس اننگز میں ۔۔۔ گا کہ سب عش عش کر اٹھیں گے۔ سمتھ نے ٹکا ہوا میں ہلا کر کہا —— اور صاحب

بریڈمین کی ہیں اس اننگز میں ضرور سکور کروں گا۔ شیطان بولے ـــ قسم ہے ٹلڈن کی کہ ـــ کسی نے فوراً ٹوک دیا کہ ٹلڈن تو ٹینس کا کھلاڑی ہے۔ شیطان بولے ـــ "اچھا تو قسم ہے گاما پہلوان کی میں سنچری ضرور کروں گا۔

بڈی چیونگ گم چباتا ہوا بولا ـــ "قسم ہے مکی ماؤس کی میں بھی کچھ نہ کچھ کر کے رہوں گا۔

شام ہو چکی تھی، کل تیس پینتیس منٹ باقی تھے۔ وکٹ خراب ہو چکی تھی اور روشنی بھی کم تھی۔ گیدی صاحب اور اُن کے لمبے لمبے مشیروں نے کچھ کانفرنس سی کی اور بولے ـــ اگر شروع کے اچھے کھلاڑی اس وقت گئے تو کہیں آؤٹ نہ ہو جائیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آخری کھلاڑیوں میں سے دو کو بھیج دیں۔ اگر وہ آؤٹ بھی ہو گئے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ممکن ہے یہ وقت نکال جائیں۔ پھر کل اصلی کھیل ہوگا مجھے اور بڈی کو چُنا گیا۔ ہمیں بے شمار ہدائتیں دی گئیں کیونکہ آج تک ہم دونوں میں سے کوئی شروع میں نہیں گیا تھا۔ بڈی کی بڑی منتیں کی گئیں کہ بس گیند روک لینا ہٹ وغیرہ ابھی مت لگانا۔ ویسے بیٹسمین تو میں بھی ایسا ویسا ہی تھا لیکن اُن دنوں کرکٹ کی کتابوں سے مشہور کھلاڑیوں کے سٹائیل نقل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں اور بڈی میدان میں گئے تو چاروں طرف تالیاں بج رہی تھیں۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت مشہور بیٹسمین ہوں اور ابھی کچھ کا کچھ کر کے رکھ دوں گا۔ کھیل شروع ہوا، چمکتی ہوئی گیند بجلی کی طرح آتی تھی اور جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی۔ میں بلّا لئے دیکھتا رہ جاتا۔ پہلے دو اوورز میں ایک گیند بھی نہ چھو سکا ایک گیند بولر کے ہاتھ سے نکلی۔ خیال آیا کہ کٹ کروں، ابھی دہنا پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ گیند کا رخ بدل گیا۔ سوچا کہ ڈرائیو کروں گا۔ گیند کا رُخ اور بھی بدل گیا میں ہُک کی تیاری کر رہا تھا کہ روکنے میں مصلحت سمجھی اور لیگ پر خواہ مخواہ گلانس ہو گیا۔ گیند نہایت تیز تھی باؤنڈری ہو گئی۔ اب کچھ ہمت بندھی۔ جہاں گیند زمین پر پڑتی اُچھل کر وہیں اُسے روک لیتا لیکن میں بالکل کتاب کی نقل کر رہا تھا سیدھے بلّے سے جب گیند کو آئینہ دکھاتا تو نعرے لگتے "بہت اچھے"۔ "شاباش"۔ بڈی کو گیند روکنا مصیبت ہو گئی۔ ہر گیند پر وہ ہٹ لگانے کے لئے بلّا اُٹھاتا لیکن پھر کچھ سوچ کر روک دینے پر اکتفا کرتا بالکل ایسے عجیب طریقے سے روکتا کہ کچھ دیر میں گیند کی چمک دمک سب اُتر گئی خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا جب ہم تالیوں کے شور میں شامیانے کی طرف لوٹے تو میں گیارہ ناٹ آؤٹ تھا اور بڈی بارہ ناٹ آؤٹ۔ جج صاحب نے بڑی شاباش دی بولے ـــ اب تم کل اچھی طرح کھیلنا تین سو سکور ہے تو زیادہ۔ لیکن کرکٹ میں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا شاید کر جاؤ۔

رات کو میں نے شیطان سے تصویروں کے متعلق پوچھا کہ فلم کب دھلواؤ گے بولے ـــ کونسی فلم؟ ـــ میں نے کہا کہ آج جو تصویریں اتاری ہیں وہ فلم۔ بولے ـــ کیمرہ تو خالی تھا۔ آج کل فلمیں ملتی کہاں ہیں۔ پوچھا ـــ تو پھر تصویریں اتارنے میں کیا مسخرا پن تھا؛ بولے ـــ ویسے ہی ذرا لطف رہتا ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہو تو انسان ذرا اسمارٹ معلوم ہوتا ہے۔ اگلے روز اخبار میں میری بہت تعریفیں تھیں۔ حتٰی کہ بولنگ کا اتنا ذکر نہیں تھا۔ جتنا بیٹنگ کا ـــ یہ سب شیطان کی کرامات تھی۔

میدان میں پہنچ کر دیکھتے ہیں تو رضیہ اور سرلا اکٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ خود بخود دوستی ہو گئی خوب گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شیطان نے پھر وہی رٹ لگا دی۔ حمیدہ سے تعارف کراؤ۔ آخر شیطان کی مراد بر آئی۔ واقعی حمیدہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

گیدی صاحب نے ہمیں پھر نصیحتیں کیں، بولے ابھی وقت بہت ہے پورے دو دن باقی ہیں۔ بس گیندیں روکتے رہو۔ اور سکور خود بخود ہوتا رہے گا۔ کھیل شروع ہوا اور ہم نے گیندیں روکنی شروع کر دیں۔ کوئی نہایت ہی فضول گیند ہوتی جو وکٹ سے میلوں پرے ہوتی۔ اُس پر ہٹ لگاتا وہ بھی دبی ہوئی۔ ادھر بڈی بالکل میری نقل کر رہا تھا۔ واقعی رنز خود بخود ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں نے سکور سو تک پہنچا دیا۔ اب تو ہمارے بیٹسمین ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی۔ بڈی آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آ رہا تھا۔ اُس نے ہٹیں لگانی شروع کر دیں۔ اور پھر شپ سے کسی نے بڈی کا کیچ کر لیا۔ بیالیس پر وہ آؤٹ ہو گیا۔ گیدی صاحب آئے لیکن وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ ایک آسان سی گیند پر وہ آؤٹ ہو گئے اور بولے میں گگلی پر آؤٹ ہوا ہوں۔ مقصود گھوڑا آیا اُس نے کھیل ذرا جما دیا۔ سکور ڈیڑھ سو ہو گیا۔ مجھے اب گیند فٹ بال جتنی دکھائی دے رہی تھی اور میں پچاس ناٹ آؤٹ تھا۔ ایک گیند پر مقصود گھوڑے نے ہٹ لگائی اور مجھے بلایا۔ ہم ایک رن کر چکے تو مقصود گھوڑے نے ایک اور کے لئے کہا۔ میں بھاگا وہ کچھ دور چلا آیا پھر چلا کر بولا ـــ واپس جاؤ گیند فیلڈر کے ہاتھ میں آ چکی تھی میں اور مقصود گھوڑا دونوں وکٹوں سے گز دو گز دور تھے۔ میں ہڑبڑا کر بھاگا۔ وکٹ تک پہنچ تو گیا لیکن بُری طرح گرا کہنیاں چھل گئیں دیکھتا ہوں تو مقصود گھوڑا واپس جا رہا تھا وہ رن آؤٹ ہو گیا تھا۔ ہم لنچ کے لئے گئے۔ [illegible] بھی لنچ کے لئے چلا گیا۔ بادل چھائے ہوئے

تھے اُن ہیں جا چھپا۔ لنچ پر تین وکٹوں پر سکور ایک سو اسی تھا۔ میں سید صاحب صاحب کے پاس گیا جہاں سرلا، رضیہ، حمیدہ اور شیطان بیٹھے تھے۔ آج حکومت آپا اور ننھی غائب تھیں ورنہ غالباً شیطان حمیدہ کی طرف دیکھ بھی نہ سکتے۔ شیطان نے کیمرے سے چند تصویریں اتاریں ـــ یا یُوں ظاہر کیا کہ تصویریں اتار رہی ہیں ـــ لنچ کے بعد ایک ہی اوور میں ہمارے دو کھلاڑی نکل گئے۔ کچھ دیر میں بادل صاف ہو گئے اور سورج چمکنے لگا۔ دو سو پر نئی گیند آئی اور مجھے ایک مرتبہ پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ میں تھکتا جا رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ بیٹنگ، بہت مشکل چیز ہے۔ آج تک کبھی اتنی دیر وکٹوں پر ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بھاگنے کو اب بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ چار پر ہمارا سکور ڈھائی سو تھا۔ میرا سکور ستر تھا۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ کمر بُری طرح دُکھ رہی تھی۔ ستر رنز ـــ کافی سکور تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سنچری کرو۔ شیطان اور حمیدہ باتیں کر رہے تھے۔ حمیدہ بولی ـــ مجھے بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے زیادہ پسند ہیں ـــ "لیفٹ ہینڈر" کھیلتا ہوا لگتا بھی اچھا ہے۔ شیطان بولے ـــ میں آج بائیں ہاتھ سے کھیلوں گا۔ اگرچہ میں نے بولنگ دہنے ہاتھ سے کی ہے۔ لیکن بیٹنگ بائیں ہاتھ سے کروں گا۔ اور پھر یہ کرکٹ تو ہے بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ مجھے ایک طرف لے جا کر شیطان نے کہا ـــ اس لڑکی نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ آج تم دیکھنا میں کیسا کھیلتا ہوں ـــ اور ہاں آج رضیہ دن بھر اداس رہی ہے۔ روٹھنا دوٹھنا سب ختم ہو چکا ہے۔ آج وہ تمہیں ضرور بلائے گی۔ اب تم بھی روٹھنا ملتوی کر دو۔ جب وہ بلائے چلے جانا اور مہربان ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت ـــ والا برتاؤ کرنا۔ اس شکر رنجی کا ذکر تک نہ کرنا۔

چار کے بعد پہلی گیند پر ایک وکٹ اور نکل گئی۔ سمتھ آیا۔ اب ایک ایک گیند پر تالیاں بجتی تھیں۔ سکور کرو نہ کرو۔ ہٹ لگاؤ نہ لگاؤ۔ چاہے روکتے رہو یا باہر کی گیند کو صاف چھوڑ دو ـــ شور ضرور مچتا تھا۔ سمتھ مجھے موقعہ دے رہا تھا۔ وعدے کے مطابق وہ گیندیں روک رہا تھا۔ آخر ایک گیند پر نعرہ لگا ـــ "ہاؤ ز اِٹ!" امپائر کی اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھ گئی اور سمتھ واپس چلا گیا۔ اب آخری کھلاڑی آ رہا تھا ـــ شیطان اپنی عینک سنبھالتے بلا گھماتے ایک عجب شان سے تشریف لا رہے تھے۔ ہجوم خاموش ہو گیا۔

جیسے ناگہانی چھا گئی ہو ـــ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب نہ سنچری ہو گی اور نہ سکور پورا ہو گا۔ میں نے شیطان سے التجا کی کہ دہنے ہاتھ سے ہی کھیلو۔ یہ بائیں ہاتھ کا شوق کبھی پھر پورا کر لینا۔ بولے ـــ ہرگز نہیں، حمیدہ دیکھ رہی ہے ـــ اور تم دیکھنا تو سہی اگر زندگی نے وفا کی تو سکور پورا کر کے دکھاؤں گا ـــ جب میں جیتنے کی ہٹ لگاؤں گا تو حمیدہ کا چہرہ فخر سے اُونچا ہو جائے گا۔

شیطان کے محبوب سٹروک دو ہیں ـــ لیگ بائی اور آف بائی۔ کبھی کبھی گیند پیڈوں سے بچ کر بلے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بلے سے نکل جائے تو پھر لازمی طور پر وکٹوں میں چلی جاتی ہے۔ اُنہوں نے لیفٹ ہینڈر کا سٹائل بنایا اور بولر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پہلی گیند اُن کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ دوسری ناک کے نیچے سے نکل گئی۔ تیسری کمر میں لگی۔ اوور کے بعد مجھ سے ملنے آئے۔ لوگوں نے سمجھا کرکٹ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خوب شور مچا۔ شیطان بولے ـــ وہ دیکھو حمیدہ عین سیدھ میں بیٹھی ہے ـــ وہ رہی۔ میں نے بتایا کہ وہ تو کوئی اور ہے شیطان نے عینک کے شیشے صاف کئے اور بولے ـــ تو ہجوم میں کہیں ہو گی۔ کاش کہ اس وقت دوربین ہوتی اور یہ پوائنٹ پر جو فیلڈر کھڑا ہے اس کی مونچھیں مجھے آؤٹ کرائیں گی۔

میرے اوور کے بعد پھر مجھ سے ملے، بولے ـــ جانتے ہو یہ وکٹ کیپر حمیدہ کا کوئی عزیز ہے۔ جی چاہتا ہے اسے ایک کیچ کرا دوں۔ بیچارے نے آج ایک بھی کیچ نہیں کیا۔ میں نے پھر ان کی منتیں کیں۔ شیطان اتنی بری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "یہ بیٹنگ کیسی ہو رہی ہے؟" مخالف بولر آہستہ سے بولا ـــ اور یہ بولنگ کیسے ہو رہی ہے؟ شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُچھل کر ایک لیگ بائی سکور کی۔ اب وہ وکٹ کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور بائی پر بائی سکور ہو رہی تھی۔ سکور دو سو اسی ہو گیا۔ میں پچانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اور شیطان نے آٹھ بائی سکور کی تھیں۔ میں اس قدر تھک چکا تھا کہ مجھے نہ کسی سکور کا چاؤ رہا تھا نہ کسی میچ کا۔ بس ایسا جی چاہتا تھا کہ پیڈ وغیرہ اتار کر یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں۔ ایک گیند پر بائی سکور کر کے شیطان نے مجھے بلایا۔ میں چلا۔ اُنہوں نے دفعتاً روک دیا گیند واپس آئی لیکن تیز تھی اس لئے دوسری طرف نکل گئی۔ شیطان نے پھر بلایا

میں چلا، گیند واپس آگئی، وہ چلّائے واپس جاؤ۔ میں بُری طرح بھاگا۔ وکٹوں تک پہنچا ہی تھا کہ شیطان نے پھر بلایا۔ ہم دونوں خوب بھاگے دوڑے لیکن سکور کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی، اس دفعہ تو میں رن آؤٹ ہوتا ہوتا بچا۔ شیطان وکٹ کیپر سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھ سے بولے۔ میرا تعارف حمیدہ جیسی لڑکی سے ہو گیا ہے اب جہنّم میں جائیں گیدی صاحب اور یہ میچ۔ اگر جیت گئے تو ایک چھوٹا سا لپ ہی تو ہے گا۔ شیطان نے وکٹ کیپر کو کھانے پر مدعو کیا۔ وہ دونوں خوب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ آخری اوور آیا اور میں نے دل کڑا کر کے ایک چوکا لگا دیا، اب میں ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو گلانس کیا اور شیطان کو بلایا۔ وہ نہیں آئے۔ چوتھی گیند پر پھر بلایا وہ پھر بھی وہیں کھڑے رہے۔ وقت ختم ہو گیا۔ جب ہم واپس آئے تو سکور دو سو پچاسی تھا۔ میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ شیطان بولے —— میاں، یہ ننانوے کا پھیر بہت برا ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ہمارے لئے منحوس ہے۔ کہیں کل تمہارے ساتھ اُن کا بولر وہی سلوک نہ کرے جو میں نے خود بیچارے فقیر صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ آخر اُس اوور میں کیا حرکت کی تھی، میرے بلانے پر کیوں نہیں آئے۔ بولے —— اس لئے کہ اب اس خاکسار کی دو آرزوئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری سنچری ہرگز نہ ہو۔ ورنہ تم ہم اناڑیوں کے زمرے سے نکل کر اپنے آپ کو بیٹسمین سمجھنے لگو گے اور ہمارا جینا دوبھر کر دو گے۔ دوسری یہ کہ بیٹنے کی ہٹ میں لگانا چاہتا ہوں کیونکہ حمیدہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ میں ابھی شیطان کو لعنت پیش کر رہا تھا کہ اتنے میں رضیہ آگئی بولی —— ذرا سنئے میں اُس کے ساتھ سے باہر آگیا۔ ہم دونوں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ وہ بولی —— اتنے دنوں سے میں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا جی اچھا نہیں تھا۔ میں نے کہا —— میں بھی اتنے دنوں سے بہت مصروف رہا۔ کچھ امتحان کی تیاری میں اور کچھ یہ ٹورنمنٹ کا سلسلہ۔ میں نے بیگ تھیوری کا ذکر کیا کہ اُسے یہ خیال کیونکر آیا۔ بولی میں نے کرکٹ کی کتاب میں پڑھا تھا۔ پوچھا —— کرکٹ کی کتاب کیوں پڑھی تھی؟ —— بولی —— آپ کا میچ جو ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بڑے شرما رہے تھے۔ وہ بولی —— اب آپ سنچری ضرور کیجئے۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے شرط لگائی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کل کیا پروگرام ہے؟ بولی —— کل چھٹی ہے۔ پوچھا —— کل میرے ساتھ ایک پک نک پر چلو گی وہاں بہت سی لڑکیاں اور بھی ہونگی۔ بولی —— "اجازت لینی ہوگی، امّی سے اور حکومت آپا سے بھی"۔ کہا —— سرلا کا بہانہ کر دینا۔ —— بولی "اچھا کوشش کرونگی"۔ کہا —— "کوشش دوشش کچھ نہیں، وعدہ کرو"۔ شرما شرما کر بولی —— "اچھا"۔

میں شیطان کے ہوسٹل گیا، وہ وکٹ کیپر صاحب وہیں تھے، بڈی بھی وہیں تھا۔ حمیدہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کئی مرتبہ ننانوے ناٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ واپسی میں مجھے ہر دیوار پر جلی الفاظ میں ننانوے ناٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہوسٹل میں پہنچا تو بہت سے لڑکے ملنے آئے ہر ایک نے ننانوے ناٹ آؤٹ دوہرایا۔ ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مجھے ننانوے ناٹ آؤٹ، ننانوے ناٹ آؤٹ، سنائی دیتا رہا، رات بھر کوئی میرے کانوں میں چیخ چیخ کر یہی کہتا رہا —— "ننانوے ناٹ آؤٹ۔ ننانوے ناٹ آؤٹ"۔

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا۔ میچ واقعی نہایت دلچسپ ہو گیا تھا۔ مینا بازار سالم کا سالم وہیں موجود تھا۔ رضیہ میرے لئے چاکلیٹ لائی تھی بولی —— "جب آپ سنچری کریں گے تب آپ کو ملیں گے"۔ سرلا اپنی آٹوگراف بک لائی تھی۔ بولی۔ "جب آپ سنچری کرائیں گے تب آپ کے دستخط کرائیں گے۔ گیدی صاحب بولے —— اگر تم نے سنچری کر لی تو آئندہ تمہیں شروع میں بھیجا کریں گے۔ بڈی بولا —— مجھے یقین ہے کہ تم ضرور سنچری کرو گے، کل میں تمہارے لئے کینڈی اور چیونگ گم کے کئی ڈبّے لاؤں گا۔

تالیوں کے شور اور نعروں کے غل میں شیطان اور میں بلّے لے کر نکلے۔ شیطان کی باری تھا۔ مخالف کپتان نے اپنے ایک فاسٹ بولر کو بلا لیا، اُس کی پہلی گیند شیطان اور وکٹ کیپر دونوں کے اُوپر سے گذر گئی، —— بائی کی چار رنز ہو گئیں —— اگلی گیند پر پھر یہی ہوا —— چار رنز اور ہو گئیں۔ اب اُنہوں نے فالتو فیلڈ لے لی۔ اور بقیہ گیندیں بھی شیطان کے اُوپر سے گذر گئیں لیکن مزید کوئی رن نہ ہوا۔ دوسری طرف سے اُنہوں نے ایک نیا بولر لگایا۔ جس کو میں اب تک نہیں کھیلا تھا۔ وہ اوور یونہی گذر گیا۔ اگلے اوور میں شیطان نے قلابازی سی کھائی اور ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا کٹ لگایا۔ ویسے اُن کا ارادہ لیگ کی طرف کھیلنے کا تھا لیکن کٹ زبردستی لگ گیا۔ اب سکور دو سو ننانوے ہو گیا۔ اور وہیں اٹک کر رہ گیا۔ چند اوور پھر ویسے ہی گذر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ

وہ شور و غل مچا تھا کہ خدا کی پناہ۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر اس مرتبہ گیند شیطان کے سر کے اُوپر سے نکل گئی تو میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ رہ جاؤں گا۔ دفعتاً شیطان نے کٹ کرنے کی کوشش کی اور گیند لیگ کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دو رنز بنائیں، سکور دو سو ننانوے ہو گیا۔ ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لئے صرف ایک رن کی ضرورت تھی اور مجھے بھی سنچری کے لئے ایک رن کی ضرورت تھی۔

اُس اوور کی ابھی تین گیندیں باقی تھیں۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تحاشہ بلا گھمایا لیکن گیند اور بلّے کی ملاقات نہ ہوئی۔ اُدھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ ننانوے ناٹ آؤٹ ایک سیاہ ٹیکا ہے جو میرے ماتھے پر لگا ہوا ہے۔ جیسے یہ ایک طوق ہے جو میرے گلے میں لٹک رہا ہے۔ جیسے یہ ایک سینگ ہے جو میرے سر میں اُگا ہوا ہے جیسے میں اس سے ہرگز پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اوور ختم ہوا اور میری باری آئی۔ وہی نیا بولر گیند پھینک رہا تھا۔ گز گز بھر کی ایک بریک کراتا تھا۔ پہلی گیند روکی، دوسری روکی، تیسری، چوتھی، پانچویں ——میں کسی پر سکور نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ اُدھر گیند آئی اِدھر میں نے آنکھیں بند کر کے بلا گھما دیا۔ خدا جانے بلّے کے کس حصّے سے لگی، لیکن لگی ضرور۔ گیند مڈ آن سے نکل گئی۔ دو فیلڈر پیچھے بھاگے۔ اُدھر میں بھاگا۔ دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے۔ میں نے گیند کی طرف دیکھا۔ فیلڈر بدستور بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا لیکن وہ وہیں کھڑے رہے۔ میں نے اُن کو بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ نہیں ہلے۔ آخر میں اُن کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنی وکٹ پر چھوڑ کر آیا اور تابڑ توڑ واپس بھاگا۔ بس رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا —— اور پھر غدر مچ گیا، زلزلہ آ گیا۔ زمین کی جگہ آسمان نے لے لی۔ آسمان زمین کی جگہ آ گیا —— سنچری ہو گئی —— ہم جیت گئے۔ ٹڈی بھاگا بھاگا آیا اور مجھے کندھے پر اُٹھا کر شامیانے تک لے گیا —— بار بار وہ یہی کہہ رہا تھا —— بوائے او بوائے —— میں اب چیمپین ہوں۔ میں ایک کپ جیت گیا ہوں۔

شیطان وکٹ کیپر اور حمیدہ کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ رضیہ نے مجھے چاکلیٹ دیئے۔ سرلا نے میرے دستخط کرائے۔ جج صاحب نے خوب شاباش دی اور بہت سے بزرگوں نے تعریفیں کیں۔ سرلا آہستہ سے بولی —— میں رضیہ کے گھر جا رہی ہوں۔ آدھ گھنٹے تک آپ میرے گھر سے رضیہ کو لے جائیے۔

میں جلدی سے ہوسٹل گیا، سائیکل کے پیچھے پک نک کی ٹوکری باندھی اور واپس آیا، رضیہ اور سرلا دونوں ملیں۔ سرلا نے مسکرا کر ہمیں رخصت کیا۔ ہم پیدل چل رہے تھے۔ رضیہ نے نہایت خوشنما کوٹ پہن رکھا تھا، بولی —— یہ نیا کوٹ ابا نے سالگرہ پر دیا تھا۔ میں اسے آج پہلی مرتبہ پہن رہی ہوں۔ میں نے پوچھا —— اور اب تک کیوں نہ پہنا۔ بولی —— میں نے سوچا کسی خاص دن پہنوں گی۔

میں نے اُسے سائیکل پہ بیٹھنے کو کہا، بولی کیریر پر تو ٹوکری بندھی ہوئی ہے میں نے کہا —— آگے بیٹھ جاؤ۔ بولی —— جو کسی نے دیکھ لیا تو؟ میں نے کہا۔ کسی نے دیکھ لیا تو میری خوش نصیبی پہ رشک کرے گا وہ شرما کر آگے بیٹھ گئی، میرا چہرہ بالکل اُس کے بالوں سے چھُو رہا تھا —— "یہ تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج پھر چرائی ہے میں بولا —— " آپ نے بھی تو سر میں حکومت آپا کا تیل لگا رکھا ہے"۔ وہ بولی۔ ہم دونوں درست تھے۔

جب ہم دو تین میل نکل گئے تو رضیہ پوچھنے لگی تو رضیہ پوچھنے لگی کہ پک نک کہاں ہو رہا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک باغ ہے وہاں ہو رہا ہے۔ اس نے پوچھا کہ پک نک میں کون کون ہونگے۔ میں نے بتایا کہ پک نک میں صرف دو ہیں —— میں اور رضیہ۔ وہ بولی —— مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا۔ میں نے بتایا کہ اس باغ میں، میں کئی سال سے تنہا آیا کرتا تھا۔ اس کے نظارے اور سنگ مرمر کی عمارتیں مجھے بہت پسند ہیں۔ عرصے سے میرا یہی جی چاہتا تھا کہ تم بھی کبھی میرے ساتھ یہاں آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے سیر کریں۔ ایک اُونچی بُرجی پر چڑھ کر غروب آفتاب دیکھیں۔ حوض کے کنارے سنگ مرمر کی محرابوں میں میں تمہیں چاندنی میں دیکھوں گا۔ ہم باغ میں پہنچ گئے، رضیہ بولی —— واپسی میں دیر تو نہیں ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا —— تم کب تک کی اجازت لے کر آئی ہو۔ بولی —— سرلا نے امی سے کہا تھا کہ رات کے کھانے تک پہنچ جائیں گے۔

میں بولا —— سرلا بہت اچھی ہے۔ وہ مُنہ بنا کر بولی —— جی ہاں، بہت ہی اچھی ہے بیچاری، آپ کی بھی بہت تعریفیں کرتی ہے۔ میں نے مُنہ بنا کر اُس کی نقل اُتاری۔ ہم دونوں ہنس دیئے۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھاس کے قطعوں اور پھولوں کے تختوں میں پھرتے رہے، درختوں میں ہم نے آنکھ مچولی کھیلی، حوض کے کنارے

بیٹھ کر چھینٹے اُڑائے۔ سیڑھیوں پر شرطیں لگا لگا کر چڑھے۔ جب دھوپ پیلی پڑ گئی اور درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تو ہم سب سے اُونچی بُرجی پر چڑھ گئے۔ وہاں سے ہم نے غروب آفتاب دیکھا۔ جو آج بیحد حسین معلوم ہوا۔ بادلوں نے آسمان میں رنگ برنگے دیا، چمکیلے محل، سنہری سیڑھیاں اور اودے اُودے پہاڑ بنا رکھے تھے۔ رنگوں کا یہ کھیل دیر تک رہا۔ آفتاب غروب ہو چکا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا سا گول چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کھلی۔ اور ہم حوض کے کنارے جا بیٹھے۔ حوض میں لہریں مچل رہی تھیں اور ہزاروں چاند تڑپ رہے تھے۔ آج چاندنی میں بلا کی جاذبیت اور نرالی دلآویزی تھی۔ سنگ مرمر کی محرابوں تلے میں نے رضیہ کو دیکھا اور یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ چاندنی زیادہ حسین ہے یا رضیہ کے چہرے کی وہ جلا جس نے چاندنی کو حُسن بخشا ہے۔ تب یُوں معلوم ہوتا جیسے رضیہ کا حُسن اور چاندنی ایک ہی نور کے حصے ہیں۔

جب ہم دونوں سائیکل پر واپس آ رہے تھے تو میرا دل مسّرت سے رقص کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس چاندنی رات میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہُوں۔

رضیہ بولی —"یہ میچ تو صرف آپ کا میچ تھا، وہ ہیٹ ٹرک خوب ہُوا — آپ گیند پھینکتے ہُوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

میں نے کہا —"وہ ہیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔"

وہ بولی —"اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ؟"

میں نے مچل کر کہا —"نہیں سو ناٹ آؤٹ۔"

بولی —"ہم تو ننانوے ناٹ آؤٹ ہی کہیں گے، وہ آخری رن تو آپ نے زبردستی بنالی۔ بھلا کرکٹ میں کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے۔ کوئی اپنے ساتھی کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھی سکور کرتا ہے۔ اور یہ سب سرلا کے ربن کی برکت ہے۔"

میں نے کہا —"ذرا میری طرف دیکھو۔" اس نے میری طرف دیکھا کہا —"اب ذرا مسکراؤ بھی۔" وہ مسکرانے لگی۔ کہا —"اب ذرا مُنہ بنا کر دکھاؤ جیسے رُوٹھتے میں بنتا ہے۔" اُس نے مُنہ بنایا۔ میں نے کہا —"تم مسکراتی ہوئی کہیں اچھی معلوم ہوتی ہو۔ ہلکی سی مسکراہٹ سے تمہارا چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ یہ مُنہ بنانا یا رُوٹھنا تمہیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ اگر یقین نہ ہو تو آج آئینے میں دیکھنا۔"

اُس نے اپنی اُنگلیوں سے آہستہ سے میرا چہرہ موڑ دیا —"آپ آگے دیکھئے — بالکل سیدھ میں — اور سائیکل سیدھی چلایئے۔ کہیں کسی درخت یا کھمبے سے ٹکر نہ ہو جائے۔"

سرلا کے ہاں پہنچے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ رضیہ کو چھوڑ کر میں نے شیطان کے ہوسٹل کا رُخ کیا، راستے میں وہی سپورٹس کا رپورٹر مل گیا، بولا — مبارک ہو آپ لوگ میچ جیت گئے ہیں، آپ ننانوے ناٹ آؤٹ رہے۔ میں نے پوچھا — آپ کو کس نے بتایا؟ بولا — رُوفی صاحب نے، اور میں نے اخبار میں آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ ذرا اور خوش قسمت ہوتے تو ایک اور سکور کر کے سنچری کر جاتے میں نے پوچھا — ابھی چھپا تو نہیں؟ بولا — نہیں آدھی رات کے بعد چھپے گا میں نے اُسے ساتھ لیا، راستے میں سٹینڈرڈ آتا تھا جہاں بڈی اکثر پایا جاتا تھا۔ وہاں سے بڈی کو پکڑا، شیطان کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا کہ ایک بڑے سے پلنگ پر رضائیاں اوڑھے چند حضرات کھانا کھا رہے ہیں۔

رضائیاں منگائی گئیں اور ہمیں بھی ساتھ بٹھایا گیا۔ "تم بھی کھانا کھاؤ نا؟" شیطان نے بڈی سے پوچھا۔

"نہیں! — میں ابھی کھا کر آیا ہوں۔"

"اچھا — تو ان کے لئے بھی کھانا لاؤ۔" شیطان نوکر سے بولے۔

"تم انڈے کھاؤ گے یا کباب؟"

"کباب!" بڈی بولا۔

"اچھا تو ان کے لئے انڈے لاؤ۔ بھلا! آملیٹ کھاؤ گے یا تلے ہُوئے؟"

"آملیٹ!" بڈی بولا۔

"تو پھر تلے ہُوئے انڈے لے آؤ۔"

رپورٹر بولا میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ شیطان نے اصرار کیا کہ چاء یا کافی ہی پی لو۔ وہ بولا —"شکریہ میں فقط کافی پیا کروں گا۔"

شیطان نوکر سے بولے —"کافی بنا لاؤ۔"

کھانے کے بعد میں نے وہ ننانوے ناٹ آؤٹ والا قصہ سنایا۔ شیطان بولے —"یار عجب سپورٹسمین ہو تم بھی۔ صرف ایک رن کے لئے اِتنے پریشان ہو رہے ہو۔ اچھا یار تمہاری سنچری بنوا دیں گے بس!" اور رپورٹر

(باقی صفحہ ۲۵۶ پر)

ناول

لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۴/-
جزیرہ سخنوران	غلام عباس	۱/۴/-
غزالہ	ٹرجنیف	۱/۴/-
پریم کا جادو	(مترجمہ) سراج الدین احمد	(زیر طبع)
بغیر عنوان کے	سعادت حسن منٹو	(زیر طبع)
اندھیرا	اختر حسین رائے پوری	,,
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	,,
گرتی دیواریں	اپندر ناتھ اشک	,,
پرچم	خواجہ احمد عباس	,,
جنت اور جہنم	کرشن چندر	,,
گدھ	,, ,,	,,
کارواں	اختر اورینوی	,,
مریض	راجندر سنگھ بیدی	,,

ڈرامے

منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۳/-/-
پاپی	اپندر ناتھ اشک	۱/۸/-
آؤ	سعادت حسن منٹو	۱/۸/-
تین عورتیں	,, ,, ,,	۱/۴/-
انسان کی زندگی	اندریف	۱/۸/-
چرواہے	اوپندر ناتھ اشک	۲/-
پیکار	گالزوردی	(زیر طبع)
اچھا اور برا	مہندر ناتھ	,,
شیطان	عصمت چغتائی	,,
شکست کے بعد	کرشن چندر	,,
رخشندہ	راجندر سنگھ بیدی	,,

منظومات

آیات و نغمات	,, ,,	۵/ /-
حرف و حکایت	,, ,,	۴/ /-
نقش و نگار	,, ,,	۳/۱/-
فکر و نشاط	,, ,,	۲/۸/-
جنون و حکمت	,, ,,	۴/ /-
سیف و سبو	,, ,,	۵/ /-
ماوراء	ن-م- راشد	۲/۱/-
نقش فریادی	فیض احمد فیض	۲/ /-
آہنگ	اسرارالحق مجاز	۲/-/-
نغمۂ حرم	اختر شیرانی	۲/ /-
آبگینے	عبدالحمید عدم	۱/۸/-
آہنگ رزم	وقار انبالوی	-/۱۲/-
۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	-/۱۲/-
۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں (مرتبہ)	ادارہ	۱/۲/
۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	۱/۴/
۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں	ادارہ	۱/۴/-
۱۹۴۵ء ,, ,,	,,	۱/۴/-

خوناب	اختر انصاری	۸/-
میراجی کے گیت	میراجی	۱۲/-
فروزاں	معین احسن جذبی	۸/-
زہر خند	یوسف ظفر	-/-
وسعتیں	سلام مچھلی شہری	۸/-
شعلۂ ساز	فراق گورکھپوری	-
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	۸/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۱۲/-
جلال و جمال	احمد ندیم قاسمی	(زیر طبع)
زہراب	علی جواد زیدی	,,
ساغر	ساغر نظامی	,,
رنگ محل (بہ ترمیم و اضافہ)	,,	,,
سلسلہ (اردو کی بہترین غزلیں)		,,
آتشکدہ	عبدالحمید عدم	,,
پرتو	جان نثار اختر	,,
تاریک سیارہ	اختر الایمان	,,
گھن گرج (انقلابی نظمیں) مرتبہ	گوپال مِتل	,,
سارنگ (گیتوں کا مجموعہ) مرتبہ	رام پرکاش اشک	,,
غزلیں	حفیظ ہوشیارپوری	,,

اجتماعیات

مشین اور مزدور	باری	/۴/-
آزادی کی راہیں	برٹرینڈ رسل	/۸/-
راجہ اور کسان	لیونارڈ امشف	/۸/-
صاحب اور مذہب	,, ,,	/۸/-
بابو اور مزدور	,, ,,	/۸/-
سوشلزم	اینگلز	/۴/-
سرمایہ داری	عبد اللہ ملک	/۸/-
جاگیرداری	,, ,,	-/۸/-
آمریت	اکرام قمر	-/۸/-
Pakistan & Untouchability	Ch. Afzal Haq	2/4
پاکستان (اردو)	چوہدری افضل حق	۱/۴/-
احساس کمتری	شیر محمد اختر	-/۸/
مربونکی قومی تحریک :	مسعود علی ندوی	-/۸/-
معیشت زر	ابن الحسن	-/۸/-
گاندھی ازم - نیشنلزم - سوشلزم :	ایم - این - رائے	۱/۸/-
سویٹ روس کے مزدور	گوپال مِتل	-/۸/-
سائنس اور دنیا	ایچ - جی - ویلز	-/۸/-
رائے کے مضامین	ایم - این رائے	/۸/-
سامراج	لینن	(زیر طبع)

ادبیات و تنقیدات

ادب کثیف	حاجی لق لق	۱/۴/-
ہندی کے مسلمان شعراء :	عبداللہ بٹ	-/۸/-
اقبال اور اسکا پیغام	محمد رفیق خاور	-/۸/-
اردو ڈراما	عبد السلام خورشید	-/۸/-
تنقید جدید	اختر اورینوی	(زیر طبع)

رجسٹرڈ ایل۔ نمبر ۳۵۲۱

سرورق دین پریس ٹمپل روڈ لاہور میں طبع ہوا